دو شہروں کی کہانی
چارلس ڈکنس
مترجم
فضل الرحمٰن

نیشنل بک ٹرسٹ کی کتاب

دو شہروں کی کہانی

مصنف
چارلس ڈکنس

مترجم
فضل الرحمن

پبلیکیشنز ڈویژن
منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ
گورنمنٹ آف انڈیا

June, 1961
Asadha, 1883 (Saka)

جون سنہ ۱۹۶۱ء، (اساڑھ شک سمت ۱۸۸۳)

قیمت 5/-

A TALE OF TWO CITIES
(Urdu)

پبلشرز:- ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶
پرنٹرز:- دلی پریس پرائیویٹ لمیٹڈ رانی جھانسی روڈ دہلی

مصنّف کا پیش لفظ

جب میں اپنے بچوں اور دوستوں کے ساتھ مسٹر ولکی کالنس کے ڈرامے میں، جس کا نام فروزن ڈیپ تھا، ایکٹ کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اس کہانی کا مرکزی خیال پیدا ہوا۔ پھر اس کیفیت کو اپنے اندر جذب کرنے کی زبردست خواہش دل میں مچلنے لگی۔ اور میں نے بڑی احتیاط اور دلچسپی کے ساتھ اس ذہنی کیفیت کی تفصیلات کا تصور باندھنا شروع کیا جو ایک باریک بین مبصر کی پیش کش کے لئے ضروری ہیں۔

جوں جوں مرکزی خیال ذہن میں مانوس ہوتا گیا تصویر کے موجودہ خدوخال ابھرتے گئے۔ جب میں ان واقعات کو ترتیب دینے لگا تو وہ مجھ پر اس طرح چھا گئے کہ مجھے ہر واقعہ کا تجربہ اور یقین ہونے لگا، اور میں محسوس کرنے لگا کہ جو کچھ ان صفحات میں بیان کیا گیا ہے وہ سب حادثے گویا خود مجھ پر گذرے ہیں۔

جب کبھی اس کتاب میں انقلاب کے دَوران میں یا اس سے قبل فرانس کے باشندوں کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے تو یقین مانئے وہ صداقت اور معتبر شہادتوں پر مبنی ہے۔ اس ہیبت ناک دَور کو سمجھنے اور سمجھانے کے دلچسپ اور مقبول عام ذریعوں میں اضافہ کرنے کا میں عرصے سے آرزومند رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے اعتراف ہے کہ مسٹر کارلائیل کی لاجواب کتاب کے فلسفے میں کسی مزید اضافے کی گنجائش نہیں۔

نومبر ۱۸۵۹ء

فہرست مضامین

تیسرا حصہ

طوفان کا راستہ

پہلا حصّہ

نئی زندگی

پہلا باب

زمانہ

عجب تضادات کا دور تھا۔

ایک طرف وہ بہترین زمانہ تھا۔ دوسری طرف بدترین زمانہ۔ ایک لحاظ سے عقل و دانش کا دور۔ دوسرے اعتبار سے جہل و نادانی کا عہد۔ بیک وقت اعتقاد اور بے اعتقادی کی فضا جہاں روشنی کے پہلو بہ پہلو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ امیدوں کی بہاریں بھی تھیں اور مایوسیوں کی خزائیں بھی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔ ایک سمت جنت کا دروازہ تھا دوسری سمت دوزخ کا دہانا۔ سامنے منزل بھی تھی اور گمراہی بھی۔ مختصر یہ کہ وہ زمانہ ہمارے زمانے سے اس قدر مشابہ تھا کہ ہمارے بعض ہم عصر جنہوں نے اس زمانے کی تاریخ لکھی ہے۔ بڑے زور شور سے دونوں زمانوں کے حسن و قبح کا مقابلہ کرتے ہیں۔

انگلستان کے تخت پر ایک چوڑے جبڑے والا بادشاہ براجمان تھا جس کی ملکہ معمولی شکل کی تھی۔ فرانس کے تخت پر بھی ایک چوڑے جبڑے والا بادشاہ مسلط تھا جس کی ملکہ قبول صورت تھی۔ دونوں ممالک کے خداوندان نعمت کو یقین کامل تھا کہ حالات

کبھی بدلنے والے نہیں۔

۱۷۷۵ء کا انگلستان۔ اس زمانہ میں بھی اپنے روحانی انکشافات کے لئے ایسا ہی مشہور تھا جیسا کہ اب ہے۔ ایک مسز ساؤتھ کاٹ تھیں جنہوں نے اس سال اپنی پچیسویں سالگرہ کا مبارک دن منایا تھا۔ ان محترمہ کے ورود مسعود پر لائف گارڈ کے ایک سپاہی نے پیغمبرانہ شان سے پیشین گوئی کی تھی کہ لندن اور ویسٹ منسٹر صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ کاک لین کا بھوت بھی بارہ سال تک پلین چٹ کے ذریعہ روحانی پیغامات دینے کے بعد غائب ہو چکا تھا۔ آج بھی ہمارے زمانے کی روحیں اس بھوت کی اندھی تقلید میں میزوں پر کھٹا کھٹ ویسی ہی گھسی پٹی۔ حیرت انگیز حد تک جدت سے محروم۔ آسمانی خبریں مہیا کر کے غائب ہو جاتی ہیں۔ کیسے تعجب کا مقام ہے کہ وہ معمولی دنیاوی خبریں جو امریکہ میں بسنے والے برطانوی شہریوں کی کانگریس کی طرف سے انگلستان کے بادشاہ اور عوام کو وصول ہوئی تھیں۔ کاک لین کے مرغوں کی آسمانی خبروں سے زیادہ اہم ثابت ہوئیں۔

جہاں تک روحانی طاقتوں کا تعلق تھا ڈھال اور ترسول کے شاہی نشان والے ہمسایہ ملک انگلستان کے مقابلہ میں فرانس بہت پچھڑا ہوا تھا۔ نہایت اطمینان سے کاغذ کے نوٹ چھاپ چھاپ کر وہ تباہی کے غار کی طرف پھسلتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے عیسائی پیشواؤں کی اصلاح اور راہنمائی میں فرانس نے اپنی دل بستگی کے لئے انسان دوستی کے عجیب و غریب سامان مہیا کر لئے تھے۔ مثلاً جب ایک لڑکے نے راہبوں کے ایک گھناؤنے جلوس کے آگے جو پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر گذر رہا تھا۔ کیچڑ میں گھٹنے ٹیکنے سے تساہل کیا تھا تو اس جرم کی پاداش

میں اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تھے۔ اور اس کی زبان گدی سے نکال دی گئی تھی۔ اور اسے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ کون جانے جب وہ معصوم جلایا جا رہا تھا تو عین اس وقت فرانس اور ناروے میں ان درختوں کا کلا پھوٹ رہا ہو جنہیں تقدیر کے لکڑہارے نے اس غرض سے چن لیا ہوگا کہ ان کی لکڑی سے تاریخ عالم کی سب سے ہیبت ناک سولی کے تختے بنائے جائیں۔ کون جانے عین اسی دن پیرس کے اطراف کی سخت زمین پر کسانوں کے بوسیدہ سائبانوں میں کیچڑ میں لت پت سوروں اور مرغیوں سے گھری ہوئی کئی ایسی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہونگی جنہیں دہقان اجل نے انقلاب کے بدنصیب قیدیوں کے لئے منتخب کر لیا ہو۔ لیکن وہ آسمانی لکڑہارا اور دہقان ہمیشہ مصروف رہنے کے باوجود کبھی کسی کو کام کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے ڈھکے چھپے قدموں کی چاپ کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ اگر کوئی اس وقت یہ شبہ بھی ظاہر کرتا کہ وہ بیدار ہیں تو اسے دہریہ اور غدار اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا۔

انگلستان میں بھی امن وقانون کی حالت کچھ ایسی قابل فخر نہ تھی۔ ہر رات خود لندن میں ہتھیار بند چور گھروں میں نقب لگاتے اور ڈاکو سڑکوں پر لوٹ مار مچاتے۔ لوگوں کو علی الاعلان خبردار کیا جاتا کہ وہ اپنا سامان حفاظت کے لئے گوداموں میں منتقل کئے بغیر شہر نہ چھوڑیں۔ رات کے ڈاکو دن کی روشنی میں سوداگر بن جاتے۔ اور اگر ان کا کوئی ہم پیشہ تاجر انہیں پہچان لیتا اور چیلنج دیتا تو لٹیروں کے یہ سردار اسے گولی سے مار کر چلتے بنتے۔ ڈاک گاڑی کو ایک دفعہ سات ڈاکوؤں نے راستے میں روکا۔ تین کو گارڈ نے ٹھکانے لگا دیا اور جب اسکی گولی بارود ختم ہوگئی تو باقی چار ڈاکوؤں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور پھر ساری ڈاک

لوٹ لی۔ لندن کے لارڈ میئر جیسی مقتدر ہستی کو رہزنوں نے ٹرن ہیم گرین کے میدانوں میں عزت مآب کے ماتحتوں کے سامنے لوٹ لیا۔ لندن کے جیلوں میں قیدی اپنے پاسبانوں سے باقاعدہ جنگ کیا کرتے تھے اور قانون کی عظمت کے محافظ ان پر گولیاں چلاتے تھے۔ شاہی محلوں کے دیوان خانوں میں چور امراء کے گلوں سے ہیروں کی مالیں اچک لے جاتے تھے۔ سپاہی سینٹ گائیلس کے گرجا گھر میں گھس کر ممنوعہ سامان کی تلاش کرتے تو عوام ان پر گولی چلاتے اور وہ عوام پر گولی چلاتے۔ اور کسی کو اس میں خاص بات نظر نہ آتی۔ اور ان لوگوں کے درمیان جلاد کی ہر جگہ ضرورت پیش آتی۔ وہ ہمیشہ مصروف رہتا۔ پھر بھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ وہ کبھی مجرموں کی قطاروں کی قطاریں سولی پر چڑھا دیتا۔ کبھی کسی کو بغیر مہلت دیئے فوراً پھانسی پر لٹکا دیتا۔ کبھی نیوگیٹ کے بیسیوں قیدیوں کے ہاتھوں کو جکڑ کے دیئے جاتے اور کبھی سینکڑوں کتابچے ویسٹ منسٹر ہال کے دروازے پر جلا دیئے جاتے۔ آج ایک خونخوار قاتل کی جان لی جا رہی ہے تو کل ایک غریب بچے کی جس کا قصور یہ تھا کہ اس نے کسان کے لڑکے کی جیب سے چھ پنس چرائے تھے۔

۱۷۷۵ء میں اور اس پاس کے سال کے لگ بھگ اور ایسے کئی واقعات پیش آئے تھے اور اس ماحول میں جب کہ تقدیر کا لکڑ ہارا اور دہقان اجل مصروف تھے۔ وہ دونوں چوڑے جبڑے والے بادشاہ اور انکی ملکائیں (جن میں ایک معمولی شکل کی اور دوسری قبول صورت تھی)، یہ چاروں تاجدار دھوم دھام سے براجمان رہے تھے۔ اور ان کے خداوندی حقوق کی بڑے زور شور سے حفاظت ہو رہی تھی۔ اس طرح ۱۷۷۵ء میں وہ

بااقتدار ہستیاں اور اس سرگزشت کے کرداروں جیسے لاکھوں معمولی انسان اپنی اپنی زندگی کے راستوں پر چلے جا رہے تھے۔

دوسرا باب

ڈاک گاڑی

نومبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ جمعہ کی رات تھی اور ڈوور کی لمبی سڑک، اس اجنبی مسافر کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ جو اس سرگزشت کا پہلا کردار ہے۔ ڈاک گاڑی شوٹرس ہل پر کھڑکھڑاتی کشاں کشاں چلی جارہی تھی۔ اور دوسرے مسافروں کے ہمراہ وہ بھی ڈاک گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسافر کچھ شوقیہ ورزش کے لئے چہل قدمی نہیں کررہے تھے بلکہ حالات سے مجبور تھے۔ ایک تو پہاڑی کی چڑھائی۔ دوسرے دلدل۔ پھر زمین کا بوجھ اور خود ڈاک گاڑی کیا کم وزنی تھی۔ تین دفعہ گھوڑے راستے میں اڑ گئے اور ایک دفعہ تو بدک کر گاڑی کو واپس بلیک ہیتھ لوٹانے پر ڈٹ گئے۔ کوچوان اور محافظوں نے شاید قوانین جنگ کی وہ دفعہ پڑھ رکھی تھی جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے کچھ جنگلی جانوروں کو زیور عقل سے آراستہ کر دیا ہے۔ انہوں نے ہنٹروں اور لگاموں کی مدد سے انہیں قابو میں کرلیا۔ سر جھکائے دُمیں جھٹکتے منہ زور گھوڑے کیچڑ میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے چلے جا رہے تھے

ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی دم میں اسکے اعضا جوڑوں سے الگ ہوکر تتر بتر ہو جائیں گے۔ جب بھی گاڑی بان ستانے کے لئے چمکار کر گھوڑوں کو رُکتا سب سے آگے والا گھوڑا زور زور سے اپنا ساز اور لگاموں سے بوجھل سر ہلاتا گویا کہتا ہو۔ یہ گاڑی اس پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتی۔ اجنبی مسافر اگلے گھوڑے کی اس حرکت پر سراسیمہ ہوکر چونک اٹھتا۔ وہ بہت زیادہ پریشان اور بوکھلایا ہوا تھا۔

پہاڑیوں کے اطراف اور نشیب کی وادیوں میں کہرے کے اُبلتے ہوئے بگولے ایک ایسے گمراہ آسیب کی طرح سرگرداں تھے جو سکون اور پناہ کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ ٹھنڈے ٹھنڈے چپچپاتے ہوئے یخ بستہ کہرے کے مرغولے ہوا میں پے در پے دائروں کی صورت میں منحوس سمندر کی لہروں کی طرح آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ڈاک گاڑی کے لیمپوں کی روشنی بھی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ گھوڑوں کے پسینے سے جو بخارات اُٹھ رہے تھے انہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا گویا یہ سارا کہرا انھیں کا پھیلایا ہوا ہے۔

اجنبی مسافر کے علاوہ دو اور مسافر ڈاک گاڑی کے ساتھ ساتھ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ تینوں گھٹنوں تک کے بوٹ پہنے ہوئے تھے اور رخساروں کی ہڈیوں اور کانوں تک لبادے لپیٹے ہوئے تھے۔ تینوں میں سے کوئی بھی ساتھ والے کی صورت سے آشنا نہیں تھا۔ تینوں نہایت پُراسرار طریقے پر ظاہری آنکھوں سے بھی اتنے ہی پوشیدہ تھے جتنے باطنی آنکھوں سے۔

اس زمانے میں لوگ اجنبیوں سے کھل کر بات کرنے سے جھجکتے تھے۔ اس ڈر سے کہ وہ ڈاکو یا ان کے حالی موالی نہ ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کسی شراب خانہ یا ڈاک گھر کے مالک سے لے کر ادنیٰ ملازم تک کوئی بھی ڈاکوؤں کے سردار کا چیلہ چانٹا ہو سکتا تھا۔

نومبر ۱۷۷۵ء کے اس جمعہ کی رات کو جس کا ذکر ہے۔ ڈوور کی ڈاک گاڑی کا گارڈ کم از کم یہی سوچ رہا تھا۔ گاڑی شوٹرس ہل کی چڑھائی پر گھسٹ رہی تھی۔ وہ ڈاک گاڑی کے پچھلے پائیدان پر کھڑا اپنے پیر پٹخ رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں اور ہاتھ ہتھیاروں کے صندوق پر جمے ہوئے تھے۔ جس میں ایک بھرمار بندوق چھ سات بھرے ہوئے پستول اور کئی چھرے رکھے ہوئے تھے۔ ڈوور کی گاڑی میں عجیب دلچسپ فضا طاری تھی۔ گارڈ مسافروں کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ مسافر گارڈ اور ایک دوسرے کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غرض کسی کو کسی پر بھروسہ نہ تھا۔ صرف کوچوان کو یقین کامل تھا۔ اور وہ ان گھوڑوں کے بارے میں مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہہ سکتا تھا کہ یہ جانور قطعی سفر کے قابل نہیں۔

"ہا.... ہا.... پٹخ نخ... ہاں بس جم کر زور لگا دو اور بیڑا پار ہے" کوچوان نے گھوڑوں کو پچکارا "ارے کم بختو کن مصیبتوں سے تمہیں چڑھا کر لایا ہوں۔ اے جو!"

"کیا ہے" گارڈ نے جواب دیا۔

"گھڑی میں کیا بجا ہوگا۔ جو۔"

"گیارہ بج کر دس منٹ"

"مر گئے تب تو" کوچوان غصہ سے بھنایا "اور ابھی تک پہاڑی کی چوٹی تک نہیں پہونچے..... ٹخ.. ٹخ... ارے قدم بڑھا کے مردودو"

آگے والے گھوڑے نے چابک کی چوٹ سے تلملا کر جی توڑ کر زور لگایا اور پچھلے تین گھوڑوں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور پھر ایک بار ڈھود ور کی ڈاک گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ مسافروں کے جوتے کیچڑ میں چھپا کے بھرتے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ جب گاڑی رک جاتی تھی تو وہ بھی رک جاتے تھے۔ وہ بالکل گاڑی سے لگے لگے چل رہے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے ہمراہی کو آگے کہر اور اندھیارے میں بڑھ کر چلنے کی رائے دیتا تو شاید وہ اسے جان کا دشمن ڈاکو سمجھ کر وہیں اس کے گولی مار دیتا۔

آخری بار جو گھوڑوں نے زور لگایا تو گاڑی پہاڑی کی چوٹی پر پہونچ گئی ۔ گھوڑے دم لینے کو رک گئے اور گارڈ نے نیچے پہیوں میں پتھر اڑکا دیئے تاکہ گاڑی ڈھلان پر لڑھک نہ جائے، اور مسافروں کے سوار ہونے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"شش شش... جو.." کوچوان نے اپنی نشست پر سے جھک کر گارڈ کو خبردار کیا...

"کیا بات ہے ٹام"

دونوں چوکنے ہو گئے۔

"جو۔ میں کہتا ہوں۔ کوئی سوار پویہ چال چلا آرہا ہے"

"میرے خیال میں سوار سرپٹ آرہا ہے۔ ٹام" گارڈ نے جواب دیا اور جلدی سے

گاڑی کا ہٹ چھوڑ کر اُچک کر پائیدان پر چڑھ گیا۔

"صاحبو بادشاہ سلامت کی خاطر آپ لوگ ہوشیار ہو جائیں" اس کے بعد وہ اپنی بھرمار بندوق تان کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ اس سرگذشت کا پہلا کردار یعنی اجنبی جو گاڑی میں سوار ہو رہا تھا پائیدان پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے پیچھے دونوں مسافر بھی سڑک پر رُک گئے۔ سب کے سب آہٹ پر کان لگائے کبھی کوچوان کو دیکھتے اور کبھی گارڈ کو۔ کوچوان نے مُڑ کر دیکھا۔ گارڈ نے مڑ کر دیکھا یہاں تک کہ اگلے گھوڑے نے بھی کان کھڑے کر لئے جیسے اسے بھی آنے والے خطرے کا احساس تھا۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ بند ہو جانے سے خاموشی اور بھی واضح ہو گئی تھی۔ گھوڑوں کے ہانپنے سے گاڑی کسی قدر لرز رہی تھی۔ اور یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی کسی جان دار کی طرح بے چین ہے۔ مسافروں کے دل اس تیزی سے دھڑکنے لگے کہ اگر کوئی ان کی آواز سُن لیتا تو تعجب کی بات نہ تھی۔ بہرحال اس خاموش لمحے میں لوگوں کے دم رُکے ہوئے تھے اور نبضیں تیز ہو گئی تھیں۔ اور وہ امید و بیم کی حالت میں سانس روکے کھڑے تھے۔ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کا شور پہاڑی کی چوٹی تک آ پہونچا۔

"خبردار.. کون ہے... ٹھیر جاؤ ورنہ گولی ماردی جائے گی۔ گارڈ پوری طاقت سے گرجا۔

گھوڑے کی رفتار یکایک رکی۔ اور کیچڑ میں ٹاپیں مارنے کی آوازوں کے

معاً کسی نے کہر کے دھندلکے میں سے پکار کر پوچھا۔

"کیا یہی ڈوور کی ڈاک گاڑی ہے؟"

"تمہاری بلا سے کوئی بھی گاڑی ہو۔ پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو؟" گارڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کیا یہی ڈوور کی ڈاک گاڑی ہے؟"

"تم یہ بات کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے ایک مسافر کی تلاش ہے؟"

"کون سا مسافر؟"

"مسٹر جارویس لاری!"

ہمارے اجنبی مسافر کے چہرے سے پتہ چل گیا کہ یہ اسی کا نام ہے۔ گارڈ کوچوان اور دوسرے مسافر اسے مشتبہ نظروں سے گھورنے لگے۔

"اپنی جگہ ٹھیرے رہو کیونکہ اگر تم نے کچھ گڑبڑ کی اور غلطی سے میری بندوق چل گئی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

گارڈ کہر میں چھپے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا اور پھر پلٹ کے چلایا "جلدی بولیے۔ لاری نام کے کوئی صاحب ہیں؟"

"معاملہ کیا ہے۔ یہ کون مجھے پکار رہا ہے۔ جیری کیا یہ تم ہو؟" مسافر نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کون منحوس ہے یہ۔ جیری مجھے اس کی آواز قطعی پسند نہیں۔ کمبخت پھٹا بانس ہے" گارڈ بڑبڑایا۔

"جی ہاں مسٹر لاری"

"کیا بات ہے"

"ٹی اینڈ کمپنی نے آپ کے نام ایک مراسلہ بھجوایا ہے"

"گارڈ میں اس آدمی کو جانتا ہوں" لاری نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

دوسرے مسافر اسے دھکا دے کر جلدی سے لپک کر گاڑی میں گھس گئے اور دروازہ بند کر کے کھڑکی چڑھالی۔

"کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اسے قریب آنے دو" مسٹر لاری نے گارڈ کو اطمینان دلایا۔

"بہت اچھا" جیری نے اور بھی کھردری آواز میں کہا۔

"بس ایک قدم آگے آؤ۔ سمجھے میری بات۔۔۔ اور جو تم نے زین میں لٹکے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں۔۔ اور کبھی بھول چوک سے تمہیں گولی لگ گئی تو میں نہیں جانتا۔ اب ذرا دیکھیں تو تمہاری صورت"

بل کھاتے ہوئے کہر میں سے آہستہ آہستہ ایک گھوڑ سوار نمودار ہوا اور ڈاک گاڑی کے قریب آگیا۔ جہاں دوسرے مسافر کھڑے تھے۔ سوار رک گیا اور گارڈ کو گھورتے ہوئے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ مسٹر لاری کو دیا۔

گھوڑا ہانپ رہا تھا۔ اور سوار اور گھوڑا دونوں سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت تھے۔

"گارڈ" مسٹر لاری نے بڑے کاروباری لہجہ میں کہا۔ گارڈ ایک ہاتھ بندوق کی نالی پر اور دوسرا ہاتھ کندھے پر رکھ کر چوکس ہوگیا۔ اور مستعدی سے سوار کو گھورتے ہوئے بولا۔

"جی سرکار"

"کوئی ڈر کی بات نہیں ... ٹیلسن بینک سے میرا تعلق ہے۔ لندن میں ٹیلسن بینک کو تم جانتے ہی ہوگے۔ میں ایک کام سے پیرس جا رہا ہوں۔ لو یہ اپنا انعام۔ شراب کا دور چڑھا لینا۔ ذرا میں خط پڑھ لوں"

"بہت اچھا سرکار مگر ذرا جلدی کیجئے"

"لاری نے گاڑی کے لیمپ کی روشنی کے سامنے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے منہ ہی منہ میں پھر اونچی آواز سے۔

"ڈوور پر صاحبزادی کا انتظار کرو" ..... خط پڑھ کر مسٹر لاری نے گارڈ سے کہا۔

"گارڈ۔ تم نے دیکھا خط مختصر ہی تھا ... جیری۔ اس خط کا صرف اتنا جواب ہے ... "نئی زندگی پائی"

"کیا عجیب و غریب جواب ہے" جیری نے چونک کر نہایت کھردری آواز میں کہا۔

"جاؤ بس یہی پیغام پہونچادو۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ مجھے خط مل گیا۔ اور کسی مزید تحریری جواب کی ضرورت نہیں۔ ذرا احتیاط سے واپس جانا۔۔۔ شب بخیر"

اتنا کہہ کر مسٹر لاری نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سوار ہوگئے۔ ہمسفروں نے ان کی کوئی مدد نہ کی، کیونکہ انہوں نے اپنی گھڑیاں اور بٹوے اپنے جوتوں میں چھپا لئے تھے اور اب سونے کا سوانگ رچائے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد اس حیلہ بازی سے اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں اور کوئی شاخسانہ نہ نکل آئے۔

کہرا اور بھی گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اور گاڑی ڈھلان پر بل کھاتے ہوئے کہر کے مرغولوں میں لڑکھڑاتی چلی جارہی تھی۔

گارڈ نے بھر مار بندوق ہتھیاروں کے بکس میں واپس رکھدی اور دوسرے ہتھیاروں پر احتیاط سے نظر ڈالی۔ کمر میں بندھے ہوئے پستول کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی نشست کے نیچے ایک چھوٹے ڈبے کا جائزہ لیا۔ جس میں کچھ لوہار کے اوزار و دو ایک مشعلیں اور آگ جلانے کی ڈبیہ تھی۔ راستے میں گاڑی کے لیمپ ٹوٹ پھوٹ جائیں یا کسی طوفان میں بجھ جائیں۔ جیسا کہ کبھی کبھار ہوجایا کرتا تھا۔ تو ایسے موقع پر وہ گاڑی میں چقماق کے ذریعہ چند لمحوں میں روشنی جلا لیتا۔ اس بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ کہیں گھاس پھوس آگ نہ پکڑ لے۔

"ٹام" گاڑی کی چھت پر سے آواز آئی۔

"ہاں، جیری"

"تم نے پیغام سنا؟"

"ہاں بھائی سنا۔"

"کیا سمجھے؟"

"خاک نہیں سمجھے۔"

"عجیب حسن اتفاق ہے" گارڈ نے کہا "میں خود بھی کچھ نہیں سمجھا۔"

ان لوگوں کے جانے کے بعد جیری کہرا اور اندھیرے میں اکیلا رہ گیا۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا تاکہ جانور تھوڑی دیر سستا لے اور وہ خود بھی اپنے جسم اور چہرے سے کیچڑ چھڑا ڈالے۔ اس نے اپنی لمبی چوڑی ٹوپی سے قریب دو سیر پانی نچوڑ ڈالا اور پھر اپنے گیلے بازو پر لگامیں ڈالے خاموش کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی کے پہیوں کا شور رات کی خاموشی میں گم ہو گیا۔ تب وہ پلٹ کر پہاڑی کی دوسری جانب اترنے لگا۔

"بہت تھک گئی ہو گی بیچاری" اس نے پیار سے اپنی گھوڑی کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا "ٹیمپل بار سے ایک سرپٹ دوڑ لگائی ہے۔ میدان میں اترنے سے پہلے میں تیری تھکن سے چور ٹانگوں پر بالکل بھروسہ نہیں کروں گا۔"۔ نئی زندگی پائی ... ہوں کیا عجیب پیغام ہے۔ جیری میاں ذرا ہوشیار رہنا یونہی مردے زندہ ہونے لگ گئے تو تمہارا کیا حشر ہو گا۔

تیسرا باب

رات کے سائے

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے کے لئے ایک راز سربستہ ہے۔ یہ غور طلب مسئلہ ہے کہ جب میں رات کے وقت کسی بڑے شہر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ہر تاریک مکان کا سایہ پُر اسرار نظر آتا ہے۔ ہر گھر کے ہر کونے میں ایک بھید چھپا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سینوں میں دھڑکتے ہوئے دل اپنے اپنے خیالات کے پردہ دار ہیں۔ کس غضب کی کیفیت طاری ہے جو موت سے مشابہ ہے۔

کس چاؤ سے میں اس کتاب زندگی کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرنا چاہتا ہوں لیکن چند ورق سے زیادہ نہیں پلٹ سکتا۔ کن آرزوؤں سے میں عارضی روشنیوں کے سہارے اس اتھاہ سمندر کے پوشیدہ خزانوں تک پہونچنا چاہتا ہوں مگر میری نظریں ان گہرائیوں کی تہہ تک نہیں پہونچ سکتیں۔ مشیت کا یہ فیصلہ ہے کہ پہلے ہی صفحے کے بعد یہ کتاب ایک جھٹکے سے بند ہو جائے۔ قضا و قدر کا یہ حکم ہے کہ جونہی سطح پر ادراک کی روشنی پڑے یہ سمندر ہمیشہ کے لئے منجمد ہو جائے اور میں نادانوں کی طرح ساحل پر کھڑا رہ جاؤں۔

میرا دوست گذر گیا۔

میرا ہمسایہ گذر گیا۔

میری محبوبہ۔ ۔ میری جان سے زیادہ عزیز محبوبہ۔ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گئی۔ سب فنا ہو گئے مگر ان کی انفرادیت کا دوامی اور لا فانی راز مرتے دم تک میرے ذہن میں محفوظ رہے گا۔ جب کسی بھی شہر خموشاں سے گذرتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کیا یہ ابدی نیند سونے والے میرے لئے جیتے جاگتے انسانوں سے زیادہ پُراسرار ہیں یا میں ہی ان کے لئے ایک پیچیدہ معمّہ ہوں۔

یہ انفرادیت ہر انسان کی میراث ہے اور اس معاملے میں ہمارے پیغام لانے والے سوار جیری اور کسی بادشاہ وزیر یا لندن کے کسی دولت مند سوداگر میں کوئی فرق نہیں۔ یہی حال ان تین مسافروں کا تھا۔ جو کھڑ کھڑاتی پرانی گاڑی میں بند بیٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے ایک راز سربستہ تھے۔ وہ اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دُور تھے۔ اگر بجائے ایک گاڑی کے وہ الگ الگ گاڑیوں میں سوار ہوتے اور ان گاڑیوں میں چھ کی جگہ ساٹھ گھوڑے جتے ہوتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے سے کوسوں دُور تھے۔

پیغام رساں دُلکی چال واپس لوٹ رہا تھا۔ کئی بار وہ شراب خانوں میں پینے کی غرض سے رُکا مگر ٹوپی سے چہرہ چھپائے الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں اس ٹوپی پر خوب سج رہی تھیں جو کالی تھیں۔ مگر ان میں گہرائی نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے اتنی قریب

قریب تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ایک دوسرے سے دُور رہنے سے ڈرتی تھیں کہ کہیں اکیلے میں کسی الزام میں نہ دھرلی جائیں۔ تکونی پیکدان کی شکل کی ٹوپی اور لمبے چوڑے مفلر کے درمیان وہ مکاری سے جھانک رہی تھیں۔ شراب پیتے وقت وہ بائیں ہاتھ سے مفلر سرکاتا اور دائیں ہاتھ سے منہ میں شراب انڈیل لیتا اور پھر فوراً منہ چھپا لیتا۔

"یوں کام نہیں چلے گا جیری!" اس نے خود سے کہا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی خیال چکر لگا رہا تھا "جیری میاں تم بے چارے ایمان دار بیوپاری ٹھیرے۔ یہ باتیں تمہارے مطلب کی نہیں۔۔۔ تمہارا دھندا الگ ہے۔۔" نئی زندگی پائی ہے، ہشت۔۔ شرطیہ وہ نشے میں دُھت تھا"

اس عجیب و غریب پیغام نے بیچارے جیری کو ایسا بوکھلا دیا تھا کہ وہ بار بار ٹوپی اُتار کر سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگتا۔ اس کی کھُردری چندیا کے ارد گرد نہایت سخت سیاہ بال اُگے ہوئے تھے۔ جو بے ترتیبی سے اس کی چوڑی چکلی ناک تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی لوہار نے میخیں ٹھوک دی ہیں۔ یا کسی دیوار پر خاردار کیلیں جڑی ہوئی ہوں۔ اچک بلی کا بہترین کھلاڑی بھی اس خوفناک انسان کے سر کو پھاندنے میں جھجکتا تھا۔

جیری کو یہ پیغام ٹیمپل بار کے قریب ٹیلسن بینک کے سنتری کو پہونچانا تھا تاکہ وہ اسے اپنے افسروں تک پہونچا دے۔ وہ مرے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا۔ رات کے تاریک سائے بھیانک روپ دھار کر اسے ڈرا رہے تھے۔ اس کی گھوڑی بھی خوفزدہ تھی

اور راستے کے ہر انجانے سائے سے چمک اٹھتی تھی۔

ادھر ڈاک گاڑی اپنے تین پُراسرار مسافروں کے ساتھ جھٹکے کھاتی کھڑکھڑاتی ڈسمرے پر گسستی چلی جارہی تھی۔ مسافروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ پریشان خیالات ان مسافروں کو بھیانک آئینوں کا روپ دیکر انھیں ڈرا رہے تھے۔

ڈاک گاڑی میں ٹیلسن بینک کا تماشا ہو رہا تھا جہاں معلوم ہوتا تھا کاروبار کرنے والوں کی بھیڑ لگ گئی ہے۔ بینک سے تعلق رکھنے والا مسافر جو چمڑے کا تسمہ مضبوطی سے تھامے تھا تاکہ گاڑی کے جھٹکوں سے لڑھک کر وہ اپنے ہمسفروں سے نہ ٹکرا جائے اور اونگھتے میں یہ خواب دیکھ رہا تھا۔ نیم باز آنکھوں سے اس نے تخیل کی مدد سے دیکھا جیسے گاڑی کے دھند میں ڈوبے ہوئے لیمپ۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں۔ اور سامنے بیٹھا ہوا موٹا تازہ ہمسفر یہ سب بینک بن گئے ہیں۔ اور دھڑلے کا کاروبار چل رہا ہے۔ گھوڑے کے ساز کی جھنکار سکوں کی جھنکار بن گئی۔ اور تخیل کے ان چند لمحوں میں اتنی ہنڈیاں بھنائی گئیں کہ باوجود اپنے اندرونی اور بیرونی کاروبار اور رسوخ کے ٹیلسن بینک نے اس سے تین گنے وقفے میں بھی نہیں بھنائی تھیں۔

اس نے ایسا محسوس کیا جیسے ٹیلسن بینک کے تہہ خانوں میں رکھی ہوئی تجوریوں کے تالے کھول کر ان میں چھپے ہوئے قیمتی زیورات اور خفیہ کاغذات شمع کی دھندلی روشنی میں دیکھ رہا ہے۔ یہ سب جانی پہچانی دولت اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ آخری بار وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ حالانکہ وہ گاڑی میں سوار تھا اور بینک۔ ایک الجھے ہوئے افیونی

کے لئے ہیں۔ درد کے مدھم احساس کی طرح ہر لمحہ اس کے ساتھ تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ خیالات کا ایک اور دھارا ساری رات اسے بے چین کرتا رہا۔ وہ کسی کو قبر کھود کر نکالنے کے لئے جا رہا تھا۔

رات کے اندھیاروں میں یہ پہچاننا مشکل تھا کہ ان ہزاروں چہروں میں سے مدفون شخص کا چہرہ کون سا ہے۔ سارے چہرے ایک ایسے شخص کے تھے جس کی عمر پینتالیس سال کی تھی۔ ان سڑے گلے چہروں کا بھیانک پن جدا جدا تھا۔ اور ہر چہرے سے مختلف جذبات نمایاں تھے۔ غرور، نفرت و حقارت، بغاوت اور ڈھٹائی، مجبوری و لاچاری، ماتم و آہ و زاری کے تاثرات یکے بعد دیگرے رنگ بدل رہے تھے۔ پچکے ہوئے گال۔ مرونی چھائے ہوئے زرد چہرے، سوکھے ہوئے ہاتھ پیر اور مدقوق ڈھانچے سامنے سے گذر رہے تھے مگر وہ سب چہرے ایک ہی شخص کے تھے جس کے سر کے بال قبل از وقت سفید ہو چکے تھے

اونگھتا ہوا مسافر اس آسیب سے بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا۔

"تم کتنے دنوں سے دفن ہو؟"

"قریب قریب اٹھارہ سال سے"۔ بس یہی ایک جواب ملتا تھا۔

"اپنی قبر سے باہر نکلنے کی ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں؟" ـــ "عرصہ ہوا"

"جانتے ہو تمہیں دوبارہ زندگی مل رہی ہے؟"

"لوگ یہی کہتے ہیں؟"

"تمہیں زندگی سے پیار ہے نا؟"

دیکھ نہیں سکتا۔"

"کیا تم لڑکی کو دیکھنے آؤ گے یا میں اسے لے آؤں؟"

اس سوال کے جوابات مختلف اور متضاد ہوتے۔ کبھی لرزتی کانپتی تھکی آواز میں جواب ملتا۔

"ٹھیرو... ڈرتا ہوں کہیں اسے دیکھ کر شادی مرگ نہ ہو جائے۔"

"کبھی اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا جواب ملتا۔ مجھے اسکے پاس لے چلو۔

اور کبھی وحشت زدہ ہو کر وہ کہتا:-

"میں اسے نہیں پہچانتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

اس خیالی گفتگو کے بعد مسافر اپنے دانست میں لگاتار زمین کھودنے لگتا کبھی بیلچے سے۔ کبھی ایک بڑی چابی سے اور کبھی اپنے ہاتھوں سے۔ وہ زمین کھودنے لگتا۔ تاکہ اس بدنصیب انسان کو قبر سے باہر نکالے۔ اور پھر وہ مٹی سے دبی زندہ لاش باہر نکالنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتی۔ اور دوبارہ مٹی میں مل جاتی۔ تب وہ مسافر خواب سے چونک پڑتا اور گاڑی کی کھڑکی اتار کر کہرا اور بارش کی حقیقتوں کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا لیکن آنکھیں کھولنے کے باوجود کہرا بارش۔ گاڑی کے چراغوں کی متحرک روشنی... اور مخالف سمت بھاگتی ہوئی جھاڑیوں کے باوجود۔ اندھیری رات کے سائے تاریک خیالات میں گھل مل جاتے۔ ٹیمپل بار کا اصلی بینک۔ پچھلے دن کا واقعی کاروبار۔ آہنی تجوریاں، وصول شدہ پیغام اور جیتا جاگتا پیغام رساں۔ یہ ساری حقیقتیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ اور ان حقیقتوں

کے درمیان وہ آسیب پھر نمودار ہوتا اور وہ اس سے پھر یوں مخاطب ہوتا۔

"تم کتنے دنوں سے دفن ہو؟"

"قریب قریب اٹھارہ سال سے۔"

"تمہیں زندگی سے پیار ہے نا؟"

"کہہ نہیں سکتا۔"

وہ لگاتار زمین کھودتا۔ یہاں تک کہ پھر کسی ہمسفر کی اضطراری حرکت پر وہ کھڑکی چڑھانے اور تسمہ تھامنے پر مجبور ہو جاتا اور سونے والے ساتھیوں کے بارے میں قیاس دوڑاتا۔ پھر پہلے کی طرح رفتہ رفتہ ان کی صورت کبھی بینک اور کبھی قبر کی سی بن جاتی۔

"تم کتنے دنوں سے دفن ہو؟"

"قریب قریب اٹھارہ سال سے۔"

"اپنی قبر سے باہر نکلنے کی ساری امیدیں ختم ہو چکی تھیں؟"

"عرصہ ہوا۔"

مذکورہ بالا الفاظ اس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے۔ اسی طرح گونج رہے تھے جیسے سچ مچ کسی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں۔ یہاں تک کہ صبح کی روشنی نے تھکے ماندے مسافر کو جگا دیا۔۔ رات کے سائے رخصت ہو چکے تھے۔

مسافر نے کھڑکی اتار دی اور چڑھتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا۔ پچھلی رات کوئی تھکے ماندے گھوڑے کھول کر کھیت میں اپنا ہل چھوڑ گیا تھا جو ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ اور

دوسرا ایک جنگلی جھاڑی تھی۔ جس میں اب تک کئی سرخ و زرد پتے کندن کی طرح چمک رہے تھے اگرچہ زمین سرد اور گیلی تھی۔ لیکن آسمان پر مطلع صاف تھا۔ اور سورج پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

"اٹھارہ سال" مسافر نے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "روز روشن کے خالق کبریا ۔۔۔ اٹھارہ سال تک زندہ درگور رہنا کیا قیامت ہے !!"

چوتھا باب

تیاری

دوپہر کو جب ڈاک گاڑی ڈوور صحیح و سالم پہونچ گئی تو دستور کے مطابق رائل جارج ہوٹل کے صدر ملازم نے گاڑی کا دروازہ بڑے فخر و مسرت سے کھولا۔ کیونکہ سردیوں کے زمانے میں ڈاک گاڑی کا لندن سے بخیر و عافیت پہونچ جانا دلیر مسافروں کے لئے قابل مبارکباد کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت گاڑی میں صرف ایک بہادر مسافر رہ گیا تھا جو مبارکباد کا اکیلا حقدار تھا۔ کیونکہ باقی دوسرے دو مسافر اپنی اپنی منزل پر اتر گئے۔ تاریک بھیگی ہوئی گاڑی جس میں گیلا بوسہ بھی ٹھنسا ہوا تھا بدبو سے بڑے سے کتے کے گھر کی طرح سڑ رہی تھی مٹر لاری

ایک جھاڑ جھنکار عبا اور کنٹوپ پہنے عبا پہنے بھوسے کی گرد جھٹکتے خود ایک بڑا سا کتا معلوم ہو رہے تھے۔

"کیا کل کوئی کشتی کیلئے روانہ ہونے والی ہے؟" انہوں نے ملازم سے پوچھا۔

"ہاں سرکار بشرطیکہ موسم خوشگوار ہو دو بجے سہ پہر تک سمندر بھی موافق ہو جائیگا آپ کو بستر چاہئے سرکار؟"

"رات کو بستر کی ضرورت ہوگی۔ مگر ایک خواب گاہ اور ایک نائی کا انتظام کر دو۔"

"اور کچھ ناشتہ سرکار۔ مہربانی کرکے ادھر تشریف لے چلئے۔ بیرا صاحب کو کانکرڈ میں پہونچا دو۔ آپ کا بیگ بھی کانکرڈ میں پہونچا دو۔ کانکرڈ میں لے جاکر صاحب کے جوتے بھی اتارو۔ ۔ سرکار کمرے میں سے نہایت حسین منظر آپ کو نظر آئے گا ـــ بیرا کانکرڈ میں نائی کو بھی لے آؤ۔ چلو چلو۔ ۔ ۔ جلدی سے کانکرڈ میں پہونچا دو۔" خواب گاہ جس کا نام کانکرڈ تھا ہمیشہ ڈاک گاڑی سے آنے والے مسافروں کے لئے وقف تھی۔ اور ڈاک گاڑی سے آنے والے مسافر ایسے لبادوں میں لپٹے لپٹائے آیا کرتے تھے کہ رائل جارج ہوٹل کے منتظمین کے لئے کمرہ بڑی دلچسپی کا موضوع بن جایا کرتا تھا۔ حالانکہ اس کمرے میں ایک خاص قسم کا آدمی داخل ہوا کرتا تھا مگر اندر سے نکلتے وقت اس کا بالکل حلیہ بدل جایا کرتا تھا اس لئے شاید حسن اتفاق تھا کہ دوسرا ملازم دو قلی کئی خادمائیں اور ہوٹل کی مالکہ یہ کانکرڈ اور کافی کے کمرے کے درمیان والے برآمدے میں آجا رہے تھے اور جب یہ ساٹھ برس کا شریف آدمی نہایت مقطع بھورے کپڑے کا سوٹ جس کے چوڑے کف اور بڑی بڑی جیبیں

جھول رہی تھیں یہاں کہ ناشتہ کرنے جارہا تھا تو سارا عملہ بہانے سے ادھر سے گذرنے لگا۔
اس صبح کو کافی روم میں سوائے بھورے لباس والے معزز آدمی کے اور کوئی نہ تھا اس لئے ناشتے کی میز آگ کے قریب گھسیٹ کر لگا دی گئی تھی۔ اور جب وہ اپنے ناشتے کے انتظار میں بیٹھا تو ایسا معلوم ہورہا تھا وہ اپنی تصویر کھچوانے منجمد ہوکر بیٹھا ہے وہ بڑے اہتمام سے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ اور اس کی لمبی چوڑی واسکٹ کی جیب میں گھڑی نہایت خواب آور مقدس نغمے کے انداز میں ٹک ٹک کررہی تھی۔ جیسے وہ اپنی دیرپائی اور سنجیدگی کا مقابلہ آتشدان میں وقتی طور پر بھڑک کر بجھنے والی آگ سے کررہی ہو۔ اس کی ٹانگیں سڈول تھیں جن پر اسے فخر تھا۔ اس کے چست بھورے موزے نہایت عمدہ قسم کے تھے۔ جوتوں کے بکسوے بھی سادہ مگر بڑے بھلے تھے۔ اس کے سر پر وگ کے مقطع مصنوعی بال چپکے ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ مصنوعی بالوں کی ٹوپی اصلی بالوں سے بنی تھی۔ مگر بالکل ریشم یا کتے ہوئے شیشے سے بنی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سوتی قمیص موزوں جیسی نفیس تو نہ تھی مگر سمندر کے ان جھاگوں کی طرح سفید تھی۔ جو قریب ہی ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ چہرے پر ضبط و تحمل کے ساتھ بردباری چھائی ہوئی تھی۔ مگر دو چمکیلی نم آنکھیں اس عجیب قسم کے مصنوعی بالوں کے نیچے روشن تھیں۔ جوانی کے زمانے میں ان آنکھوں نے بڑی مشکل سے انھیں ٹیلسن بنک کی سنجیدہ خشک فضا کا عادی بنایا ہوگا۔ باوجود جھریوں کے اس کے گالوں پر صحت مندی کی سرخی تھی۔ اور پریشانی کی کوئی جھلک نہ تھی۔ شاید ٹیلسن بنک کے یہ کنوارے کلرک دوسروں کی پریشانیاں اور فکریں اپنے سر لینے کے عادی تھے۔ مگر یہ

فکریں اور ذمہ داریاں مانگے کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی طرح آسانی سے پہنی بھی جا سکتی تھیں اور دُور بھی کی جا سکتی تھیں۔ تصویر کھچوانے والے آدمی کی طرح بیٹھ کر مسٹر لاری اونگھ گئے۔ جب ناشتہ آیا تو جاگ پڑے۔ اپنی کرسی ناشتے کی میز کے قریب سرکاتے ہوئے انہوں نے ملازم سے کہا: "ایک کمرہ ایک خاتون کے لئے تیار رکھو وہ آج کسی وقت بھی آجائیں گی۔ وہ مسٹر جارویس لاری کے متعلق پوچھیں یا ٹیلسن کے کسی نمائندے سے ملنا چاہیں تو مہربانی کر کے مجھے اطلاع دینا۔"

"بہت اچھا سرکار۔ ٹیلسن بینک لندن ہی میں ہے نا سرکار؟"

"ہاں۔"

"بہت اچھا سرکار۔ لندن اور پیرس آنے جانے والے آدمیوں کی خدمت کرنے کا ہمیں بارہا موقع ملتا ہے۔ ٹیلسن کمپنی کے لوگ کافی آیا جایا کرتے ہیں سرکار۔"

"انگلینڈ اور فرانس دونوں ہی جگہ ہمارا دفتر ہے۔"

"مگر آپ خود تو میرا خیال ہے زیادہ سفر کرنے کے عادی نہیں ہیں سرکار؟"

"ہاں کئی سال سے میرا آنا جانا نہیں ہوا۔ پندرہ برس ہوئے جب میں آخری دفعہ فرانس سے آیا تھا۔"

"اچھا سرکار تو آپ میرے یہاں آنے سے پہلے آئے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے ہمارے ہوٹل کے عملے کے یہاں آنے سے پہلے۔ اس سے پہلے جارج ہوٹل کسی اور کا تھا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"مگر سرکار میں شرط بدتا ہوں ٹیلسن بینک کا دفتر پندرہ برس کیا پچاس برس سے کامیابی سے قائم ہوگا۔"

"اگر تم اپنے اندازے سے حساب لگائے ہوئے سالوں کی تعداد دگنی یعنی ڈیڑھ سو سال کردو تو بھی غلط نہ ہوگا۔"

"اچھا سرکار۔"

ملازم نے حیرت سے منہ اور آنکھیں پھاڑیں اور میز سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے اپنا جھاڑن ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ اور نہایت اطمینان سے ایسے مہمان کو کھاتے پیتے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اونچے برج یا ستاروں کا قیافہ لگانے والی بلند عمارت سے کھڑا معائنہ کررہا ہو۔ ہر زمانے میں ہوٹل کے نوکروں کا یہی طریقہ رہا ہے۔

ناشتہ کرکے مسٹر لاری ساحل پر چہل قدمی کے لئے چلے گئے۔ تنگ اور مختصر سا ٹیڑھا میڑھا ڈوور کا قصبہ ساحل سے چھپا ہوا تھا اور اس کا بالائی حصہ اس طرح کھریا کے چٹانوں میں چھپا تھا جیسے وہ کوئی بحری شتر مرغ ہو (جب صحرا میں طوفان آتا ہے تو شتر مرغ اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے) ساحل ناہموار لڑھکتے ہوئے پتھروں اور غضبناک موجوں کا ایک ریگ زار بنا ہوا تھا۔ بے لگام سمندر جو من میں سمائے کرسکتا تھا۔ اور اس سمندر کو تباہی سے ہی دلچسپی تھی۔ وہ قصبے کے کنارے سے ٹکرا کر چٹانوں پر دیوانگی سے گرجتا اور ساحل کی ریت کو کاٹ کر بہائے جاتا۔ آس پاس کے گھروں میں ایسی سڑاندا آتی تھی جیسے سمندر میں مریض انسانوں کی طرح بیمار مچھلیاں صحت یابی کے لئے نہلائی جارہی ہوں تھوڑی

بہت مچھلیاں بھی بندرگاہ پر پکڑی جاتی تھیں مگر عام طور پر لوگ سمندر کو تاکتے ہوئے رات کے وقت مٹرگشت زیادہ لگایا کرتے تھے۔ خاص طور پر جب سمندر میں طوفان آتا۔ چھوٹے چھوٹے بیوپاری جو کوئی خاص کاروبار نہیں کرتے تھے ایک دم سے بڑی بڑی رقمیں کما لیتے۔ دست غیب سے دولت پانے والوں کو روشنی نہیں بھاتی تھی۔

دن ڈھلا اور سہ پہر ہو گئی۔ فضا تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے صاف ہو جاتی تھی تو فرانس کا ساحل نظر آنے لگتا تھا مگر کہرا اور دھند کا بڑھ گیا۔ اور مسٹر لاری کے خیالات پر بھی فکر کی گھٹائیں چھا گئیں۔ جب اندھیرا ہو گیا تو وہ کافی کے کمرے میں آتش دان کے سامنے بیٹھ گئے۔ بظاہر انھیں رات کے کھانے کا انتظار تھا مگر ان کا ذہن مسلسل کھدائی میں مصروف تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں میں ان کا دماغ کھوئے جا رہا تھا۔

زیرِ زمین کوئلہ کھودنے والا اگر کھدائی کے درمیان پینے لگ جائے تو عمدہ شراب کی بوتل سے اس کے سوا اور کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ اس کی روزی ماری جائے گی۔ مسٹر لاری کو اس کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ وہ دیر سے اکتائے ہوئے بیکار سے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر ایسا ہی مکمل سکون اور اطمینان تھا جیسا کہ بوتل کے ختم پر ایک معمر انسان کے چہرے پر طاری ہو جاتا ہے۔ کہ اتنے میں تپلی سی گلی میں گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور ایک گاڑی سرائے میں داخل ہوئی۔

انہوں نے اپنا گلاس بغیر ہونٹوں سے لگائے رکھ دیا۔

"صاحبزادی آگئیں!" انہوں نے کہا۔

چند منٹ کے اندر ایک خادم آیا اور اطلاع دی کہ لندن سے مس مینٹ تشریف لائی ہیں اور ٹیلسن بینک والے صاحب سے ملنا چاہتی ہیں۔

"اتنی جلدی!"

مس مینٹ نے راستہ میں کھا، پی لیا تھا لہٰذا کھانے کی تو انھیں حاجت نہ تھی۔ وہ ٹیلسن بینک والے صاحب سے اگر انھیں فرصت ہو اور تکلیف نہ ہو تو فوراً ملنے کی خواہش مند تھیں۔

بینک والے صاحب کے لئے اس کے سوا اور چارہ نہ تھا کہ وہ گھبرا کر جلدی سے گلاس چڑھا جائیں۔ انھوں نے اپنے وگ کے مضحکہ خیز مصنوعی بال کانوں پر درست کئے اور خادم کے پیچھے پیچھے مس مینٹ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ وسیع مگر تاریک تھا۔ ماتمی رنگ کے نہایت سیاہ گھوڑے کے بالوں سے بنے ہوئے پردوں سے آراستہ تھا۔ اور بھاری سیاہ میز وں سے پٹا پڑا تھا۔ سامان پر اس قدر تیل چپڑا گیا تھا کہ میز پر رکھی ہوئی دو اونچی اونچی شمعوں کا عکس فرنیچر کے پھول پتوں پر جم گیا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شمعیں ایک سیاہ مہاگنی کی قبر میں دفن ہیں اور جب تک انھیں کھود کر اس قبر سے نہ نکالا جائے روشنی کے پھیلنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

کمرے میں اس قدر اندھیرا تھا کہ مسٹر لاری گھسے ہوئے قالین پر سے گذرتے چلے گئے اور یہ سمجھے کہ مس مینٹ کسی دوسرے ملحقہ کمرے میں ہوں گی۔ جب شمعوں کے پاس سے چل کر جانے لگے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک سترہ برس کی نوعمر لڑکی سواری کا لبادہ اوڑھے

آتش دان اور شمعوں کے درمیان ان سے ملاقات کرنے کی منتظر کھڑی ہے وہ ہاتھ میں اب تک سفری ٹوپی کا فیتہ پکڑے ہوئے تھی۔ نازک سی دبلی پتلی دوشیزہ جس کے بال سنہری تھے اور جس کی نیلی آنکھیں خود ان کی آنکھوں سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ پیشانی پر ایک اچھوتی ذہانت اور بردباری تحریر تھی۔ کتنی نوعمر اور چکنی پیشانی تھی! ایک انوکھے انداز میں اس پیشانی پر ہلکی سی جنبش سے شکنیں پڑ گئیں۔ ان شکنوں میں نہ ہی کوئی ذاتی پریشانی کی جھلک تھی نہ تعجب یا خوف... صرف ایک روشنی تھی۔ مستعدی تھی۔ ان آنکھوں میں بیک وقت سب ہی کچھ تھا۔ جونہی مسٹر لارس کی نگاہ اس پر پڑی، ایک لمحے کو انھیں اس کی شکل اس ننھی سی بچی سے مشابہ نظر آئی جسے اپنے ہاتھوں میں لے کر انہوں نے آبنائے پار کی تھی۔ سمندر میں طوفان تھا۔ بلا کی سردی تھی اور اولے بار ش ہو رہی تھی۔ نہ معلوم کیسے وہ جیتی جاگتی شباہت غائب ہو گئی۔ جیسے کسی نے اس آئینے کو بھاپ سے دھندلا کر دیا ہو جو اس کی پشت پر آویزاں تھا جس کے چوکھٹے میں نیگرو کیوپڈ تراشے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کے سر کٹے ہوئے تھے اور سب کے سب اپاہج تھے اور سیاہ ٹوکریوں میں بحیرۂ مردار کے پھل سیاہ دیویوں کو پیش کر رہے تھے۔ مسٹر لارس بڑے تکلف کے ساتھ اس کے سامنے جھک گئے۔

"تشریف رکھیے قبلہ" نہایت صاف خوشگوار اور کم سن آواز میں لڑکی نے کہا۔ لہجے میں بہت خفیف سا غیر ملکی اثر تھا۔

پرانے زمانے کے دستور کے مطابق مسٹر لارس نے کہا "میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں صاحبزادی!" وہ پھر ادب سے جھکے اور بیٹھ گئے۔

"کل مجھے بینک کی طرف سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ کوئی نئی خبر۔ ۔ ۔ کوئی انکشاف ۔ ۔ ۔"

"الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں، دونوں باتیں صادق آتی ہیں۔"

"میرے والد کی مختصر سی جائداد کے بارے میں۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ ان کو انتقال کئے کتنا عرصہ ہو گیا۔"

مسٹر لاری نے گھبرا کر کرسی پر پہلو بدلا اور پریشان ہو کر شفاخانے کے سیاہ فام کیوپڈ بچوں کے جلوس پر نظر ڈالی۔ جیسے ان کی احمقانہ ٹوکریوں میں کسی کے دکھوں کی دوا ہو گی۔

"میرے لئے ضروری تھا کہ میں پیرس جاؤں اور وہاں بینک کے کوئی صاحب ہیں ان سے ملوں جو تکلیف کر کے اس کام کے سلسلے میں پیرس آئے ہیں۔"

"وہ میں ہی ہوں۔"

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔"

وہ ادب سے مسٹر لاری کے سامنے جھک گئی۔ اس زمانے میں لڑکیاں اسی طرح آداب بجالایا کرتی تھیں، اس کی معصوم خواہش تھی کہ مسٹر لاری پر واضح ہو جائے کہ وہ انھیں کس قدر بزرگ اور عقلمند مانتی تھی۔ مسٹر لاری دوبارہ لڑکی کے سامنے ادب سے جھک گئے۔

"بینک کے تجربہ کار مہربان اصحاب کو جنھوں نے مجھے فرانس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے یہ جواب دیدیا کہ چونکہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں

بہت ممنون ہوں گی۔ اگر سفر کے دَوران میں صاحب موصوف کو میرا نگراں مقرر کیا جائے۔ صاحب موصوف لندن سے روانہ ہو چکے، مگر میرا خیال ہے کہ ایک ہرکارے کی معرفت ان سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ یہاں میرا انتظار کریں "

" مجھے خوشی ہے کہ یہ کام میرے سپرد کیا گیا اور جب یہ کام پورا ہو جائے تو مجھے اور بھی خوشی ہو گی "

" شکریہ — میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ بینک سے مجھے یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ ممدوح مجھے تمام تفصیلات بتا دیں گے۔ نیز یہ کہ مجھے ایک عجیب و غریب راز سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ میں تیار ہوں اور ان تفصیلات کو سننے کے لئے سخت بے چین ہوں "

" ظاہر ہے — ہاں.. میں.. " مسٹر لاری نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنے وگ کے مصنوعی بال سنوارتے ہوئے بولے " میں بڑی مشکل میں ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیسے ابتدا کی جائے " وہ کچھ نہ کہہ سکے اور جھجکتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا جو ٹکٹکی باندھے انھیں گھور رہی تھی۔ لڑکی کے نوعمر چہرے پر وہی اچھوتے جذبات نمایاں تھے وہی حسین اور معنی خیز تاثرات! اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ بڑھایا۔ جیسے وہ کسی گذرنے والے سائے کو اپنی مٹھی میں پکڑ لینا چاہتی ہو۔

" کیا آپ واقعی میرے لئے اجنبی ہیں "

" آپ کا کیا خیال ہے " مسٹر لاری نے ہاتھ آگے پھیلا کر مسکراتے

ہوئے جرح کی۔

نازک خوبصورت ناک سے ذرا اوپر ابروؤں کے درمیان جذبات کے اتار چڑھاؤ سے اس کے چہرے پر عجیب کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس کرسی کے پاس وہ کھڑی تھی اس پر بیٹھ گئی۔ مسٹر لاری نے اس کے خیالات میں کھوئے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھا! اور جونہی اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں یوں گویا ہوئے۔

"مس مینٹ — چونکہ آپ نے انگلستان کو اپنا وطن بنایا ہے میں آپ کو ایک نوجوان انگریز خاتون ہی کہوں گا۔"

"جیسی جناب کی مرضی۔"

"مس مینٹ — میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ اور مجھے اپنا کاروباری فرض انجام دینا ہے۔ آپ اس دوران میں مجھے ایک بولنے والی مشین سے زیادہ اہمیت نہ دیجئے گا اور دراصل بات بھی کچھ ایسی ہے۔ صاحبزادی اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اپنے بینک کے ایک اسامی کا قصہ سناؤں۔"

"قصہ۔"

مسٹر لاری نے جان بوجھ کر اس غلط لفظ کو دُہرایا اور جلدی سے کہنے لگے۔

"ہاں آسامی۔۔۔ بینک کے کاروبار میں ہم عام طور پر اپنے اہل معاملہ کو آسامی ہی کہتے ہیں۔ وہ ایک فرانسیسی شہری تھے۔ مشہور سائنسدان۔ بڑے لائق ڈاکٹر۔"

"وہ بووے کے رہنے والے تو نہیں تھے؟"

ہمارے ہاں یوروپ کے ہی رہنے والے تو تھے۔ تمہارے والد موسیو منیٹ کی طرح رہیں کے رہنے والے تھے اور انہیں کی طرح تمام پیرس میں مشہور و معروف تھے۔ مجھے اُن سے نیاز حاصل تھا۔ کاروباری تعلقات کے ساتھ ہی ان کا رازدار بھی تھا۔ بیس سال ہوئے۔ میں اس زمانے میں اپنے فرانسیسی دفتر میں کام کر رہا تھا۔"

"اس زمانے میں! کس زمانے میں؟"

"میں بیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں صاحبزادی۔ انہوں نے انگریز خاتون سے شادی کی تھی۔ وکیلوں میں سے میں بھی تھا۔ ان کا کاروبار بھی اور متعدد فرانسیسی خاندانوں کے کاروبار کی طرح ٹیلسن بینک کی تحویل میں تھا۔ اسی طرح میں اپنے بیسیوں آسامیوں کا نگران کار رہا ہوں۔ صاحبزادی یہ محض کاروباری تعلقات ہیں۔ یہاں کسی دوستی یا جذباتی لگاؤ کا کوئی سوال نہیں۔ میرے تعلقات بھی ایسے ہی بدلتے رہتے ہیں جیسے آسامی بدلتے رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میری حیثیت ایک بے حس مشین جیسی ہے۔ ہاں تو سنئے۔"

"مگر یہ تو میرے والد کی کہانی ہے۔" وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عجیب الجھن کی وجہ سے اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ "اب مجھے خیال آتا ہے کہ میرے والد کے انتقال کے دو سال بعد میری ماں بھی چل بسی اور میں یتیم رہ گئی تھی۔ مجھے انگلستان لے آئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ ہی تھے۔"

اس نے اپنا چھوٹا سا لرزتا ہوا ہاتھ مسٹر لاری کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے رسمی طور پر اس کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔ پھر انہوں نے کرسی سرکا کے قریب کر دی۔ ان کا

ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بار بار کبھی اپنی ٹھوڑی کھجاتے کبھی بالوں پر ہاتھ پھیرتے اور کبھی بات کرتے میں ہاتھ کو جنبش دیتے۔ وہ جھک کر اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اور لڑکی منہ اوپر اٹھائے ان کے چہرے کو تک رہی تھی۔

"مس مینٹ — وہ میں ہی تھا۔ اور اس کے بعد سے میں نے آج تک آپ کو نہیں دیکھا۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے تعلقات ہمیشہ کاروباری ہوا کرتے ہیں۔ اور ان میں جذبات کو قطعی دخل نہیں ہوتا۔ نہیں کبھی نہیں۔ آپ ٹیلسن بینک کی نگرانی میں رہیں اور میں بینک کے دوسرے کاروبار میں لگا رہا — جذبات! میرے پاس ان جھگڑوں میں پڑنے کا وقت ہے نہ کوئی موقع۔ صاحبزادی۔ میری ساری زندگی سکّہ ڈھالنے کی مشین چلانے میں صرف ہوئی ہے" اپنے پیشے کے متعلق اس عجیب و غریب تشریح کے بعد مسٹر لاری نے اپنے وگ کے مصنوعی بال دونوں ہاتھوں سے چپکانا شروع کئے (حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ پہلے ہی سے چپکے ہوئے تھے) اور پھر اسی پہلے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"جیسا کہ آپ نے کہا یہ آپ کے والد ہی کی المناک کہانی ہے لیکن صرف اتنا فرق ہے کہ اگر آپ کے والد کا بالفرض اس وقت انتقال نہ ہوا ہوتا — ارے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ تو بہت بری طرح سے ڈر گئیں"

وہ واقعی خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کی کلائی تھام لی "خدا کے لئے اپنے دل پر قابو رکھئے" مسٹر لاری نے کرسی کی پشت سے اپنا ہاتھ

ہٹا کر لڑکی کی کانپتی ہوئی انگلیوں کو تھام لیا اور بڑے پیار سے سمجھانے لگے " جیسا کہ میں کہہ رہا تھا یہ ایک کاروباری معاملہ ہے "

اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ کر وہ بے انتہا بدحواس ہو کر ہکلا گئے ۔ پھر کہنے لگے " میں نے کہا فرض کیجئے کہ موسیو مینٹ نہیں مرے بلکہ ایک پُراسرار طریقہ پر غائب ہو گئے یا انھیں زبردستی غائب کر دیا گیا ۔ فرض کیجئے اس مقام کا نام بھی معلوم ہو جاتا ہے جہاں وہ قید تھے ۔ حالانکہ اس جگہ کا پتہ چلانا آسان بات نہ تھی ۔ اگر ان کا کوئی ہم وطن دشمن اپنا وہ خاص اختیار استعمال کرتا جس کے بارے میں کچھ زیرلب کہتے ہوئے بہادر سے بہادر بھی لرز اٹھتے تھے ۔ وہ خاص اختیار جس کے ذریعے ایک سادہ کاغذ پر کوئی بھی الزام لگا کر کسی کو بھی غیر معین مدت کے لئے قید کروایا جا سکتا تھا ۔ فرض کرو ۔ اس کی بیوی نے ۔ بادشاہ ۔ ملکہ ۔ درباریوں اور پادریوں کی منت سماجت بھی کی کہ اس کے لاپتہ ہونے کا حال بتایا جائے ۔ لیکن سب بیکار ۔ کہیں بھی اس کی شنوائی نہ ہوئی ۔ اگر ایسا ہوتا تو بورے کے اس بدنصیب ڈاکٹر کی داستان تمہارے والد کی داستان ہوتی "

" آپ کو خدا کا واسطہ ۔ آگے فرمایئے ۔ پھر کیا ہوا ۔ جلدی کیجئے "

" ضرور کہوں گا ۔ کیا تم برداشت کر سکو گی "

" جی ہاں ۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں ۔ مگر للہ مجھے اس امید و بیم کی الجھن سے نکالئے "

" تم دل مضبوط کر کے بول رہی ہو ۔ واقعی تمہارا دل مضبوط ہے ۔ شاباش ! "

" لڑکی کا دل بڑھانے کے لئے" انہوں نے کہا۔ حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ بات بالکل برعکس ہے "آپ اسے کاروباری معاملہ سمجھئے۔ ایسا کاروبار جسے نمٹانا ہے۔ ہاں تو فرض کیجئے کہ ڈاکٹر کی بیوی نے اپنی ساری ہمت اور جرأت کے باوجود اس قدر شدید ستم جھیلے کہ وہ اپنی نومولود ـــ"

" لڑکی ـــ وہ نومولود لڑکی ہی تھی نا ـــ"

" ہاں ۔۔۔ لڑکی ہی تھی ۔۔ میرا مطلب ہے کہ بھئی یہ کاروباری معاملہ ہے۔ ذرا اپنے دل کو قابو میں رکھئے صاحبزادی ۔۔۔ ہاں تو اگر اس بدنصیب خاتون نے اتنے دکھ اٹھائے کہ اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ وہ اپنی بچی کو اس غم کی میراث سے محفوظ رکھے گی جو خود اس کے اپنے حصّے میں آیا تھا۔ اور اسے بجائے اصل حال بتانے کے اس غلط فہمی میں رکھے گی کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ ارے، ارے خدا کے لئے میرے سامنے دوزانو نہ ہو۔ اس کی کیا ضرورت ہے "

" میرے مہربان، میرے محسن، سچ سچ کہہ دیجئے۔ واقعہ کیا ہے "

" ارے ۔۔۔ بھئی ۔۔ یہ کاروباری معاملہ ہے تم تو مجھے بوکھلائے دیتی ہو۔ میرے حواس گم ہو گئے تو یہ معاملہ کیسے سنبھال سکوں گا۔ ہمیں ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے ـــ اگر تم ۔۔ براہ کرم تم اتنا بتا دو کہ نو پنے کتنے پنس ہوئے یا بیس گنیوں میں کتنے شلنگ ہوتے ہیں تو میری ہمت بندھ جائے گی اور مجھے تمہاری دماغی حالت کے بارے میں پورا اطمینان ہو جائے گا "

لڑکی نے براہ راست اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مسٹر لاری نے اسے آہستہ سے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ خاموش بیٹھ گئی۔ وہ اب تک مضبوطی سے ان کی کلائیاں پکڑے ہوئے تھی۔ مگر جب اس کے ہاتھوں کی لرزش کم ہوگئی تو ان کا دل قابو میں آیا "ہمت سے کام لو ۔ کاروبار ۔۔ ہمیں نہایت ضروری کاروبار کرنا ہے ۔ ہاں تو مس مینٹ آپ کی والدہ نے یہ راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے مرتے دم تک آپ کے والد کی تلاش میں انتھک کوشش جاری رکھی۔ اور جب وہ دل شکستہ ہو کر دنیا سے چل بسیں تو تمہارا سن اس وقت دو سال کا تھا۔ تمہیں یہ راز کہ تمہارا باپ کسی نامعلوم قید خانہ میں گھٹ گھٹ کر مر گیا یا وہاں برسوں پڑا آہستہ آہستہ گھلتا رہا۔ نہیں بتایا گیا تاکہ تمہاری حسین اور پُر مسرت زندگی پر ان دکھوں کا منحوس سایہ نہ پڑے اور تم بے فکری سے پھلو پھولو۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے انہوں نے لڑکی کے سنہری بالوں کی طرف پسندیدگی اور رحم کے ملے جلے جذبات سے متاثر ہو کر دیکھا۔ اور انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی سے ان بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہو۔

"آپ جانتی ہی ہوں گی کہ آپ کے والدین کے پاس کچھ زیادہ دولت نہیں تھی جو کچھ بھی تھا وہ آپ کی والدہ اور آپ کے لئے وقف تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور روپیہ اور جائیداد کے بارے میں کوئی نئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ مگر ۔۔"

انہوں نے اپنی کلائی پر دباؤ محسوس کیا اور خاموش ہو گئے۔

لڑکی کی پیشانی کی دلکشی نے انھیں خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ لیکن اب اس پیشانی پر ایک طرح کی بے حسی کے ساتھ دہشت و کرب کے جذبات نمایاں تھے۔

"مگر ان کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بہت بدل گئے ہوں۔ شاید بالکل تباہ حال ہو چکے ہوں۔ پھر بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ بہرحال وہ زندہ تو ہیں۔ تمہارے والد کو ان کے ایک قدیم نوکر کے گھر پہونچا دیا گیا ہے۔ اور ہم وہیں جا رہے ہیں۔ میں اس لئے جا رہا ہوں کہ ان کو شناخت کر سکوں۔ اور تم اس لئے۔۔۔ کہ تم انھیں دوبارہ زندگی، محبت، فرض اور راحت و آرام سے روشناس کراؤ"

وہ سر سے پیر تک لرزنے لگی۔ اور مسٹر لاری بھی متاثر ہو کر کانپنے لگے۔

"میں ان کی بھٹکی ہوئی روح سے ملنے جا رہی ہوں۔۔۔ ان سے نہیں ان کے آسیب سے" اس نے گھٹی ہوئی خوفزدہ آواز میں کہا۔ جیسے وہ خواب میں کھوئی ہوئی ہو۔

"دل مضبوط رکھو۔ دیکھو تمہیں میری بھی ہر ایک بات معلوم ہو گئی" مسٹر لاری نے لڑکی کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "اب تم اپنے بے چارے باپ کے پاس جا رہی ہو۔ سمندر پُر سکون رہے گا۔ سفر آرام سے کٹ جائے گا۔ اور بہت جلد تم ان کے پاس پہونچ جاؤگی"

"میں خوش و خرم آزادی سے زندگی گزارتی رہی اور کبھی ان کے آسیب نے میرے خواب میں آکر مجھے پریشان نہیں کیا" اس نے ڈرتے ہوئے دھیمی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"بس ایک بات اور ہے" مسٹر لاری نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے پُرزور لہجے میں کہنا شروع کیا" وہ ایک نئے نام سے ملے ہیں۔ ان کا اصلی نام یا تو بہت دن چھپا یا گیا تھا یا فراموش کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا بیکار ہی نہیں بلکہ نہایت خطرناک ہوگا کہ آیا وہ غلطی سے اتنے دن مقید رہے یا جان بوجھ کر انھیں جیل میں سڑایا گیا۔ بہتری اسی میں ہے کہ کہیں بھی کسی قسم کا ذکر نہ آنے پائے اور چپکے سے انھیں کم از کم کچھ دنوں کے لئے فرانس کے باہر لے جائیں۔ میں انگریز باشندہ ہوں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ٹیلسن بینک کو بھی فرانس میں خاص اہمیت حاصل ہے اس کے باوجود ہم اس ذکر کو نہیں چھیڑتے۔ اس معاملے کے متعلق تحریری حوالہ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ یہ بالکل راز کی کارروائی ہے۔ میرے تمام وثیقوں اور روزناچوں کے لئے بس ایک جملہ کافی ہے ... نئی زندگی پائی ... اس کا کچھ ہی مطلب ہو سکتا ہے — ہیں — یہ کیا ہوا — اس لڑکی نے تو ایک لفظ بھی نہیں سنا — مس مینٹ!"

وہ سکتے کے عالم میں وہیں بیٹھی رہی اور بغیر کرسی سے ٹیک لگائے بے حس پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے چہرے پر کرب اور دہشت داغ دی گئی تھی۔ وہ ان کا ہاتھ اس قدر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی کہ اس کی گرفت سے بغیر تکلیف پہونچائے ہاتھ چھڑانا ناممکن تھا۔ اس لئے بغیر اپنی جگہ سے ہلے کسی کو مدد کے لئے پکارا۔

ایک وحشت ناک عورت سرائے کے دوسرے نوکروں کے آگے آگے بھاگتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس پریشانی کے باوجود مسٹر لاری نے دیکھا کہ اس کا چہرا اور بال لال ہیں۔ اس کے جسم پر عجیب و غریب وضع کا چست لباس تھا اور سر پر اناج ناپنے کے ڈبے کی شکل کی ٹوپی پہنے تھی جو کچھ کچھ پنیر کی بڑی سی ٹکیہ سے مشابہ تھی۔ صاحبزادی کا ہاتھ چھڑانے کا مشکل مسئلہ اس نے نہایت آسانی سے یوں حل کر دیا کہ مسٹر لاری کے سینے پر کس کے ایسا مکا مارا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرائے۔

"یقیناً یہ کوئی مرد ہے"! مسٹر لاری نے پاس کی دیوار سے ٹکرا کر ہانپتے ہوئے سوچا

"ذرا دیکھو ان کم بختوں کو۔ کھڑے منہ کیا تک رہے ہو" عورت نے سرائے کے نوکروں کو ڈانٹا.....

"کیا لعل جڑے ہیں میری صورت میں۔ ارے جا کے لاؤ نا، کچھ سونگھانے کی دوا۔ کچھ ٹھنڈا پانی۔ سرکہ۔ چلو جلدی کرو۔ نہیں تو مزا چکھا دوں گی کہ یاد کروگے۔ ان چیزوں کے لئے ایک دم بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ پھر اس نے بڑے پیار سے مریضہ کو صوفے پر لٹا دیا اور نہایت نرمی اور ہوشیاری سے اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔

"میری جان۔ میری چڑیا" کہتے ہوئے چاؤ سے اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر سوارنے لگی۔ اور پھر مسٹر لاری پر برس پڑی۔

"اجی وہ بھورے کپڑوں والے صاحب۔ ایسی کیا بات بتانی تھی جو بچی کی جان پر بن گئی۔ کیا انسانیت سے نہیں بتا سکتے۔ ذرا اس کے ٹھنڈے ہاتھ اور پیلے مکھڑے

پر تو نظر ڈالو۔ اس بوتے پہ بیٹھکر بنے پھرتے ہو"!

مسٹر لاری اس غیر متوقع سوال پر بے حد بوکھلا گئے۔ اور دور کھڑے دیکھتے رہے ان کی ہمدردی اور انکساری میں قدرے کمی آگئی۔ ملازموں کو مزا چکھانے کی پُراسرار دھمکی دے کر بغیر یہ بتائے کہ کس چیز کا مزا چکھایا جائے گا، ہٹی کٹی عورت نے سرائے کے سب نوکروں کو نکال باہر کیا۔ اور آہستہ آہستہ بہلا پھسلا کر لڑکی کو پیار سے اپنے شانے سے لگالیا

"امید ہے کہ اب صاحبزادی کا مزاج بہتر ہو جائے گا" مسٹر لاری نے کہا۔

"بھورے کپڑوں والے صاحب — اس میں تمہاری تو کوئی کرامات نہیں ہے" پھر لڑکی سے کہنے لگی "میری پیاری میری جان"—

"مجھے امید ہے کہ تم بھی مس مینٹ کے ساتھ فرانس جاؤ گی" مسٹر لاری نے دبی ہوئی آواز میں انکسار اور ہمدردی سے کہا۔

"میں کیوں جانے لگی۔ اگر سمندر پار کرنا میرے نصیب میں لکھا ہوتا تو خدا مجھے جزیرے پر کیوں پیدا کرتا" دبنگ عورت نے جواب دیا۔

یہ ایک اور نہایت غور طلب مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس کے بارے میں سوچ بچار کرنے کی غرض سے مسٹر لاری وہاں سے کھسک گئے۔

پانچواں باب

شراب خانہ

ایک بڑا سا شراب کا پیپا سڑک پر گر کر ٹوٹ گیا۔ گاڑی سے اتارتے وقت یہ حادثہ ہوگیا تھا۔ پیپا لڑھکتا ہوا پھٹ گیا۔ اس کے گرد پڑے ہوئے لوہے کے حلقے ٹوٹ گئے اور وہ شراب خانے کے باہر اخروٹ کے چھلکے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا پڑا تھا۔

آس پاس کے سب کام میں مشغول اور بیکار لوگوں نے اپنے اپنے مشغلے چھوڑ دیئے اور شراب پینے کو لپکے۔ سڑک کے ناہموار نوکیلے پتھر جو شاید اس غرض سے بنائے گئے تھے کہ ان پر چلنے والا ہر جاندار لنگڑا ہو جائے۔ ان کے گڑھوں میں شراب جمع ہوگئی۔ ہر گڑھے کو اس کی ناپ کے مطابق دھکا پیل کرتے ہوئے انسانوں نے گھیر رکھا تھا۔ کچھ لوگ زمین پر دوزانو ہو کر چلوؤں سے شراب لے لے کر پینے لگے۔ یا ان عورتوں کی مدد کرنے کی کوشش کرنے لگے جو ان کے کندھوں پر اس غرض سے جھکی ہوئی تھیں کہ اس سے قبل کہ ان کی انگلیوں میں سے شراب بہہ جائے، وہ چسکی لگا لیں۔ دوسرے مرد اور عورتیں پیالوں اور ٹوٹے پھوٹے مٹی کے برتنوں کو شراب میں ڈبو ڈبو کر بھر رہی تھیں۔ عورتوں کے سروں سے رومال تک اتار کر شراب میں ڈبو کر بچوں کے منہ میں نچوڑنے جا رہے تھے

کچھ لوگ شراب کو بہنے سے روکنے کے لئے مٹی کی منڈیریں بنا رہے تھے دوسرے کھڑکی میں سے جھانکنے والے تماش بینوں کی ہدایات کے مطابق دوڑ دوڑ کر شراب کو نئے راستوں میں بہنے سے روکنے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ چند پیپے کے بھیگے ٹکڑے چاٹ رہے تھے کچھ شراب سے گلے ہوئے پیپے کے ٹکڑے مزے لے لے کر بڑے شوق سے چبا رہے تھے۔ شراب کو بہالے جانے کے لئے نالیاں تو نہیں تھیں اس لئے صرف شراب ہی نہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس قدر کیچڑ بھی سمیٹ لی گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید سڑک پر خاکروب جھاڑو دے گیا ہے۔ مگر اس گلی میں خاکروب کا وجود بھی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ جب تک یہ شراب کا تماشا چلتا رہا فضا مردوں عورتوں اور بچوں کے قہقہوں سے گونجتی رہی۔ لڑائی کم تھی اور خوش مذاقی زیادہ۔ ایک قسم کی برادرانہ دوستی کا جذبہ نمایاں تھا۔ عجب قابل دید نظارہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو شرکت کے لئے بلا رہے تھے۔ خاص طور پر تندرست اور کھلنڈرے لوگ تو شوق سے ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کا جام صحت پی رہے تھے اور مصافحہ کر رہے تھے۔ کوئی درجن بھر تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے بھی لگے۔ جب شراب ختم ہو گئی اور جہاں زیادہ مقدار میں گری تھی وہاں انگلیوں کے کھرچنے کی وجہ سے لکیریں سی بن گئیں تو مظاہرہ جیسے اچانک شروع ہوا تھا ویسے ہی ختم ہو گیا۔ وہ آدمی جو لکڑی چیرتے چیرتے اپنی آری اس میں پھنسا کر چھوڑ آیا تھا پھر جا کر اپنے کام میں جٹ گیا۔ وہ عورت جو انگیٹھی سے اپنے اور اپنے بچے کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پیر سینکتے سینکتے بھاگ آئی تھی

اپنی دہلیز پر پھر واپس چلی گئی۔ تنگے بھوکے چیکٹ بالوں والے انسان جو اپنے تہہ خانوں میں سے اُجالے میں نکل آئے تھے۔ واپس وہیں اتر گئے۔ گلی پر پھر وہی اداسی طاری ہوگئی جو اس گلی کے لئے اس چہل پہل سے زیادہ موزوں تھی۔ شراب سرخ تھی۔ پیرس میں سینٹ انٹائن کی جس تنگ گلی میں گری تھی وہاں کی زمین رنگ گئی۔ بہت سے ہاتھ۔ بہت سے چہرے اور برہنہ پیر اور بہت سے چوبی جوتے بھی رنگین ہو گئے تھے۔ لکڑیاں چیرنے والے کے ہاتھوں سے جلانے کی لکڑی کے ٹکڑوں پر سرخ دھبے لگ گئے اس عورت کی پیشانی جو بچے کو دودھ پلارہی تھی اس چیتھڑے سے رنگ گئی تھی۔ جو شراب میں ڈبویا گیا تھا۔ وہ جنہوں نے پیپے کے ٹکڑے چوڑے تھے۔ ان کے منہ شیروں کے کلوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک دراز قد مسخرے نے جو شراب میں لتھڑا ہوا تھا۔ اور جس کی بورے کی طرح جھلسی ہوئی ٹوپی میں سے آدھے سے زیادہ سر کھلا ہوا تھا۔ اپنی انگلیاں سرخ شراب میں ڈبوئیں اور ایک دیوار پر لکھ دیا ــ خون!۔

وہ دن دور نہیں تھا جب یہ شراب بھی سڑک کے پتھروں پر لنڈھائی جانے والی تھی۔ اور اس کے دھبوں سے ہزاروں انسانوں کے دامن داغدار ہونے والے تھے سینٹ انٹائن سے جو اُداسی کے بادل عرصے کے لئے عارضی طور پر چھٹ گئے تھے۔ وہ پھر چھا گئے۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ سردی، غلاظت، بیماری، جہالت اور مفلسی اس مقدس ہستی کے درباری تھے۔ اور دربار کے یہ امرا انتہائی طاقتور تھے۔ خاص طور پر مفلسی۔ اس چکی کے دو پاٹوں نے ہر قسم کے لوگوں کو بار بار پیسا تھا۔ یقیناً یہ وہ چکی

نہتی جو بوڑھوں کو پیس کر جوان بنا دیتی ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ کانپتے ہوئے ہر دروازے سے آتے جاتے ہر کھڑکی سے جھانکتے۔ ہوا کے جھکڑ میں پھڑپھڑاتے ہوئے چیتھڑوں میں لپٹے اور ہر گوشے میں سردی سے ٹھٹھرے نظر آتے۔ وہ چکی جس نے انھیں پیسا تھا ایسی تھی جس نے نوجوانوں کو بوڑھا بنا دیا تھا۔ بچوں کے چہروں سے ان کی معصومیت اور بھولا پن چھین کر ان میں قبل از وقت سنجیدگی اور بزرگی پیدا کر دی تھی۔ اور ان کے بوڑھے اور پُر شکن چہرے ان کھیتوں کی مانند تھے جہاں ہل چلا کر بھوک بوئی گئی ہو۔ ہر چہار طرف بھوک کا راج تھا۔

اونچے اونچے گھروں میں سے بھوک اگ رہی تھی ان چیتھڑوں پر جو رسیوں اور بانسوں پر ٹنگے تھے۔ بھوک کی چھاپ تھی۔ ان چیتھڑوں میں لکڑی اور کاغذ کی صورت میں بھوک کے پیوند لگے تھے۔ جلانے کی لکڑی چیرنے والے کی لکڑیوں کے ہر ٹکڑے میں بھوک کی آگ چھپی تھی۔ خاموش، بجھی ہوئی چمنی پر سے بھوک جھانک رہی تھی بھوک سڑک پر گھوم رہی تھی۔ اس گھورے پر بھوک سرگرداں تھی جہاں کھانے کو غلاظت میں چیچھڑے بھی نہ تھے۔ نانبائی کی دکان پر "بھوک" کا لفظ کندہ تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی سڑی ہوئی روٹیوں کے مختصر ذخیرے اور کبابی کی دکان میں مرے ہوئے کتے کے پکے ہوئے گوشت پر بھوک کی مہر چسپاں تھی۔

بھڑبھونجے کے بھاڑ میں سے ہر دانہ کے چٹخنے پر ایسی آواز آتی تھی جیسے "بھوک" اپنا خشک ڈھانچہ کھڑکھڑا رہی ہو۔ دو بوند تیل میں تلے خشک آلوؤں کی ہر دو پیسے

خالی رکابی میں بھوک ریشہ ریشہ ہو کر بلی ہوئی تھی۔

جہاں بھی سینگ سما سکتے تھے وہاں بھوک قابض تھی۔ تنگی خمدار گلیوں میں جہاں بدبودار سڑاند تھی جن میں سے اور بھی تنگ و تاریک گلیوں کا جال نکل کر پھیلا ہوا تھا۔ جہاں چیتھڑے اور گوڈر بستے تھے۔ بدبودار چیتھڑے اور گودڑ جس طرف دیکھو ہر چیز پر اداسی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ مگر ستائے ہوئے انسانوں کی بے رونق پھٹی ہوئی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی۔ اس جانور کی آنکھوں جیسی چمک جو شکاریوں کے نرغے میں گھر کر حملہ کر دیتا ہے۔ کچلے ہوئے خون سے دہکتے ہوئے انسان ——— جن کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ بھنچے ہوئے ہونٹ۔ پیشانیوں کے بل۔ جیسے پھانسی کی رسی کے بل۔ کرب سے سرنگوں سوچ رہے تھے ——— صبر یا انتقام۔

دوکانوں کے سابق بورڈ پکار پکار کر اس علاقے کی بھیانک مفلسی کا اعلان کر رہے تھے۔ بوچڑ اور قصابوں نے سڑے گلے چھیچھڑوں کی تصویریں دوکانوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ نانبائی کی دوکان میں سب سے زیادہ خراب آٹے کی سوکھی مارملی روٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور شراب خانوں کی تختیوں پر شراب اور پینے والے پتلی شراب کی چھٹ کے پیمانے ہاتھوں میں لئے غرا رہے تھے اور مشتعل نظروں سے رازدارانہ انداز میں منصوبے بنا رہے تھے۔ سوائے ہتھیاروں اور اوزاروں کے ہر چیز خراب حالت میں دکھائی گئی تھی۔ چاقو اور کلہاڑیاں چمکیلی اور دھار دار تھیں۔ لوہار کا

ہتوڑا لوزنی تھا۔ اور بندوق ساز کا سامان ہلاکت خیز تھا۔

مکانوں کے سامنے فٹ پاتھ نہ ہونے کی وجہ سے سڑک کے اپاہج کر دینے والے ناہموار پتھر اور کیچڑ بھرے گڑھے عین دروازے سے لگ جاتے تھے۔ اس لئے موری سڑک کے بیچ میں بن گئی تھی۔ جو ہمیشہ گندے پانی اور کیچڑ سے اٹی رہتی۔ مگر جب موسلا دھار بارش ہوتی، جھر جھری لے کر ابل پڑتی، اور بدحواس ہو کر آس پاس کے گھروں میں گھس جاتی۔ سڑک کے اس پار تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بھدّی وضع کی لالٹینیں لگی ہوئی تھیں جنہیں رسّی اور گراری کی مدد سے اوپر کھینچ کر چڑھایا گیا تھا رات کے وقت لالٹینیں جلانے والا انہیں نیچے اتار کر جلاتا اور پھر رسّی کھینچ کر اوپر چڑھا دیا کرتا۔ دھندلی ٹمٹماتی ہوئی بتیاں سروں پر لٹکی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے سیاہ سمندر پر روشنیاں بھٹک رہی ہوں۔ واقعی وہ ایک سمندر پر سرگرداں تھیں۔ جہاز اور مسافر ایک خوفناک طوفان کے خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ وقت آنے والا تھا جب فاقہ زدہ اور مدقوق بےکار بیٹھے بیٹھے لالٹینیں جلانے والے کی حرکتوں کا بغور مطالعہ کریں گے۔ اور پھر ان کے دماغ میں اس کی ترکیب کو بہتر بنانے کے منصوبے بننا شروع ہوں گے۔ رسیوں اور چرخیوں کی مدد سے انسانوں کو سولی پر چڑھائیں گے۔ اور ان کے خون میں لتھڑی سرخ لاشوں کے روشن نشانوں سے غربت کی تاریکی میں اجالا ہو جائے گا۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اور فرانس میں چلنے والی بادِ مخالف کے ہر جھونکے کے ساتھ چڑیوں کو ڈرانے کے لئے کھیتوں میں

ایستادہ میوِلوں کے چیتھڑے پھڑپھڑا رہے تھے۔ لیکن خوش رنگ پروں والی خوش الحان چڑیاں نڈر اور بے خبر تھیں!

شراب کی دکان نکڑ پر تھی اور دوسری دکانوں سے نسبتاً اچھی حالت میں تھی۔ دوکان کا مالک پیلی واسکٹ اور سبز برجس پہنے دوکان کے سامنے کھڑا ضائع ہوئی شراب پر دھینگا مشتی دیکھ رہا تھا "اس میں میرا کچھ نقصان نہیں" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا "بازار کے لوگوں کا کیا دھرا ہے اب انہیں کو تاوان بھگتنا پڑے گا۔"

اسی وقت اس کی نظر لمبے قد کے مسخرے پر پڑی جو دیوار پر اپنا لطیفہ لکھ رہا تھا اس نے سڑک کے اس پار سے پکارا۔

"اے گیسپرڈ کیا کر رہے ہو۔"

مسخرے نے اپنے قبیلے کے لوگوں کی طرح نہایت معنی خیز طریقے پر اشارہ کیا جس کا کوئی مطلب واضح نہ ہو سکا۔

"کیوں جی پاگل خانہ جانے کا ارادہ ہے" سڑک پار کر کے دوکاندار نے اس سے کہا پھر مٹی بھر کیچڑ اٹھائی اور تحریر پر لیپ کر اسے مٹا دیا "کیوں بے۔ ایسے الفاظ لکھنے کے لئے بس یہی جگہ رہ گئی ہے۔"

اپنی گفتگو کے درمیان اس نے قصداً یا بھول سے اپنا نسبتاً صاف ہاتھ مسخرے کے دل پر رکھ دیا مسخرے نے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔ نہایت پھرتی سے ہوا میں اچھلا نہایت مضحکہ خیز رقص کے انداز میں کھڑا ہو گیا اور ایک جھٹکے سے اپنا ایک پیر کا جوتا

اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس وقت وہ ایک پیمانہ حد تک حقیقت پسند مسخرہ معلوم ہو رہا تھا۔

"جوتا پہن لو" دوکاندار نے کہا۔ "شراب کو شراب ہی کہو۔ اور قصہ ختم کر دو۔" یہ نصیحت کرنے کے بعد اس نے قصداً مسخرے کے کپڑوں سے اپنا کیچڑ میں سنا ہوا ہاتھ پونچھ ڈالا۔ کیونکہ مسخرے کی خاطر ہی تو اس نے اپنا ہاتھ گندہ کیا تھا۔ پھر اس نے سڑک پار کی اور شراب کی دوکان میں گھس گیا۔ شراب کی دوکان کا مالک سانڈ کی سی گردن کا جنگلی آدمی تھا۔ اس کا سن تیس برس کا ہوگا۔ بڑا گرم مزاج انسان معلوم ہوتا تھا کیونکہ سردی کافی تھی۔ مگر وہ کوٹ پہننے کی بجائے اسے کندھے پر ڈالے ہوئے تھا۔ قمیص کی آستین چڑھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے بھورے ہاتھ کہنیوں تک کھلے ہوئے تھے۔ سیاہ گھونگریالے بالوں پر ٹوپی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ سانولا تھا۔ اس کی فراخ آنکھیں اچھی تھیں۔ اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ دیکھنے میں خوش مزاج بھی تھا اور لڑاکو بھی۔ مجموعی طور پر ایک نہایت مضبوط کردار کا مالک اور ارادہ کا پکا معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ کسی پتلی سی گلی کے بیچوں بیچ دندناتا چلا جا رہا ہو تو اس سے مڈبھیڑ ہو جانا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ کوئی چیز اُسے راستے سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

اس کی بیوی میڈم ڈیفارج سودا بیچنے کی میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ میڈم ڈیفارج اسی کی عمر کی ایک نہایت تگڑی عورت تھی۔ بڑی چوکس آنکھیں تھیں جو خاص طور پر کسی کو بھی نہ دیکھتی تھیں۔ انگوٹھیوں سے بوجھل ہاتھ۔ چہرے سے مستقل مزاجی عیاں اور حرکات سے اطمینان قلب ظاہر۔ وہ ایک ایسا کردار تھا جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا

تھا کہ وہ جو معاملہ بھی اپنے ہاتھ میں لے لے اس میں بھول چوک سے غلطی ہو جانے کا کوئی امکان نہیں۔ میڈم ڈیفارج کو سردی بہت لگتی تھی۔ اس لیے اس نے سر کے گرد ایک بھاری سی بھڑکیلی شال لپیٹ رکھی تھی۔ ایسے کہ اس کے کانوں کے بڑے بڑے بندے نمایاں تھے۔ اس کی بنائی کا سامان آگے دھرا تھا۔ جو اس نے ابھی ابھی وہاں رکھ دیا تھا اور دانت کریدنے لگی تھی۔ اس کی داہنی کہنی بائیں ہتھیلی پر ٹکی ہوئی تھی۔ اور جب اس کا خاوند آیا تو اس نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف آہستہ سے کھنکاری اور اپنی سیاہ کھینچی ہوئی ابرو ذرا سے اوپر اٹھا کر دانت کریدتی رہی۔

اس خفیف سے اشارے سے اس نے اپنے خاوند پر یہ واضح کر دیا کہ اسکی غیر موجودگی میں کوئی نیا گاہک آیا تھا اور دوسرے گاہکوں کے ساتھ کھڑا تھا جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

دوکان کے مالک نے اپنی آنکھیں چاروں طرف گھمائیں اور کونے میں بیٹھے ہوئے ایک شریف مرد اور نوجوان لڑکی پر جما دیں۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے دو آدمی تاش کھیل رہے تھے اور دو ڈومینو میں مشغول تھے۔ تین میز کے پاس کھڑے تھوڑی سی بچی کچی شراب کو آہستہ آہستہ ختم کر رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ شریف مرد نے لڑکی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "یہی ہمارا آدمی ہے۔"

"یہاں تمہارا کیا کام ؟ میں تمہیں قطعی نہیں جانتا" موسیو ڈیفارج نے دل ہی دل میں کہا۔ بظاہر اس نے قصداً ان دو اجنبی ہستیوں کی طرف توجہ دی اور ان

تین گاہکوں سے بات چیت کرتا رہا جو میز کے پاس کھڑے پی رہے تھے۔

"کیوں بھئی جیکوبس کیا حال چال ہے" ان میں سے ایک بولا "گرمی ہو تی شراب سب اڑ گئی"

"ایک ایک اینٹ جیکوبس" موسیو ڈیفارج نے جواب دیا۔

ایک ہی نام کو دہراتے ہوئے سن کر میڈم ڈیفارج ایک ذرا کے ذرا پھر کھنکاری اور ابروؤں کو ذرا سا اچکایا۔ ان بدنصیب جانوروں کو روز روز شراب چکھنے کا موقع نہیں ملا کرتا۔ سوائے موت اور سیاہ روٹی کے ان کے مقدر میں اور کچھ نہیں۔ کیوں جیکوبس۔ کیا رائے ہے تمہاری" دوسرے نے موسیو ڈیفارج کو مخاطب کر کے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو جیکوبس"! موسیو ڈیفارج نے جواب دیا۔

دوبارہ ایک ہی نام کے دہرائے جانے پر پھر میڈم ڈیفارج دانت کریدنے لگی۔ لیکن آہستہ سے کھنکاریں اور ابروؤں کو ہلکی سی جنبش دی۔

ان تین گاہکوں میں سے تیسرے نے اپنا گلاس چڑھا کر ایک چٹخارہ لیا اور کہا۔

"ہاں یہی تو عذاب ہے ان غریب جانوروں کے منہ کا مزہ ہمیشہ ہی کڑوا رہتا ہے کیا مصیبت کی زندگی ہے ان لوگوں کی۔ ٹھیک کہتا ہوں، جیکوبس"

"بالکل درست کہتے ہو" موسیو ڈیفارج نے جواب دیا۔

جب تیسری بار ایک ہی نام ادل بدل کر استعمال کیا گیا تو میڈم ڈیفارج نے

دانت کرید نے کا خیال ایک طرف رکھ دیا۔ بھویں چڑھائیں اور اپنی جگہ آہستہ سے کسمسائی!

"بس یہ ٹھیک ہے ۔۔۔ حضرات ۔۔۔ یہ میری بیوی ہیں" اس کا شوہر بڑبڑایا۔
تینوں گاہکوں نے نہایت ادب سے ہیٹ اُتارے اور میڈم کو تعظیم دی۔ اس نے ان پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور سر کے اشارے سے اس تعظیم کو قبول کیا۔ پھر اس نے شراب کی دوکان میں چاروں طرف نظر ڈالی اپنی بنائی اٹھائی اور بظاہر بڑے اطمینان اور بے پروائی سے بننے میں مشغول ہو گئی!۔

"حضرات ۔۔۔ صبح بخیر ۔۔۔ میرے باہر جانے سے پہلے آپ نے جس مردانہ کمرے کو ملاحظہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی وہ پانچویں منزل پر ہے" اس کے شوہر نے کہا جو بڑے غور سے اپنی بیوی کے ہر اشارہ کو دیکھ رہا تھا۔ "زینے کا دروازہ اس چھوٹے سے صحن میں کھلتا ہے جو میرے گھر کی کھڑکی سے ملحق ہے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ "لیکن مجھے یاد آیا آپ میں سے ایک صاحب اس طرف جا چکے ہیں۔ اور اپنے ساتھیوں کو راستہ بتا سکتے ہیں ۔۔۔ خدا حافظ حضرات" انہوں نے شراب کی قیمت ادا کی اور وہاں سے چل دیئے۔ موسیو ڈیفارج کی نظریں اپنی بیوی کی بنائی پر جمی ہوئی تھیں کہ معمر آدمی اپنے کونے سے اٹھ آئے اور کچھ بات کرنے کی اجازت چاہی۔

"بڑی خوشی سے صاحب" ڈیفارج خاموش دروازے سے ان کے ساتھ ہولیا ان کی بات چیت میں زیادہ وقت نہ لگا۔ ایک ہی لفظ نے سارا معاملہ طے کر دیا۔ جسے سُنکر ڈیفارج چونک پڑا اور ایک دم سے نہایت مودب ہو گیا۔ دوسرے

لمحے اس نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ شریف مرد نے پھر لڑکی کو اشارے سے بلایا اور وہ دونوں بھی باہر چلے گئے۔ میڈم ڈیفارج پھر پتلی انگلیوں سے بنتی رہی۔ اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ مسٹر جاروس لاری اور مس مینٹ شراب کی دوکان سے نکل کر موسیو ڈیفارج کے ساتھ اس دروازے کی طرف چل دیئے۔ جدھر اس نے پہلے تین گاہکوں کو بھیجا تھا۔ یہ دروازہ ایک سیاہ بدبودار صحن میں کھلتا تھا اور بہت سے گھنے پیچ کمروں کی طرف جانے کا عام راستہ تھا۔ یہاں کافی آبادی تھی۔ تاریک زینہ کے پاس پتھر کے فرش پر ڈیفارج اپنے آقا کی بیٹی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر جھک گیا۔ اور اس کے ہاتھ کو چوما۔ یہ ایک نہایت لطیف حرکت تھی مگر اس میں سختی آگئی تھی۔ موسیو ڈیفارج میں ان چند لمحوں میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس کے چہرے سے ساری خوش مزاجی اور اخلاص غائب ہوگیا۔ اور وہ ایک نہایت پراسرار غصہ ور اور خطرناک انسان بن گیا۔

"بہتر ہے کہ آہستہ آہستہ چڑھیں کیونکہ بہت اُوپر جانا ہے اور آپ کو تکلیف ہوگی" جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے تو موسیو ڈیفارج نے نہایت کرختگی سے مسٹر لاری سے کہا۔

"کیا وہ تنہا ہیں؟"

"بالکل تنہا! خدا ان پر رحم کرے ان کے ساتھ کون ہوسکتا ہے" اس نے ویسے ہی دھیمی آواز میں کہا۔

"تب کیا وہ ہر وقت اکیلے رہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"خود اپنی مرضی سے؟"

"نہیں بلکہ — ضرورت سے مجبور ہو کر۔ ایسی ہی تھی ان کی حالت اس وقت بھی جب ان لوگوں نے مجھے بلایا اور معلوم کرنا چاہا کہ میں انھیں اپنی ذمہ داری پر لے جاؤں گا۔ یا نہیں۔ اب بھی — ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔"

"بہت بدل گئے ہیں پہلے سے؟"

"ہونہہ۔ بدل گئے ہیں!"

شراب کی دوکان کا مالک چلتے چلتے رک گیا۔ ایک موٹی سی گالی دے کر اس نے دیوار کو کوٹ ڈالا۔ کوئی جواب اس سے زیادہ شدید اور متاثر کن نہیں ہو سکتا تھا۔ جوں جوں مسٹر لاری اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اوپر چڑھتے گئے ان کے دل کا بوجھ بڑھتا گیا۔

آج کل کے زمانے میں بھی پیرس کے کثیر آبادی والے حصہ کا ایسا زینہ کافی ذلیل ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں تو ایسا ہی زینہ مع اپنی جملہ غلاظتوں کے ایک بھیانک حقیقت تھا۔ خاص طور پر نازک طبع لوگوں کے لئے جو ان کے عادی نہ تھے اس اونچی عمارت میں جتنے بھی چھوٹے موٹے کمرے تھے ان میں بسنے والے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ دروازوں کے سامنے ہی پھینک دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کھڑکیوں سے باقی کا

فضا پھینکا کرتے تھے۔ اگر وہ غربت کی غلاظتیں اس حصہ کو رہنے بسنے کے لئے ناکارہ نہ بھی بنا دیتیں تب بھی کوڑے کی سڑاند سے وہاں کی ہوا غیر صحت بخش اور زہریلی تھی غربت پر غلاظت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ ان کا راستہ گندہ اور زہریلی فضا میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ خود مسٹر لاری بھی پریشان تھے اور لڑکی کی ہر لحہ بڑھتی ہوئی گھبراہٹ سے مجبور ہو کر راستہ میں دو دفعہ دم لینے کے لئے ٹھیرے۔ دونوں مرتبہ وہ ایک جنگلے کے قریب سانس لینے کے لئے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ تھوڑی بہت صاف ہوا اس ماحول میں رہ گئی ہے اس جنگلے کے راستے باہر جا رہی ہے اور باہر کی ساری زہریلی غلیظ ہوا سمٹ کر اس راستے سے اندر آ رہی ہے۔ اس جنگلے میں سے کچھ نیچ کھنڈر مکانوں کی جھلک بجائے آنکھوں کے حلق کے ذریعہ دماغ میں اُتر رہی تھی۔ آس پاس کی کوئی چیز بھی جو نو تردم کی برجیوں سے نیچے تھی صحت مند زندگی اور ذہنی سکون کی آئینہ دار نہ تھی۔

آخر کار وہ زینہ کی آخری سیڑھی پر پہونچکر تیسری بار رک گئے۔ ایک مختصر سا زینہ اور تھا جو سب سے زیادہ گندہ اور پھسلوان تھا۔ جس کی ٹیڑھی میڑھی سیڑھیوں پر چڑھنا بھی ایک مرحلہ سے کم نہ تھا شراب خانے کا مالک بجائے مسٹر لاری کے ہمقدم چلنے کے برابر ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ جیسے کہ وہ ڈر رہا ہو کہ کہیں لڑکی کوئی سوال نہ پوچھ بیٹھے۔ اس زینہ پر پہونچ کر وہ رُک گیا۔ اور بڑی احتیاط سے ٹٹول کر جیب سے کنجی نکالی۔

"دوست کمرہ میں تالا پڑا رہتا ہے؟" مسٹر لاری نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں؟" موسیو ڈیفارج نے سختی سے جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں بدنصیب انسان کو یوں تنہا رکھنا ضروری ہے؟"

"میرے خیال میں تالا لگانا ضروری ہے؟" موسیو ڈیفارج نے پیشانی پر بل ڈال کر چپکے سے کہا۔

"کیوں؟"

"کیوں! کیونکہ وہ اتنی مدت تک بند کمرے میں رہے ہیں کہ بغیر تالے کے انہیں رکھا گیا تو وحشت اور خوف سے وہ پاگل ہو کر اپنے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ مر جائیں گے۔ اگر ان کے کمرے کا تالا کھلا چھوڑ دیا جائے تو نہ جانے وہ اپنی کیا گت بنا ڈالیں؟"

"کیا ممکن ہے؟"

"جی ہاں؟ ہم جس حسین دنیا میں بستے ہیں وہاں یہی نہیں اور بھی بہت کچھ ممکن ہے۔ ممکن ہی نہیں۔ آئے دن عملاً کیا جاتا ہے۔ خدا شیطان کی عمر دراز کرے؟"

اور پھر موسیو ڈیفارج نے غصہ اور نفرت سے کہا "آیئے آگے چلئے؟"

یہ بات چیت اتنی نیچی آواز میں ہوئی کہ لڑکی کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پڑی۔ مگر وہ اس وقت بری طرح لرزنے لگی۔ اور اس کے چہرے پر انتہائی پریشانی چھا گئی۔ مسٹر لاری نے اس کو تسلی دینے کے لئے کچھ کہنا ضروری سمجھا؟ ہمت سے

کام لیجئے صاحبزادی ــــ ہمت اور فرض شناسی کو ہاتھ سے نہ دو۔ کوئی دم کی بات ہے سب مشکلیں حل ہو جائیں گی ۔ پھر وہ ساری محبت اور پیار جو انھیں سکون پہونچا سکتا ہے کام میں لانا ہوگا ۔ ہمارے مہربان دوست ڈیفارج تمہیں سہارا دیں گے ۔ کاروبار ہے یہ تو . . . . دل مضبوط رکھو۔"

دبے پاؤں وہ لوگ آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گئے ۔ زینہ بہت چھوٹا تھا اور وہ جلد ہی اوپر پہونچ گئے ۔ آگے اچانک ایک موڑ تھا ۔ وہاں تین آدمی جھکے ہوئے جھری میں سے کمرے کے اندر جھانک رہے تھے ۔ پیروں کی چاپ سن کر تینوں مڑ کر سیدھے ہو گئے یہ وہی تین آدمی تھے جو شراب خانہ میں پینے کی غرض سے آئے تھے ۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے ان لوگوں کا خیال ہی نہ رہا" موسیو ڈیفارج نے تشریح کی ۔ مہربان اب تشریف لے جائیے ہمیں بڑا ضروری کام ہے ۔" اس نے تینوں سے کہا ۔

تینوں خاموشی سے وہاں سے سرک گئے ۔

ایک دروازہ اور تھا اور جب وہ لوگ چلے گئے تو ڈیفارج اس دروازے کی طرف بڑھا ۔ مسٹر لاری نے غصہ سے اس کے کان میں کہا ۔

"موسیو مینٹ کا تماشہ بنا کر لوگوں کو دکھاتے ہیں ؟"

"جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ۔ چند خاص لوگوں کو میں انھیں دکھاتا ہوں ۔"

"یہ مناسب ہے ؟"

"میرے خیال میں مناسب ہے ۔"

"یہ خاص لوگ کون ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب کیسے کرتے ہو؟"

"میں ان خاص آدمیوں کو پہچانتا ہوں جو میرے ہمنام ہوتے ہیں اور جیکوس کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ انھیں دیکھ کر سبق حاصل کرتے ہیں۔ آپ انگریز ہیں۔ آپ اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے۔ مہربانی سے ذرا دیر انتظار کیجئے۔" انھیں الگ رہنے کی تنبیہہ کر کے اس نے جھک کر دیوار کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ پھر فوراً بعد سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر دو تین بار دروازے پر دستک دی۔ دو تین بار دروازے کو کنجی سے کھڑکھڑایا اور آہٹ پیدا کرنے کے لئے زور زور سے تالے میں کنجی گھمانے لگا۔

دروازہ آہستہ سے اندر کی طرف کھل گیا۔ کمرے میں جھانک کر اس نے کچھ کہا۔ ایک نحیف آواز میں جواب ملا۔ دونوں طرف سے بمشکل ایک آدھ لفظ ہی بولا گیا ہوگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور دونوں کو داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ مسٹر لاری نے دیکھا لڑکی گری جا رہی ہے۔ انہوں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سنبھالا۔

"کاروبار کی بات ہے۔۔ اندر چلئے۔" انھوں نے اصرار کیا ان کے گالوں پر جو نمی چمک رہی تھی وہ ان کے کاروباری ہونے کا قطعی ثبوت نہیں تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے!" اس نے خوف سے لرز کر جواب دیا۔

"ڈر! کاہے کا ڈر؟"

"ان سے۔۔۔ میرا مطلب ہے اپنے والد سے۔"

مسٹر لاری اس کی ابتر حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ موسیو ڈیفارج نے انھیں شانے سے

آگے بڑھنے کو کہا تو انہوں نے مجبوراً لڑکی کا بازو اپنی گردن میں ڈال کر اسے تھوڑا سا اٹھالیا اور جلدی سے کمرے میں لے گئے۔ انھوں نے اسے دروازے کے قریب ہی بٹھا دیا وہ ان سے لپٹی جا رہی تھی اور وہ اسے تھامے ہوئے تھے۔

ڈیفارج نے کنجی نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ تالا لگا کر کنجی ہاتھ میں لے لی۔ یہ سب کچھ اس نے بڑے اہتمام سے کیا تاکہ کھٹکے سے موسیو مینیٹ پر واضح ہو جائے کہ دروازہ بند ہو گیا۔ آخر میں نپے تلے ہوئے قدموں سے کھڑکی تک گیا اور پلٹ پڑا۔

یہ کوٹھری جلانے کی لکڑی اور دوسرے سامان کے رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس لئے نہایت تاریک تھی۔ کھڑکی خفیہ دروازے کی طرح کی تھی۔ اور در حقیقت چھت میں جڑی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر گلی میں سے سامان اٹھانے کے لیے ایک چھوٹا سا کرین لگا ہوا تھا۔ یہ دو پٹ کی کھڑکی فرانسیسی ساخت کی بنی ہوئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لئے اس کھڑکی کا ایک پٹ بند تھا اور دوسرا تھوڑا سا کھلا تھا۔ اتنی کم روشنی آنے کی گنجائش تھی کہ داخل ہوتے ہی کوئی چیز دیکھنا مشکل تھا۔ بہت عرصے تاریکی میں رہنے کا عادی انسان ہی وہاں بیٹھ کر اس اندھیرے میں کوئی باریکی کا کام کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس کمرے میں باریکی کا کام کیا جا رہا تھا! دروازے کی طرف پیٹھ کئے ایک ضعیف سفید ریش انسان بیٹھا تھا۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا جدھر شراب خانہ کا مالک کھڑا اسے تک رہا تھا۔ وہ آگے کو جھکا ہوا نہایت انہماک سے جوتے بنا رہا تھا۔

چھٹا باب

جوتے بنانے والا

"صبح بخیر!" موسیو ڈیفارج نے جوتے بنانے میں مشغول جھکے ہوئے سفید سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے سر اٹھا کر نہایت نحیف آواز میں جو دور دراز سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔

"صبح بخیر!"

تھوڑی دیر بعد پھر آہستہ سے سر اٹھا کر کہا۔ "ہاں میں کام کر رہا ہوں۔" اس بار سر نیچا کرنے سے پہلے دو تھکی ہوئی آنکھیں سوال کرنے والے چہرے پر لحظہ بھر کے لئے ٹھہریں۔

آواز کی کمزوری قابل رحم اور دردناک تھی۔ یہ کمزوری جسمانی تکان کی وجہ سے نہیں تھی۔ حالانکہ طویل قید نے جسم کو بھی لاغر بنا دیا تھا۔ تکلیف دہ بات تو یہ تھی کہ یہ آواز تنہائی اور جبری خاموشی کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی اور صدیوں پہلے دی گئی صدا کی آواز بازگشت کی طرح دھیمی اور مبہم معلوم ہوتی تھی۔ اس میں

انسانی آواز کی جھنکار اور زندگی مرچکی تھی ۔اس کو سنکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک خوشنما خوش رنگ چیز مرجھا کر ایک پھیکا سا دھبہ بن کر رہ گئی ہو۔ ایسی دھیمی اور کھوئی ہوئی جیسے کہیں زمین کے پوشیدہ سینے سے ابھر رہی ہو۔

اس آواز سے اس کھوئے ہوئے مظلوم جاندار کی قابل رحم حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔ جو ایک ریگستان میں گم کردہ راہ فاقہ زدہ مسافر کی طرح ریت پر گر کر دم توڑنے سے پہلے آخری بار اپنے گھر اور دوستوں کو یاد کر رہا ہو۔ کچھ دیر تک وہ کام پر جٹا رہا۔ وحشت زدہ آنکھیں پھر ایک بار اوپر اٹھائیں۔ تجسس اور دلچسپی سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ ویسے ہی اضطراری انداز میں یہ دیکھنے کے لئے کہ آنے والا ابھی تک اپنی جگہ موجود ہے۔

"میں چاہتا ہوں اس کمرے میں تھوڑی سی روشنی بڑھ جائے۔ آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی" موسیو ڈیفارج نے جوتے بنانے والے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جوتے بنانے والے نے کام روک دیا۔ خالی خالی آنکھوں سے پہلے ایک طرف فرش کو دیکھتے ہوئے کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر دوسری طرف ایسے ہی نظر ڈالی — اور آنکھیں اٹھا کر اپنے مخاطب کو دیکھا۔

"کیا کہا تم نے"

"اگر کمرے میں تھوڑی سی روشنی بڑھ جائے تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا"

"اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو مجھے برداشت کرنا ہوگا" لفظ تمہاری مرضی پر قدرے زور دیتے ہوئے کہا۔

دروازے کے ادھ کھلے پٹ کو ذرا اور کھول کر اسے وہیں اٹکا دیا گیا جس کی وجہ سے کافی روشنی کوٹھری میں پڑنے لگی ۔ کمرے میں کام کرنے والا ایک نامکمل جوتا گود میں رکھے بیٹھا تھا ۔ اس کی بنچ پر اور پیروں کے قریب مختلف قسم کے چمڑے کے ٹکڑے اور دو چار معمولی اوزار بکھرے پڑے تھے ۔ اس کی ناہموار ترشی ہوئی مختصر سی ڈاڑھی سفید تھی ۔ چہرہ سوکھا مارا تھا مگر آنکھیں بے انتہا روشن تھیں ۔ ویسے بھی اس کی آنکھیں الجھے ہوئے بالوں اور سیاہ بھوؤں اور دبلے پتلے چہرے پر بڑی بڑی معلوم ہوتیں مگر وہ قدرتی طور پر بڑی تھیں اور بہت بے تکی لگ رہی تھیں ۔ پھٹی پرانی چیتھڑوں کی قمیص کے کھلے ہوئے گریبان میں سے اس کا سوکھا اور تھکا ماندا جسم دکھائی دے رہا تھا ۔ وہ خود اس کا موم جامہ کا کوٹ اس کے ڈھیلے موزے اور باقی کے پھٹے پرانے کپڑے اتنے عرصے تک روشنی اور دھوپ سے محروم رہنے کی وجہ سے سب ایک رنگ کے زرد پھیکے کاغذ کی طرح معلوم ہوتے تھے ۔ کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا ۔

اس نے روشنی سے بچنے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی ہڈیوں کے آر پار روشنی جھلک رہی ہے کام روک کر وہ خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا ۔ سامنے کھڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھنے سے پہلے ہمیشہ وہ ایک طرف فرش کو گھورتا پھر دوسری طرف جیسے آواز کا رخ پہچاننے کی عادت ختم ہو چکی تھی ۔ یوں بھٹکے ہوئے انداز میں وہ بات کو شروع کرتا اور پھر

سب کچھ اس کے ذہن سے اُتر جاتا۔

"یہ جوتوں کی جوڑی آپ آج ختم کرلیں گے؟" موسیو ڈیفارج نے پوچھا، اور مسٹر لاری کو اشارے سے آگے بلایا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"یہ جوتوں کی جوڑی آج ہی ختم کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں کہہ نہیں سکتا کہ میرا ارادہ ہے۔ میرا قیاس تو ہے۔ . . مگر مجھے پتہ نہیں۔"

مگر اس سوال نے انھیں کام یاد دلادیا اور وہ پھر اس پر جھک گئے۔

لڑکی کو دروازے پر چھوڑ کر مسٹر لاری خاموشی سے آگے بڑھ آئے۔ جب وہ جوتا بنانے والے کے پاس کچھ منٹ تک کھڑے رہے تو اس نے اوپر دیکھا۔ ایک دوسرے شخص کی موجودگی پر کوئی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں غیر ارادی طور پر ہونٹوں کو ٹٹولنے لگیں۔ اس کے ناخون اور ہونٹ بھی زرد ہی تھے۔ پھر ہاتھ کام پر لگ گیا۔ اور وہ پھر جوتے پر جھک گیا۔ اس اشارے اور فعل میں مشکل سے ایک لمحہ صرف ہوا ہوگا۔

"آپ نے دیکھا آپ سے کوئی ملنے آیا ہے؟" موسیو ڈیفارج نے کہا۔

"تم نے کیا کہا؟"

"ایک ملاقاتی آیا ہے۔"

جوتے بنانے والے نے اپنے کام سے ہاتھ ہٹائے بغیر پہلے کی طرح اوپر دیکھا

"دیکھئے ان صاحب کو۔ اچھے بنے ہوئے جوتے کی خوب پہچان ہے۔ یہ جوتا جو آپ بنا رہے ہیں انھیں دکھائیے۔"

"موسیو ۔۔۔ لیجئے جوتا۔۔۔"

مسٹر لاری نے جوتا لے لیا۔

"موسیو کو بتائیے یہ کس قسم کا جوتا ہے اور جوتا بنانے والے کا نام کیا ہے۔"

جواب دینے سے پہلے وہ کافی دیر کے لئے خاموش رہا۔

"تم کیا پوچھ رہے تھے۔ میں بھول گیا۔ کیا کہا تم نے۔"

"میں نے کہا کیا آپ موسیو کو سمجھا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کا جوتا ہے۔"

"یہ ایک زنانہ جوتا ہے چہل قدمی کے وقت پہننے کا زنانہ جوتا۔ نئے فیشن کا ہے۔ میں نے نیا فیشن کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے نمونہ دے دیا گیا تھا۔" اس نے جوتے کو دیکھا اس کی نظروں میں تھوڑا سا غرور کا جذبہ ابھر آیا۔

"اور بنانے والے کا نام۔" ڈیفارج نے کہا۔

اب اس کے ہاتھ میں کوئی کام نہ تھا تو اس نے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بنا کر اُلٹے ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھی۔ پھر اُلٹے ہاتھ کی مٹھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹکائی پھر اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسلسل اس فعل کو دہراتا رہا۔ وہ ہر بات کے بعد یوں خلا میں کھو جاتا تھا کہ اسے بار بار متوجہ کرنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا ایک بیہوش کمزور انسان کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہو یا نزع سے موت کی آغوش میں ڈوبتے ہوئے انسان کو راز معلوم

کرنے کے لئے جلایا جارہا ہو۔

"کیا تم نے مجھ سے میرا نام پوچھا؟"

"یقیناً!"

"ایک سو پانچ ــــ شمالی برج!"

"بس؟"

"ایک سو پانچ شمالی برج!"

اس کے گلے سے عجیب سی آواز نکلی۔ جو نہ آہ تھی اور نہ کراہ ــــ وہ پھر کام پر جھک گیا۔

"آپ پیشہ ور موچی ہیں؟" مسٹر لاری نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پھر گہری خاموشی کو توڑا۔

اس نے ڈیفارج کی طرف اپنی اندوہناک آنکھیں گھمائیں جیسے کہ وہ چاہتا ہو اس سوال کے جواب کا بار وہ اٹھائے۔ مگر جب اس طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو پہلے زمین پر نظر دوڑائی۔ پھر مسٹر لاری کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں پیشہ ور موچی نہیں ــــ نہیں ــــ جوتے بنانا میرا پیشہ نہیں تھا۔ یہ فن میں نے خود سیکھ لیا ہے۔"

"اجازت لے کر۔"

وہ خود فراموشی میں ڈوب گیا۔ کئی منٹ تک وہ پہلے کی طرح ہاتھوں کی الٹ پھیر

کرتا رہا۔ اس کی بھٹکی ہوئی نظریں پھر اپنے مخاطب کے چہرے پر آہستہ آہستہ لوٹ آئیں اور ٹھیر گئیں۔ وہ چونک پڑا۔ جیسے کسی نیند کے ماتے کو گزشتہ رات کی بات یاد آگئی ہو۔

"میں نے اجازت لے کر بڑی مشکلوں سے خود جوتے بنانا سیکھا۔ اور جب سے جوتے بنایا کرتا ہوں۔"

اس نے جوتا مسٹر لاری سے واپس لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے غور سے اس کے چہرے کو تاکتے ہوئے کہا۔

"موسیو مینٹ کیا میں آپ کو قطعی یاد نہیں رہا۔"

ہاتھ سے جوتا گر پڑا اور وہ سوال کرنے والے کو نظریں جمائے گھورتا رہا۔

"موسیو مینٹ" انھوں نے ڈیفارج کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "آپ اس شخص کو کیا بالکل بھول گئے۔ اس کی طرف دیکھئے۔ میری طرف دیکھئے۔ کیا آپ پرانے بینک کے منیجر کو نہیں پہچانتے۔ پرانے نوکر کو نہیں جانتے۔ موسیو مینٹ پرانے زمانے کی کوئی بھولی بھٹکی یاد آپ کے دماغ میں نہیں ابھرتی۔"

سالہا سال کی قید بھگتنے والا خاموش باری باری سے کبھی مسٹر لاری کو اور کبھی ڈیفارج کو تکتا رہا۔ ذہانت کے نقوش جو برسوں سے دھندلے پڑے تھے آہستہ آہستہ فراموشی کے سیاہ بادلوں کو چیر کر پیشانی پر ابھرنا شروع ہوئے۔ وہ پھر گڈمڈ ہوگئے تاریکی میں ڈوب گئے، غائب ہوگئے۔ مگر ایک لحہ کو ان کی جھلک ضرور نظر آئی تھی۔ لڑکی بھی دیوار سے لگی لگی قریب کھسک آئی تھی۔ جہاں سے کھڑی کھڑی وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسکے

چہرے پر بھی یہی جذبات اسی طرح منعکس تھے۔ وہ ہاتھ جو شاید اس نے ڈر سے اس سے نیچے اور اس کی صورت کو نظروں سے دور رکھنے کے لئے اٹھائے تھے۔ اب پیار سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ان لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا مردنی چھایا ہوا چہرہ لے کر اسے کلیجے سے لگا لینے کو بے قرار تھی۔ وہ اپنے پیار سے اس میں دوبارہ جان ڈالنے کے لئے بے چین تھی ایک ہی جذبہ دونوں پر جوش مار رہا تھا۔ جیسے بوڑھے کے چہرے سے روشنی کھنچکر اس کے جوان اور حسین چہرے میں سما گئی ہو۔

اس پر پھر تاریکی چھا گئی۔ اس نے بار بار زمین کو گھورنے کے بعد وقت در سے بے توجہی سے دونوں کو دیکھا۔ جوتا اٹھایا اور کام میں غرق ہو گیا۔

"آپ مسٹر لاری کو پہچان گئے موسیو؟" ڈیفارج نے چپکے سے پوچھا۔

"ہاں — ایک لمحے کے لئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ساری کوشش فضول ہے۔ مگر ایک لمحے کے لئے یہ پرانا پہچانا چہرہ مجھے یاد آیا — ش! خاموش — دور ہٹ آؤ! ش!"

لڑکی دیوار سے ہٹ کر اس بنچ کے قریب آگئی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی بے خبری اور لاعلمی بڑی تکلیف دہ تھی — اگر وہ چاہتا تو کام کرتے میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ خاموش بغیر بولے چالے سناٹے میں وہ ایک واہمہ کی طرح کھڑی رہی۔ اور وہ اپنے کام میں غرق رہا۔ لیکن جلد ہی اسے جوتے سینے کے اوزار بدلنے کے لئے آگے جھکنا پڑا۔ وہ چمڑا کاٹنے کا چاقو اٹھانا چاہتا تھا۔ جو اس طرف رکھا تھا جدھر لڑکی

نہیں کھڑی تھی۔ چاقو اٹھا کر کام شروع کرنے والا تھا کہ اس کی نظر لڑکی کے گون کے کنارے پر پڑی۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ مسٹر لاری اور ڈیفارج چونک کر آگے بڑھے مگر لڑکی نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ ڈر رہے تھے کہ وہ چاقو سے اس پر حملہ کر دے گا ۔ مگر وہ قطعی خوفزدہ نہ تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑے وحشت سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹ ہلے ۔ مگر آواز نہ نکل سکی ۔ آخر کار پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ کیا ہے"

آنسو بے اختیار اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے ۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو چوم کر اس کی طرف پھیلا دیا۔ پھر دونوں ہاتھ ایسے سینے پر رکھ لئے جیسے وہ اس کا اجڑا ہوا سر چھاتی سے لگا رہی ہو۔

"تم جیلر کی بیٹی تو نہیں ہو"

"نہیں" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کون ہو تم"

اسے اپنی آواز پر بھروسہ نہ تھا اس لئے چپ چاپ اس کے قریب بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ سہم کر دور ہٹا۔ مگر اس نے محبت سے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ اس کی اس حرکت پر بوڑھے کو ایک عجیب قسم کی لہر جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کا سارا جسم لرز اٹھا۔ اس نے آہستہ سے اوزار رکھ دیا۔ اور خاموش اس کے چہرے پر نظریں

گاڑدیں۔ اس کے سنہرے بال جو لاپرواہی سے پیچھے ہٹا دیئے گئے تھے۔ لمبے لمبے حلقوں کی صورت میں اس کی گردن پر پڑے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ہاتھ بڑھا کر ان بالوں کو آہستہ آہستہ ہاتھ میں لیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا۔ بیچ میں وہ پھر کھو سا گیا اور سب کچھ بھول کر ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر زیادہ دیر کے لئے نہیں۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر لڑکی نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ دو تین بار اس نے اسے دیکھا جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ وہ واقعی حقیقت ہے یا صرف اس کا وہم۔ پھر اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چیتھڑے کی شکل کا تعویذ نکالا اور اسے گھٹنے پر رکھ کر کھولا۔ اس میں گنتی کے چند بال تھے بمشکل سے دو تین سنہرے بال ہوں گے۔ جو اس نے برسوں پہلے انگلی کے گرد لپیٹ کر گچھا بنا کر رکھے تھے۔!

اس نے لڑکی کے بال پھر ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور کہا۔

"بالکل ایک جیسے ہیں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کب کا واقعہ ہے۔ کیسے ہوا تھا؟"

اس کی پیشانی پر الجھن اور پریشانی سے گہری شکنیں پڑ گئیں۔ بالکل ویسی ہی شکنیں اس نے لڑکی کی پیشانی پر دیکھیں۔ اسے روشنی کی طرف موڑ کر وہ غور سے دیکھنے لگا۔

"اس نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ اس رات جب میری طلبی کا حکم آیا تھا۔ میرے جانے کے خیال سے وہ خوفزدہ تھی۔ حالانکہ مجھے کوئی ڈر نہ تھا اور

جب وہ مجھے شمالی برج میں پکڑ کر لائے تو یہ بال میرے شانہ پر ملے تھے ان بالوں کو میرے پاس رہنے دو۔ یہ مجھے یہاں سے جسمانی طور پر نکل بھاگنے میں کوئی مدد نہیں پہونچا سکتے۔ حالانکہ روحانی طور پر قید و بند کی سختیاں دُور کر سکتے ہیں، یہی الفاظ اس وقت میں نے کہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ؟"

کہنے سے پہلے اس نے کئی بار ان الفاظ کو منھ ہی منھ میں دہرایا۔ مگر جب بولنے کے لئے اسے الفاظ ملے تو وہ سلجھے ہوئے اور درست تھے۔ گو وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

"یہ کیا تھا ۔۔ کیا وہ تم ہی تھیں ؟"

وہ ایک دم لڑکی کی طرف مڑا تو مسٹر لاری اور ڈیفارج خوفزدہ ہوکر پھر آگے بڑھے۔ مگر وہ نہایت اطمینان سے اس کی گرفت میں بیٹھی رہی اور بہت دھیمی آواز میں التجا کی ۔

"مہربانی کر کے آپ لوگ مخل نہ ہوں نہ کچھ بولئے اور نہ ہمارے درمیان دخل دیجئے ؟"

"سنو! یہ کس کی آواز تھی ؟" بوڑھے نے چونک کر کہا۔

اس نے لڑکی کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ایک آہ بھری اور بدحواس ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگا۔ مگر بہت جلد اس کی گھبراہٹ ختم ہوگئی۔ سوائے جوتے بنانے کے اس کے دماغ سے ہر چیز مٹ چکی تھی۔ اس نے اپنا تعویذ لپیٹ کر

اپنے گریبان میں چھپالیا۔ مگر لڑکی کو دیکھ دیکھ کر وہ حسرت سے سرہلاتا رہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم بہت کم سن ہو۔ بہت شگفتہ ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ تم قیدی کی حالت کو دیکھ رہی ہو۔ یہ وہ ہاتھ نہیں جنہیں وہ پہچانتی تھی۔ یہ چہرہ بھی وہ نہیں جس سے وہ واقف تھی۔ . . نہ وہ آواز ہے جو وہ سنا کرتی تھی۔ نہیں۔ نہیں۔ وہ کبھی زندہ تھی۔ شمالی برج میں سالہا سال گذارنے سے پہلے وہ بھی زندہ تھا۔ تمہارا نام کیا ہے میرے معصوم فرشتے؟"

اس کی نرم اور پیار بھری آواز سے لڑکی میں ہمت آگئی اور گھٹنوں کے بل جھک کر التجا بھرے انداز میں اس نے اپنے ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیئے۔

"جناب پھر کسی وقت آپ کو میرا نام معلوم ہو جائے گا۔ میری ماں کون تھی میرا باپ کون تھا۔ اور کس طرح میں ان کی دکھ بھری کہانی سے بے خبر رہی۔ میں آپ کو یہاں اور اس وقت کچھ نہیں بتا سکتی۔ اس وقت تو صرف آپ سے اتنی التجا کرتی ہوں کہ مجھے سینے سے لگا کر پیار کر لیجئے۔ میرے عزیز۔ میرے پیارے۔ میرے حق میں دعا کیجئے۔ مجھے پیار کیجئے۔"

اس کے بوڑھے سفید بالوں پر لڑکی کے جاندار سنہرے بالوں کی شعاعیں پڑ رہی تھیں گویا اس کے وجود پر آزادی کے نور کا پرتو پڑ رہا تھا۔

"اگر آپ کو میری آواز میں وہ نغمہ سنائی دے جو اس میٹھی آواز سے مشابہ ہے جو کبھی آپ کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ تو جی بھر کے رو لیجئے۔ اگر میرے بالوں کے

لمس میں آپ کو اس پیارے سر کا لمس یاد آ رہا ہے جو کبھی آپ کے سینے پر ٹکا کرتا تھا۔ جب آپ جوان تھے۔ آزاد تھے ــــ تو اس کی یاد میں آنسو بہایئے۔ ہمارا ایک گھر ہوگا جہاں میں جی جان سے آپ کی خدمت کروں گی۔ آپ کی دیکھ بھال کروں گی۔ اگر اس گھر کے ذکر پر آپ کو اس گھر کی یاد آ جائے جو برسوں ہوئے اُجڑ گیا اور آپ یوں غم میں گھلا کیے۔ تو اس کی یاد میں آنسو بہا کر جی کی بھڑاس نکال لیجیے۔"

اس نے ضعیف مظلوم انسان کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔ اور ایک ننھے سے بچے کی طرح اسے تسکین دینے لگی۔

• میرے عزیز ــــ آپ کے دکھوں کا زمانہ بیت چکا۔ میں آپ کو یہاں سے لے جانے کے لئے آئی ہوں۔ انگلینڈ میں ہم آرام اور سکون سے زندگی بسر کریں گے۔ اگر اس بات پر آپ کو اپنی تباہ شدہ زندگی کا خیال آجائے وہ کارآمد زندگی جسے ہمارے بے رحم وطن فرانس نے مٹی میں ملا دیا تو آنسو بہا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیجیے۔ . . اور جب میں آپ کو اپنا نام بتا دوں اور یہ بتاؤں کہ میرے والد کون ہیں اور وہ زندہ ہیں اور میری ماں کا انتقال ہوگیا۔ اور جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے باوقار باپ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی ان سے معافی کی خواستگار ہوں۔ کہ میں انجان رہی۔ اور میرے باپ پر میری ماں کی جدائی میں نیند حرام ہوگئی۔ اور میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکی ہو اور یہ کہ میری ماں نے اپنے دُکھ مجھ سے چھپائے تو آپ میری اور میری ماں کی بدنصیبی پر آنسو بہایئے۔ میرے مہربان ــــ اوہ خدا تیرا ہزار ہزار شکر ــــ برسوں کی گھٹن اور

ضبط کے بعد آج یہ آنسو بہہ نکلے ۔۔۔ ان کی سسکیاں میرا کلیجہ ہلائے دیتی ہیں ۔۔۔ اے معبود تیرا لاکھ لاکھ شکر ۔۔۔"

کس قدر دل ہلا دینے والا نظارہ تھا ۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بیہوش ہو گیا تھا ۔ اس کا سر لڑکی کے سینے پر لٹکا تھا ۔ نظارہ خوبصورت تھا مگر اس کے پیچھے تمام دکھ اور مظالم پوشیدہ تھے جو انتہائی کرب ناک اور بھیانک تھے ۔ ۔ ۔ دیکھنے والوں نے اپنے چہرے ڈھانک لئے ۔

بڑی دیر تک کوٹھری میں خاموشی چھائی رہی ۔ دکھ بھری سانسوں اور سسکیوں سے لرزتا ہوا جسم سکون پا گیا ۔ جیسے ہر طوفان کے بعد سکون چھا جاتا ہے زندگی بھی ایک مہیب طوفان ہے اس کے بعد سکون اور آرام انسان کا انجام ہے تب وہ باپ اور بیٹی کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھے ۔ آہستہ آہستہ وہ زمین پر آ رہا تھا ۔ اور تھکان سے بے شعور پڑا تھا ۔ بیٹی بھی سرک کر اس کے قریب ہی اتر آئی تھی ، تاکہ اس کا سر اپنے ہاتھوں پر ٹکا سکے ۔ اس کے گھنے بال باپ کے چہرے پر آن پڑے تھے ۔

جب مسٹر لاری آنسو پونچھتے ہوئے انھیں اٹھانے جھکے تو لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا ۔

"انھیں پریشان کئے بغیر اگر انھیں پیرس سے لے جانے کا انتظام ہو جائے تو ۔۔۔"

"مگر سوچئے تو ۔ کیا یہ سفر کے قابل ہیں ؟" مسٹر لاری نے پوچھا ۔

"اس بھیانک شہر میں رہنے سے جہاں اُن پر اس قدر ظلم ہوا ہے وہ جانے کو ترجیح دیں گے۔"

"یہ درست ہے۔" ڈیفارج نے کہا۔ جو قریب ہی بات سننے کے لئے جھکا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ موسیو مینٹ کا فرانس سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ کہئے تو میں گاڑی اور گھوڑوں کا انتظام کروں۔"

"کاروباری معاملہ ہے اور کاروبار کی باتیں میرے ذمے ہیں۔" مسٹر لاری نے موقع پاکر فوراً نہایت غیر جذباتی بن کر کہا۔

"تو مہربانی کرکے ہمیں یہاں چھوڑ جایئے۔" مس مینٹ نے استدعا کی۔ "آپ دیکھ رہے ہیں انھیں کتنا سکون مل رہا ہے۔ میرے ساتھ چھوڑ کر جانے میں اب آپ کو تکلف نہ کرنا چاہئے۔ اور پریشان ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ اگر آپ باہر سے تالہ لگا جائیں تو کوئی ہمیں پریشان نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے جب آپ لوٹ کر آئیں گے تو انھیں اس طرح پرسکون پائیں گے۔ ویسے بھی میں آپ کے لوٹنے تک ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ پھر تم انھیں سیدھے یہیں سے لے جائیں گے۔"

مسٹر لاری اور ڈیفارج دونوں اس فیصلے پر ذرا ہچکچا رہے تھے ان کا خیال تھا دونوں میں سے ایک کو وہاں رہنا چاہئے۔ مگر چونکہ وقت کم تھا رات ہو رہی تھی اور ابھی گاڑی اور سفر کے لئے ضروری کاغذات کا انتظام کرنا تھا۔ آخر میں انھوں نے سہولت کی خاطر کام تقسیم کر لیا۔

جب رات ہوگئی۔ لڑکی زمین پر باپ کے قریب پتھر پر سر رکھے لیٹی باپ کو تک رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا اور وہ دونوں خاموش پڑے تھے کہ اتنے میں دیوار کے سوراخوں میں سے روشنی کی چمک دکھائی دی۔

مسٹر لاری اور ڈیفارج نے سفر کی پوری تیاری کرلی تھی اور اپنے ساتھ سفر کے لئے اوڑھنے بچھانے کے سامان اور لبادوں کے علاوہ گوشت روٹی شراب اور گرم کافی بھی لے آئے تھے۔ کمرے میں صرف ایک کھوٹے کا بچھونا تھا موسیو ڈیفارج نے اسے چارے کے لئے ساتھ لے لیا۔ لالٹین جوتے بنانے والے کی بنچ پر رکھ دی اور مسٹر لاری کی مدد سے ضعیف آدمی کو اٹھانے لگے۔

انسانی عقل ان رازوں کی تہہ تک نہیں پہونچ رہی تھی۔ جو ان خالی خالی آنکھوں اور خوفزدہ چہرے کے پیچھے پوشیدہ تھے۔ کیا انہیں خبر تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ یاد تھا کہ ان سے ان لوگوں نے کیا کہا تھا۔ کیا انہیں پتہ تھا کہ وہ آزاد ہوچکے تھے۔ ان سوالوں کا جواب کسی ہوشمند کے پاس نہ تھا۔ مسٹر لاری اور ڈیفارج نے ان سے کچھ بات کرنا چاہی مگر ان کی وحشت سے ڈر گئے۔ کیونکہ وہ رک رک کر الجھی الجھی باتیں کرنے لگے۔ اس لئے دونوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ نہایت وحشیانہ انداز میں بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیتے۔ پہلے تو وہ ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کو اپنی بیٹی کی آواز سن کر کچھ مسرت ہو رہی تھی۔ اور جب وہ بولتی تو فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

جبریہ حکم ماننے کے وہ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ بغیر کسی چون و چرا انھیں جو کچھ دیا گیا چپ چاپ کھا پی لیا۔ جو لبادے اور کمبل اوڑھنے کو دیئے اوڑھ لئے۔ مگر جب بیٹی نے ان کا ہاتھ پکڑا تو بڑی مستعدی سے اس کا ہاتھ اپنے بازوؤں میں ڈال کر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ لوگ نیچے اترنے لگے۔ موسیو ڈیفارج روشنی لئے آگے آگے تھے اور مسٹر لاری اس چھوٹے سے جلوس کے پیچھے چل رہے تھے۔ دو چار ہی سیڑھیاں اترے ہوں گے کہ موسیو مینٹ رک گئے۔ انھوں نے در و دیوار پر ایک نظر ڈالی۔

"بابا آپ کو یاد ہے یہ جگہ یاد ہے۔ آپ یہاں آئے تھے۔ یاد ہے؟"

"کیا کہا تم نے؟"

مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے سوال کو دہراتی وہ دھیمی آواز میں بولے۔

"یاد ہے — نہیں مجھے کچھ یاد نہیں — کتنے سالوں کی بات ہے!"

اس جواب سے یہ ظاہر ہو گیا کہ انھیں قطعی یاد نہیں کہ انھیں جیل خانے سے اس گھر میں لایا گیا — پھر وہ بڑبڑائے۔

"ایک سو پانچ — شمالی برج — !" اور جب انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی تو ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اس مضبوط قلعے کو دیکھ رہے ہیں جہاں وہ اتنے عرصے قید رہے تھے احاطے میں پہنچ کر وہ غیر شعوری طور پر ٹھٹک گئے جیسے انھیں انتظار ہو کہ اب قلعے کا پھاٹک کھلے گا اور خندق پر پل گرایا جائے گا۔ سامنے گاڑی کھڑی دیکھی تو انھوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے پھر سر پکڑ لیا۔

دروازے کے پاس کوئی بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ کھڑکیوں میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ گلی میں سے کوئی بھولا بھٹکا راہ گیر بھی نہیں گزر رہا تھا۔ ایک غیر مرئی خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ صرف ایک میڈم ڈیفارج تھی جو تن تنہا دروازے سے لگی کھڑی بن رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی !۔

قیدی اور اس کی بیٹی گاڑی میں داخل ہو چکے تھے۔ مسٹر لاری سوار ہو ہی رہے تھے کہ قیدی نے اپنے جوتے بنانے کے اوزار لانے کی خواہش ظاہر کی۔ مسٹر لاری ٹھٹک گئے۔ میڈم ڈیفارج نے جلدی سے اپنے شوہر سے پکار کر کہا کہ وہ ابھی لاتی ہے اوزار — اور بنتی ہوئی روشنی سے گزر کر احاطے سے چلی گئی۔ اس نے جلدی سے اوزار لاکر دیدیئے اور پھر دروازے سے ٹیک لے کر کھڑی ہو گئی۔ اور بنتی رہی — اس نے کچھ نہیں دیکھا! وہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی! ڈیفارج کوچوان کے پاس سوار ہو گیا۔ اور سرحد کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ کوچوان نے اپنا ہنٹر پھٹکارا اور گاڑی اوپر لٹکی ہوئی سڑک کی دھندلی لرزتی ہوئی لالٹینوں کے سائے میں روانہ ہو گئی۔

اوپر جھولتی ہوئی لالٹین۔ اوپر — جھولی ہوئی روشنیاں! جو حسین سڑکوں پر جگمگا رہی تھیں — اور گندی گلیوں میں دھندا ور دھوئیں سے اٹی ہوئی تھیں۔ گاڑی ان کے سائے میں چلی جا رہی تھی۔ روشنی سے منور دوکانوں اور ہنستے کھیل کھلاتے انسانوں کے پاس سے گزرتی — جگمگاتے کافی خانوں اور تھیٹروں کے دروازوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی شہر کے پھاٹک کے قریب پہونچ گئی۔ پھاٹک پر تعینات سپاہیوں نے کہا۔

"وہ آپ نے کاغذات دکھائے مسافر صاحبان؟"

"یہ دیکھئے افسر صاحب ——" موسیو ڈیفارج نے گاڑی سے نیچے اتر کر اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "یہ ان بزرگ کے کاغذات ہیں جو گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ وہ میرے ہمراہ ہیں —— یہ کاغذات —— میرے ہاتھ میں دیئے گئے تھے —— یہ ——" اس نے اپنی آواز بہت دھیمی کر لی۔ فوجی لائنوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ایک وردی پوش ہاتھ مع لالٹین کے گاڑی میں داخل ہوا —— ہاتھ کے مالک کی آنکھوں نے اندر ضعیف انسان کی صورت میں وہ نظارہ دیکھا جو ہر شب و روز نظر نہیں آتا۔

"سب ٹھیک ہے آگے بڑھو ——" وردی نے کہا۔

"خدا حافظ" ڈیفارج نے کہا۔

گاڑی چلتی رہی۔ لالٹینوں کی روشنیاں دھندلی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ غائب ہو گئیں اور گاڑی تاروں کی چھاؤں میں چلتی رہی۔

ان ساکت اور ابدی روشنیوں کے سائبان کے نیچے —— غیر فانی روشنیاں —— جن میں سے بعض تو زمین سے اتنی دور تھیں کہ سائنس والوں کا بیان ہے کہ ان کی شعاعوں کا اس دارالاسباب تک پہونچنا بھی مشتبہ ہے۔ رات کے تاریک سائے بھٹکتے جا رہے تھے۔ صبح تک سردی اور اضطراب کی گھڑیوں میں یہ سائے مسٹر لاری کے کانوں میں وہی بات کہتے رہے۔ قبر کھود کر نکالے ہوئے مردے کے سامنے بیٹھ کر مسٹر لاری حیران تھے کہ کون سی قوتیں اس دماغ میں دوبارہ بیدار ہو سکتی ہیں۔ اور

کون سی قوتیں ہمیشہ کے لئے فنا ہو چکیں ۔۔۔

"کیا تم نہیں چاہتے کہ دوبارہ زندگی ملے!"

اور وہی پرانا جواب :۔

"پتہ نہیں ۔"

دوسرا حصّہ

سنہرا بندھن

پہلا باب

پانچ سال بعد

۱۷۸۰ء میں بھی ٹیلسن بنک کی عمارت جو ٹمپل بار کے سامنے تھی۔ نہایت بوسیدہ تھی۔ یہ ایک بہت چھوٹی۔ نہایت تاریک۔ نہایت بد وضع اور رہائش کے لئے نہایت تکلیف دہ عمارت تھی۔ یہ ایک پرانی وضع کی عمارت تھی۔ اور بنک کے حصہ داروں کو اس کے گھٹے ہوئے ماحول پر فخر تھا۔ اس کی تاریکی پر فخر تھا۔ اس کے بھونڈے پن اور ناقابل رہائش ہونے پر فخر تھا۔ بلکہ وہ تو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ اپنی خرابیوں کے معاملے میں ایک نہایت امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ اور انھیں پختہ یقین تھا کہ اگر ٹیلسن بنک کی عمارت کم خراب ہوتی تو اتنی قابل اعتماد نہ ہوتی۔ خاموشی سے اس بات پر یقین کرنے کے بجائے وہ باقاعدہ کاروبار کے سلسلے میں اس نکتے کو بطور ڈنڈے کے گھمایا کرتے تھے۔

ٹیلسن کو کہنیاں ٹکانے کی جگہ کی حاجت نہیں۔

ٹیلسن کو روشنی کی ضرورت نہیں۔

ٹیلسن کو کسی سجاوٹ کی پروا نہیں۔ نوکس اینڈ کو یا سنوکس برادرس کو اس دکھاوے کی ضرورت ہوگی مگر ٹیلسن کو خدا کے فضل سے . . . .

اگر بینک کے کسی حصہ دار کا لڑکا عمارت کی از سر نو تعمیر کا سوال اٹھاتا تو باپ اسے فوراً عاق کر دیتا۔ اس معاملے میں اس عمارت کا اس ملک سے بڑا گہرا جوڑ تھا۔ اگر اس ملک کے نوجوان کبھی قابل اعتراض قوانین اور رسم ورواج میں کچھ ترمیم کرنے کا سوال اٹھاتے تو وہ فوراً عاق کر دیئے جاتے۔ چونکہ یہ خرابیاں بہت پرانے زمانے سے چلی آ رہی تھیں اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ زمانہ قدیم کی یہ میراث جتنی زیادہ قابل اعتراض ہے اتنی زیادہ قابل قدر ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر ٹیلسن بینک ایک نہایت تکلیف دہ جگہ تھی۔ دروازہ کھولئے تو اس میں سے ایسی چوں چرخ کی آواز نکلتی جیسے کسی جاں بلب مریض کی گھانٹی چل رہی ہو۔ دروازہ کھلتے ہی آپ دو سیڑھیاں نیچے بینک میں دھڑام سے گریں گے۔ جب آپ کے حواس ذرا درست ہوں گے تو آپ کو ایک چھوٹی سی دوکان میں دو مختصر سی میزیں نظر آئیں گی۔ اور آپ کا چیک ایک بڈھے پھونس کلرک کے ہاتھ میں ایسا کانپنے گا جیسے کوئی آندھی اسے پھڑ پھڑا رہی ہو! وہ اپنی چندھی آنکھوں سے گھٹی ہوئی اندھیاری کھڑکیوں کی روشنی میں جس میں سے فلیٹ اسٹریٹ سے اڑنے والی کیچڑ کی بارش ہوا کرتی تھی آپ کے دستخط شناخت کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ کھڑکیاں خود ہی کیا کم تاریک اور گھٹی ہوئی تھیں کہ ان کی رہی سہی روشنی ٹیمپل بار کی اونچی عمارت نے روک لی تھی۔ اگر کاروبار کے سلسلہ میں آپ کو منیجر سے ملنا پڑے تو آپ کو پچھلے حصے کی ایک کال کوٹھری میں بٹھا دیا جاتا جہاں آپ کو زندگی کے تاریک ترین پہلو یاد آنے لگتے۔ تب منیجر

جیبوں میں ہاتھ ڈالے آئے گا تب بمشکل آپ اندھیرے میں اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ٹپٹپاتے رہ جائینگے۔ آپ کے روپیہ کا لین دین کرم خوردہ میزوں کی پرانی درازوں میں سے ہوگا۔ جب وہ کھولی اور بند کی جائیں گی۔ تو ان کا برادہ اور دھول اڑکر آپ کی ناک اور حلق میں گھس جائے گی۔ بنک کے نوٹوں میں پرانی گھنی بدبو آئے گی۔ جیسے وہ تیزی سے پھر چیتھڑوں میں تبدیل ہونے والے ہیں۔ آپ کی قیمتی چیزیں قریب کے کسی تہہ خانے میں گھسیٹ دی جاتیں۔ جہاں وہ غلاظت میں ڈوب کر جلد ہی دو ایک روز میں اپنا سنہرا ملمع کھودیں گی۔ آپ کے حبہ نامے ان کوٹھریوں میں رکھ دیئے جائیں گے جو پہلے باورچی خانے اور برتن دھونے کی کوٹھریاں تھیں۔ جن کے سیف بنالئے گئے تھے۔ ان موم جاموں کی یہاں ساری چکنائی نچڑ جائے گی۔ آپ کے صندوقچے اس کمرے میں رکھے جائیں گے جہاں کھانے کی میز لگی ہے مگر کبھی کسی نے ان پر کھانا نہیں کھایا اور وہاں آپ کا پہلا محبت نامہ یا آپ کے بچوں کے پہلے خط رکھے ہوں گے۔ جنہیں ٹیمپل بار پر لٹکے ہوئے سر اپنی مردہ آنکھوں سے گھورا کرتے تھے۔ ۱۷۸۰ء میں وہ بہیمانہ اور وحشیانہ رسم جاری تھی جو صرف اشنتی اور ابی سینیا کو زیب دیتی تھی۔ اور حال ہی میں اس کا تدارک ہوا تھا۔

لیکن اس زمانہ میں موت کی سزا دینا ہر طبقے اور پیشے کے لئے نہایت کارآمد نسخہ سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور پر ٹیلسن بنک کو تو اس معاملے میں فوقیت حاصل تھی۔ قدرت نے موت کو ہر مرض کی دوا بنایا ہے تو پھر قانون کیوں نہ اس نسخے کا استعمال کرے۔

اسی لئے ہر وہ شخص جو جھوٹے دستخط بناتا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ کوئی غلط نوٹ دینے والا قتل کر دیا جاتا۔ کوئی غیر قانونی طور پر کسی کا خط کھول لیتا تو مار دیا جاتا۔ کوئی چالیس شلنگ چھ پنس اڑا لیتا تو اس کا سر اڑا دیا جاتا۔ اگر ٹیلسن بینک کے دروازے سے کوئی گھوڑے کا رکھوالا گھوڑا چرا کرلے جاتا تو اس کو ختم کر دیا جاتا تھا۔ کھوٹے سکے ڈھالنے والا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ غرض جرم کے سارنگ کے تین چوتھائی سر خاموشی کی فضا میں ڈبو دیئے جاتے تھے۔ اس سے جرم میں کچھ کمی آنے کے بجائے معاملہ الٹا ہی ہوتا تھا لیکن اس طریقہ سے سارا جھگڑا آسانی سے ختم ہو جاتا تھا۔ اور فضول کارروائیوں میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ ٹیلسن بینک نے اپنے زمانہ میں اور دوسرے بینکوں کی طرح اتنی جانیں لی تھیں کہ بجائے مرحوموں کے سر چپکے سے غائب کرنے کے اگر انھیں ایک چبوترے کی صورت میں چن دیا جاتا تو جتنی تھوڑی بہت بینک کی نچلی منزل میں روشنی آتی تھی وہ بھی نہ آنے پاتی۔

ٹیلسن بینک کے صندوقچوں اور الماریوں میں گھٹتے ہوئے نہایت بوڑھے انسان بڑی سنجیدگی سے کام میں مشغول رہتے تھے۔ اگر کبھی ٹیلسن بینک کی لندن والی شاخ میں کوئی نوجوان شخص نوکر رکھا جاتا تو اسے کہیں حفاظت سے چھپا دیا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو جاتا۔ وہ اسے ایک اندھیری جگہ بند رکھتے جیسے پنیر کو رکھا جاتا ہے اور اس وقت تک اسے باہر نہ نکالتے جب تک کہ اس میں بینک کا ذائقہ نہ رچ جاتا اور اس پر نیلی نیلی پھپوندی نہ لگ جاتی۔ تب ہی وہ نمائش کے قابل سمجھا جاتا اور عموماً بڑی بڑی کتابوں پر جھکا نظر آتا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے نیچے کو جھولتے ہوئے پتلون اور گلس سے

ٹیلسن بینک کے بھاری بھر کم ہونے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ٹیلسنس کے باہر ایک
اوپر کے کام کے لئے آدمی نوکر تھا جو چوکیداری اور چپراسی گیری پر مامور تھا اور بغیر ضرورت بن
بلائے اندر نہیں آسکتا تھا۔ وہ دفتر کے وقت میں حاضر رہتا تھا۔ اور جب وہ کسی کام سے
باہر بھیجا جاتا تو اپنی جگہ اپنے بیٹے کو بٹھا جاتا۔ یہ جنگلی سا لڑکا کوئی بارہ برس کا تھا اور بالکل
اپنے باپ کا چربہ معلوم ہوتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ ٹیلسن بینک والے بڑے شاندار انداز
میں اس اوپر کے کام کرنے والے کو جھیلتے تھے۔ بینک ہمیشہ اسی قسم کے لوگوں کی سرپرستی
کیا کرتا تھا اور وقت اور تقدیر نے اس شخص کو وہاں پہونچا دیا تھا۔ اس کا خاندانی نام
کرنچر تھا۔ اور بچپن میں بتسمہ کی مدد سے ہاونڈس ڈچ کے مشرقی گاؤں کے گرجے میں اس
نے گناہ کا پیشہ چھوڑ کر جیری نام کا ایک پنچھلا لگا لیا تھا۔

وائٹ فرائرز کی ہینگنگ سورڈ والی گلی میں اس مسٹر کرنچر کا نجی گھر ہے۔ مارچ کی
سرد صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ یہ ۱۷۸۰ء "انو ڈومین" کی ایک سرد مارچ کی صبح ہے اور
ساڑھے سات بجے ہیں " انو ڈومین " کو مسٹر کرنچر ہمیشہ اینا ڈومینوز کہا کرتے تھے اور ان کا
خیال تھا عیسوی سنہ اس سال سے شروع ہوتا تھا۔ جب اس نام کی ایک عورت نے
یہ ہر دلعزیز اور دلچسپ کھیل ایجاد کیا تھا اور اسے اپنا نام بخش دیا تھا۔

مسٹر کرنچر کا دولت خانہ کچھ زیادہ پرلطف محلے میں نہیں تھا۔ اگر ایک ڈبے میں
ایک کانچ جڑ دیں اور اسے ایک کمرہ سمجھیں تو ان کے پاس دو کمرے تھے لیکن وہ بڑے
سلیقے سے رکھے جاتے تھے۔ مارچ کی صبح تھی اور خوب ہوا چل رہی تھی۔ جس کمرے میں

مسٹر کرنچر سو رہے تھے وہ خوب رگڑ رگڑ کر دھویا گیا تھا اور ساکھو کی میز پر ایک صاف اور سفید کپڑا بچھا کر ناشتے کے لئے پیالیاں اور رکابیاں سجائی گئی تھیں۔ مسٹر کرنچر ایک مسخرے کی طرح ایک ٹکڑے جوڑ کر بنائی ہوئی رضائی اوڑھے آرام فرما رہے تھے۔ پہلے تو وہ بڑے سکون سے سوتے رہے۔ پھر بے چینی سے ادھر ادھر کروٹیں بدلنے لگے۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے سخت سیاہ بال سر پر خاردار میخوں کی طرح کھڑے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا ان کیلوں میں پھنس کر چادر تار تار ہو جائے گی۔ انھوں نے اکتائی ہوئی آواز میں چڑ کر کہا۔

"لعنت ہو۔ وہ پھر جٹ گئی!"

ایک صاف ستھری محنتی قسم کی عورت جو کونے میں دوزانو جھکی ہوئی تھی جلدی سے بڑبڑا کر اٹھی تو صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ اس کے ہی متعلق ذکر ہو رہا ہے۔

"کیوں جی تم پھر جٹی ہوئی ہو" مسٹر کرنچر نے پلنگ کے نیچے جوتا ڈھونڈھتے ہوئے کہا۔ یہ دو جملے صبح بخیر کے طور پر کہنے کے بعد تیسرے جملے کی جگہ اپنا جوتا عورت کے کھینچ مارا۔ جوتا کیچڑ سے لت پت تھا۔ گھر کی اقتصادی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ جب مسٹر کرنچر بینک کے کام سے واپس آتے تھے تو ان کے جوتے بالکل صاف ہوتے تھے۔ مگر جب وہ صبح اٹھتے تھے تو ان کے جوتے کیچڑ میں سنے ہوتے تھے

نشانہ خطا ہو جانے کے بعد پینترا بدل کر مسٹر کرنچر نے کہا "فساد کی جڑ ـــ کیا ارادے ہیں تیرے"

"میں تو صرف عبادت کر رہی تھی"

عبادت کر رہی تھی۔ خوب! کیا لاجواب عورت ہے۔ سجدے مار مار کر دعائیں مانگ رہی ہے۔"

"میں تمہارے خلاف دعائیں نہیں مانگ رہی تھی۔ میں تو تمہارے حق میں دعا کر رہی تھی۔"

"تم قطعی میرے لئے دعائیں نہیں مانگ رہی تھیں۔ فرض کرو مانگ بھی رہی تھیں تب بھی میں اس چکر کے میں آنے والا نہیں۔" پھر انھوں نے بیٹے سے مخاطب ہوکر کہا۔ آؤ میری کیسی اچھی عورت ہے۔ تیری ماں تمہارے باپ کی خوش حالی کے خلاف دعائیں مانگ رہی ہے۔ واہ — کیا فرمانبردار عورت ہے تمہاری ماں! یہ دیکھو جاکر ٹکریں مار رہی ہے۔ اور دعا کر رہی ہے کہ خدا اس کے بیٹے کے حلق سے رزق چھین لے" ماسٹر کریم جو صرف قمیص پہنے تھا۔ اس بات پر سخت برافروختہ ہوا۔ اور مڑ کر اپنی ماں کو ڈانٹنے لگا کہ اس کے تختے پر سے ہٹ کر عبادت کرے۔

مسٹر کریم نے خود اپنی بات کی کاٹ کی اور کہا۔

"اے مغرور عورت تو کیا سمجھتی ہے اندازاً بتا کہ تیری دعاؤں کی کیا قیمت ہوگی۔"

"وہ دل سے نکلتی ہیں جیتی۔ اور یہی ان کی قیمت ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

"اگر یہی ان کی قیمت ہے تو وہ بیکار ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں اپنے خلاف دعائیں مانگنے والوں کا ٹکہ دیتا ہوں میری اتنی مقدرت نہیں۔ تمہارے ستھرے پن کی عادت کی وجہ سے میں نحوست برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اگر تمہیں ٹکریں ہی مارنی ہیں تو اپنے شوہر

اور بیٹے کی خوش حالی کے لئے سجدے کرو، نہ کہ ان کی پامالی کے لئے۔ اگر میری قسمت میں کوئی بھلی بیوی ہوتی یا اس لڑکے کی کوئی بھلی ماں ہوتی اور گزشتہ ہفتہ بجائے بد دعاؤں کی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنے کے سرخروئی حاصل ہوتی تو یوں بوکھلا کر میرا دماغ نہ خراب ہوجاتا اور میں اچھا بھلا مذہبی آدمی ہوتا۔ لعنت ہو! " مسٹر کرنچر نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

" اگر میں بھلا آدمی نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ پاک بازی اور تمام علم کے باوجود بھی میری جان پر وہ مصیبت ٹوٹی۔ جو کسی ایماندار محنتی انسان پر ٹوٹتی اور اسے دھوکا دیا جاتا تو حواس باختہ ہوجاتا۔ بیٹا جیری۔ کپڑے پہن لو۔ مگر اتنے میں اپنے جوتے صاف کرتا ہوں۔ تم ذرا اپنی ماں پر نظر رکھنا۔ اور ذرا بھی سجدے میں گرنے کا شبہ ہو تو مجھے بتانا۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

" کہے دیتا ہوں میں پھر سے اس مصیبت میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ پرانی چھکڑا گاڑی کی طرح میری چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ افیون کے ڈلے کی طرح اونگھ رہا ہوں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور اگر میرا جوڑ جوڑ نہ دکھ رہا ہوتا تو میرے لئے یہ پہچاننا بھی مشکل ہوجاتا کہ میں ہی ہوں یا کوئی اور شخص ہے۔ اس کے باوجود میری جیب ویسی ہی خالی ہے اور مجھے شبہ ہے کہ تم نے صبح شام دعائیں مانگ کر مجھے کنگال کر دیا ہے۔ اور اب میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا فساد کی جڑ اب تو کیا کہتی ہے؟ " اس کے ساتھ ساتھ مختلف جملے کہے جا رہا تھا۔ اے!... ہاں... بڑی اللہ والی ہو نا! تم تو اپنے میاں اور بیٹے کے خلاف محاذ نہیں بناؤ گی، ہاں تم کیوں بناؤ گی! ایسے ہی سمجھتے ہوئے

ملنے برابر دیئے جارہا تھا۔ جیسے ایک گھومتی ہوئی چکی میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے جوتے صاف کرکے کام پر جانے کی تیاریاں کرتا جارہا تھا۔ اس عرصے میں اس کا بیٹا جس کے سر پر ننھا چھوٹی چھوٹی میخوں جیسے بال کھڑے ہوئے تھے اس کی کمسن آنکھیں باپ کی طرح قریب قریب تھیں۔ اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کررہا تھا اور اپنی ماں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ وہ اپنے سونے کی کوٹھری میں سے جہاں وہ منہ ہاتھ دھورہا تھا بار بار نکل کر دبی ہوئی آواز سے ماں کو ڈراتا "اے اماں . . . تم پھر سجدہ کرنے کو تھیں۔ اے ابا . . . " یوں جھوٹ موٹ جیسے اسے پکڑنے کے لئے وہ دھمکارہا تھا۔ اور جب وہ قریب پریشان ہوجاتی تو نہایت کمینہ پن سے مسکراتا ہوا واپس چلا جاتا۔

جب ناشتے پر بیٹھے تو مسٹر زکہ کا مزاج ویسا ہی برہم تھا اور جب ناشتے سے پہلے مسز کریفر نے دعا پڑھی تو خاص طور پر احتجاج کیا۔

"او فسادکی جڑ اب یہ کیا کر رہی ہے، پھر جٹ گئی"

"اس کی بیوی نے بتایا کہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی"

"مت کرو ــــ" مسٹر کریفر نے چاروں طرف دیکھا جیسے انھیں ڈر ہو کہ انکی بیوی کی عرضی کے جواب میں کہیں میز سے روٹی ہی نہ غائب ہوجائے" میں نہیں چاہتا کہ مارے برکت کے مجھے اپنے گھربار سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں یہ قطعی برداشت نہیں کرسکتا کہ برکت میری میز پر سے برتن بھانڈے اڑائے جائے۔ بس خاموش رہو"

جیری کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے اس نے کسی دعوت میں رات بھر رنگ رلیاں

منائی ہوں۔ وہ ناشتہ کھانے کے بجائے اس سے بلی کی طرح کھیل رہا تھا اور کٹہرے میں بند چوپائے کی طرح غرّا رہا تھا۔ نو بجے اس نے اپنے بکھرے ہوئے حواس کو سمیٹا اور حتی المقدور بظاہر نہایت سنجیدہ اور کاروباری بن کر اپنی دن کی نوکری پر روانہ ہوگیا۔

وہ اپنے آپ کو "ایماندار بیوپاری" کہتا تھا حالانکہ اس کی نوکری قطعی بیوپار کہلانے کے قابل نہ تھی۔ اس کا سارا سازوسامان صرف ایک لکڑی کا اسٹول تھا۔ جو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ روزانہ صبح چھوٹا جیری وہ اسٹول لے کر اپنے باپ کے ساتھ جاتا اور بینک کی اس کھڑکی کے نیچے رکھ دیتا۔ جو ٹمپل بار سے سب سے قریب تھی۔ جہاں پہلی گذرنے والی گاڑی میں سے تھوڑا سا بھوسہ مانگ تانگ کر اوپر کا کام کرنے والا آدمی اپنے پاؤں کو گرم رکھنے کی خاطر سارے دن کے لئے وہاں اپنا اڈا جما لیتا۔ اپنی اس نشست پر بیٹھا ہوا کرنچر فلیٹ اسٹریٹ اور ٹمپل میں اتنا ہی مشہور تھا جتنی خود بار مشہور تھی اور اتنا ہی بدہیت!۔

پونے نو بجے کرنچر اپنی نشست پر بیٹھ گیا تاکہ پرانے لوگ جب بینک میں داخل ہوں تو وہ اپنی بگڑی ہوئی ٹوپی کو سلام کے قصد سے ہاتھ لگا سکے۔ اس کا لڑکا اگر اس وقت گلی میں آنے جانے والے کمسن لڑکوں سے کشتیاں لڑ کر انہیں روحانی اور جسمانی اذیتیں پہونچانے سے فرصت ملتی تو اس کے بازو میں کھڑا ہو جاتا۔

باپ بیٹے ایک دوسرے سے بے حد مشابہ تھے۔ وہ ایسے سر جوڑے رہتے جیسے ان کی آنکھیں پاس پاس جڑی تھیں۔ فلیٹ اسٹریٹ میں صبح صبح گزرنے والی گاڑیاں اور

لوگوں کو خاموش بیٹھے دیکھتے ہوئے وہ بالکل بندروں کے ایک جوڑے سے مشابہ لگتے۔ بڑا جیری بیٹھا گھاس کے تنکے چبا کر تھوکا کرتا۔ چھوٹا اپنی بے قرار آنکھوں سے بار بار اسے اسی طرح تکتا جیسے وہ فلیٹ اسٹریٹ کی دوسری چیزوں پر نظر رکھتا تھا۔ یوں مختلف کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود ان کی شباہت میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔

ٹیلسن بینک کی عمارت کے ایک مقررہ پیغام رساں نے دروازے سے کھوپڑی نکالی اور کہا۔

"قلی چاہئے۔"

"آہا — ابا — صبح ہی صبح کام کی بو بہی ہوگی۔"

اپنے باپ کو خدا حافظ کہہ کے چھوٹا جیری اسٹول پر بیٹھ گیا اور وراثت میں پائے ہوئے شغل کو یعنی گھاس کے تنکے کو اٹھا کر چبانے لگا۔ جو اس کا باپ چبا رہا تھا اور اسے بخش گیا تھا۔

"ہمیشہ زنگ آلود رہتی ہیں۔ اس کی انگلیاں ہمیشہ زنگ آلود رہتی ہیں۔" چھوٹا جیری بڑبڑایا۔ "یہاں تو لوہے کا زنگ کہیں بھی نہیں تو پھر میرے باپ کی انگلیوں پر لوہے کا زنگ کہاں سے لگ جاتا ہے۔"

دوسرا باب

نظارہ

"پرانی کوتوالی تو جانتے ہی ہوگے" پیغام رساں جیری سے بینک کے سب سے پرانے کلرکوں میں سے ایک نے کہا۔

"جی ہاں سرکار — پرانی کوتوالی جانتا ہوں" جیری نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ٹھیک! اور تم مسٹر لاری کو بھی جانتے ہو؟"

"سرکار کوتوالی سے زیادہ اچھی طرح مسٹر لاری کو جانتا ہوں" جیری نے ایسے کہا جیسے کبھی انہیں بھی کوتوالی زبردستی جانا پڑا تھا" ایک ایماندار بیوپاری کی حیثیت سے میں پرانی کوتوالی سے زیادہ واقفیت رکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ دروازہ جہاں سے گواہ داخل ہوتے ہیں تلاش کرکے دربان کو یہ پرچہ دو کہ مسٹر لاری کو پہونچا دے۔ تب وہ تمہیں اندر جانے کی اجازت دیدے گا۔"

"کچہری میں سرکار؟"

"ہاں کچہری میں۔"

مسٹر کرنچر کی آنکھیں ایک دوسرے کے قریب سمٹ آئیں۔ جیسے وہ ایک دوسرے

سے پوچھ رہی ہوں " کیا خیال ہے اس بارے میں"

" کچہری میں ٹھہار ہوں سرکار " یہ آنکھوں کی آپس کی بات چیت سے متاثر ہوکر جیری نے پوچھا۔

" بتاتا ہوں سب کچھ۔ دربان یہ پرچہ مسٹر لاری کو پہونچادے گا پھر تم ہاتھ وا تھ ہلاتا تاکہ مسٹر لاری کی نظر تم پر پڑ جائے۔ پھر ان پر یہ ظاہر کر دینا کہ تم کدھر کھڑے ہو۔ پھر تم اس وقت تک وہاں ٹھیرے رہو۔ جب تک کہ مسٹر لاری کا حکم نہ ہو"

" بس اتنا ہی سرکار "

" بس اتنا ہی ___ انھیں ایک پیغام رساں چاہئے۔ انھیں پتہ چل جائے گا کہ تم وہاں موجود رہو۔

دقیانوسی کلرک نے جان بوجھ کر کاغذ کو تہہ کر کے اس پر پتہ اور نام لکھا۔ مسٹر کرنچر اسے خاموشی سے تکتے رہے۔ جب وہ جاذب سے تحریر کو خشک کرنے لگا تو بولے۔

" میرا اندازہ ہے شاید آج جھوٹی دستاویزوں کے مقدمے پیش ہوں گے "

" غداری کا مقدمہ ہے "

" اس کا مطلب ہے مجرم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے ___ کس قدر بہیمانہ فعل ہے ! " جیری نے کہا۔

" یہ قانون ہے " دقیانوسی کلرک نے تعجب سے اپنی عینک اس کی طرف موڑ کر کہا " یہ قانون ہے "

"ایک آدمی کا حلیہ بگاڑنا بڑا سخت قانون ہے۔ مارنا ہی کافی ظلم ہے۔ مگر اس کا حلیہ بگاڑ دینا میرے خیال میں بہت زیادہ سختی ہے جناب!"

"قطعی نہیں" دقیانوسی کلرک نے جواب دیا "قانون کی برائی مت کرو۔ اپنے سینے اور پھٹی ہوئی آواز کی خبر لو۔ اچھے دوست۔ اور قانون کو اپنی خبر آپ لینے دو۔ یہ میری نصیحت ہے دوست!"

"سرکار یہ سب نم ہوا کی بدولت ہوا ہے جو میری آواز اور چھاتی پر جم گئی ہے" جیری نے کہا "اب اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ——— میرا روزی کمانے کا طریقہ کتنا تر ہے!"

"ہاں بھئی ——— ہم سب ہی مختلف طریقوں سے روزی کماتے ہیں۔ کچھ ہم میں "تر" طریقوں سے روزی کماتے ہیں کچھ "خشک" طریقوں سے۔ لو یہ خط۔ اور جاؤ ———" جیری نے خط لے لیا اور ظاہر لاپروائی مگر اندر سے محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا:

"تم بھی تو ایک نچنت بڑے ہو" پھر جھک کر تعظیم دی۔ جاتے جاتے اپنے بیٹے کو اپنے کام کے متعلق بتایا اور چل دیا۔

ان دنوں پھانسیاں ٹائبورن پر دی جاتی تھیں۔ اس لئے نیوگیٹ کے باہر والی سڑک اتنی زیادہ حد تک بدنام نہیں ہوئی تھی جیسی کہ بعد میں ہو گئی۔ مگر جیل نہایت گندا کی جگہ تھی۔ زیادہ تر بدمعاشی اور مکاری وہیں ہوتی تھی۔ جہاں خوفناک بیماریاں پلتی تھیں

جو قیدیوں کے ساتھ ساتھ کچہری میں بھی آ جاتی تھیں اور کبھی کبھی لارڈ چیف جسٹس پر سیدھا حملہ کر کے انھیں پھانسی پانے والے مجرم سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتیں۔ بار ہا ایسا ہوا کہ سیاہ ٹوپی پہن کر موت کا حکم سنانے والے جج کو مجرم سے پہلے اپنی موت کا پیغام پہونچ گیا۔ پرانی کوتوالی کو لوگ موت کی سرائے کا احاطہ کہتے تھے۔ جہاں سے روز روز مسافر گاڑیوں اور بگھیوں میں سوار ڈھائی میل کا راستہ طے کر کے تیزی سے ملک عدم کو روانہ ہوتے جاتے رواج عام تو کتنا مضبوط ہو جاتا ہے۔ کہ کسی شریف آدمی کو اس پر شرم کیوں نہیں آتی۔ یہ جگہ مرنے کے کنبہ کے لئے بھی مشہور تھی۔ یہ ادارہ بزرگوں کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور بڑے بھیانک اور ناقابل قیاس مظالم توڑنے کے کام آتا تھا۔ ایک اور عزیز ترین قدیم رواج یعنی کوڑے مارنے کے شکنجے کی وجہ سے بھی اسے شہرت حاصل تھی۔ جو مشاہدہ کرنے والے کو بڑا نرم دل اور انسان دوست بنا دیتا تھا۔! خون بہانے کے لئے بھی یہ جگہ موزوں تھی کیونکہ یہ بھی بزرگوں کی عقل مندی اور سوجھ بوجھ کا عطیہ تھا۔ اور اس کی آڑ میں عقلی لوگ نہایت بھیانک جرائم کھلے بندوں کر سکتے تھے۔ الحاصل ان دنوں پرانی کوتوالی کو "جو کچھ ہے۔ صحیح ہے" کے اصولوں کے مطابق بالکل جائز جگہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس عقیدے کو ماننے میں مشکل یہ ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بھی تو الجھا ہوا نتیجہ نکلتا ہے کہ ہ جو کچھ بھی کبھی تھا ——— وہ غلط نہیں تھا۔

پیغام رساں اس مشاق شناور کی طرح جسے پچھلے راستہ کا ان جانے کی عادت ہو۔ اس غلیظ مجمع میں سے گذر گیا جو وہاں خوفناک نظارے کے انتظار میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ ۵

دروازہ جس کی اسے تلاش تھی مل گیا اور ایک چھوٹی سی کھڑکی میں سے اس نے اپنا خط پکڑا دیا
لوگ پرانی کوتوالی میں پیسے خرچ کر کے یہ بھیانک تماشہ دیکھنے آتے تھے جیسے وہ بیڈلم کے
پاگل خانے میں ٹکٹ خرید کر ناٹک دیکھنے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اول الذکر تماشہ
زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔ اس لئے پرانی کوتوالی کے دروازوں پر کڑا پہرا رہتا تھا سوائے
ان سماجی حالات کے پیدا کردہ دروازوں کے جن سے مجرم داخل ہوتے تھے۔ یہ ہمیشہ چوپٹ
کھلے رہتے تھے۔

تھوڑی ہجر مچر کے بعد بڑے تکلف سے ذرا سا دروازہ کھلا اور مسٹر جیری کر نچر
اس میں سے سرک کر کچہری میں پہونچ گئے۔ انھوں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آدمی
سے پوچھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں ہو رہا ہے۔"

"کیا ہونے والا ہے؟"

"غداری کا مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔"

"ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے؟"

"ہاں۔ پہلے سے چو کھٹے پر گھسیٹ کر ادھوری پھانسی دی جائے گی۔ پھر اس کی
آنکھوں کے سامنے اس کے ٹکڑے اتارے جائیں گے۔ پھر پیٹ چیر کر اس کی انتڑیاں نکال
کر اس کے سامنے جلائی جائیں گی۔ تاکہ وہ دیکھ سکے۔ پھر اس کا سر اڑا دیا جائے گا اور جسم

کے چار ٹکڑے کئے جائیں گے ۔ یہی سزا ہے غداری کی" اس شخص نے چٹخارا لیکر کہا ۔

" تمہارا مطلب ہے اگر اس کا جرم ثابت ہو گیا تب ؟" جیری نے کہا ۔

" ارے جرم تو وہ ثابت کر ہی دیں گے ۔ اس کی تم فکر نہ کرو"

مسٹر کرنچر دربان کی طرف متوجہ ہوگئے جو خط ہاتھ میں لئے مسٹر لاری کی طرف جا رہا تھا ۔ مسٹر لاری وگ پہنے ہوئے چند لوگوں کے درمیان بیٹھے تھے ۔ ایک صاحب جو وگ پہنے تھے اور ملزم کے وکیل تھے ان کے پاس ہی بیٹھے تھے ان کے سامنے بہت سے کاغذات کا پلندہ رکھا تھا ۔ ان کے پاس ایک اور آدمی وگ پہنے بیٹھا تھا جو مسلسل کچہری کی چھت کی طرف گھورے جا رہا تھا ۔ جیری کھنکارا کھانسا اپنی ٹھوڑی کھجی اور ہاتھ ہلائے یہاں تک کہ مسٹر لاری نے اس کی طرف دیکھ لیا ۔ وہ اسے تلاش کرنے کھڑے ہونے ہی والے تھے کہ دیکھ کر آہستہ سے سر ہلایا اور پھر بیٹھ گئے ۔

" اس مقدمے سے ان کا کیا تعلق ہے" پاس کھڑے ہوئے آدمی نے پھر جیری سے دریافت کیا ۔

" قسم لے لو جو مجھے کچھ بھی معلوم ہو" جیری نے کہا ۔

" کیا پوچھ سکتا ہوں پھر تمہارا اس سے کیا تعلق ہے"

" قسم ہے مجھے یہ بھی نہیں معلوم" جیری نے کہا ۔

جج داخل ہوا لوگ کھڑے ہو کر پھر بیٹھ گئے ۔ اس لئے مسٹر جیری کی بات وہیں ختم ہوگئی ۔ لوگوں کی توجہ کٹہرے کی طرف مبذول ہوگئی ۔ جیلر جو وہاں کھڑے تھے باہر گئے

اور انھوں نے ملزم کو لاکر کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

ہر شخص نے جو وہاں موجود تھا اسے گھورنا شروع کیا سوائے اس شخص کے جو چھت کی طرف نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ لوگوں کی سانسیں اس کی طرف بل کھاتی ہوئی ایک سمندر یا اندھی آگ کی طرح بڑھیں۔ پرشوق چہرے کھمبوں اور کونوں کی آڑ سے نکل نکل کر اسے ایک نظر دیکھنے کو بے قرار تھے۔ وہ جو پچھلی صف میں تھے اسے سر سے پیر تک دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ جو کچہری کے فرش پر تھے وہ اپنے قریب والے کے کندھوں کا سہارا لے کر اسے کسی شرط پر بھی ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو کر پنجوں کے بل کھڑے ہوگئے۔ کچھ منڈیروں پر چڑھ گئے یا ہوا میں معلق ہو گئے۔ کہ کسی طرح اس کا رواں رواں دیکھ لیں۔ آخرالذکر لوگوں میں جیری سب سے زیادہ نمایاں تھے اور ایک بے چین مجنوں وار نیوگیٹ کی دیوار کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ آتے وقت بھوک کھلنے کے لئے جو بیر پی تھی اب وہ اس کا بھبکا ملزم کی طرف چھوڑ رہے تھے۔ انکی سانس اور دوسرے لوگوں کی بیر۔ جن۔ چائے۔ کافی اور نہ جانے کیا الابلا میں بسی ہوئی سانس ملزم کی پشت پر لگے ہوئے شیشوں کو دھندلا بنا رہی تھی اور باہر ٹھنڈ ہونے کی وجہ سے یہ سب سانس بھاپ سے پانی بن بن کر شیشوں پر بہنا شروع ہو گئی تھیں جس شخص کو یہ لوگ اس بری طرح گھور رہے تھے وہ ایک پچیس برس کا خوبرو جوان تھا۔ دھوپ سے تمتمائے ہوئے گال اور سیاہ آنکھیں صورت سے مرتبہ کا انسان معلوم ہوتا تھا وہ سادہ سیاہ یا شاید گہرا سرمئی لباس پہنے تھا۔ اس کے لمبے اور سیاہ بال ایک فیتے سے گردن پر

بندھے ہوئے تھے۔ سجاوٹ سے زیادہ بکھرنے کے خیال سے انہیں سمیٹ کر باندھ دیا گیا تھا
جیسے دماغی پریشانی ہزار لبادوں میں چھپائے نہیں چھپتی۔ اسی طرح موقعہ کی نزاکت کی وجہ
سے جو اس کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی وہ دھوپ سے تمتاتے گالوں کے نیچے سے جھلک
رہی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ روح سورج سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ ویسے
وہ اپنے آپ پر مکمل قابو پائے ہوئے تھا۔ وہ جج کے سامنے ادب سے جھکا اور خاموش
کھڑا ہو گیا۔

جس دلچسپی سے لوگ اس کو گھور گھور کر سانسوں کے جھٹکے چھوڑ رہے تھے وہ قطعی انسانیت
کے لئے باعثِ فخر نہ تھی۔ اگر اس کے حق میں اتنا خوفناک فیصلہ نہ ہونے والا ہوتا یا کوئی
موہوم سی امید ہوتی کہ اس ہیبتناک سزا کی تفصیلوں میں کوئی کمی ہو سکے گی۔ تو صرف
اتنی سی معافی پر لوگوں کی ساری دلچسپی ختم ہو جاتی۔ وہ جسم جو شرمناک طریقہ پر کچلا
جانے والا تھا حسین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فانی انسان جس کے ٹکڑے اڑنے والے تھے دلچسپی
کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے طریقوں سے فنکارانہ طور پر اپنی دلچسپی کو چھپانا چاہ رہے
تھے مگر یہ صاف ظاہر تھا یہ شوق بیہمانہ تھا۔

کچہری میں خاموشی چھا گئی۔ چارلس ڈارنے نے ایک دن پہلے ان تمام الزامات کی
صحت سے انکار کیا تھا جو مخالف وکیل نے اسے مجرم ثابت کرنے کے لئے بڑے زور شور سے
عائد کئے تھے۔ یعنی یہ کہ ڈارنے جھوٹا اور غدار ہے اس نے ہمارے محترم و مکرم عالی جناب
عالی مرتبت وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے آقائے نامدار شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی ہے اور

مختلف موقعوں پر فرانس کے بادشاہ لوئی کی ان لڑائیوں میں جاسوسی کر کے مخبری کی ہے جو ہمارے عالی مرتبت عالی جاہ شہنشاہ کے خلاف لڑی گئی تھیں اور مکاری اور دغا بازی سے غداری کر کے ہماری ان فوجوں کی تعداد کے بارے میں خبر پہونچائی ہے جن کو ہمارے عالی مرتبت عالی جاہ ملبند اقبال وغیرہ وغیرہ نے کنیڈا اور شمالی امریکہ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان قانونی اصطلاحوں سے مسٹر جیری کے سر پر بھی الجھن اُبھر رہی تھیں اور وہ صرف اتنا سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ اوّل الذکر چارلس ڈارنے اپنے مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں ان کے سامنے کھڑا ہے۔ جیوری سے حلف اٹھوایا جا رہا تھا۔ اور اٹارنی جنرل بولنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ملزم کو معلوم تھا کہ وہ تمام لوگ جو وہاں موجود تھے تخیل میں اسے پھانسی دے رہے تھے۔ اس کا سر تن سے جدا کر رہے تھے اسے چار ٹکڑوں میں کاٹ رہے تھے۔ اس کے باوجود نہ وہ ڈرا اور جھجکا، نہ تھیٹر والوں کے انداز میں ایستادہ ہوا۔ وہ خاموش بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ ابتدائی کارروائی اس نے بڑی سنجیدگی اور غور سے سنی اور کٹہرے پر اس قدر ساکت ہاتھ جمائے کھڑا تھا کہ وہ جڑی بوٹیاں جو تختے پر پڑی تھیں اپنی جگہ سے ہلیں بھی نہیں۔ جیل کی ہوا اور بخار کے جراثیم سے بچا دے کے لئے ساری کچہری میں جڑی بوٹیاں اور سرکا چھڑک دیا گیا تھا۔

ملزم کے اوپر روشنی ڈالنے کے لئے اس کے سر پر ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ ہزاروں گنہگار اور معصوم اپنا عکس اس آئینہ پر ڈال کر اس آئینہ کی سطح کے ساتھ ساتھ صفحۂ زمین سے بھی مٹ چکے تھے۔ جیسے سمندر اپنے مردوں کو نکال پھینکتا ہے اگر یہ آئینہ بھی اپنے تمام

مردوں کو یک وقت نکال پھینکے تو کتنا خوفناک نظارہ ہو اور ان کے بھوت اس جگہ کو آسیب خانہ بنا دیں۔ شاید قیدی کے دل میں کوئی موہوم سا خیال اس ذلت اور بدنامی کا آیا جو اس سے وابستہ تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی کی ایک لکیر پڑی اس نے اوپر دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سیدھے ہاتھ سے اس نے کٹہرے پر پڑی ہوئی جڑی بوٹیوں کو بکھیر دیا۔

اس حرکت سے اس کا چہرہ کھڑکی کی اس سمت کو مڑ گیا جو اس کے دائیں بازو پر تھی۔ اس کی نظریں فوراً اپنے مقابل جج کی کرسی والے کونے میں بیٹھی ہوئی دو صورتوں پر جم گئیں۔ یہ حرکت کچھ اتنی عیزارادی اور اچانک سرزد ہوئی کہ تماشائین بھی اس طرف دیکھنے لگے۔

ان دو شخصیتوں میں سے لوگوں نے دیکھا ایک تو بیس سال سے کچھ اوپر ایک جوان لڑکی تھی اور دوسرا ایک شریف مرد جو یقیناً اس کا باپ تھا۔ سفید بالوں کی وجہ سے وہ بہت پروقار اور ممتاز ہستی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر ظاہری بزرگی کے بجائے غور و فکر کے آثار تھے۔ جب وہ یوں مراقبہ میں چلا جاتا تو بہت بوڑھا لگتا۔ جیسا کہ وہ اس وقت لگ رہا تھا۔ ایک لمحہ میں اپنی بیٹی سے بات کرتے وقت وہ بہت حسین شخص معلوم ہو رہا تھا جس نے ابھی زندگی کی بہاروں کو خیرباد نہیں کیا تھا۔

اس کی بیٹی اس کے بازو میں ہاتھ ڈالے اس کے پاس بیٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس کی پیشانی پر خوف اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات

منعکس تھے کیونکہ ملزم کی جان خطرے میں تھی۔ ان جذبات کا اظہار اس کے چہرے پر اس قدر شدید اور قدرتی انداز میں ہو رہا تھا کہ تماش بین جن کے دل میں ملزم کے لئے کوئی جذبہ رحم نہ تھا پگھل گئے، اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ پوچھنے لگے۔

"یہ لوگ کون ہیں؟"

جیری جو بھی طور پر اپنے خیال کے مطابق قیاس آرائیاں کر رہا تھا اور بے خیالی میں اپنی انگلیوں کے پوروں پر سے زنگ چوس رہا تھا۔ گردن بڑھا کر ان کے متعلق مختلف باتیں غور سے سننے لگا۔ اس کے گرد دھکا پیل کرتے ہوئے مجمع نے یہ سوال ایک حوالدار کے سامنے پیش کر دیا اور جواب ایک سے دوسرے تک ہوتا ہوا جیری تک پہونچ گیا۔

"گواہ۔"

"کس طرف کے گواہ؟"

"مخالفت میں۔"

"کس کی مخالفت میں؟"

"ملزم کی۔"

جج جس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک گئی تھیں چونک کر اس شخص کو بغور دیکھنے لگا جس کی جان اس کی مٹھی میں تھی۔

اٹارنی جنرل ابھی بیٹھے [illegible]

تیسرا باب

ناامیدی

اٹارنی جنرل کا کام جیوری پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ان کے سامنے جو ملزم کھڑا ہے۔ گو عمر میں کم سہی۔ غداری کے فن میں منجھا ہوا تھا۔ اس لئے موت کا سزاوار تھا۔ یہ خط وکتابت جو اس کے اور عوام کے دشمنوں کے درمیان چل رہی تھی آج کی یا کل کی یا سال دو سال کے عرصہ ہی میں نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً ملزم بہت زیادہ عرصے سے فرانس اور انگلستان کے درمیان آتا جاتا رہتا تھا۔ اور اس کی کوئی معقول وجہ ملزم کے پاس نہیں۔ شکر ہے کہ غداری کی حرکتیں قدرتی طور پر خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ورنہ اس کی کارستانیوں کا پردہ کبھی نہ فاش ہونے پاتا۔

اٹارنی جنرل کے خیال میں خدا نے اس فرض کو ادا کرنے کے لئے ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا جو تمام برائیوں سے پاک اور بے باک ہے۔ اس نے اس کے راز کی کرید کی اور چاہا کہ بادشاہ کے وزیر ریاست اور باوقار مشیر خاص کے کانوں تک اس کی تفصیل پہونچائے۔ اس غرض سے اس خادم نے ان کے حضور میں باریابی کی درخواست کی۔ اس

قوم پرست کے ارادے فی الجملہ نیک تھے۔ وہ ملزم کا کبھی دوست تھا لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اسے ملزم کے برے ارادوں کا پتہ چل گیا۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس دوست کو جس کی اب اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ ملک و قوم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اگر برطانیہ میں بھی یونان اور روم کی طرح مجسمے نصب کرنے کا رواج ہوتا تو اس محترم شہری کا مجسمہ ضرور تیار کیا جاتا۔ مگر چونکہ یہ رواج نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا مجسمہ نصب نہیں ہو سکے گا جیوری کو مختلف شعرا کے کلام کا ایک ایک لفظ از بر ہوگا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ نیکی اثر آفریں ہے۔ مگر چونکہ جیوری نے وہ اشعار قطعی نہیں پڑھے تھے اس لئے ان کے چہروں سے دل کا چور ظاہر ہو رہا تھا۔ خاص طور پر سب سے درخشاں انسانی صفت یعنی قوم پرستی یا اپنے ملک کی محبت کا اس بے داغ کردار والے معزز سرکاری گواہ کی شاندار مثال نے ملزم کے نوکر کو جو کتنا ہی حقیر سہی مگر جس کا ذکر کرنا باعث عزت ہے۔ اس قدر متاثر کیا کہ اسے اپنے آقا کی جیبوں اور میز کی درازوں کی تلاشی لینے پر آمادہ کر دیا۔ نیز اٹارنی جنرل نے فرمایا کہ وہ خود اس قابل قدر نوکر کے خلاف رکیک اور کمینی افواہیں سننے کو تیار ہیں۔ اس کے باوجود وہ مجموعی طور پر اس کو اپنے بہن بھائیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اپنے ماں باپ سے زیادہ اس کی عزت کرتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ جیوری بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی۔ ان دونوں گواہوں کی شہادت اور ملزم سے حاصل کئے ہوئے کاغذات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جائے گی کہ ملزم نے بلاشبہ وقتاً فوقتاً شاہی فوجوں کی نقل و حرکت اور ان کی بحری و بری طاقت کی فہرست اور دیگر معلومات دشمن کو پہونچائی ہے

گو یہ ثابت نہ ہو سکا کہ یہ فہرستیں مجرم نے تحریر کی ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ یہ تو ملزم کے خلاف اور بھی پختہ ثبوت ہے کہ وہ نہایت چالباز اور محتاط ہے۔ ثبوت حاصل کرنے کے لئے پانچ برس پہلے کے واقعات پر غور کرنا ہوگا۔ برطانوی اور امریکی فوجوں کے درمیان لڑائی چھڑنے سے چند ہفتے پہلے سے ملزم اپنی کمینی کارروائی شروع کر چکا تھا۔ ان شہادتوں کی روشنی میں جیوری کے ارکان کو جنہیں اپنی وفاداری اور ذمہ داری کا پورا احساس ہے اسے ملزم قرار دینا چاہئے۔ اور طوعاً وکرھاً اس کا خاتمہ کرنا ہی پڑے گا اگر مجرم کا سر تن سے جدا نہ کیا گیا تو وہ ساری عمر تکیے پر سر رکھ کر نہ سو سکیں گے۔ ان کی بیویاں کبھی اپنے تکیوں پر سر رکھ کر نہ سو سکیں گی۔ ان کے بچے کبھی اپنے تکیوں پر سر رکھ کر نہ سو سکیں گے۔ غرض سب کے لئے تکیوں پر سر رکھ کر سونا ناممکن ہو جائے گا۔ خاتمے پر اٹارنی جنرل نے ہر گول مول دلیل کا واسطہ دے کر جیوری سے ملزم کا سر مانگا۔ جسے وہ بڑے وثوق سے ابھی سے مرا ہوا تصور کر چکے تھے۔ سرکاری وکیل خاموش ہوئے تو ملزم کے سر پر بڑی نیلی مکھیاں بھبھنانے لگیں۔ جیسے ابھی سے وہ جسم بیجان ہو گیا ہو۔ جب ذرا مکھیوں کا نغمہ رکا تو بے داغ کردار والا قوم پرست گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ پھر سالیسیٹر جنرل نے اٹارنی جنرل کے نقش قدم پر چل کر جان برساڈ نامی قوم پرست پر جرح کی۔ ان کی پاک صاف مقدس روح کی جو روداد اٹارنی جنرل نے سنائی تھی وہ بالکل حرف بحرف درست تھی۔ وہ تو فوراً اپنے مقدس سینے پر سے فرض کا بوجھ اتار کر بڑی انکساری سے رخصت کی اجازت مانگتے۔ مگر

مسٹر لاری کے قریب جو وگ پہنے ہوئے حضرت کاغذوں کا ڈھیر سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان سے چند سوال پوچھنے کی اجازت مانگی تھی۔ سامنے جو وگ پہنے ہوئے دوسرے صاحب بیٹھے تھے وہ ابھی تک کچہری کی چھت کو گھورے جا رہے تھے۔

"کیا گواہ نے خود کبھی جاسوسی کی خدمات انجام دی تھیں؟"

"نہیں اتنی کمینی حرکت سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔"

"ذریعہ معاش کیا ہے؟"

"اپنی جائداد ہے۔"

"کیا ٹھیک سے یاد ہے کہ یہ جائداد کہاں ہے؟"

"کسی کو اس معاملہ میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"کیا ورثہ میں ملی تھی؟"

"ہاں ملی تھی۔"

"کس سے؟"

"رشتہ دار سے۔"

"بہت دُور کے رشتہ دار سے؟"

"کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔"

"کبھی جیل بھگتنے کا اتفاق ہوا؟"

"قرض داروں کی جیل میں کبھی نہیں۔ مگر اس مقدمہ سے اس بات کا کوئی تعلق

نظر نہیں آتا۔"

"قرض داروں کے جیل خانہ میں کبھی نہیں گئے . . . بتاؤ ——— کبھی جانے کا موقع نہیں ملا۔"

"ہاں ہوا تھا۔"

"کتنی مرتبہ؟"

"دو یا تین دفعہ۔"

"چار یا پانچ دفعہ تو نہیں گئے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"پیشہ کیا ہے؟"

"شرافت۔"

"کبھی کسی نے لات جمائی ہے؟"

"شاید۔ جمائی تھی۔"

"اکثر؟"

"نہیں۔"

"کبھی کسی نے لات مار کر کوٹھے سے نیچے پھینکا؟"

"کبھی نہیں! ایک دفعہ البتہ زینے کے بالائی حصے پر لات ماری گئی تھی۔ مگر خود جان بوجھ کر نیچے لڑھک آئے۔"

"پانسوں میں بے ایمانی کرنے کی وجہ سے لات پڑی تھی"

"حملہ کرنے والے جھوٹے نے ایسی ہی کوئی غلط بیانی کی تھی۔ پٹے ہوئے تھا وہ جھوٹ بول رہا تھا"

"قسم کھا کر وہ جھوٹ بول رہا تھا"

"قطعی طور پر"

"جوئے میں بے ایمانی کر کے گذر اوقات رہی ہے؟"

"کبھی نہیں"

"جوئے سے گذر اوقات کی ہے؟"

"اتنی ہی جتنی سب شریف آدمی کرتے ہیں"

"کبھی قیدیوں سے قرضہ لیا؟"

"ہاں"

"ادا کیا؟"

"نہیں"

"کیا یہ مختصر سی بے تکلفی ــــ ذرا۔ قیدیوں کے ساتھ سرائوں گاڑیوں اور جہاز کے عرشے پر روا رکھی گئی تھی"

"نہیں"

"یقیناً ملزم کے پاس یہ فہرستیں دیکھی ہوں گی"

"نہیں۔"

"مثال کے طور پر خود تو حاصل نہیں کی تھیں؟"

"نہیں۔"

"گواہی کے لئے پیش کرنے کے لئے بنالی تھیں؟"

"نہیں۔"

"لوگوں کو پھانسنے کے لئے باقاعدہ سرکاری تنخواہ تو نہیں پاتے؟"

"نہیں۔ توبہ توبہ۔"

"یا ترکیبیں تو نہیں بناتے؟"

"نہیں۔ توبہ۔"

"قسم کھا سکتے ہو؟"

"ہزار بار۔"

"سوائے ملک کی خدمت کے اور کوئی مطلب تو نہیں؟"

"نہیں۔ کوئی مطلب نہیں۔"

نیک خادم رد جیر کلائی بھی مقدمے میں دھڑا دھڑ قسمیں کھاتا گیا۔ اس نے چار سال قبل نیک نیتی سے بھولے پن میں ملزم کی نوکری قبول کی تھی۔ کیلے کے عرشے پر اس نے ملزم سے پوچھا تھا، کیا اسے کوئی اچھا نوکر چاہیے۔ اور ملزم نے اسے نوکر رکھ لیا تھا۔ اس نے ملزم سے خدا کی راہ میں نوکری کا سہارا دینے کی التجا نہیں کی تھی۔ جلد ہی

اسے ملزم پر شبہ ہو گیا اور اس پر نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ اس نے کئی بار اس قسم کی فہرستیں کپڑے درست کرتے وقت ملزم کی جیبوں میں دیکھیں۔ اس نے ملزم کے ڈیسک کی درازمیں سے یہ فہرستیں نکالیں۔ اس نے اس جگہ پہلے سے نہیں رکھی تھیں۔ اس نے ملزم کو ایسی ہی فہرستیں کیلے میں فرانسیسی لوگوں کو دکھاتے ہوئے دیکھا اور ایسی ہی فہرستیں کیلئے اور بولون میں فرانسیسیوں کو بتاتے ہوئے دیکھا۔ اسے اپنے ملک سے محبت تھی۔ اس لئے وہ یہ برداشت نہ کر سکا اور مخبری کر دی۔ اس پر چائے کے ایک سیٹ کی چوری کا بھی شبہ نہیں کیا گیا! اسے ایک رائی دان کی چوری میں سہواً پھانس لیا گیا تھا۔ مگر وہ برتن ملزم کا نکل گیا۔ یہ صرف اتفاق تھا۔ کہ وہ آخری گواہ کو سات آٹھ برس سے جانتا تھا۔ یہ کوئی عجیب اتفاق نہیں کہلایا جا سکتا۔ سب ہی اتفاق عجیب ہوتے ہیں؛ ایک یہ اتفاق بھی عجیب کہلانے کے قابل نہیں کہ وہ وطن پرست ہے۔ وہ ایک سچا برطانوی باشندہ تھا۔ کاش اس جیسے لوگ اور بھی ہوتے۔

نیلی مکھیاں پھر بھنبھنانے لگیں۔ اٹارنی جنرل نے مسٹر جارویس لاری پر جرح شروع کی۔

"مسٹر جارویس لاری آپ ٹیلسن بینک میں کلرک ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کیا ۱۷۷۵ء کے نومبر میں جمعہ کی رات کو لندن سے ڈوور تک ڈاک گاڑی میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا گاڑی میں اور مسافر بھی تھے؟"

"دو اور تھے؟"

"کیا رات کو وہ سڑک پر اتر گئے تھے؟"

"جی ہاں؟"

"مسٹر لاری غور سے ملزم کو دیکھئے۔ کیا ان دونوں میں سے ایک یہ ہو سکتا تھا؟"

"میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ بھی ان میں سے ایک تھا۔"

"کیا یہ ملزم ان دونوں میں سے کسی ایک سے مشابہ ہے؟"

"دونوں لبادوں میں چھپے ہوئے تھے۔ رات بہت اندھیری تھی اور ہم آپس میں بے تکلف بھی نہ تھے۔ اس لئے میں اس کی بھی تصدیق نہیں کر سکتا؟"

"مسٹر لاری پھر ذرا ملزم کو دیکھئے۔ فرض کیجئے اسے بھی ان مسافروں کی طرح لبادے میں لپیٹ دیا جائے۔ کیا اس کے ڈیل ڈول میں کوئی بات ہے کہ یہ ان میں ایک سے مشابہ نظر آئے؟"

"نہیں؟"

"آپ قسم نہیں کھا سکتے۔ مسٹر لاری کہ یہ ان میں سے ایک ہرگز نہیں تھا؟"

"نہیں؟"

"تو کم از کم آپ کو تو اعتراف ہے کہ ان میں سے ایک ملزم ہو سکتا تھا؟"

"ہاں سوائے اس کے کہ مجھے یاد ہے کہ دونوں کانپ رہے تھے۔ میری طرح ڈاکوؤں کے ڈر سے لرزاں تھے۔ اور یہ ملزم ایسا مسکین نظر نہیں آتا جو کبھی لرزے۔"

"کیا آپ نے کبھی بناوٹی مسکینی دیکھی ہے مسٹر لاری؟"

"یقیناً میں نے دیکھی ہے۔"

"مسٹر لاری پھر ایک دفعہ ملزم کی طرف دیکھئے۔ جہاں تک آپ کو علم ہے۔ کیا آپ نے اسے پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے۔"

"کب؟"

"جب چند دن بعد میں فرانس سے واپس لوٹ رہا تھا تو ملزم کیلے میں عرشے پر سوار ہوا اور میرے واپسی کے سفر میں ساتھ تھا۔"

"وہ کس وقت جہاز پر سوار ہوا؟"

"آدھی رات کے بعد کا وقت ہوگا۔"

"رات کے سناٹے میں کیا وہ اکیلا مسافر تھا جو ایسے بے وقت سوار ہوا؟"

"اتفاق سے وہی اکیلا تھا۔"

"اتفاق کی بات چھوڑیئے۔ کیا وہ اکیلا مسافر تھا جو عرشے پر رات گئے آیا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا آپ اکیلے سفر کر رہے تھے مسٹر لاری۔ یا کوئی ساتھی بھی تھا؟"

"میں ایک صاحب اور اس کی بیٹی کے ساتھ تھا۔ یہ دونوں عدالت میں حاضر ہیں۔"

"یہ دونوں عدالت میں حاضر ہیں؟ کیا آپ نے ملزم سے کوئی بات چیت کی تھی۔"

"بہت کم۔ موسم بہت خراب تھا۔ اور سفر لمبا اور کٹھن تھا۔ میں تو اس کنارے سے اس کنارے تک تقریباً صوفے پر لیٹا ہی رہا۔"

"مس مینٹ۔"

سب کی نظریں جوان لڑکی کی طرف گھوم گئیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ہو گئی اس کا باپ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"مس مینٹ، قیدی کی طرف دیکھئے۔"

ایک حسین نوجوان لڑکی کی ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کا مقابلہ کرنا ملزم کے لئے سارے مجمع کے گھورنے سے زیادہ صبر آزما تھا۔ وہ اس سے دور گویا اپنی قبر کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس وقت مجمع کی تجسس بھری نظروں کے باوجود کچھ دیر کے لئے وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ تخیل نے سامنے پڑی ہوئی جڑی بوٹیوں کے ڈھیر کو باغ کی پھلواری میں تبدیل کر دیا ضبط اور سانس کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں اس کے ہونٹوں کا خون کھینچ کر دل کی طرف دوڑ گیا۔ بڑی بڑی مکھیاں پھر اونچے سُروں میں بھنبھنانے لگیں۔

"مس مینٹ۔ آپ نے پہلے کبھی قیدی کو دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کہاں ؟"

"چھوٹے جہاز پر جس کا ابھی ذکر ہو رہا تھا اور اسی موقع پر ؟"

"آپ وہی نوجوان خاتون ہیں جن کا ابھی حوالہ دیا گیا تھا ؟"

"جی ہاں بدقسمتی سے میں وہی ہوں ؟"

اس کی ہمدردی میں ڈوبی روحانی آواز جج کی موسیقی سے خالی آواز میں ب گئی۔ انھوں نے کہا :۔

"جو سوال تم سے کیے جائیں ان کا جواب دو اور اپنی رائے کا اظہار مت کرو ؟"

"مس مینٹ آبنائے کو پار کرتے وقت سفر میں آپ کی قیدی سے کوئی بات چیت ہوئی تھی ؟"

"جی ہاں ؟"

"اس کو یاد کر کے بیان کیجیے ؟"

مکمل خاموشی کے درمیان اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا :۔

"جب یہ صاحب جہاز پر آئے تو . . ؟"

"تمہارا مطلب قیدی سے ہے ؟" جج نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا :

"جی ہاں حضور والا ؟"

"تو پھر قیدی کہو ؟"

"جب قیدی جہاز پر آیا تو اس نے دیکھا کہ میرے والد بہت تھکے ہوئے ہیں

اور ان کی صحت بہت گر گئی ہے"

اس نے قریب کھڑے ہوئے باپ کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا "میرے والد اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ انھیں اندر لے جاتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ اس لئے میں نے جہاز کے کمرے کی سیڑھیوں کے پاس ان کے لئے کھلی ہوا میں بستر لگا دیا۔ اور ان کی نگہداشت کے لئے میں ان کے قریب ہی عرشے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت جہاز پر ہم چار مسافروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ مہربانی کر کے انھوں نے مجھ سے والد کی دیکھ بھال کے متعلق رائے دی کہ میں کس طرح انھیں ہوا اور موسم سے بچاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں یہ کیسے کروں۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ بندرگاہ سے نکل کر ہوا کا رُخ کس جانب ہوگا۔ انہوں نے میری مدد کی۔ انھوں نے میرے والد کی علالت پر نہایت نرمی اور مہربانی سے تاسف کا اظہار کیا جو مجھے یقین ہے وہ دل سے محسوس کر رہے تھے۔ یوں ہماری بات چیت کی ابتدا ہوئی"

"دخل در معقولات کی معافی چاہتا ہوں مگر بتایئے کیا وہ جہاز پر تنہا سوار ہوئے تھے"

• نہیں "۔۔۔ ان کے ساتھ کتنے لوگ تھے۔

• دو فرانسیسی اصحاب" "کیا وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے"

• وہ آخر وقت تک آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ فرانسیسی اپنی کشتی میں سوار ہو گئے"

"کیا ان کے درمیان ان فہرستوں سے مشابہ کاغذات کا تبادلہ ہوا تھا؟"

"کچھ کاغذات کا تبادلہ تو ضرور ہوا تھا۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کاغذات کیسے تھے۔"

"کیا اس ناپ اور شکل کے تھے؟"

"ممکن ہے اس شکل اور ناپ کے ہوں۔ مگر میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ حالانکہ وہ میرے بہت قریب کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ جہاز کی سیڑھیوں کے بالائی حصے پر کھڑے تھے تاکہ انھیں لیمپ کی روشنی مل سکے۔ مگر لیمپ بہت دھندلا تھا اور وہ لوگ بہت آہستہ بول رہے تھے۔"

"کچھ قیدی کی گفتگو کے بارے میں بتائیے۔"

"قیدی نے بڑی فراخ دلی سے میرے اوپر اعتبار کیا تھا۔ شاید ہماری مجبوریوں سے متاثر ہو کر انھوں نے ہمارے ساتھ نہایت ہی اچھا اور مہربانی کا برتاؤ کیا۔ مجھے امید ہے کہ ان کی عنایات کے بدلے میں میری آج کی گواہی سے انھیں کوئی گزند نہیں پہونچے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ کر رو پڑی۔

نیلی مکھیاں پھر بھنبھنائیں!۔

"مس مینٹ یہ شہادت فراہم کرنا آپ کا فرض تھا۔ آپ کو دینی ہی پڑی۔ سوائے گواہی دینے کے اور آپ کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ مگر آپ کو یہ سب کچھ طوعاً و کرہاً کرنا پڑ رہا ہے۔ قیدی کو اس بات کا اندازہ ہے۔ اگر اسے اس بات کی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی تو اس عدالت میں کوئی بھی اس کا ہم خیال نہیں۔ مہربانی کر کے اپنا

بیان جاری رکھئے۔"

"انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک نہایت مشکل اور نازک کام کے سلسلے میں یہ سفر کر رہے ہیں۔ اس سے لوگوں کے مصیبت میں پڑ جانے کا ڈر ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس کام کی وجہ سے انھیں چند دنوں کے لئے فرانس جانا پڑا تھا۔ اور شاید کچھ عرصہ تک اور انھیں یونہی فرانس اور انگلستان کے درمیان آنا جانا پڑے گا۔"

"کیا انھوں نے کچھ امریکہ کے بارے میں بھی کہا تھا مس مینٹ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے۔"

"انھوں نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کس وجہ سے یہ جھگڑا ہو گیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے خیال میں تو اس میں انگلستان کی حماقت اور غلطی تھی۔ انھوں نے مذاق میں کہا کہ شاید جارج واشنگٹن کو بھی ایک دن اتنی ہی شہرت مل جائے جتنی جارج سوم کو ملی ہے۔ مگر جس طرح انھوں نے یہ بات کہی تھی وہ انداز قطعی خطرناک نہ تھا۔ صرف ہنسی ہنسی میں یونہی وقت گذارنے کے لئے کہہ دیا تھا۔"

کسی دلچسپ سین میں جب کسی خاص اداکار کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا ہوتا ہے، تو تماش بینوں کے چہروں پر بھی لاشعوری طور پر وہی جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنا بیان دے رہی تھی تو اس کی پیشانی پر فکر اور تردد سے شکنیں پڑ گئی تھیں۔ جب جج کچھ لکھنا شروع کر دیتا تو وہ وقفہ دینے کے لئے رک جاتی۔ اس وقت موافقین اور مخالفین کے چہروں کو بے چینی سے دیکھ کر ان کی رائے کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی بھری عدالت میں اکثر

حاضرین کے چہروں پر بھی وہی تاثر تھا۔ اس حد تک کہ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے لوگوں کی پیشانیاں آئینے ہیں۔ جن میں گواہ کے چہرہ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب جج نے جارج واشنگٹن کے بارے میں خوفناک جملہ کفر سنا اور بھنّا کر آنکھیں نکالنے لگا۔

اٹارنی جنرل نے اب جج سے استدعا کی احتیاطاً اور قواعد کے مطابق یہ ضروری ہے کہ نوجوان خاتون کے باپ کو گواہی کے لئے طلب کیا جائے۔ ڈاکٹر مینٹ گواہ کے کٹہرے میں کھڑے ہوگئے۔

"ڈاکٹر مینٹ۔ قیدی کی طرف دیکھئے۔ کیا آپ نے اس سے پہلے اسے دیکھا ہے؟"

"ایک مرتبہ جب وہ میرے گھر پر لندن میں آئے تھے۔ تین یا ساڑھے تین سال ہوئے؟"

"کیا آپ شناخت کر سکتے ہیں کہ یہ آپ کے ساتھ جہاز پر سفر کر رہا تھا۔ یا آپ کی بیٹی اور قیدی کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں ان پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟"

"نہیں جناب دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں کر سکتا؟"

"کیا آپ کی اس مجبوری کا کوئی خاص مقصد یا وجہ ہے؟"

"جی ہاں؟" انھوں نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر مینٹ، کیا بدقسمتی سے آپ کو بغیر عدالت کی کارروائی کے۔ بغیر کسی الزام کے۔ ایک مدت دراز تک اپنے وطن میں جیل کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں؟"

"ایک طویل مدت تک:" ڈاکٹر مینٹ نے ایسے دردناک لہجہ میں کہا کہ سب کے دل ہل گئے۔

"کیا اس موقعہ پر آپ فوراً رہا ہو کر آئے تھے؟"

"لوگ یہی کہتے ہیں؟"

"کیا اس واقعے کے متعلق آپ کو کچھ بھی یاد نہیں؟"

"کچھ یاد نہیں! میرا دماغ ایک سادہ صفحے کی طرح ہے۔ ایک زمانے میں . . . . پتہ نہیں کب . . . میں جیل میں جوتے بنا کر وقت کاٹتا تھا ــــ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ لندن میں مقیم پایا۔ جب خدا کی مہربانی سے میرے ہوش وحواس دوبارہ قائم ہوئے تو وہ مجھ سے بہت گھل مل گئی تھی . . . میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسے مجھ سے اتنی قریب ہو گئی۔ مجھے اس کی تفصیل نہیں یاد رہی کہ یہ سب آہستہ آہستہ کیونکر ہوا۔"

اٹارنی جنرل بیٹھ گئے۔ باپ اور بیٹی بھی ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ مقدمہ میں ایک نرالا نکتہ پیدا ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ قیدی پانچ سال پہلے نومبر کے مہینے میں جمعہ کی رات کو ایک اور آدمی کے ساتھ جو اس سازش میں شریک تھا مگر لاپتہ ہے ڈوور کی ڈاک گاڑی میں سفر کر رہا تھا اور دھوکا دینے کے لئے کسی اور مقام پر اتر گیا۔ وہاں اس نے قیام نہیں کیا۔ بلکہ کچھ میل دور بندرگاہ کے ایک فوجی کیمپ پر گیا۔ اور معلومات فراہم کیں۔ ایک گواہ بلایا گیا تاکہ وہ شناخت کرے کہ وہ وہی شخص

ہے جسے اس نے فوجی کیمپ اور بندرگاہ والے شہر میں ہوٹل کے کافی روم میں ایک دوسرے کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔ ملزم کے وکیل نے اس گواہ پر جرح کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہ یہی کہے جا رہا تھا کہ اس نے قیدی کو اور کسی موقعہ پر نہیں دیکھا۔ وہ شخص جو سامنے وگ پہنے بیٹھا تھا اور کارروائی کے درمیان مسلسل چھت کو گھورے جا رہا تھا اس نے کاغذ کے ٹکڑے پر دو چار لفظ لکھے، اسے مروڑ کر گولی بنائی اور ملزم کے وکیل کی طرف پھینک دی کاغذ کے ٹکڑے کو کھول کر پڑھنے کے بعد وکیل نے تعجب سے ملزم کو بڑے غور سے دیکھا

"تم اب بھی کہتے ہو کہ تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ شخص یہ قیدی ہی تھا" گواہ کو پورا یقین تھا۔

"کیا تم نے کبھی بالکل قیدی کا ہم شکل شخص دیکھا ہے؟"

"ایسا ملتا ہوا نہیں دیکھا جس پر قیدی کا شبہ ہو" گواہ نے کہا۔

"یہ صاحب جو میرے لائق دوست ہیں۔ ان کی طرف دیکھو"

وکیل نے کاغذات کا پرچہ دینے والے کی طرف اشارہ کرکے کہا "اور اب قیدی کو غور سے دیکھو۔ کیا خیال ہے۔ کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں؟"

لائق و فائق دوست لفنگا تو نہیں لگ رہا تھا۔ مگر لاپروا اور بدقطع کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھے کہ جب دونوں کا مقابلہ کیا گیا تو صرف گواہ ہی نہیں بلکہ حاضرین بھی حیران رہ گئے۔ جج سے درخواست کی گئی کہ وہ اس شخص کا وگ اتروا دیں۔ یہ اجازت جج نے ذرا چیں بہ جبیں

ہو کر دی تو شباہت اور بھی واضح ہو گئی۔ جج نے مسٹر اسٹرایور یعنی وکیل ملزم سے سوال کیا۔
"کیا اب مسٹر کارٹن پر بھی غداری کا مقدمہ چلایا جائے گا؟" لائق دوست کا
نام مسٹر کارٹن تھا۔

"جی نہیں" مسٹر اسٹرایور نے جج کو جواب دیا۔ مگر گواہ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے
ہیں کہ جو غلطی ایک بار سرزد ہو گئی ہے کیا دوبارہ اس کے سرزد ہونے کا امکان نہیں۔
اگر وہ اس سے پہلے اس شباہت کو محسوس کر لیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہونچتی۔ اور اپنی جلدبازی
کے بعد اسے آیندہ اپنی گواہی پر کیسے بھروسہ ہوگا۔ ان سوالوں سے وکیل کا صرف ایک
مقصد تھا کہ وہ گواہ کو کانچ کے برتن کی طرح چکنا چور کر دے اور اس کی گواہی کا کباڑا بنا ڈالے

اس عرصہ میں مسٹر کرنچر مقدمہ کی کارروائی کے درمیان بے خیالی میں اپنی
انگلیوں پر سے پیٹ بھر کے زنگ کھا چکے تھے اور سننے میں محو تھے۔ جب تک مسٹر اسٹرایور
نے قیدی کے مقدمہ کو کاٹ چھانٹ کر ایک چست لباس کی طرح جیوری کے اوپر منڈھ
دیا۔ انھوں نے جیوری پر ظاہر کر دیا کہ یہ قوم پرست برساڈ ایک کرائے کا جاسوس
اور غدار ہے۔ زندگیوں کا سودا کرنے والا ہے۔ بے شرم اور لعنتی جوڈاز (یہودا)
کے بعد یہی سب سے بڑا بدمعاش ہے جو کہ وہ اس وقت واقعی لگ رہا تھا۔ پاکباز
خادم کلائی اس کا دوست اور ساجھے دار تھا اور اس سے بہتر اسے کون مل سکتا تھا۔
ان جھوٹے حلف اٹھانے والے دغا بازوں نے اس قیدی کو اس لئے اپنے چنگل میں
پھانسنے کی کوشش کی کہ وہ فرانسیسی نژاد ہے۔ اور اپنے خاندان کے کسی اہم کام کے

سلسلے میں آبنائے کے پار اسے آنا جانا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کے خیال سے جو اس کے عزیز اور پیارے ہیں وہ اس خاندانی راز کو افشا کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ حالانکہ اس وجہ سے اس کی جان تک خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ شہادت اس نوجوان خاتون سے جبریہ دلوائی گئی، اور عدالت نے دیکھا کہ اسے اس قسم کی شہادت دیتے وقت کیسی روحانی کوفت ہو رہی تھی۔ مگر اس شہادت کی کوئی اہمیت نہیں۔ چونکہ سوائے معصوم بات چیت اور گپوں کے جو ایک نوجوان مرد اور خاتون آپس میں کیا کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں اور کچھ نہ تھا۔ مگر جارج واشنگٹن کے ذکر کے موقعہ پر واقعی نہایت دور از قیاس اور ناممکن باتیں کہی گئی تھیں۔ لیکن ان کو بھی ایک بھونڈے مذاق سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ گورنمنٹ کے لئے یہ نہایت اچھی بات ہوگی۔ کہ رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے لئے ذلیل ترین نفرتوں اور دہشتوں کو استعمال میں لانے کی سعی میں خود اس کا تختہ الٹ جائے۔ مسٹر اٹارنی جنرل نے اس نکتے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر بات بے بنیاد ثابت ہوئی۔ اس ملک کی عدالتوں میں اسی قسم کی واہیات شہادتیں مقدمات کو مسخ کیا کرتی ہیں۔ مگر اس موقع پر پھر قابل جج نے سختی سے اس بات کو رد کر دیا جیسے وہ حقیقت نہیں تھی اور کہا کہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر وہ اس قسم کی خرافات نہیں سن سکتے۔

پھر مسٹر اسٹرائیور نے اپنے گواہ حاضر کئے۔ مسٹر کرنچر بڑی توجہ سے سنتے رہے اور اٹارنی جنرل نے وہ چست کپڑے جو ملزم کے وکیل نے جیوری پر منڈھے تھے الٹے کر دیئے اور شد و مد سے یہ ظاہر کیا کہ برساڈ اور کلائی ان کے خیال میں سو گنا زیادہ اچھے تھے۔ اور

ملزم سو گنا زیادہ خراب تھا۔ سب سے آخر میں قابل جج نے ان کپڑوں کو کبھی سیدھا کیا، کبھی پھر الٹا کیا اور یقیناً انھیں کاٹ چھانٹ کر ملزم کا کفن بنا دیا۔

اس کے بعد جیوری مشاورت کے لئے اندر چلی گئی۔ اور نیلی مکھیاں پھر بھنبھنانے لگیں۔ مسٹر کارٹن جو بیٹھے چھت کو دیکھ رہے تھے پریشانی کی حالت میں بھی نہ اپنی جگہ سے ہلے اور نہ رویہ بدلا۔ ان کے قابل دوست مسٹر اسٹرائیور اپنے سامنے کاغذوں کا ڈھیر رکھا اپنے پاس بیٹھنے والوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اور گھبرا گھبرا کر جیوری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حاضرین ادھر ادھر گھوم رہے تھے اور نئے گروہوں میں شریک ہو رہے تھے۔ جج صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے ٹہل رہے تھے۔ اور انھیں احساس تھا کہ حاضرین کو شبہ ہو رہا ہے کہ وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ مگر کارٹن وہ اکیلا انسان تھا جو کرسی سے ٹیک لگائے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا کالیت کا گون کندھوں پر سے پھسل گیا تھا۔ وگ اتارنے کے بعد لاپرواہی سے ویسے ہی سر پر رکھا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سارے دن یونہی چھت پر نظریں جمائے بیٹھا رہا تھا وہ ایسی لاپرواہی سے بیٹھا تھا کہ نہایت ذلیل نظر آرہا تھا۔ حقیقت میں وہ قیدی سے مشابہ تھا خاص طور پر جب دونوں کا مقابلہ کیا گیا تو وقتی طور پر وہ ذرا جوش میں آگیا تھا اور شبہ بہت بہت واضح ہو گئی تھی۔ مگر بہت سے لوگ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر تعجب کر رہے تھے کہ انھوں نے ان دونوں میں کیسے مشابہت دیکھی۔ مسٹر کرنچر نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے کہا۔

"میں آدھی گنی کی شرط لگاتا ہوں کہ یہ شخص کوئی قانونی کام نہیں کر سکتا۔ بھلا اس جیسے کو کون مقدمہ سپرد کرے گا؟"

ظاہر میں مسٹر کارٹن بے تعلق سے بیٹھے تھے مگر تمام تفصیلات کا مطالعہ وہ دوسروں سے زیادہ غور سے کر رہے تھے۔ مثلاً جب مس مینٹ نے اپنا سر اپنے باپ کے سینے پر ڈھکا دیا تو وہ صب سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے اسے دیکھا اور زور سے پکارا ۔۔ " آفیسر ذرا خاتون کو سنبھالو۔ انھیں باہر لے جاؤ۔ دیکھتے نہیں وہ گری جارہی ہیں"۔

جب مس مینٹ کو لے جایا گیا تو لوگوں کو اس پر بہت رحم آرہا تھا اور اس کے باپ سے بھی ہمدردی ظاہر کی جانے لگی۔ قید کے زمانہ کو دوبارہ یاد کرنا ان کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ جرح کے وقت بڑی پریشانی ظاہر ہورہی تھی۔ اور یوں اندرونی خلجان میں ڈوبے ہوئے وہ بہت بوڑھے لگ رہے تھے۔ اور تب سے ان پر فکر کے گہرے بادل سے چھائے ہوئے تھے۔ جب وہ باہر جانے لگے تو جیوری نے تھوڑی دیر رُک کر دیکھا اور اپنے نمائندے سے کچھ کہا۔ وہ متفق نہیں تھے اور دوسرے کمرے میں جانا چاہتے تھے۔ جج صاحب جن کے دماغ میں شاید اب تک جارج واشنگٹن بھرا ہوا تھا متعجب تھے کہ انھیں اتفاق کیوں نہیں۔ مگر بڑی خوشدلی سے اجازت دیدی کہ وہ پہرے داروں کی حفاظت میں جاسکتے ہیں۔ اور خود بھی چلے گئے"۔

مقدمہ کی سماعت سارا دن ہوتی رہی تھی اور عدالت میں اب چراغ روشن کئے جارہے تھے۔ یہ خبر پھیل رہی تھی کہ جیوری دیر تک تخلیہ میں رہے گی۔ لوگ تازہ دم ہونے کے لئے روانہ ہوگئے اور قیدی کٹہرے کے پیچھے جاکر بیٹھ گیا۔

مسٹر لاری جو نوجوان خاتون اور اس کے والد کے ساتھ باہر چلے گئے تھے۔ لوٹ

آئے اور جیری کو اشارے سے بلایا جو بھیڑ چھٹ جانے کی وجہ سے ان کے کچھ قریب پہونچ گیا تھا۔

"جیری اگر تم کچھ کھانا پینا چاہو تو جا سکتے ہو۔ مگر آس پاس ہی رہنا۔ جیوری کی واپسی کی تم کو خبر مل جائے گی۔ ان کے آنے کے بعد یہاں موجود رہنا کیونکہ میں فیصلہ کی خبر بینک بھیجنا چاہتا ہوں۔"

جیری کا ماتھا سلام کے لئے کافی چوڑا تھا اس نے انعام کا شکریہ ادا کرنے کیلئے ماتھے سے ہاتھ لگایا۔ اسی وقت مسٹر کارٹن اٹھ کر آئے اور مسٹر لاری کا بازو چھو کر کہا۔

"خاتون کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"بڑی پریشان ہیں مگر ان کے والد ان کی ڈھارس بندھا رہے ہیں۔ اور عدالت سے باہر جا کر ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔"

"میں ملزم کو یہ خبر پہونچا دوں! میرے خیال میں بینک کے کسی معزز شخص کے لئے قیدی سے یوں کھلے بندوں بات کرنا اچھا نہیں۔ آپ سمجھے۔"

مسٹر لاری کا چہرہ تمتما اٹھا۔ شاید وہ خود اس نکتے پر غور کر رہے تھے۔ مسٹر کارٹن نے عدالت کے کٹہرے کے باہر کا رخ کیا۔ عدالت کے باہر کا بھی ادہر ہی راستہ تھا۔ اور مسٹر جیری معہ اپنی میخوں کے آنکھیں چوکنی کئے کان لگائے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

"مسٹر ڈارنے!"

قیدی فوراً آگے بڑھا۔

"یقیناً آپ کو اپنی گواہ مس مینٹ کی طبیعت کے بارے میں معلوم کرنے کی فکر ہو گی وہ بالکل بخیریت ہیں۔ اس وقت وہ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔"

"مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ کیا براہ کرم آپ ان تک یہ بات میرے شکریہ کے ساتھ پہونچا سکتے ہیں؟"

"ہاں اگر آپ کہیں تو میں ان تک یہ پیغام پہونچا دوں گا۔"

مسٹر کارٹن کا رویہ بدتمیزی کی حد تک لاپروائی کا تھا وہ کٹہرے پر ہاتھ ٹکائے ملزم کی طرف سے منھ موڑے کھڑے رہے۔

"شکریہ قبول کیجئے۔"

"آپ کو فیصلہ سے متعلق کیا امید ہے مسٹر ڈارنے؟" انھوں نے ویسے ہی ذرا مڑ کر کہا۔

"بدترین فیصلہ کی امید ہے۔"

"بدترین فیصلہ کی امید کرنا ہی بہتر ہے۔ آثار بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ مگر ان کا سوچ بچار کے لئے مہلت مانگ کر جانا آپ کے حق میں اچھا ہے۔"

عدالت سے باہر نکلتے وقت آوارہ گردی کرنے کی اجازت نہ تھی اس لئے جیری نے اور کچھ نہ سنا اور انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔ صورت شکل سے دونوں کتنے مشابہ تھے۔ طور طریق میں کتنے مختلف۔ وہ قریب قریب کھڑے تھے۔ دونوں کا عکس آئینہ میں پڑ رہا تھا۔ نیچے راستہ چوراچکوں سے بھرا ہوا تھا۔ قیمہ کے سموسوں اور شراب کے شغل میں آدھ گھنٹہ گھسٹ گھسٹ کر گذر گیا۔

پیغام رساں جس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی فوائدات سے لطف اندوز ہونے کے بعد بڑی بے آرامی سے ایک کرسی پر اونگھ گیا۔ تیزی سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے لوگوں کی موج آئی اور اسے بہاکر اپنے ساتھ زینہ پر لے گئی جو عدالت کو جاتا تھا۔

"جیری جیری ۔۔۔" جب وہ دروازے پر پہونچا تو مسٹر لاری اسے پہلے ہی سے پکار رہے تھے۔

"جی حضور! واپس لوٹنا بڑا کٹھن کام ہے۔ ابھی حاضر ہوا جناب۔ کہئے کیا حکم ہے؟"

مسٹر لاری نے اسے ایک کاغذ بھیڑ کے بیچ میں تھماکر پوچھا۔

"مل گیا۔۔ جلدی کرو۔"

"ہاں سرکار۔"

ایک کاغذ کے ٹکڑے پر جلدی میں لکھا ہوا تھا "بری ہوگیا۔"

"اگر اس دفعہ بھی آپ لکھتے دوبارہ زندگی مل گئی" تو اب کے میں آپ کا مطلب صاف سمجھ جاتا۔ جیری مڑکر بڑبڑایا۔ اس کے سوا اس سے زیادہ اس کے پاس سوچنے یا کہنے کا وقت نہ تھا۔ پرانی کوتوالی سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد ہی عدالت سے خلقت کا ایک ایسا زبردست ریلا نکلا جس نے اس کے پیر اکھاڑ دیئے۔ گلی میں بھنبھناہٹ گونج رہی تھی جیسے مکھیاں دل شکستہ ہوکر دوسری لاش کی تلاش میں اڑی جارہی ہوں۔

چوتھا باب

مبارک باد

عدالت کے نیم تاریک برآمدے میں سے دن بھر جو انسانوں کا قلیہ اُبلا تھا۔ اس کی تلچھٹ رِس رہی تھی۔ ڈاکٹر مینٹ۔ لوسی مینٹ۔ مسٹر لاری ملزم کے سالیسٹر اور وکیل مسٹر اسٹرائیور رہا شدہ مسٹر چارلس ڈارنے کے گرد جمع تھے۔ اور انھیں گلو خلاصی پر مبارکباد دے رہے تھے۔

اس دھندلی روشنی میں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ اس قدر بردبار اور ذہین ڈاکٹر مینٹ وہی صاحب ہیں جو پیرس کی ایک غلیظ کوٹھری میں جوتے بنا رہے تھے۔ انھیں دوبارہ دیکھنے کے بعد بھی پھر دیکھنا پڑتا تھا۔ حالانکہ اس طرح بھی دیکھنے والے کو یہ پتہ نہ چل جاتا کہ ان کی دھیمی کمزور آواز میں کتنا غم ہے۔ اور بغیر کسی وجہ کے بار بار خود فراموشی کیوں چھا جاتی ہے۔ عام طور پر تو جیل خانہ کی یاد تازہ کرنے سے جیسا کہ عدالت میں ہوا۔ ان پر یہ گھٹن اور تکلیف غالب آجاتی تھی۔ جس کا ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا۔ مگر بغیر وجہ ان پر روحانی کرب کا حملہ ہوتا تھا۔ اسے وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو ان کی اصلی زندگی کی کہانی سے واقف نہیں تھے۔ اور انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گرمیوں کا سورج ان پر بیسٹیل کے سائے ڈال رہا ہے حالانکہ بیسٹیل کا جیل خانہ تین سو میل دور تھا۔ صرف ان کی بیٹی غم کے ان تاریک سایوں کو

اپنے پیار کے جادو سے ہٹا سکتی تھی۔ وہ ایک سنہرا بندھن تھی۔ جس کے ذریعے سے ان کا وہ ماضی جو غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹنے سے پہلے تھا اور وہ حال جو دکھوں کے گذر جانے کے بعد شروع ہوا ایک مسلسل زمانہ بن گیا تھا۔ اس کی آواز کا نغمہ۔ اس کے چہرے کا نور اور اس کے ہاتھ کا لمس ہمیشہ ان کے درد و غم کے لئے تریاق کا اثر رکھتا تھا۔ ہمیشہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ ایسے بھی بعض لمحے ان پر گذرتے تھے جب اس کی ساری صلاحیتیں بیکار ثابت ہوتیں۔ مگر ایسے لمحے اب شاذ ہی آتے تھے۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ گذر گئے۔ مسٹر ڈارنے نے پرجوش طریقہ پر اس کے ہاتھ کو شکر گذار ہو کر بوسہ دیا۔ پھر مسٹر اسٹرائیور کی طرف مڑ کر بڑی گرم جوشی سے شکریہ ادا کیا۔

مسٹر اسٹرائیور تیس برس سے زیادہ کے نہ ہونگے۔ مگر پچاس برس کے لگتے تھے موٹے تازے اونچی آواز سے بولنے والے چہرہ جیسے لال چقندر۔ مزاج میں شیخی اور اکھڑ پن۔ وہ ہر محفل میں اور ہر موقع پر اخلاقی اور جسمانی طور پر کندھے سے دھکا مار کے آگے بڑھ جانے کے عادی تھے ان کی اس عادت سے ان کو اپنے پیشے میں ترقی کرنے میں بڑی مدد ملی۔

وہ ابھی تک اپنا گون اور وگ پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے سینہ تان کر ایک ہی دھکے میں اپنے سابق موکل مسٹر لاری کو بھیڑ سے باہر کھسکا دیا۔ اور بولے:۔

"مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں نے آپ کو باعزت بری کرالیا۔ نہایت ہی مکروہ الزام تھا۔ حد سے زیادہ مکروہ الزام تھا۔ اور اسی وجہ سے ثابت نہ ہو سکا"

"آپ نے زندگی بھر کے لئے مجھے اپنا احسان مند بنا دیا" سابق موکل نے اُن کا

ہاتھ تھام کر رکھا۔

"میں نے اپنی پوری کوشش آپ کے لئے صرف کر دی" مسٹر ڈارنے نے۔ "یقیناً میری پوری کوشش اتنی ہی قابل قدر ہے جتنی کسی اور کی" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔ اس انکساری کا مطلب دوسروں سے اپنی تعریف کروانا تھا۔ لہٰذا مسٹر لاری کو کہنا پڑا: "واہ دوسروں کا آپ سے کیا مقابلہ" اور پھر وہ واپس حلقے میں دوڑ آئے۔ جس میں سے وہ کاندھا مار کر ہٹا دیئے گئے تھے۔

"اچھا آپ کا یہ خیال ہے۔ آپ سارا دن حاضر رہے۔ آپ ٹھیک جانتے ہونگے آپ بھی کاروباری آدمی ہیں"

"اس لئے میں ڈاکٹر مینٹ سے درخواست کروں گا کہ مجلس برخاست کریں اور ہم سب کو گھر جانے کی اجازت دیں۔ مس لوسی بہت بیمار نظر آ رہی ہیں۔ مسٹر ڈارنے نے بھی بڑا کٹھن دن گذارا ہے۔ ہم سب تھک گئے ہیں"

"یہ صرف آپ اپنے لئے کہہ سکتے ہیں مسٹر لاری مجھے تو ابھی ساری رات کام کرنا ہے۔ ہاں آپ اپنے لئے ضرور کہہ سکتے ہیں"

مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔

"جی ہاں میں اپنے لئے بھی کہہ رہا ہوں۔ مسٹر ڈارنے، مس لوسی ــ مس لوسی کیا خیال ہے کیا میں سب کی طرف سے یہ بات نہیں کہہ سکتا" انھوں نے اس کے باپ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ڈاکٹر مینٹ نہایت سرد مہری سے ڈارنے کو

دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تفکر، ناپسندیدگی، بے اعتباری اور خوف جھانک رہا تھا۔ ان کے چہرے پر یہ عجیب تاثر تھا اور ان کے خیالات نہ جانے کہاں بھٹک رہے تھے

"بابا!" لوسی نے آہستہ سے اپنے والد کا بازو چھو کر کہا۔

انہوں نے آہستہ آہستہ اس اندھیرے خیال کو دور جھٹک دیا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"گھر چلیں بابا!"

"ہاں!" انھوں نے ایک لمبی آہ کھینچکر کہا۔

بری شدہ قیدی کے دوست احباب اسے چھوڑ کر جا چکے تھے کیونکہ اس نے سب سے یہی کہا تھا کہ وہ آج رات رہا نہیں کیا جائے گا۔ برآمدے کی تمام روشنیاں بجھائی جا چکی تھیں۔ لوہے کے پھاٹک ایک جھنکار سے بند ہو رہے تھے۔ بھیانک جگہ سنسان ہو رہی تھی۔ دوسرے دن کی پھانسیوں، کوڑوں کی سزاؤں اور لوہے سے داغنے کا نظارہ کرنے لوگ پھر یہاں جمع ہو جائیں گے۔ اپنے باپ اور ڈارنے کے درمیان چلتی ہوئی لوسی باہر تازہ ہوا میں پہونچ گئی۔ ایک گھوڑا گاڑی بلائی گئی اور باپ بیٹی اس میں روانہ ہو گئے۔

مسٹر اسٹرائیور انھیں برآمدے میں چھوڑ کر خود لباس بدلنے کے کمرے (روب روم) کی طرف کندھے مارتے چلے گئے۔ ایک اور شخص جس نے کسی سے بات چیت نہیں کی خاموش اندھیرے میں دیوار سے ٹکا کھڑا تھا اور جب گاڑی چلی گئی تو چپ چاپ اوروں کے ساتھ

باہر نکل آیا اور دیر تک دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے مسٹر لاری اور مسٹر ڈارنے کے پاس گیا۔

"کہئے مسٹر لاری۔ کاروباری آدمی اب مسٹر ڈارنے سے بات چیت کر سکتے ہیں؟"

مقدمہ کے درمیان جو خدمات مسٹر کارٹن نے انجام دی تھیں ان کا نہ کسی نے ذکر کیا تھا اور نہ کسی کو علم تھا۔ وہ اپنا گون اور وگ اتار چکے تھے مگر اس کے بغیر وہ کچھ بہتر نہیں لگ رہے تھے

"مسٹر ڈارنے آپ کو معلوم نہیں کہ ایک کاروباری آدمی کے دماغ میں کتنے مختلف خیالات چکر لگاتے ہیں۔ خاص طور پر جب ایک کاروباری انسان کا دماغ نیکی اور کاروبار کے درمیان تقسیم ہو جاتا ہے۔ آپ کو ہنسی آئے گی مسٹر ڈارنے۔"

"آپ یہ بات پہلے بھی کہہ چکے ہیں جناب۔ ہم کاروبار پیشہ لوگ خود اپنے افعال کے مالک ہیں۔ اپنے سے زیادہ ہمیں بینک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" مسٹر لاری نے شرمندہ ہو کر گرمجوشی سے کہا۔

"جانتا ہوں جانتا ہوں۔" مسٹر کارٹن نے لاپروائی سے کہا۔ "چراغ پا مت ہوئیے آپ بھی دوسروں ہی کی طرح ہیں بلکہ ان سے بہتر ہیں میرے خیال میں۔"

"مگر جناب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس معاملے میں آپ کا کیا تعلق ہے۔ میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں اس لئے آپ معاف کریں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا اس معاملہ سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔"

مسٹر لاری نے اس کی طرف سے بے توجہ ہو کر کہا۔

"مطلب۔ خدارا میرا اس میں کوئی مطلب نہیں" مسٹر کارٹن نے کہا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے جناب"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"

"اگر مطلب ہوتا تو آپ ادھر توجہ کرتے" مسٹر لاری نے کہا۔

"بخدا ۔۔۔ کبھی بھی نہیں ۔۔۔ مجھے دخل نہ دینا چاہئے" مسٹر کارٹن نے جواب دیا۔

"اچھا جناب" مسٹر لاری نے اسی بے توجہی سے بھنا کر کہا "کاروبار ایک نہایت معزز اور باوقار پیشہ ہے۔ اور اگر مصلحت نے تکلف اور خاموشی کی مہر لگا دی ہے تو مسٹر ڈارنے ایک دریا دل نوجوان ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ خدمات کا صلہ کس طرح ادا کیا جاتا ہے شب بخیر مسٹر ڈارنے ۔۔۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا نے آج آپ کی جان بخشی اسی لئے کروا دی کہ آپ ایک پر مسرت زندگی گذار سکیں۔ ۔ ۔ اے گاڑی والے" شاید کچھ خود اپنے آپ سے غصے تھے کچھ وکیل پر غصہ آرہا تھا گاڑی میں بیٹھ کر ٹیلسن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسٹر کارٹن کے منھ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اور ذرا بہک رہے تھے۔ مسٹر ڈارنے کی طرف مڑے ۔۔۔ اور کہا "یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہ گئے۔ آپ کو یہاں سڑک کے پتھروں پر اپنے ہمزاد کے ساتھ کھڑے ہونا کچھ عجیب سا لگ رہا ہوگا"

"ابھی تک مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں پھر اس دنیا کا باشندہ بن گیا ہوں" ڈارنے نے کہا۔۔۔

"کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا آپ دوسری دنیا کی طرف کافی دُور چلے گئے تھے۔ آپ کی آواز بڑی کمزور ہو رہی ہے۔"

"مجھے کمزوری آ رہی ہے میرے خیال میں۔"

"تو پھر خدا کے لئے کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ میں نے تو جب ہی کھا لیا۔ جب وہ احمق اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ آپ کو اس دنیا میں رکھیں یا دوسری دنیا میں پہونچا دیں۔ آیئے آپ کو قریب ترین ہوٹل میں لے چلتا ہوں۔ جہاں آپ کو اچھا کھانا مل جائے گا۔"

وہ اس کا بازو ہاتھ میں ڈال کر لڈگیٹ ہل سے فلیٹ اسٹریٹ کی طرف لے گیا وہاں وہ دونوں سائبان والے راستے سے گذر کر ایک کمرے میں پہونچے۔ جہاں اچھے کھانے اور نفیس شراب کی مدد سے چارلس ڈارنے میں جان پڑنے لگی۔

کارٹن اسی میز پر اس کے مقابل شراب کی بوتل لئے بیٹھا اس کی طرف قدرے گستاخی سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اب آپ کو محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کرہ ارض پر موجود ہیں۔ مسٹر ڈارنے۔"

"ہاں اتنا محسوس کرنے کے قابل تو ہو گیا ہوں۔ گو وقت اور مقام کے بارے میں ابھی کچھ الجھن باقی ہے۔"

"بڑا اطمینان محسوس کر رہے ہوں گے"! اس نے نہایت تلخی سے کہا اور اپنا بڑا گلاس پھر بھر لیا۔

"جہاں تک میری رائے کا سوال ہے۔ میں تو یہی بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں اس

دنیا کا باشندہ ہوں۔ میرے لئے یہاں سوائے اس شراب کے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں۔ اور نہ دنیا کو میری ضرورت ہے۔ اس معاملے میں ہم دونوں بالکل مختلف ہیں۔ مجھے تو یہ یقین ہوتا جارہا ہے کہ کسی بات میں بھی ہم ایک دوسرے سے مشابہ نہیں۔"

"دن بھر کی تھکن اور جذباتی الجھن اور اس کے بعد اپنے ہمزاد کے روبرو بیٹھنا چارلس ڈارنے کو یہ سب ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ کیا جواب دے۔ اس لئے وہ خاموش ہی رہا۔

"کھانا کھا چکے مسٹر ڈارنے تو اب آپ کسی کا جام صحت کیوں نہیں پیتے۔ جام صحت پیجئے نا۔"

"کس کا جام صحت؟"

"وہ نام اس وقت آپ کی زبان کی نوک پر ہے۔ ہونا تو چاہئے۔ یقیناً ہوگا اس کی تو میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مس مینٹ۔"

"جی۔ مس مینٹ!"

جام صحت پیتے وقت کارٹن اپنے مقابل بیٹھے ساتھی کو ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا پھر خالی گلاس اپنی پشت کی جانب دیوار پر دے مارا۔ پھر گھنٹی بجائی۔ اور دوسرا گلاس لانے کا حکم دیا۔

اندھیرے میں ایسی حسین دوشیزہ کو گاڑی میں سوار کرانے کے لئے سہارا دینا بھی لطف

سے خالی نہیں مسٹر ڈارنے!" اس نے اپنا تازہ جام بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں" ابرو پر ذرا بل ڈال کر تکلف سے جواب دیا گیا۔

"ایسی حسینہ اگر رحم کھائے اور کسی کے لئے آنسو بہائے تو وہ کیا محسوس کرتا ہوگا۔ کیا اس کی خاطر کوئی پھانسی کے مقدمے کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس امید میں کہ کوئی ہمدردی محسوس کرکے آنسو بہائے گا۔ کیوں مسٹر ڈارنے"

ڈارنے پھر بھی خاموش رہا۔

"میں نے آپ کا پیغام پہونچایا تو بہت خوش ہوئیں۔ اپنی خوشی ظاہر تو نہیں ہونے دی، مگر مجھے یقین ہے خوشی ہوئی ہوگی" اس بات کے تذکرے پر ڈارنے کو یاد آیا کہ اس کے عیر دلچسپ ساتھی نے خود اپنی مرضی سے اس کی مشکل میں مدد کی تھی۔ اس نے بات کا موضوع بدل کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

"نہ مجھے کسی شکریہ کی ضرورت ہے اور نہ میں اس کا حقدار ہوں" کارٹن نے بڑی لاپرواہی سے کہا "اس کا اول تو کوئی موقع نہیں تھا۔ دوسرے پتہ نہیں یہ میں نے کیوں کیا۔" مسٹر ڈارنے "ایک سوال پوچھ سکتا ہوں"

"بڑی خوشی سے مگر آپ کی مہربانیوں کا یہ بدلا کیسے ہو سکتا ہے"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میں آپ کو خاص طور پر پسند کرتا ہوں"

"واقعی مسٹر کارٹن، میرے دل میں یہ سوال اٹھا ہی نہیں" ڈارنے نے کچھ جھینپ

"تو پوچھ لیجئے یہ سوال اپنے دل سے"

"آپ ظاہر تو یہی کرتے ہیں مگر میرا خیال ہے آپ مجھے پسند نہیں کرتے"

"میں آپ کی عقل مندی کا قائل ہوتا جارہا ہوں۔ جی ہاں۔ میں آپ کو قطعی پسند نہیں کرتا" کارٹن نے کہا۔

"اس کے باوجود شاید ایسی کوئی بات نہیں کہ ہم بغیر کدورت اور دشمنی کے خداحافظ نہ کہہ سکیں" گھنٹی بجانے کے لئے اٹھتے ہوئے ڈارنے نے کہا۔

"زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں!" کارٹن نے اتفاق کیا۔ ڈارنے نے گھنٹی بجائی ۔۔

"پوری طرح اندازہ لگایا" کارٹن نے کہا۔ جب ڈارنے نے اثبات میں جواب دیا تو کارٹن نے ملازم سے کہا۔

"میرے لئے ایک بوتل شراب اور لاؤ۔ اور مجھے دس بجے جگا دینا"

بل ادا ہوگیا تو چارلس ڈارنے نے اٹھا اور شب بخیر کہا۔ بغیر جواب دیئے کارٹن بھی اٹھا اور جھلا کر کہا "ایک آخری بات اور ڈارنے ۔۔ تمہارا خیال ہے میں پیئے ہوئے ہوں؟"

"میرا خیال ہے آپ نے شراب پی ہے۔ مسٹر کارٹن!"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میں نے شراب پی ہے"

"آپ کہلوانا ہی چاہتے ہیں تو ہاں مجھے معلوم ہے"

"تو پھر تمہیں یہ بھی جاننا پڑے گا کہ میں نے کیوں شراب پی ہے۔ میں ایک ناکام احمق ہوں جناب۔ مجھے دنیا میں کسی کی پروا نہیں۔ اور دنیا میں کسی کو میری پروا نہیں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ کو اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال کرنا چاہئے تھا۔"

"ہاں شاید ایسا ہو سکتا تھا۔ مسٹر ڈارنے۔ ہو سکتا تھا! اپنے سنجیدہ چہرے پر نہ جائیے۔ آپ کو کیا خبر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اچھا شب بخیر!"

جب وہ عجیب آدمی تنہا رہ گیا تو شمع اٹھا کر ایک آئینہ کے سامنے جا کر خاموش غور سے اپنی صورت دیکھنے لگا۔ "کیا وہ تمہیں پسند ہے اپنے ہم شکل کو آخر پسند کرنے کی وجہ۔ تم میں تو پسند کے قابل کوئی خاص بات نہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اوہ۔ لعنت تمہاری صورت پر! تم نے خود میں کون سی تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ واہ واہ کیا عمدہ بات ہے کہ اس شخص کو پسند کیا جائے جو تمہیں محرومیوں کا احساس دلائے۔ اور تم کیا کچھ بن سکتے تھے۔ اس سے جگہ بدل لو ــــ تو کیا وہ حسین نیلی آنکھیں تمہاری طرف اس طرح دیکھیں گی جس طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کیا تمہارے لئے بھی اس کے چہرے پر ویسا ہی کرب طاری ہوگا۔ جیسا اس کی خاطر ہوا تھا۔ اے۔ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ صاف صاف کہہ دو کہ تمہیں اس سے نفرت ہے!"

غم غلط کرنے کے لئے وہ پھر اپنی شراب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند منٹ میں سب ختم کر کے اپنے بازو پر سر ٹکا کر سو گیا ــــ اس کے بال میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ موم کے بہنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شمع اس کے لئے کفن تیار کر رہی ہے۔

پانچواں باب

گیدڑ

وہ پینے پلانے کے دن تھے۔ عام طور پر لوگ بہت زیادہ شراب پیا کرتے تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ عادتیں کتنی سدھر گئی ہیں۔ آج کل ایک شریف انسان بس اتنی شراب پیتا ہے کہ اس کی حالت مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ اس زمانے میں اس مقدار کو دیکھ کر لوگ ہنستے تھے۔ وکیلوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی یقیناً مستی اور مے پرستی کے معاملے میں کسی دوسرے تہذیب یافتہ گروہ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ مسٹر اسٹرائیور جو تیزی سے کندھے مارتے وکالت کے نفع بخش پیشے میں کسی اپنے ہم پیشہ سے پیچھے نہ تھے۔ اس خشک کاروبار کے علاوہ شراب کی تردامنی میں بھی کافی پیش پیش رہتے تھے۔ پرانی کوتوالی میں وہ بہت ہردلعزیز تھے اور سیشن میں بھی ان کا رسوخ تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے کامیابی کے مختلف زینے طے کرنے کے بعد جن سیڑھیوں سے اوپر چڑھے تھے ان ہی کے ڈنڈے کاٹتے جاتے تھے۔ سیشن اور پرانی کوتوالی بڑے چاؤ سے انھیں بازو پھیلا کر اپنی آغوش میں لیتی تھی۔ اور مسٹر اسٹرائیور کا لال چقندر چہرا شاہی عدالت کے لارڈ چیف جسٹس کے سامنے روزانہ کندھے مار کر پہونچ جاتا تھا۔ بہت سے وگ پہنے ہوئے لوگوں کے درمیان ان کا وگ سے ڈھکا ہوا

سر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ایک سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف اونچا ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ والے عضوے گھور رہے ہیں۔

عدالت میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسٹر اسٹرائیور بہت چرب زبان۔ سخت بے مروت نہایت مستعد اور بے جگرے انسان ہیں۔ ان میں بیانات کا نچوڑ نکال لینے کی صلاحیت جو ایک وکیل کے لئے بہت اہم صفت ہے۔ قطعی نہ تھی۔ مگر ایک دم انہوں نے اس میدان میں قابل تعریف ترقی کر لی۔ جتنا زیادہ کام انھیں ملا اتنا ہی تیزی سے ان کی مقدمہ کی تہہ کو پہونچنے کی صلاحیت بڑھی۔ کتنی ہی رات گئے تک وہ سڈنی کارٹن کے ساتھ بیٹھ کر مباحثہ کرتے۔ آخر میں صبح کے وقت سارے ضروری نکات انھیں ازبر یاد ہو جاتے۔

سڈنی کارٹن جو کہ حد سے زیادہ کاہل اور نکما تھا۔ اسٹرائیور کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ وہ دونوں مل کر جتنی شراب ہلاری اور مائیکل میس کے درمیان پی چکے تھے۔ اگر جمع کی جاتی تو ایک شاہی جہاز اس میں تیر سکتا تھا۔ اسٹرائیور کے ہاتھ میں کوئی مقدمہ ایسا نہیں آتا تھا جس میں کارٹن جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے عدالت کی چھت کو گھورتا نہ موجود ہو۔ وہ ایک ہی حلقے میں گھومتے پھرتے تھے۔ اور رات گئے تک دادِ عیش دیا کرتے۔ یہ افواہ اڑا کرتی تھی کہ بارہا دن دھاڑے کارٹن چوری چوری لڑکھڑاتا ہوا آوارہ بلی کی طرح اپنے گھر کی طرف جاتا دیکھا گیا تھا۔ آخر کار ان لوگوں میں جن کا ان سے تعلق تھا یہ بات مشہور ہو گئی کہ گو سڈنی کارٹن خود کبھی شیر نہیں بن سکتا حیرت انگیز حد تک کامیاب گیدڑ ملتا اور جس حیثیت سے اسٹرائیور کی خدمت بجا لاتا تھا

• دس بج گئے صاحب ؛ سرائے کے نوکر نے جس سے اس نے جگانے کو کہہ دیا تھا کہا۔

"دس بج گئے جناب"

"کیا بات ہے"

"دس بج گئے صاحب!"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ رات کے دس بج گئے"

"ہاں صاحب۔ حضور نے جگانے کو کہا تھا"

"اوہ — یاد آگیا — بہت اچھا۔ ٹھیک ہے"

تھوڑی دیر دوبارہ سو جانے کی کوشش کی۔ لیکن نوکر نے نہایت ہوشیاری سے پانچ منٹ تک آگ کرید کر اسے سونے نہ دیا۔ آخر وہ اُٹھ بیٹھا۔ سر پر ہیٹ رکھا اور باہر نکل گیا ٹیمپل میں داخل ہو کر اس نے کنگس، بنچ واک، اور پیپر بلڈنگ کے دو چکر لگائے۔ تازہ دم ہو کر وہ اسٹرائیور کے دفتر میں چلا گیا۔

ان مباحثوں میں اسٹرائیور کا کلرک کوئی مدد نہیں کیا کرتا تھا۔ اس لئے وہ گھر چلا گیا تھا۔ خود اسٹرائیور نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک گون اور سلیپر پہنے تھا۔ تن آسانی کے خیال سے اس کا گلا کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد تھکاوٹ اور پریشانی سے حلقے پڑے ہوئے تھے جو اس طبقہ کے آزاد منش لوگوں کا خاصہ ہے۔ جیفری کے شاہکار سے لیکر آج تک ہر اس قسم کی تصویر میں جو شرابیوں کی زندگی سے متعلق ہے ایسی ہی آنکھیں دکھائی گئی ہیں۔

"اے میرے مجسم حافظے۔ آج تمہیں کچھ دیر ہو گئی؟" اسٹرائیور نے کہا۔

"مقررہ وقت سے شاید پندرہ منٹ کی دیر ہو گئی ہو گی"

وہ ایک تاریک کمرے میں گئے، جس میں کتابیں بکھی ہوئی تھیں۔ اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ آتش دان میں آگ روشن تھی۔ ایک کیل پر کیتلی لٹکی ابل رہی تھی۔ کاغذوں کے انبار کے درمیان بہت سی شراب براندی رم شکر اور لیموں سے لبریز ایک میز چمک رہی تھی۔

"تم نے اپنی بوتل ختم کر لی؟"

"میرے خیال میں آج رات کو دو ہو ئیں۔ میں آج کے موکل کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ یا یہ کہہ لو اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا؟"

"سڈنی تم نے شباہت کا جو نکتہ اٹھایا وہ لاجواب تھا۔ تمہیں کیسے خیال آیا۔ کب یہ بات سوجھی؟"

"مجھے خیال ہوا وہ کافی حسین آدمی ہے۔ اور میں نے سوچا اگر قسمت ساتھ دیتی تو میں بھی قریب قریب ویسا ہی ہوتا۔"

مسٹر اسٹرائیور اتنا ہنسے کہ ان کی قبل از وقت بڑھی ہوئی توند ہلنے لگی۔

"تم اور تمہاری قسمت! کام کرو کام۔"

گیدڑ نے منہ بناتے ہوئے اپنا لباس ڈھیلا کیا۔ دوسرے کمرے میں جا کر ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا سا جگ ایک تسلہ اور ایک دو تولیے اٹھا لایا۔ تولیے پانی میں بھگو کر انہیں تھوڑا سا نچوڑا اور تہہ کر کے نہایت بھونڈے طریقے سے سر پر جمائے اور کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"اب میں تیار ہوں۔"

"آج رات بہت سر کھپانا نہیں پڑے گا۔ اے میرے حافظ" مسٹر اسٹرائیور نے

خوش مزاجی سے کہا اور کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگے۔

"کتنا ہے؟"

"صرف دو مقدمے ہیں؟"

"جو سب سے مشکل ہے پہلے اس سے نمٹیں گے؟"

"یہ لو۔ سڈنی۔ لگے ہاتھوں کام شروع کر دو؟"

پھر شیر صوفے سے پیٹھ لگا کر آرام سے شراب کی میز کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ دوسری طرف گیدڑ اپنی کاغذات سے لدی میز پر بیٹھا تھا۔ بوتل اور گلاس قریب ہی تیار رکھے تھے۔ بار بار دونوں شراب کی میز کی طرف بے تکلفی سے متوجہ ہو جاتے تھے۔ مگر دونوں کا انداز جدا تھا۔ شیر زیادہ تر پیٹی میں ہاتھ ڈالے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ یا تو آگ کو گھورتا یا کوئی ہلکی پھلکی مثل دیکھنے لگتا۔ گیدڑ پیشانی پر شکنیں ڈالے کام میں اس قدر مشغول تھا کہ گلاس کئی منٹ ٹٹولنے کے بعد اسے ملتا اور ہونٹوں تک پہونچتا۔ دو تین بار تو اس قدر مشکل پڑ گئی کہ گیدڑ کو پھر ٹھنڈے پانی میں تولئے ڈبونے پڑے۔ جگ اور تسلے کے پاس چکر لگانے کے بعد جب وہ سر پر تولیا باندھ لیتا تو اس کی سنجیدہ اور پریشان شکل بڑی بھونڈی لگتی۔

آخر کار گیدڑ نے شیر کے لئے نہایت پر تکلف ضیافت طبع کا سامان تیار کر کے اس کے سامنے پیش کر دیا۔ شیر نے نہایت احتیاط سے اسے قبول کیا۔ اس میں سے اپنی پسند سے چھانٹ لیا۔ اس پر اپنی رائے لکھی۔ گیدڑ مدد کرتا رہا۔ جب اچھی طرح بحث مباحثہ ہو چکا تو پھر شیر نے اپنے ہاتھ پیٹی میں ڈال لئے، اور مراقبہ میں چلا گیا۔ گیدڑ نے پھر شراب سے

حلق کو تروتازہ کیا۔ سر پر بھیگا تولیہ جمایا اور دوسری پیش کش کی تیاری میں جٹ گیا۔ وہ بھی اسی طرح شیر کی خدمت میں حاضر کی گئی۔ تین بجے سے پہلے کام ختم نہ ہوا۔

"کام ختم ہوگیا سڈنی اب جام بھرو" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔

گیدڑ نے سر پر سے تولیہ ہٹایا جس میں سے پھر بھاپ نکلنے لگی تھی۔ جھرجھری لی۔ جمائی لی۔ کانپا اور شراب انڈیلنے لگا۔

"آج سرکاری گواہوں کے معاملے میں تم بہت پختہ کار ثابت ہوئے سڈنی۔ ہر سوال تیار کر دیا گیا تھا۔"

"کیا میں ہمیشہ پختہ کار ثابت نہیں ہوتا؟"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔ مزاج اتنا برہم کیوں ہو رہا ہے آج۔ شراب پیو درست ہو جائے گا۔"

شیر معذرت کے طور پر غرایا اور گیدڑ نے حکم کی تعمیل کی۔

"وہی پرانے شریوزبری اسکول کا پرانا سڈنی کارٹن!" اسٹرائیور نے اس کے ماضی اور حال کا معائنہ کرتے ہوئے سر ہلا کر کہا: "وہی ڈھل مل یقین سڈنی۔ گھڑی میں اوپر گھڑی میں نیچے۔ ابھی چہک رہے ہیں۔ ابھی دل گرفتہ!"

"آہ — ہاں وہی سڈنی اور وہی اس کا نصیب۔ اس زمانہ میں بھی میں دوسرے لڑکوں کے سوال حل کیا کرتا تھا۔ مگر اپنے شاذ ہی کرتا تھا۔" سڈنی نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"مگر کیوں؟"

"خدا جانے — میرا یہی طریقہ تھا شاید۔"

وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے سامنے پیر پھیلائے بیٹھا آگ کو گھور رہا تھا۔

"کارٹن" اس کے دوست نے اپنے کندھے چوڑے کئے اور ایسے اس کی طرف دیکھا جیسے آتش دان وہ بھٹی ہے جس میں مضبوط ارادے تپا کر ڈھالے جاتے ہیں۔ اور شریوزبری کے سڈنی کارٹن کے لئے سب سے نازک اور اہم بات یہ تھی کہ اسے کندھے پکڑ کر اس میں گھسیٹ دیا جائے۔

"کارٹن تمہارا راستہ ہمیشہ گھسٹتے گذرا۔ اور ایسی ہی گھسٹتے گذرے گا۔ تم کوئی مقصد نہیں رکھتے اور نہ سرگرمی سے کام کرتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔"

"اونہہ لعنت ہے! اب لکچر مت شروع کر دینا" سڈنی نے خوش دلی سے ہنس کر کہا۔

"جو کچھ میں نے کیا ہے۔ وہ کیونکر کیا ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں وہ کیونکر کرتا ہوں" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔

"میرے خیال میں کچھ تو مجھے پیسے دے کر کام کروا لیتے ہو۔ مگر مجھے نصیحت کرنا فضول ہے۔ میرے لئے اب یہ ہوائی باتیں کسی کام کی نہیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لیتے ہو۔ تم ہمیشہ پہلی صف میں رہتے ہو۔ میں ہمیشہ پیچھے رہا۔"

"میں اپنی کوششوں سے اگلی صف میں پہونچا۔ کیا میں وہاں ہی پیدا ہوا تھا؟"

"میں اس مبارک موقع پر موجود نہیں تھا۔ مگر میری رائے میں تم اگلی صف میں پیدا ہوئے تھے۔" اس پر وہ ہنس پڑا، اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

"شریوزبری سے پہلے اور شریوزبری میں اور شریوزبری کے بعد سے اب تک تم اپنے مرتبہ پر پہونچے اور میں اپنی جگہ آن پڑا۔ اس وقت بھی جب کہ ہم دونوں پیرس کے طلبا کے بورڈنگ میں فرانسیسی زبان۔ فرانسیسی قانون اور فرانسیسی تہذیب کے دستر خوان کے گرے پڑے ٹکڑے چن رہے تھے جو بعد میں ہمارے کام بھی نہ آئے۔ تم ہمیشہ کسی مقام پر پہونچ جاتے تھے اور میں — میں کہیں بھی نہ تھا۔"

"اس میں قصور کس کا تھا؟"

"اپنی قسم۔ یقین نہیں آتا کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہ تھا۔ تم ہر وقت بھاگ دوڑ دھکا پیل میں جٹے ایسے بے قرار رہتے تھے کہ میرے لئے سوائے سستی اور کاہلی میں غرق ہو کر زنگیا جانے کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ صبح صبح ماضی کے تاریک پہلوؤں کو یاد کرنے کوفت ہوتی ہے۔ جانے سے پہلے کوئی ایسی بات کرو کہ طبیعت کا رخ بدل جائے۔"

"اچھا — تو پھر حسین گواہ کا جام صحت پلاؤ۔" اسٹرائیور نے گلاس اٹھا کر کہا۔
"کیوں اب تو طبیعت بحال ہو گئی۔"

"حسین گواہ! آج دن کو بھی اور رات کو بھی کافی گواہوں سے پالا پڑا۔ تمہارا خوبصورت گواہ کون ہے۔" وہ اپنے گلاس میں دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

"شاندار ڈاکٹر کی بیٹی — مس مینٹ!"

"وہ اور خوبصورت؟"

"کیوں کیا وہ خوبصورت نہیں؟"

"نہیں!"

"اماں دماغ چل گیا ہے آج ساری عدالت اس پر لٹو ہو گئی تھی؟"

"ساری عدالت کی یہی ایک ہی کہی۔ پرانی کوتوالی کو حُسن پرکھنے کا ماہر کس نے مقرر کردیا وہ تو بس ایک سنہرے بالوں والی گڑیا تھی؟"

"جانتے ہو سڈنی؟" مسٹر اسٹرائیور نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے آہستہ سے اپنے لال چقندر چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا "جانتے ہو مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا جیسے تمہیں سنہرے بالوں والی گڑیا پر رحم آرہا ہے۔ اور تم نے فوراً دیکھ لیا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے؟"

"فوراً دیکھ لینے کی خوب رہی۔ ارے بھئی کوئی لڑکی چاہے وہ گڑیا ہو یا نہ ہو ایک آدمی کی ناک سے گز دو گز کے فاصلے پر بیہوش ہو جائے تو اسے دیکھنے کے لئے دوربین لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جام پلائے دیتا ہوں۔ مگر حسین ہونے کے بارے میں مجھے اتفاق نہیں۔ اب میں اور زیادہ نہیں پیوں گا۔ نیند آرہی ہے؟"

جب سڈنی کارٹن کے میزبان نے ایک شمع کی مدد سے زینہ پر روشنی دکھا کر اسے نیچے پہونچایا تو وہ سرد مہری سے کھڑکیوں میں سے جھانک رہا تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو ہوا سرد اور غمگین تھی۔ آسمان گدلا اور دریا تاریک اور دھندلا ہو رہا تھا فضا ایک مردہ ریگستان

کی مانند اُداس سی صبح کی تُند ہوائیں ریت کے بگولوں کو فضا میں چک پھیریاں دے رہی تھیں۔ جیسے کہ دُور ریگستان کی دھول اٹھ رہی ہو اور اس کے غبار نے بڑھ کر شہر کو اپنے قابو میں لے لیا تھا۔

اس کے دل کی تمام طاقتیں مردہ تھیں۔ چاروں طرف ریگستان تھا۔ وہ سنسان چھت پر سے گذرتے وقت چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ سامنے صحرا میں اس کی بہترین خواہشات دنیا کی لذتوں سے احتراز اور ارادے کی پختگی۔ ایک سراب کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اس کے خوابوں کے حسین شہر کے ہوادار جھروکوں میں سے حسن و رعنائی اس کی طرف متوجہ تھیں ــــ وہ باغ تھے ــــ جو زندگی کے پکے پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ امید کے چشمے اس کی آنکھوں میں چھلک رہے تھے۔ ایک لمحہ جھلک دکھا کر سب کچھ غائب ہو گیا۔ کوئیں کی طرح بنے ہوئے گھروں میں سے ایک زینے پر وہ چڑھتا چلا گیا۔ بے ترتیب بستر پر گر پڑا، اور اس کا تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا سورج طلوع ہوا۔ دنیا میں شاید ہی اتنا غم کا مارا انسان ہوگا۔ جتنا کہ وہ تھا۔ سڈنی کارٹن بہترین صلاحیتوں کا مالک لائق فائق انسان تھا۔ مگر ساری خوبیاں غلط راستے پر رواں دواں تھیں۔ اور وہ اس قابل نہ تھا کہ ان کو سیدھے راستہ پر موڑ سکے۔ خود اپنی مدد سے قاصر۔ مسرتوں سے محروم۔ اسے اپنی محرومیوں کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا یہ غم اسے ایک دن ڈس کر ہی چھوڑیں گے۔ وہ مٹ جائے گا اور اسے کوئی پرواہ نہ تھی!

چھٹا باب

سیکڑوں آدمی

سوہو اسکوائر کے قریب ایک خاموش گلی میں ڈاکٹر مینٹ کا پرسکون مکان واقع تھا۔ اتوار کی ایک خوشگوار دوپہر کو مسٹر جارویس لاری جو کلوکین ویل میں رہتے تھے ڈاکٹر کے ساتھ کھانا کھانے ان کے گھر جا رہے تھے۔ ڈارنے کے خلاف غداری کے مقدمہ کو ختم ہوئے چار ماہ گذر چکے تھے۔ اور لوگوں کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اور بھول بھال چکے تھے۔ مسٹر لاری کچھ دن کاروبار کے سلسلہ میں مشغول رہے۔ اور اب ڈاکٹر سے ان کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی تھی۔ اور وہ اکثر ان کے پُرسکون مکان میں زندگی کے بہترین لمحے گذارنے آجایا کرتے تھے۔

اس خوشگوار اتوار کو مسٹر لاری تین وجوہات کی بنا پر جا رہے تھے جو ان کی عادت ثانی بن چکی تھی۔ اوّل تو یہ کہ ہر خوشگوار اتوار کو وہ ڈاکٹر اور لوسی کے ہمراہ چہل قدمی کے عادی تھے۔ دوسرے ناخوشگوار اتوار کو وہ عموماً وہاں خاندان کے دوست کی حیثیت سے جایا کرتے تھے۔ بات چیت مطالعہ کرتے اور کھڑکی سے باہر کے نظارے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اور یوں دن بیت جایا کرتے تھے۔ تیسرے ان کی اپنی نجی گتھیاں تھیں۔

جنہیں سوچ بچار کے بعد سلجھانے کے لئے ڈاکٹر کے گھر کا ماحول بہت موزوں ثابت ہوتا تھا۔ جہاں ڈاکٹر کا مکان تھا وہ جگہ بھی ایسے عجیب و غریب کونے میں تھی جس کا لندن میں ملنا محال تھا۔ اس میں سے گذر کر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈاکٹر کے گھر کی سامنے والی کھڑکیوں سے سڑک کا خاموش اور پرسکون منظر دکھائی دیتا تھا اس وقت وہاں بہت کم عمارتیں بنی تھیں۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے شمال میں جنگلی درخت اور پھول بہار پر تھے۔ ان کھیتوں میں کنٹیلی جھاڑیاں پھولوں سے لدی رہتی تھیں۔ آجکل تو ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ گاؤں کی تازہ ہوائیں چرچ کے مہذب علاقے میں گھٹ کر بیٹھنے کے بجائے ایک خانماں برباد بھکاری کی طرح زنانٹے سے سو ہو میں اٹکھیلیاں کیا کرتی تھیں جنوبی دیواروں پر موسم کے دنوں میں آڑو پکا کرتے تھے اس گوشے میں صبح سویرے تو موسم سرما کی دھوپ آتی تھی۔ مگر جب سڑک پر گرمی ہونے لگتی تو یہ حصہ چھاؤں میں ہو جاتا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ گھور اندھیرا چھا جاتا۔ کیونکہ اندر چھاؤں میں بیٹھ کر باہر پھیلی ہوئی چمکیلی دھوپ بخوبی نظر آتی تھی۔ جگہ کافی خنک مگر زندگی کی سرگرمی سے خالی نہ تھی۔ یہ جگہ آواز بازگشت کے لئے بہت ہی موزوں مقام اور سڑکوں کے ہنگاموں سے بچاؤ کے لئے بہترین کمینگاہ تھی۔

اس گلی میں یہ گھر بندرگاہ میں سکون سے ٹھیری ہوئی کشتی کی مانند تھا اس وسیع اور آرام دہ مکان کی دو منزلیں ڈاکٹر نے کرائے پر لے رکھی تھیں۔ دوسرے حصوں میں مختلف قسم کے کاروبار ہوتے تھے۔ مگر دن میں بھی شور و غل نہیں ہوتا تھا۔ اور رات کو سب اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ پچھواڑے کی ایک عمارت میں آرگن بنائے جاتے تھے۔ ادھر جانے کے لئے صحن میں سے گذرنا پڑتا تھا جہاں ایک حسین سائے دار درخت تھا جس کی پتیاں ہوا میں آہستہ آہستہ

سرسرایا کرتی تھیں۔ یہاں چاندی کی صفائی بھی کی جاتی تھی۔ ہال کے سامنے دیوار پر ایک نہایت پُراسرار دیوزاد کی تصویر بنی تھی۔ یہ لحیم شحیم ہاتھ میں ہتوڑا لئے سونا کوٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جن نے کوٹ کوٹ کر اپنے جسم کو سونے میں تبدیل کر دیا ہے اور اب اس بات کا منتظر ہے کہ ہر آنے جانے والے کو کوٹ کر سونا بنا ڈالے۔

ایک خاموش سا کرائے دار بالائی منزل پر رہتا تھا اس کے پیشے کے متعلق کسی کو کچھ خبر نہ تھی نیچے کے حصے میں گاڑیوں پر سجاوٹ کے لئے جھالریں اور بیل بوٹے بنانے والے کا دفتر تھا مگر اس کے متعلق بھی کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

کبھی کوئی بھولا بھٹکا کاریگر کوٹ پہنتا ہوا ہال میں سے گذر جاتا یا اکا دکا اجنبی ادھر اُدھر جھانکتا دکھائی دے جاتا۔ دُور سے دھماکوں کی آواز دیوزاد کے ہاتھ میں تھامے ہوئے ہتوڑے سے نکلتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ ان باتوں کی تفصیل سے صرف یہ بات ثابت کرنا مقصود ہے کہ اتوار کو یہ جگہ ایسی پُرسکون تھی کہ صبح سے لے کر شام تک گوریاں گھر کے پچھواڑے پیڑ پر مزے سے من مانی کیا کرتیں اور گھر کے سامنے والے حصے میں آواز بازگشت گونجا کرتی۔

ڈاکٹر کی کچھ پرانی شہرت کام آئی کچھ ان کی کہانی سنکر لوگوں سے میل ملاقات بڑھی۔ اس لئے واقفیت کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ وہ مریضوں کا بھی دام میں علاج کیا کرتے تھے۔ سائنسی معلومات، مہارت، ہوشیاری اور نئے نئے تجربات کی بنا پر ان کی خاصی مانگ تھی اور وہ جتنا چاہتے آسانی سے کما سکتے تھے۔

مسٹر لاری ان باتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور جب ایک خوش گوار اتوار کو

اس پُرسکون گوشہ والے گھر کی گھنٹی بجائی تو وہ انھیں باتوں کے بارے میں سوچ رہے تھے

"ڈاکٹر مینیٹ گھر پر ہیں؟" دروازہ کھلنے پر انہوں نے پوچھا۔

"بس آتے ہی ہوں گے"

"مس لوسی؟"

"وہ بھی آتی ہوں گی"

"مس پروس گھر پر ہیں؟"

مس پروس کے گھر پر رہنے کا قطعی امکان تھا۔ مگر ملازمہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنی موجودگی کا اظہار کرنا پسند کریں گی یا نہیں۔ لہذا وہ ان سے اجازت لئے بغیر ہاں یا نا کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

"خیر چونکہ میں تو گھر میں آ ہی گیا ہوں اس لئے میں ادھر جا کر بیٹھتا ہوں۔"

حالانکہ ڈاکٹر کی بیٹی کو اپنے وطن کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ پھر بھی قدرتی طور پر اس میں کفایت شعاری کی صلاحیت تھی۔ جو فرانس کی سب سے کارآمد اور قابل تعریف خاصیت ہے۔ فرنیچر سادہ تھا لیکن چھوٹی موٹی کم قیمت مگر با مذاق سجاوٹ کی چیزوں سے بہت خوشگوار فضا پیدا کر دی گئی تھی۔ کمرے کی ہر چھوٹی بڑی شے کا چناؤ اور رنگوں کی آمیزش کسی کے نازک ہاتھوں، تیز نظر اور ذہن رسا کی مرہون منت تھی۔ چھوٹی اور سستی چیزوں سے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نازک اور خوبصورت سجاوٹ سے ترتیب دینے والی کے حسن اور نزاکت کا پتہ چلتا تھا۔ مسٹر لاری کھڑے ان چیزوں کو دیکھ رہے تھے جیسے میز اور کرسیاں

بذات خود زبان حال سے پوچھ رہی تھیں۔ آیا وہ انھیں پسند ہیں یا نہیں۔

اس منزل پر تین کمرے تھے جن کے سب دروازے ہوا کی خاطر کھلے ہوئے تھے۔ ہر طرف انھیں صاحب خانہ کا عکس نظر آرہا تھا۔ اور وہ زیر لب مسکراتے ایک سے دوسرے کمرے میں گئے پہلا کمرہ سب سے بہتر تھا۔ اس میں لوہے کی چڑیاں، کتابیں، پھول اور ڈیسک، کام کرنے کی میز اور رنگوں کا ڈبہ رکھا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر کا معائنہ کا کمرہ تھا۔ وہی کھانے کے کمرے کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا تیسرا ڈاکٹر کا سونے کا کمرہ تھا۔ پیڑ کی پتیوں میں سے چھن چھن کر دھوپ کی کرنیں کمرے کو منور بنا رہی تھیں وہیں ایک کونے میں جوتے پہننے کے سامان کی میز لگی تھی جس پر اوزار رکھے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے پیرس میں سینٹ اسٹائن کے شراب خانے کی پانچویں منزل پر کالی کوٹھری میں رکھے تھے۔ "تعجب ہے وہ اپنے دکھوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس سامان کو رکھے ہوئے ہیں" مسٹر لاری نے رک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے" اچانک سوال کیا گیا اور وہ چونک پڑے۔

سرخ وحشی خاتون مس پروس بولیں جن کے مضبوط ہاتھوں کا کس بل ڈوور کے رائل جارج ہوٹل میں وہ دیکھ چکے تھے۔

"میرا خیال تھا ___" مس لاری کہنے لگے۔

"کیا خاک تھا آپ کا خیال ___" مس پروس نے کہا اور مسٹر لاری کا منھ بند ہوگیا۔

"کیا حال چال ہیں" خاتون نے رکھائی سے پوچھا مگر اس سے ظاہر ہوتا تھا انھیں مسٹر لاری سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔

"میں — اچھا ہوں — شکریہ آپ کا" مسٹر لاری نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ تو اچھی ہیں؟"

"ہاں۔ بس زندہ ہیں!"

"واقعی! کیوں؟"

"کچھ نہیں — اپنی بیٹیا کی طرف سے جی پریشان ہے؟"

"واقعی؟"

"ارے بے خدا کا واسطہ۔ واقعی کے علاوہ اور کچھ کہنے کو نہیں ہے آپ تو واقعی کہہ کے میرا دماغ لوٹا دیں گے؟"

مس پروس نے کٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"حقیقت میں پھر"

حقیقت میں یہ تو اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ پھر بھی خیر — ہاں میں بہت پریشان ہوں۔

"وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟"

"میں نہیں چاہتی کہ درجنوں آدمی جو پیاری بٹیا کے لائق نہیں۔ ان سے ملنے آئیں؟"

"کیا کوئی دو درجن آچکے ہیں؟"

"ارے آپ دو درجن لیے پھرتے ہیں۔ ارے سیکڑوں کہیے؟"

موصوفہ کو ہر بات بڑھا چڑھا کر کہنے کا مرض تھا۔ نہ اس سے پہلے ایسے لوگوں کی کمی تھی اور نہ آج ہے۔

"یا خدا!" مس پروس کے سامنے خدا کا نام لینے ہی میں خیریت تھی۔

"اتنے سال میں پیاری بٹیا کے ساتھ رہی ہوں۔ یا وہ میرے ساتھ رہی ہیں۔ وہ ایک ہی بات ہے۔ مجھے ان کا خرچہ ملتا رہا ہے۔ اگر مجھ میں ان کا اور اپنا خرچہ اٹھانے کی سکت ہوتی تو ایک کوڑی بھی نہ لیتی۔ خیر اس وقت تو وہ دس برس کی تھی مگر اب ۔۔۔ اب بڑی مشکل آن پڑی ہے" مس پروس نے کہا۔

مسٹر لاری کی قطعی سمجھ میں نہیں کہ یہ بڑی مشکل کون سی آن پڑی تھی۔ انھوں نے اپنے جسم کا سب سے مقدس حصہ یعنی سر ہلا دیا۔ تاکہ یہ جادو کا لبادہ مس پروس جس جواب کو موزوں سمجھیں اس پر منڈھ لیں۔

"نہ جانے کون کون لوگ جو کسی صورت سے بھی میری لاڈلی بٹیا کے قابل نہیں گھسے چلے آتے ہیں اور یہ شروعات آپ نے کی تھی" مس پروس نے کہا۔

"میں نے شروعات کی مس پروس؟"

"یہ آپ نے نہیں کی شروعات ان کے باپ کو کون دوبارہ زندہ کر کے لایا؟"

"اوہ ۔۔۔ اگر آپ اسے شروعات کہنا کہتی ہیں تو ۔۔۔"

"تو آپ کے خیال میں یہ شروعات نہیں تو کیا خاتمہ تھا۔ جب آپ نے ایک بات شروع کی تو اچھی خاصی مصیبت کھڑی ہو گئی" مس پروس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "میں یہ نہیں کہتی کہ ڈاکٹر مینٹ میں کوئی عیب ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ وہ ایسی بیٹی کے اہل نہیں۔ کسی حال میں بھی کسی کو ان کے اوپر کسی قسم کا الزام رکھنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مگر ان کے

بعد یہ تو بڑی مصیبت ہوگئی ہے کہ جتھے کے جتھے چلے آرہے ہیں ۔ اگر باپ مجھ سے پیاری بیٹی کی محبت چھین لے تو خیر ایک دفعہ میں معاف بھی کر سکتی ہوں ۔۔۔ مگر ۔۔۔"

مسٹر لاری بخوبی واقف تھے کہ مس پروس بڑی جلدی رشک کرنے لگتی ہیں ۔ مگر اب تو وہ انہیں بہت اچھی طرح سمجھنے لگے تھے ۔ انھیں ان سے یہ قطعی امید نہ تھی کہ وہ ان عورتوں میں سے ہوں گی ۔ جو اپنی جوانی کھو دینے کے بعد کسی نوجوان کی غلام ہو رہتی ہیں ۔ اور خود چونکہ بدصورت ہیں اور قسمت نے ان کو یہ نعمتیں نہیں بخشیں ۔۔۔ اور نہ حسین امیدیں ان کی تاریک زندگیوں میں روشن ہو سکیں اس لیے وہ کسی ایسی ہستی کی پوجا کرنے لگتی ہیں جو ان خوبیوں کی مالک ہو ۔ اور اس طرح اپنی محرومیوں کو فراموش کر دیتی ہیں ۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی اور اچھی طرح جانتے تھے کہ جو خدمت دل کی گہرائیوں سے کی جاتی ہے ۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ۔ خاص طور پر جب اس میں روپے پیسے کا لالچ نہ شامل ہو ۔ ان کے دل میں اس بات کی اتنی وقعت تھی کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مس پروس کا مقام کسی چھوٹے موٹے فرشتے سے کسی طرح کم نہیں ۔ اور یقیناً ان خواتین سے تو بہت بلند ہے جن کا ٹیلسن بینک میں کھاتہ کھلا ہوا تھا ۔

" اگر میرے بھائی سالومن نے زندگی میں ایک حماقت نہ کی ہوتی تو بس دنیا میں وہی ایک ایسا انسان تھا جو پیاری بٹیا کے لئے موزوں ثابت ہوتا ۔ اس کے علاوہ نہ کوئی دوسرا ہے اور نہ ہو سکتا ہے " مس پروس نے کہا ۔

اس معاملے میں بھی مسٹر لاری کو مس پروس کی نجی کہانی کا علم تھا ۔ ان کا بھائی سالومن انتہائی کمینہ اور بدمعاش آدمی تھا ۔ اور مس پروس کا سارا روپیہ پیسہ اڑا کر انھیں کنگال بنا چکا تھا

اور نہایت بے مروتی سے انھیں کوڑی کوڑی کو محتاج بنا کر غائب ہو گیا تھا۔ مگر مس پروس کو اب بھی سالومن پر مکمل اعتبار تھا۔ اس غلطی کو وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ ان کی رائے میں وہ اب بھی کافی معزز انسان تھا۔ مگر مسٹر لاری اس کی بد ذاتیوں کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کی اس خوش فہمی سے قطعی متاثر نہیں تھے۔

"اس وقت ہم دونوں اکیلے ہیں۔ ہم دونوں ہی کاروباری انسان ہیں۔ آج میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں" مسٹر لاری ڈرائنگ روم میں آکر نہایت بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے بولے "کیا کبھی لوسی سے بات چیت کے سلسلے میں وہ اس زمانے کا ذکر بھی کرتے ہیں جب وہ جوتے بنایا کرتے تھے؟"

"کبھی نہیں"

"تو پھر وہ بنچ اور سارا سامان کیوں اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں"

"شاید وہ اپنے دل میں ضرور سوچا کرتے ہیں" مس پروس نے سر ہلا دیا۔

"آپ کو پختہ یقین ہے کہ وہ اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتے ہیں"

"ہاں"

"کیا ——— آپ یہ سوچتی ہیں ——— کہ"

"میں سوچا نہیں کرتی ——— مجھ میں سوچنے سمجھنے کا بوتا ہی نہیں"

"غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ خیال کرتی ہیں ——— کبھی کبھی اتنا خیال تو آتا ہے"

"ہاں کبھی کبھی"

"کیا آپ کے خیال میں ڈاکٹر کا خود کوئی اندازہ ہے کہ ان پر یہ مصیبت کس وجہ سے ٹوٹی۔ کیوں اتنے سال دکھ جھیلے۔ نیز اپنے اس دشمن کا نام یاد ہے جس نے ان کے اوپر یہ ظلم نازل کیا" مسٹر لاری نے آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی چمک پیدا کر کے نرمی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں سوائے اس کے جو میری پیاری بٹیا بتا دیتی ہیں اور کچھ نہیں سوچا کرتی"

"اور وہ کیا بتاتی ہیں"

"ان کا خیال ہے کہ یاد ہے"

"غصہ نہ ہو جائیے گا کہ میں آپ سے سوال پہ سوال کئے جا رہا ہوں۔ میں ایک کوڑھ مغز کاروباری آدمی ہوں اور آپ بھی کاروباری خاتون ہیں"

"کوڑھ مغز بھی؟" مس پروس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"نہیں نہیں — یہ صفت آپ کے لئے نہیں" مسٹر لاری گھبرائے کہ ناحق کوڑھ مغزی کا ذکر چھڑ گیا۔

"ہاں تو معاملہ کی بات کرنا چاہیے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ڈاکٹر منیٹ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بالکل بے قصور تھے۔ تو پھر وہ اس سلسلے میں خاموش کیوں ہیں۔ خیر مجھ سے نہ سہی۔ حالانکہ مجھ سے پرانے کاروباری تعلقات ہیں اور اب ہم خاصے بے تکلف ہیں۔ مگر اپنی پیاری بیٹی سے تو کہا ہوتا جس سے وہ اتنی شدید محبت کرتے ہیں۔ اور جو خود ان سے اتنی محبت

کرتی ہے۔ مس پروس یقین مانئے میں یونہی کھوج لگانے کے لئے یہ باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ مجھے گہری دلچسپی ہے ان سے "

"میرے قیاس کے مطابق اور میرا قیاس سو فی صدی درست ہی سمجھئے۔ اصل میں وہ اس موضوع سے ڈرتے ہیں" مس پروس نے ذرا انکساری سے نرم آواز میں کہا۔

"ڈرتے ہیں؟"

"صاف ظاہر بات ہے کہ وہ کیوں ڈرتے ہوں گے۔ اس زمانے کی یاد دہانی سے بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ اور پھر اسی وجہ سے وہ خود کو بھول گئے تھے۔ انھیں پتہ بھی نہیں کہ کیسے انھوں نے خود کو گم کر دیا تھا اور پھر کیسے پالیا۔ انھیں ہمیشہ پھر خود کو کھو دینے کا خوف لگا رہتا ہوگا۔ میرے خیال میں یہی وجہ پریشان کر دینے کے لئے کافی ہو سکتی ہے "

مسٹر لاری کو اتنے پتہ کی بات سننے کی امید نہ تھی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ اگر دل کے اس تار کو چھو لو۔ ان کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اس سے تو بہتر ہے کہ ذکر ہی نہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ آپ کو اچھا لگے یا برا، اس بات کو نظر انداز کرنا پڑے گا کبھی کبھی وہ رات کو اٹھ کر اپنے کمرے میں مسلسل ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیاری بٹیا کو پتہ چل جاتا ہے کہ اپنے تخیل میں وہ اپنے پرانے قید خانے میں ٹہلے جا رہے ہیں۔ متواتر ٹہلے جا رہے ہیں۔ وہ جلدی سے ان کے پاس پہونچ جاتی ہیں۔ پھر دونوں ٹہلنے لگتے ہیں اور ٹہلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں سکون مل جاتا ہے۔ نہ وہ اپنی وحشت کے بارے میں بتاتے ہیں اور نہ وہ اس سے اس بارے میں کچھ پوچھتی ہے بس خاموش وہ دونوں ٹہلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس کی محبت اور قربت سے ڈاکٹر کو سکون

سنتا ہے اور خود فراموشی دُور ہو جاتی ہے۔"

مس پروس اپنے تخیل کے وجود سے انکار کرتی تھیں۔ مگر بار بار ٹہلنے کے لفظ کی تکرار سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں اس اکتا دینے والی حالت سے کتنا دکھ اور وحشت ہوتی تھی اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان میں تخیل کی کمی نہیں۔ گلی کا یہ گوشہ آواز بازگشت کے لئے ایک لاجواب مقام مانا جاتا ہے آنے والے قدموں کی چاپ ایسے گونجنے لگی جیسے ان کے ذکر نے انھیں پھر چلنے پھرنے پر مقرر کر دیا ہو۔

"وہ لوگ آگئے۔ اب جلد ہی سینکڑوں آدمی آنا شروع ہو جائیں گے۔"

اس کونے میں آواز اس قدر صاف گونجتی تھی کہ وہاں کھڑے ہو کر سننے والے کی قوت سماعت بہت تیز ہو جاتی تھی۔ مسٹر لاری باپ اور بیٹی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تو ان کے آنے سے بہت قبل ان کے پیروں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا پھر واپس لوٹ گئے کبھی ان کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ان نئے قدموں کی آہٹ بھی شامل ہو جاتی جو کبھی نظر نہ آتے تھے۔ اور جب بالکل قریب آجاتے تو ہمیشہ کے لئے یہ آہٹ گم ہو جاتی تھی۔ بالآخر باپ اور بیٹی دونوں آگئے۔ مسٹر لاری انھیں خوش آمدید کہنے دروازے پر موجود تھے۔

مس پروس کی حالت قابل دید تھی۔ حد سے زیادہ گھبرائی ہوئی لال منہ کئے وہ نہایت گم سم ہو گئی تھیں۔ جب ان کی لاڈلی اوپر آئی تو انھوں نے اس کی ٹوپی اتاری۔ اسے رومال کے کونے سے جھاڑا پونچھا۔ اس کا لبادہ جھاڑ جھٹک کر تہہ کیا۔ اور اس کے خوبصورت بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا مگر وہ خود حسین ترین اور انتہائی خود پسند ہوتیں اور یہ ان کے اپنے حسین بال ہوتے تو بھی وہ شاید اسی طرح غرور سے ان پر ہاتھ پھیرتیں۔ ان کی لاڈلی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کی اتنی توجہ سے احسان مند

ہو کر پہلے تو انھیں گلے لگا کر شکریہ ادا کیا پھر اس نے احتجاج کیا کہ وہ اس کی اتنی فکر کیوں کرتی ہیں لیکن یہ فقرہ بڑے ہلکے پھلکے مذاق کے انداز میں کہا گیا۔ ورنہ مس پروس کے دل پر چوٹ لگتی اور وہ برامان جاتیں۔ اور اپنے کمرے میں جاکر رونے لگ جاتیں۔ ڈاکٹر بھی بڑے خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ وہ دونوں کو دیکھ کر مس پروس سے کہہ رہے تھے کہ وہ اس کا دماغ خراب کر دیں گی حالانکہ جن نظروں سے وہ اسے دیکھ کر بات کر رہے تھے وہ کچھ کم دماغ خراب کرنے والی نہ تھی بلکہ اگر ممکن ہوتا تو ان آنکھوں میں یہ جذبہ کچھ مس پروس سے زیادہ ہی ہوتا۔ مسٹر لاری بھی کچھ کم قابل دید نہیں تھے وہ اپنا چھوٹا سا وگ پہنے تھے ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی کنواری قسمت کو سراہ رہے تھے۔ کہ ان کی بدولت انھیں آخری وقت میں اس پُرسکون گھر سے لگاؤ اور قربت نصیب ہوئی۔ مگر یہ منظر دیکھنے سیکڑوں آدمی قطعی نہیں آئے۔ اور مسٹر لاری مس پروس کی پیشینگوئی کے سچ ثابت ہونے کا انتظار ہی کرتے رہے۔

کھانے کا وقت ہو گیا اور وہ سیکڑوں انسان نازل ہوئے۔ اس چھوٹے سے گھر کی دیکھ بھال میں نچلے حصّہ کا انتظام مس پروس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں۔ ان کے بنائے ہوئے کھانے نہایت سادہ مگر مزے دار ہوتے تھے۔ اور بڑے سلیقے سے سجائے جاتے تھے۔ کچھ فرانسیسی کچھ انگریزی ترکیبوں کے میل سے وہ لاجواب چیزیں تیار کیا کرتی تھیں۔ مس پروس کی دوستیاں عموماً نہایت غیر جذباتی قسم کی ہوتی تھیں۔ انہوں نے سارے سوہو کو کھوج ڈالا۔ اور ایسے غریب فرانسیسی لوگوں کا پتہ چلا لیا جنہیں شلنگ دو شلنگ کا لالچ دیکر فرانسیسی فواکہات تیار کرنے کے راز معلوم کئے جاسکتے تھے۔ گال کے ان انحطاط پذیر

بیٹوں اور بیٹیوں سے انھوں نے ایسے ایسے لاجواب فن حاصل کر لئے کہ ماما انھیں کسی جادوگرنی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ بالکل سنڈریلا کی سرپرست پری کی طرح وہ باغ سے کوئی بھی ترکاری خرگوش یا مرغی منگا لیتیں اور جی چاہے جیسی قاب تیار کر دیتی تھیں۔

ہر اتوار کو مس پروس ڈاکٹر کی میز پر کھانا کھایا کرتیں مگر باقی دنوں وہ نامعلوم اوقات پر یا تو نچلی منزل میں اپنا کھانا لے جانے پر مصر ہوتیں یا دوسری منزل پر اپنے نیلے کمرے میں کھاتیں جہاں سوائے لاڈلی بیٹی کے اور کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ان موقعوں پر وہ اس کی بہت خاطر کرتی اور وہ اپنی پیاری بیٹی کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر پگھل جاتیں اور کھانا بہت ہی خوشگوار بن جاتا۔

اس دن فضا میں بڑی گھٹن تھی۔ اور لوسی کی رائے ہوئی کہ کھانے کے بعد کھلی ہوا میں پیڑ کے نیچے شراب لے جا کر اس سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ چونکہ سب کی توجہ لوسی کی طرف ہوا کرتی تھی اور ہر ایک اسی کو خوش کرنا چاہتا تھا اس لئے سب پیڑ کے نیچے چلے گئے۔ لوسی مسٹر لاری کا جام اپنے ہاتھ سے لے گئی۔ کچھ دنوں سے لوسی نے مسٹر لاری کے ساقی کی خدمات اپنے ذمے لے لی تھی۔ اور جتنی دیر وہ بیٹھے باتیں کرتے رہتے وہ ان کا جام بھرتی رہی۔ پُراسرار گھروں کی پشت ان کی طرف تھی۔ وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اور ان کے سروں پر درخت اپنی زبان میں سرگوشیاں کرتا رہا۔

اب بھی سیکڑوں اشخاص نے حاضری نہیں دی۔ جب وہ پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے تو مسٹر ڈارنے تشریف لائے اور وہ اکیلے ہی تھے۔

ڈاکٹر مینٹ اور لوسی ان سے بڑے تپاک سے پیش آئے۔ لیکن فوراً مس پروس کے سر اور جسم میں جھٹکے آنے شروع ہوگئے۔ اور وہ اندر چلی گئیں۔ انھیں عموماً یہ تکلیف ہوجاتی تھی جسے وہ بے تکلف بات چیت کے موقعے پر "جھٹکوں کا دورہ" کہا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر کی طبیعت اس وقت بہت موزوں ہورہی تھی اور وہ کافی جوان لگ رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر باپ اور بیٹی کی شباہت بہت واضح ہوجاتی تھی۔ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے لوسی ان کے شانے پر سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ ان کا بازو اس کی کرسی کی پشت پر رکھا تھا۔ اس وقت دونوں کی مشابہت کا موازنہ کرنا بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔

ڈاکٹر سارا دن مختلف موضوعات پر پرُجوش بات چیت کرتے رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے ٹاور کو تفصیل سے دیکھا ہے؟" مسٹر ڈارنے نے موضوع کی مناسبت سے پوچھا کیوں کہ اس وقت لندن کی پرانی عمارتوں پر گفتگو ہورہی تھی۔

"میں اور لوسی یوں ہی ایک دفعہ وہاں گئے تھے۔ اتنی دیر میں بس اتنا اندازہ ہوا کہ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ اس سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا۔"

"آپ کو تو یاد ہوگا مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوچکا ہے مگر جس حیثیت سے میں گیا تھا کچھ دیکھنے بھالنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔" ڈارنے نے ذرا غصے سے سرخ ہوکر مسکراتے ہوئے کہا "جب میں وہاں تھا تو لوگوں نے ایک عجیب بات بتائی تھی۔"

"کیا بات تھی؟" لوسی نے پوچھا۔

"مرمت کے سلسلہ میں مزدوروں کو ایک کال کوٹھری کا پتہ چلا جسے عرصہ ہوا بنانیکے

بعد بالکل فراموش کر دیا گیا تھا۔ اس کوٹھری کے کونے کونے میں قیدیوں نے نام، پتے، تاریخیں، شکایتیں اور دعائیں پتھروں پر کھود رکھی تھیں۔ شاید پھانسی کے لئے جاتے وقت ایک قیدی نے ایک کونے میں تین حرف کندہ کر دیئے تھے۔ کسی بہت ہی رَدّی اوزار سے جلدی میں لرزتے ہوئے ہاتھوں سے حروف کندہ کئے گئے تھے۔ پہلے تو وہ ڈی، آئی، سی، پڑھے جاتے تھے مگر غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ "سی" کے بجائے "جی" کا حرف ہے۔ جیل خانے میں ایسے کسی قیدی کا اندراج نہیں ہوا، جس کے نام کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہوں۔ نام کے بارے میں بہت قیاس آرائی کی گئی۔

آخر میں یہ طے ہوا کہ یہ کسی نام کے پہلے حروف ہیں بلکہ مکمل لفظ "ڈگ" یعنی کھودنا بنتا ہے۔ تحریر کے نیچے فرش کو بڑے غور سے جانچا گیا۔ اور ایک پتھر کے نیچے جلے ہوئے کاغذ کی راکھ ملی جو ایک جلے ہوئے چمڑے کی راکھ میں گھل مل گئی تھی۔ گمنام قیدی نے کیا لکھا تھا یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے گا۔ لیکن اس نے کچھ لکھا ضرور تھا۔ اور جیلر نے اسے چھپانے کے لئے دفن کر دیا تھا۔"

"ابا ۔۔۔ کیا آپ کی طبیعت خراب ہے ۔۔۔" لوسی نے گھبرا کر کہا۔

ڈاکٹر مینٹ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ لوگ ان کی یہ غیر حالت دیکھ کر بہت خوفزدہ ہو گئے۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر پانی کی ایک بوند کی طرف اشارہ کیا۔ واقعی بارش کی بڑی بڑی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ مگر قید خانے میں انکشاف کے بارے میں جو کچھ سنا گیا تھا اس کے متعلق انھوں

نے ایک لفظ نہ کہا۔

انھوں نے اتنی تیزی سے اپنے کو سنبھال لیا کہ مسٹر لارین کو اپنی معاملہ شناس آنکھوں پر اعتبار نہ رہا۔

گول کمرے میں کھڑے ہو کے انھوں نے معذرت کی کہ اب بھی وہ کوئی ناگہانی بات ہو جائے تو چونک پڑتے ہیں۔ ان کی یہ حالت اچانک پانی آجانے سے ہو گئی تھی۔ یہ بتاتے وقت وہ کمرے میں آراستہ سنہرے دیو کے بازو سے زیادہ مستحکم نظر آرہے تھے۔ مس پروس نے چائے بنائی ان پر پھر جھٹکوں کا دورہ پڑا ہوا تھا ابھی تک سیکڑوں آدمی نہیں وارد ہوئے تھے۔ صرف مسٹر کارٹن آئے تھے اور انھیں ملا کر دو ملاقاتی ہو گئے تھے۔

رات بوجھل تھی۔ حالانکہ دروازے کھلے ہوئے تھے پھر بھی گرمی سے دم گھٹ رہا تھا جب چائے کی میز ہٹائی گئی تو سب کھڑکی کے پاس جا کر گہرے جھٹپٹے کو دیکھنے لگے۔ لوسی اپنے باپ کے قریب بیٹھی تھی۔ پاس ہی ڈارنے بیٹھا تھا۔ کارٹن کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ لمبے سفید پردے ہوا کے جھکڑ سے اڑ کر آسمانی پروں کی طرح چھت پر لہرا رہے تھے۔

"بھاری بھاری بوندیں اب بھی اکا دکا پڑے جارہی ہیں بارش آہستہ آہستہ آرہی ہے" ڈاکٹر مینیٹ نے کہا۔

"بڑے یقین کے ساتھ آرہی ہے"

عام طور پر بیٹھ کر انتظار کرنے والے لوگوں کی طرح وہ نیچی آواز میں بول رہے تھے جیسے لوگ اندھیرے کمرے میں بجلی کی چمک کے انتظار میں ہمیشہ آہستہ بولتے ہیں۔

گلی میں بڑی گڑبڑ تھی۔ لوگ بارش سے پناہ لینے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے وہ کونا جو آواز بازگشت کے لئے بے مثل مانا جاتا تھا آتے جاتے قدموں کی چاپ سے گونج رہا تھا۔ قدم گذر جاتے پھر بھی آواز بازگشت دوبارہ سہ بارہ گونجا کرتی۔

"ان گنت انسان ہیں ــــ پھر بھی کتنی تنہائی ہے" تھوڑی دیر سننے کے بعد مسٹر ڈارنے نے کہا۔

"کتنا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر ڈارنے ــ کبھی میں شام کو یہاں بیٹھ کر سوچا کرتی ہوں" ــــ لوسی کہتے کہتے رک گئی ــــ "ایسی اندھیری ڈراؤنی رات میں تو ایسی باتوں کے خیال کے ذکر سے بھی لرزہ آتا ہے۔"

"کچھ حرج نہیں بتائیے تو ہم سب ساتھ ہی لرز اٹھیں گے۔"

"آپ کو تو یہ میرا وہم ہی معلوم ہوگا۔ یہ خیالات تو بس اسی کو متاثر کر سکتے ہیں جو ان کو اپنے تخیل سے بنائے۔ میرے خیال میں انھیں کسی دوسرے کے دل میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ کبھی شلم کو تنہا بیٹھ کر میں قدموں کی چاپ سنا کرتی ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان قدموں کی چاپ ہے جو آہستہ آہستہ ہماری زندگی میں گھسے آرہے ہیں۔"

"اس کا یہ مفہوم ہوا کہ ایک دن ہماری زندگیوں میں ایک خلقت دخل در اندازہونے والی ہے۔" سڈنی کارٹن نے اپنے پرانے گھٹے ہوئے انداز میں کہا۔

قدموں کی چاپ کا سلسلہ لامتناہی تھا اور ان کی تیزی دم بدم بڑھنے لگی۔ اس کونے میں پیروں کی آہٹ دوبارہ سہ بارہ گونج رہی تھی ــــ کچھ قدم کھڑکی کے نیچے تھے، کچھ

جا رہے تھے۔ کچھ آ رہے تھے۔ کچھ لڑکھڑا رہے تھے اور پھر ساکت ہو گئے۔ سب کے سب دُور سڑک پہ تھے۔ نظروں سے دُور!

"کیا یہ قدم ہم سب کی زندگی میں جُدا جُدا داخل ہوں گے۔ مس مینٹ، ہم ان کو خندہ آپس میں تقسیم کر لیں گے؟"

"پتہ نہیں مسٹر ڈارنے ـــــ میں نے کہا تو یہ میرا احمقانہ تخیل ہے۔ خیر آپ پوچھ رہے ہیں تو بتائے دیتی ہوں۔ واضح رہے کہ یہ خیال جب میں اکیلی ہوتی ہوں جب ہی آتے ہیں۔ میرے تخیل میں ان لوگوں کے قدموں کی چاپ ہے جو میری اور میرے والد بزرگوار کی زندگی میں دخل انداز ہونے والے ہیں!"

"بغیر حرج اور احتجاج کئے میں ان قدموں کو اپنی زندگی میں سمیٹ لوں گا" مسٹر کارٹن نے کہا۔ "مس مینٹ ایک مجمع ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور بجلی کی چمک میں میں انھیں دیکھ سکتا ہوں!" یہ آخری جملہ کارٹن نے بجلی کے چمکنے پر کہا، ایک لمحہ کو وہ کھڑکی سے ٹکا ہوا نظر آ گیا۔

"اور سن بھی سکتا ہوں۔ وہ تیزی سے چیختے پھرتے چلے آ رہے ہیں!" بادلوں کی گرج کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ اس کا اشارہ بارش کی چمک اور گرج کی طرف تھا۔ وہ خاموش ہو گیا کیونکہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پھر ایکدم موسلا دھار پانی کے ساتھ ہی بجلی چمکی اور بادل گرج کر طوفان پھٹ پڑا۔ چمک دمک گرج اور بارش کو ایک لمحہ قرار نہ تھا۔۔۔ قریب آدھی رات کے مطلع صاف ہو کر چاند نکل آیا۔

جب سینٹ پال کے بڑے گھنٹے نے ایک بجایا تو آسمان کھُل چکا تھا اور جیری کے ساتھ جو بوٹ پہنے لالٹین لے کر چل رہا تھا۔ مسٹر لاری اپنے گھر کلرکین ویل کی طرف لوٹ رہے تھے کلرکین ویل اور سوہو کے درمیان کچھ حصے سنسان سڑک کے پڑتے تھے اور راہزنوں کے خوف سے مسٹر لاری ہمیشہ جیری کو ساتھ رکھتے تھے۔ حالانکہ ہمیشہ تو وہ دو گھنٹہ پہلے واپس آجایا کرتے تھے۔

"کیا رات تھی! ۔ بالکل ایسی ہی خوفناک رات جب مردے قبروں سے نکل پڑتے ہیں"۔ مسٹر لاری نے کہا۔

" مالک میں نے ایسی رات نہ دیکھی نہ سنی۔ بھلا کوئی وجہ بھی ہو" جیری نے جواب دیا۔

" شب بخیر" مسٹر کارٹن سے کاروباری آدمی نے کہا " شب بخیر۔ مسٹر ڈارنے زندگی میں دوبارہ ہم سب پھر ایک ساتھ ایسی رات بتائیں گے "

شاید! اور شاید وہ وقت بھی ایک دن آجائے۔ جب انھیں انسانوں کے غول کے غول اپنی طرف جھپٹتے نظر آئیں!

ساتواں باب

رئیس نامدار شہر میں

رئیس نامدار شاہی دربار کے بہت بڑے بارسوخ امراء میں سے تھے۔ پیرس کے شاندار ہوٹل میں وہ پندرہ روزہ جشن منانے میں مشغول تھے۔ رئیس نامدار تخلیہ کے مقدس ترین کمرے میں تھے۔ یہ جگہ ان کے پرستاروں کے لئے جو بیرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ نہایت بلند و بالا مقام رکھتی تھی۔ رئیس نامدار چاکلیٹ ملا ہوا دودھ نوش فرماتے جا رہے تھے۔ ویسے رئیس نامدار بڑی آسانی سے چیزیں نگل لیا کرتے تھے۔ اور کچھ بدمزاج لوگوں کا خیال تھا۔ بڑی تیزی سے فرانس کو ہڑپ کرتے جا رہے تھے مگر صبح کا چاکلیٹ باورچی کے علاوہ جب تک چار آدمی نہ جٹتے انکے حلق سے نہ اتر پاتا تھا۔

جی ہاں، جھلملاتی ہوئی وردیوں میں ملبوس چار خادم جن کا داروغہ جیب میں دو گھڑیاں نہ ہو تو زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ رئیس نامدار کے ایجاد کردہ رواج کے مطابق اپنی متحدہ کوششوں سے چاکلیٹ ان کے حلق کے پار کیا کرتے تھے۔ ایک خادم چاکلیٹ کا برتن خدمت اقدس میں پہونچاتا۔ دوسرا چاکلیٹ گھول کر اس ایک آلے کی مدد سے پھینٹتا جو وہ ساتھ لاتا تھا تیسرا ایک مقررہ نپکن پیش کرتا اور چوتھا جس کے پاس دو سونے کی گھڑیاں تھیں۔ چاکلیٹ انڈیلتا۔

رئیس نامدار اگر ان میں سے ایک خادم کو بھی کم کر دیتے تو دنیا کو کیا منہ دکھاتے۔ اگر تین خادم رہ جاتے۔ تو بلاشبہ ان کی شان میں بٹہ لگ جاتا۔ اور اگر دو رہ جاتے تو وہ کبھی اس سانحے سے جاں بر نہ ہو سکتے۔

گزشتہ رات رئیس نامدار ضیافت پر مدعو تھے۔ وہاں مزاحیہ ڈراما اور گرانڈ اوپرا نے بہت پر تکلف سامان دل بستگی مہیا کیا تھا۔ رئیس نامدار ہر شب ایسے مہذب احباب کی صحبتوں میں چھوٹی موٹی ضیافتوں میں مدعو ہوا کرتے تھے۔ وہ اس قدر منکسر المزاج اور بھولے بھالے تھے کہ ان کے اوپر حکومت کے خشک اور غیر دلچسپ قوانین اور خفیہ معاملات سے کہیں زیادہ "گرانڈ اوپرا" اور "کامیڈی" کا اثر تھا۔ ان کی خواہشات کے سامنے سارے فرانس کی ضروریات زندگی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ فرانس کی خوش نصیبی تھی۔ فرانس پر کیا موقوف ہے ہر بیدار بخت ملک کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ رنگین مزاج اسٹورٹ بادشاہوں کے زمانہ میں انگلستان کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ جس کے انھوں نے کوڑے کر لئے تھے۔

رئیس نامدار کا عام انتظام کے بارے میں ایک بیش بہا اصول تھا کہ انتظام میں دخل اندازی کی جائے اور اسے اپنی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسرا مقدس اصول یہ تھا کہ ہر انتظام کرتے وقت خود ان کے مفاد اور ان کی جیب کا خاص خیال رکھا جائے۔ اپنی عیش و عشرت سے لبریز زندگی کے بارے میں یہ قول مبارک تھا کہ دنیا اس لئے بنائی گئی ہے کہ ان کی حیاتیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہو۔ بائبل کے قدیم احکامات میں انہوں نے ایک خفیف سی تبدیلی کر دی تھی۔ رئیس نامدار فرمایا کرتے تھے! "دنیا اور دنیا کی نعمتیں ـــــ میرے لئے ہیں"

اس کے باوجود رئیس نامدار کو اندازہ ہو چلا تھا کہ ان کے نجی معاملات کے سلسلے میں آہستہ آہستہ قباحتیں پیدا ہو کر وبالِ جان بنی جارہی تھیں۔ فرانسیسی صلاحیتوں کو وہ کسی مصرف میں نہیں لگا سکتے تھے تو بہتر تھا کہ انھیں کسی اور کو دیدیا جائے۔ اس لئے فارمرجنرل یعنی نجی فوج کے مالک سے انھیں سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ حکومت کے علاوہ ان کے نجی اخراجات کا بھی تو اہم سوال تھا۔ فارمرجنرل بہت دولت مند تھا۔ رئیس نامدار کے باپ دادا پڑھی در پڑھی سے عیاشیوں میں روپیہ پھونک کر قلاش ہوچکے تھے۔ اور دن بدن کنگال ہوتے جارہے تھے۔ اس لئے رئیس نامدار نے خانقاہ سے اپنی بہن کو نکال لیا۔ کیونکہ اس وقت اسے راہبہ بننے سے بچایا جاسکتا تھا۔ اسے انھوں نے ایک ایسے فارمرجنرل سے تحفتہً بیاہ دیا۔ جو اتنے اونچے خاندان کا فرد نہیں تھا۔

وہ فارمرجنرل اس وقت ہاتھ میں ناشپاتی کے برابر سونے کی موٹھ والی چھڑی لئے ملحقہ کمرے میں موجود تھا۔ لوگ اس کے سامنے ناکیں رگڑتے تھے۔ اس کی بھی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ لوگ جن کی رگوں میں اعلیٰ درجہ کا خون دوڑ رہا ہے مثلاً رئیس نامدار اور ان کی بہن یعنی اس کی بیوی جو ہمیشہ اس پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے یہ دونوں اس کے سامنے سجدے کریں۔

فارمرجنرل بڑا شاندار آدمی تھا۔ اس کے اصطبل میں تیس تو گھوڑے تھے۔ محل میں چوبیس نوکر تعینات تھے۔ اس کی بیوی کی چاکری کرنے کے لئے چھ باندیاں مقرر تھیں حالانکہ اس نے یہ ساری دولت صرف لوٹ مار سے جمع کی تھی۔ مگر شادی کے ذریعہ سے

اس کی سماجی حیثیت بہت بلند ہو گئی تھی۔

دیکھنے میں یہ کمرہ نہایت خوش نما تھا۔ اور نہایت خوش مذاق طریقہ پر اپنے زمانہ کی بہترین اشیاء سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مگر دراصل اس کا حسن عارضی تھا۔ اگر اس کمرے کا ان چڑیوں کو بھگانے والے بیوپاروں اور ان کے چیتھڑوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے موازنہ کیا جاتا تو یہ آرائش اور یہ دولت قطعی پائدار نہ تھی۔ تو ترحم کے بلند و بالا عیار ان دو مختلف دنیاؤں کے درمیان تقریباً ایک ہی فاصلے پر کھڑے خاموش سنتریوں کی طرح تک رہے تھے۔ یہ بڑا بحث طلب سوال تھا۔ مگر کون اٹھاتا یہ سوال۔ خاص طور سے رئیس نامدار کے دولت خانہ پر۔ اس وقت رئیس نامدار کے یہاں بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے فوجی افسر جنہیں فوجی اصولوں کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ سمندری افسر جنہیں جہازوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ سرکاری افسر جنہیں معاملات کی کچھ خبر نہ تھی۔ مذہب اور تقدس سے بے بہرہ مذہبی رہنما۔ جن میں دنیا کی بدترین کمزوریاں تھیں۔ بدنظر۔ بدزبان، اور آبرو باختہ خواتین غرض سب کے سب اپنے طبقوں کے لئے حد سے زیادہ ناموزوں تھے اور سب نالائق اپنا تعلق مختلف شعبوں سے ظاہر کرنے میں سخت دروغ بیانی سے کام لے رہے تھے۔ مگر سب کم و بیش رئیس نامدار ہی کے قبیلے کے تھے۔ ایسے بیسیوں افراد سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ جہاں ان کی لوٹ کھسوٹ جاری تھی۔ ان کے علاوہ ایسے بھی لوگ تھے جن کا براہ راست حکومت اور رئیس نامدار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن وہ بھی کسی حقیقی اور ٹھوس چیز سے وابستہ نہ تھے۔ نہ ان کا ان زندگیوں سے کوئی ربط تھا۔ جو

سیدھی راہ پر سفر کرنے والے کو منزل مقصود کی طرف لے جاتی ہیں ۔ یہ بھی کافی تعداد میں موجود تھے ۔ رئیس نامدار کے پچھلے کمروں میں ڈاکٹر اپنے شاہی مریضوں کا مسکرا مسکرا کر معائنہ کرتے ہوائی بیماریوں کے لئے نہایت لطیف نسخے تجویز کرتے اور لاکھوں روپیہ کما لیتے ۔ غیب داں جنہیں ریاست پر جو بھوت پریت کا سایہ ہوا ہے دور کرنے کی ہزاروں ترکیبیں معلوم تھیں ۔ مگر انھیں بھی وہ ترکیب نہیں معلوم تھی جس سے سنجیدگی سے کام کر کے اصلی گناہ کی بیخ کنی کی جاسکے ۔ وہ رئیس نامدار کی نشست گاہ میں بڑھ بڑھ کر اپنے کھوکھلے علم کا رعب جما رہے تھے ۔ مرتد فلسفی جو صرف الفاظ سے نئی دنیا بنا رہے تھے اور تاش کے پتوں سے بابل کے مینار کھڑے کر کے آسمان تک پہونچنے کے خواب دیکھ رہے تھے ۔ یا ان مرتد کیمیا گروں سے مل کر منصوبے بنا رہے تھے ۔ جو لوہے کا سونا بنانے کی ترکیبوں کی تلاش میں تھے ۔ یہ سب رئیس نامدار کی محفلوں کی رونق تھے ۔ نہایت کھری نسل کے شرفا ہر اس چیز کو جس سے نسل انسانی کو فائدہ پہونچے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ایسے لوگوں کی موجودہ زمانے میں بھی کمی نہیں ۔ سبھی اس ضیافت میں پستی اور کمینے پن کے نمونے بنے بیٹھے تھے ۔ پیرس کی اس عظیم الشان دنیا میں لوگ ایسے لیسے لاجواب خاندان چھوڑ گئے تھے کہ تمام مخبر ۔۔۔ اس مہذب محفل میں آدھے تو مخبر اور جاسوس ہی تھے ۔ اگر وہ سب کے سب اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتے پھر بھی اس محفل میں انھیں کوئی ایسی عورت نہ ملی جو اپنے طور طریق یا لباس سے اپنے ماں ہونے کا اقبال کر لیتی ۔ ماں کے نام کو کوئی عزت نہیں حاصل تھی کیونکہ اس کا بھی رواج ختم ہو چکا تھا ۔ ان کے بچے گاؤں میں دیہاتی عورتوں کے پاس رہتے تھے ۔

وہی ان کی پرورش کرتی تھیں۔ ساٹھ ساٹھ برس کی بوڑھی دادیاں کمسن چھوکریوں کی طرح کپڑے پہنے عورتوں میں چہلیں کیا کرتی تھیں۔

رئیس نامدار سے تعلق رکھنے والا ہر فرد بشر تصنع کے کوڑھ سے داغدار ہو چکا تھا۔ بیرونی کمرے میں قریب نصف درجن لوگ ایسے بیٹھے تھے جنہیں شبہ ہونے لگا تھا کہ زمانے کے حالات کچھ بگڑتے جارہے ہیں۔ کامیابی سے ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے نصف درجن میں سے آدھے درویشوں کے اس عجیب وغریب گروہ سے جاملے تھے۔ جو بڑے غور وخوض سے یہ سوچ رہا تھا کہ کون سا طریقہ تیر بہدف ثابت ہوگا منہ سے جھاگ نکال کر ایک دم غضب ناک ہو جائیں۔ یا زور زور سے دھاڑیں مار کر سکتے میں پڑجائیں اور اسطرح رئیس نامدار کی رہنمائی کے لئے نہایت صاف اور کھلا اشارہ مجسم بن جائیں۔ ان تین درویشوں کے بعد جو باقی کے تین فلسفی بچے تھے وہ ایک دوسرے گروہ میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ لوگ "کرہ ارض کے مرکز" کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا انسان سچائی کے مرکز سے کھسک گیا ہے کیوں۔ اور کب۔ اس کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ انسان مرکز سے تو ہٹ گیا ہے مگر ابھی دائرے سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اس لئے پوری کوشش کرکے اسے دائرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ روزہ رکھ کر روحوں سے ملاقات کرکے۔ توبہ استغفار کرکے اسے پھر ڈھکیل کر واپس مرکز پر پہونچا دیا جائے۔ ان لوگوں کے روحوں سے نہایت پُر آمد قسم کے مباحثے ہوا کرتے تھے۔ لیکن نتیجہ کبھی کچھ نہ نکلا۔!

مگر ایک بات بڑی ڈھارس بندھاتی تھی۔ رئیس نامدار کی ضیافتوں میں لوگ

لباس بہت عمدہ اور لاجواب پہنے ہوئے تھے۔ وہ نفیس گھونگھر ڈالے ہوئے بال ان پر چمکیلے پاؤڈر کی تہیں جمی ہوئی، برجیوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے بال رنگ روغن سے مصنوعی طور پر صاف کئے ہوئے چہرے۔ ایسی شاندار تلواریں، کہ بس دیکھا ہی کیجئے۔ خوشبوؤں کے استعمال کے وہ نایاب طریقے جو برسوں پرانی سڑی گلی شے کو تروتازہ ظاہر کریں۔ اونچی نہایت نفیس نسل کے سر فار چھوٹے چھوٹے تعویذ زیب تن کئے رہتے تھے۔ جب وہ چلتے تو چھم چھم آواز پیدا ہوتی تھی اور یہ سنہری زنجیریں ننھی ننھی قیمتی گھنٹیوں کی طرح بج اٹھتی تھیں۔

یہ سنہری جھنکار ــــ ریشم اطلس اور تن زیب کی سرسراہٹ دھیرے دھیرے سینٹ اینٹائن میں سلگنے والی خونخوار بھوک کو ہوا دے رہی تھی ــــ !

ہر شے کو اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لئے صرف لباس کا جادو استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہر شخص خوش نمائی نئی وضع کے لباسوں کے جشن کے لئے آراستہ و پیراستہ ہو کر آیا ہے۔ جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

ٹولریز کے محل سے لے کر رئیس نامدار اور سارے دربار تک ــــ محلسراؤں میں اور عدالتوں میں اور پوری سوسائٹی میں ــــ ہر شخص کو سنورنے کا خبط تھا۔ صرف چڑیوں کو اڑانے کیلئے جو بیولے نصب تھے وہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ جلاد تک فیشن پہونچ چکا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو گھونگھریالے بنا کر ان پر چمکیلا پاؤڈر جمائے ــــ سنہری بیل ٹکا کوٹ زیب تن کئے سفید موزے اور گرگابی پہنے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ سولی یا موت کے چکر کے پاس دکھاوٹی ان نول شاذ ہی استعمال ہوتی تھی، کلیسائی رسومات کے مطابق موسیو پیرس اور موسیو اورلین اور باقی

کے دوسرے لوگ نہایت نفیس لباس میں آراستہ وہاں براجمان ہوتے تھے۔

۱۷۸۰ء میں رئیس نامدار کی ان دعوتوں میں شرکت کرنے والوں میں کسی کو ذرا بھی گمان نہ تھا کہ وہ نظام جو پاؤڈر کئے گھنگھریالے بالوں ــــ سنہری بیلوں سے مرصع کپڑوں ــــ سفید ریشمی موزوں اور گرگابیوں کے بل بوتے پر قائم تھا۔ تاقیام شمس و قمر باقی نہیں رہے گا۔ جب رئیس نامدار نے چوکولیٹ کا بار چار خادموں کے شانے پر سے ہلکا کر دیا تو انہوں نے مقدس اور پاک کمرے کے دروازے کھولنے کا حکم دے دیا۔ تب چاروں طرف سے اظہار عقیدت میں سلامیاں دی گئیں۔ قدم بوسی اور سجدے ادا کئے گئے۔ عجز و انکسار سے ناکیں رگڑ ڈالی گئیں۔ جہاں تک روحانی اور جسمانی قدم بوسی کا سوال تھا وہ سب رئیس نامدار کے حضور میں صرف ہو گئی۔ اور آسمانی خدا کے لئے کچھ باقی نہ رہا۔ یہی وجہ تھی کہ رئیس نامدار کے پرستار خدا کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دیتے تھے۔

کسی کو وعدہ سے سرفراز کیا کسی کو مسکراہٹ سے۔ ایک خادم کے کان میں کوئی چھوٹی سی بات کہہ دی جو اسے نہال کر گئی۔ دوسرے کو دست مبارک سے شفا بخشتے۔ رئیس نامدار اپنے کمرے سے گذرتے ہوئے سچائی کے بلند ترین مرکز پر پہونچ گئے۔ وہاں وہ پھر مڑے اور لوٹ کر پھر اپنے حجرے میں چاکولیٹ سے روحانی رشتہ قائم کرنے کے لئے غائب ہو گئے اور پھر نہیں دکھائی دیئے۔

تماشہ ختم ہو گیا۔ ہوا میں جو ہلکی سی بے چینی تھی بڑھ کر طوفان بن گئی۔ اور چھوٹی چھوٹی قیمتی گھنٹیاں کھنکھناتی نیچے اتر گئیں۔ صرف ایک شخص اس مجمع میں سے باقی رہ گیا۔ ہیٹ بغل

میں دبائے۔ اس کی ڈبیا سنبھالے وہ آہستہ آہستہ آئینوں کے سامنے سے گذر کر جانے لگا۔
"تمہیں شیطان کے سپرد کرتا ہوں"۔ وہ شخص آخری دروازہ کے پاس رکا، اور
رئیس نامدار کے مقدس حجرے کی طرف مڑ کر کہا۔ اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔

اس کی لگ بھگ ساٹھ برس کی عمر ہوگی۔ انداز میں رعونت پائی جاتی تھی۔ اور چہرہ
ایک خوبصورت مصنوعی خول کی طرح تھا۔ شیشہ کی طرح زرد اور ہر نقش بہت واضح۔ ناک
ویسے تو خوبصورت تراش کی تھی مگر نتھنوں کے اوپر سے دبی ہوئی تھی۔ ان دو گڑھوں سے ہی
اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کبھی ان کا رنگ بھی تبدیل ہو جاتا تھا
اور خفیف سی نبض کی جنبش سے یہ گڑھے پھیلنے سکڑنے لگتے۔ ان سے اس کے چہرے پر مکاری اور
بے رحمی ظاہر ہوتی تھی۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو دہانہ اور لمبوتری کھنچی ہوئی آنکھیں بھی چہرے
کی شقاوت کے تاثر کو بڑھاتی تھیں۔ پھر بھی چہرا حسین اور غیر معمولی تھا۔

شخص مذکور نیچے اتر کر احاطے میں سے ہوتا ہوا جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور روانہ
ہوگیا۔ دعوت میں اس سے بہت لوگوں نے بات چیت کی تھی۔ وہ الگ تھلگ ایک طرف
کھڑا تھا۔ اور رئیس نامدار کو چاہئے تھا ذرا زیادہ گرم جوشی کا اظہار کرتے۔ اس وقت اسے
یہ بات بہت خوش گوار معلوم ہو رہی تھی۔ کہ عام لوگ ہٹ کر اس کی گاڑی کو راستہ دے رہے
تھے اور کبھی تو پیچھے سے بال بال بچ کر بھاگتے۔ اس کا کوچوان ایسے گاڑی ہانک رہا تھا جیسے وہ
کسی دشمن پر حملہ آور ہو۔ کوچوان کی اس خوفناک لاپروائی سے آقا کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی
اس کو نگے، دور بہرے شہر میں کبھی شکایت کی آواز بلند ہو جاتی کہ اس شہر میں جہاں سڑکیں تنگ ہیں

اور فٹ پاتھ نہیں ہیں۔ شہر کے امرا اس قدر تیز رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے ہیں کہ نچلے طبقہ کے عام لوگ زخمی ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مگر کسی نے نہ شنوائی کی نہ توجہ دی اور اس معاملہ کو بھی مجبور اور مقہور عوام پر چھوڑ دیا گیا کہ جیسے چاہیں اس کا حل تلاش کریں۔

وحشیانہ انداز میں کھڑکھڑاتی شور مچاتی نہایت غیر انسانی طریقہ پر آزادی سے گاڑی سڑکوں پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ آج کل تو یہ باتیں ڈراؤنے خواب معلوم ہوتی ہیں کہ جب یہ گاڑی سڑک کے موڑ پر اچانک مڑی تو سامنے عورتیں چیختی چلاتی بھاگ گئیں۔ مردوں نے ایک دوسرے کو اور بچوں کو راستے سے گھسیٹ لیا۔

اس فوارے کے قریب سڑک کے کونے سے جونہی گاڑی مڑی اس کے ایک پہیے کو ایک تکلیف دہ جھٹکا محسوس ہوا۔ بہت سی آوازوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ گھوڑے الف ہوگئے، پھر آگے جھک گئے۔

اگر گھوڑے اونچے نہ ہوگئے ہوتے تو شاید گاڑی نہ رکتی۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر یہی ہوتا تھا۔ گاڑیاں زخمیوں کو چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ اور کیوں نہ چلی جاتیں۔ خوف زدہ کوچوان جلدی سے نیچے اترا۔ بیس ہاتھوں نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔

"کیا گڑبڑ ہے؟" موسیو نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔

شب کی ٹوپی پہنے لمبے سے آدمی نے گھوڑوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے ایک بنڈل اٹھایا اور فوارے کی منڈیر پر رکھ دیا۔ اور وہیں کیچڑ اور پانی میں گر کر جنگلی جانوروں کی

طرح چلانے لگا۔

"معاف فرمائیے گا — حضور بچہ تھا —" ایک اجڑے ہوئے مسکین آدمی نے کہا۔

"مگر یہ اتنی بیہودہ آوازیں کیوں نکال رہا ہے۔ کیا یہ اس کا بچہ تھا؟"

"معاف فرمائیے گا — سرکار — جی ہاں — بڑے افسوس کی بات ہے!"

فوارہ ذرا فاصلہ پر تھا۔ یہاں سڑک کھلی تھی اور دس بارہ مربع گز کا رقبہ چھٹا ہوا تھا۔ ایک دم لمبا سا آدمی گاڑی کی طرف آیا۔ مارکوئیس نے فوراً تلوار کے دستے پر ہاتھ ڈالا

"مار ڈالا —" وحشیانہ انداز میں وہ آدمی چیخا، خشمگیں ہو کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے اور گھور کر چلایا — "مر گیا!"

لوگ قریب آگئے، اور مارکوئیس صاحب کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں صرف شوق اور دیدار کی جستجو تھی۔ کوئی نفرت یا غصہ کا اظہار نہ تھا۔ پہلی چیخ کے بعد لوگوں نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی۔ وہ خاموش تھے۔ وہ آدمی جو بول رہا تھا اس کی آواز بے جان اور انتہائی انکساری کی وجہ سے دبی ہوئی تھی۔ مارکوئیس صاحب نے ان سب پر ایسی نظر ڈالی جیسے وہ صرف چوہے تھے اور اپنی بلوں سے باہر نکل آئے تھے

انھوں نے اپنا بٹوہ نکالا۔

"کس قدر تعجب کی بات ہے کہ تم اپنی اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتے تم یا تمہارے بچے ہمیشہ سامنے راستہ میں آتے رہتے ہیں۔ اب بھلا مجھے کیسے معلوم ہو کہ میرے

گھوڑوں کے کہاں چوٹ لگی ۔ یہ دیکھو ۔ یہ اسے دے دو" انھوں نے کوچوان کی طرف ایک اشرفی پھینکی ۔ سب کی گردنیں آگے بڑھ آئیں تاکہ سب گری ہوئی اشرفی کو دیکھ سکیں ۔ لمبے آدمی نے پھر ایک حیوان جیسا نعرہ مارا ۔ " مرگیا "

ایک اور آدمی بھیڑ چیرتا آیا ۔ لوگوں نے اسے راستہ دیدیا ۔ اس نے اس آدمی کو سہارا دیا ۔ اسے دیکھ کر بد نصیب انسان اس کے شانے پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ اور فوارے کی طرف اشارہ کیا ۔ جہاں کچھ عورتیں اس ساکت بنڈل پر جھکی ہوئی تھیں ۔ وہ بھی مردوں کی طرح خاموشی سے ادھر ادھر گھوم رہی تھیں ۔

" مجھے سب معلوم ہے ۔ اچھی طرح معلوم ہے ۔ ہمت نہ ہارو گیسپرڈ ننھے کھلونے کے لئے اس زندگی سے بہتر ہوا کہ وہ مرگیا ۔ ایک پل میں بغیر تکلیف کے مرگیا ۔ کیا بغیر دکھ کے وہ ایک گھنٹہ جی سکتا تھا" آخر میں آنے والے نے کہا ۔

" اے ۔ کیا نام ہے تمہارا ۔ تم تو پورے فلسفی معلوم ہوتے ہو "

" مجھے ڈیفارج کہتے ہیں "

" کیا کام کرتے ہو "

" مارکوئیس صاحب شراب بیچتا ہوں "

" یہ لو " مارکوئیس نے دوسری اشرفی اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا " اٹھاؤ ۔ شراب بیچنے والے فلسفی اور چاہے جیسے خرچ کرو ۔ دیکھو کیا گھوڑے تو بخیریت ہیں " بغیر مجمع کی طرف دوسری نظر ڈالے مارکوئیس صاحب آرام سے اپنی نشست پر ٹیک

لگا کر بیٹھ گئے۔ بالکل اس شریف آدمی کی طرح جس نے اتفاقیہ کوئی معمولی سی چیز توڑ دی ہو۔ اور پھر اس کا ہرجانہ ادا کر دیا ہو۔ مگر اچانک ان کے سکون میں خلل پڑ گیا۔ جب اشرفی بھناتی ہوئی گاڑی میں آئی اور فرش پر چھن سے گری۔

"روکو" مارکوئیس صاحب نے کہا۔ گھوڑے رُک گئے۔ "یہ کس نے پھینکی؟"

انھوں نے اس طرف دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے شراب فروش ڈیفارج کھڑا تھا۔ بدنصیب باپ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اور اس کے پاس ایک بگڑی سی سانولی عورت کھڑی بن رہی تھی۔!

"کمینے کتو" مارکوئیس صاحب نے چہرے پر کسی جذبے کے اظہار کے بغیر کہا۔ صرف ان کی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے "میں بڑی خوشی سے تم سب کے اوپر سے گاڑی گذار کرلے جا سکتا ہوں۔ اور تمہارا بیج دنیا سے نیست و نابود کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کس بدمعاش نے گاڑی پر پھینکا تھا اور اگر وہ گاڑی کے قریب ہے تو پہیوں سے پس کر آٹا ہو جائے گا۔"

لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے۔ عرصہ دراز سے ان کا ان لوگوں سے پالا پڑ رہا تھا جو قانون کے اندر اور قانون کے باہر بھی کیا کچھ ان کے ساتھ کر سکتے تھے۔ نہ کوئی ہاتھ اٹھا نہ کوئی آواز بلند ہوئی۔ حتیٰ کہ کسی نے آنکھ اٹھانے کی بھی جرأت نہ کی۔ مردوں میں سے تو کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی۔ مگر وہ عورت جو کھڑی بن رہی تھی۔ وہ برابر مارکوئیس صاحب کے چہرے کو گھور رہی تھی۔ اس کی طرف توجہ دینا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر انھوں نے اس پر

اور ان تمام چوہوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے اور حکم دیا "گاڑی چلاؤ"
ان کی گاڑی گذر گئی۔ پیچھے پیچھے اور بھی گاڑیاں تیزی سے گذریں۔ وزیر کی۔
مدارالمہام کی — مذہبی رہنما کی۔ فارمر جنرل کی — ڈاکٹر کی۔ وکیل کی۔ گرینڈ اوپرا
مزاحیہ ڈراما کی، پھر پورے فینسی بال کی گاڑیاں تیزی سے گذرتی گئیں۔ چوہے جلوس
دیکھنے کے لئے بلوں سے رینگ کر نکل آئے تھے، اور گھنٹوں دیکھتے رہے۔ سپاہی اور پولیس
کے لوگ ان کے اور جلوس کے درمیان ٹہل رہے تھے۔ اور ایک فصیل سی بنا رکھی تھی جس
کے پیچھے چوہے دبکے ہوئے جھانک رہے تھے۔ باپ اپنی پوٹلی اٹھا کر کہیں روپوش ہو چکا
تھا۔ وہ عورتیں جو اس کی نگرانی کر رہی تھیں وہیں بیٹھی فوارے کے بہتے ہوئے پانی کو اور
جلوس کے ریلے کو تک رہی تھیں۔ صرف ایک عورت تھی جو سب سے نمایاں کھڑی بن رہی
تھی — قسمت کی تھرتھلی انگلیوں کی طرح اس کی انگلیاں بھی بن رہی تھیں۔ فوارے
کا پانی بھی بہہ رہا تھا۔ تیز و تند دریا بہہ رہا تھا۔ دن۔ رات میں ڈوب رہا تھا۔
قوانین قدرت کے مطابق شہر میں کتنی ہی زندگیاں موت کے بھنور میں ڈوب رہی تھیں۔
وقت اور موج کسی انسان کا انتظار نہیں کرتے! چوہے اپنے اندھیرے بلوں میں گھسے ایک دوسرے کے
پاس سو رہے تھے۔ فینسی بال شب کے طعام کے وقت روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ دنیا اپنے
محور پر گھوم رہی تھی۔

آٹھواں باب

رئیس نامدار گاؤں میں

منظر خوبصورت تھا۔ اناج چمک رہا تھا مگر بہت ہی قلیل تھا۔ جہاں گیہوں اگنا چاہئے تھی وہاں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں خراب جَو بویا ہوا تھا۔ گیہوں کے بجائے بڑے قسم کے مٹر سیمیں اور نہایت ردّی ترکاری اُگی ہوئی تھی۔ کاشت کرنے والوں اور کھیتوں پر ایک ہی قسم کی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے کھیتیاں زبردستی اگنے پر مجبور ہوں۔ اور نیم مردہ ہوکر مٹ جانے اور تباہ ہوجانے کی آرزومند ہوں۔ مارکوئیس صاحب اپنی وزنی سفری گاڑی میں چار گھوڑوں اور دو سائیسوں کے ہمراہ پہاڑی کے ڈھال پر آہستہ آہستہ گھسٹ رہے تھے۔ مارکوئیس صاحب کے چہرے کی سرخی سے ان کے اعلیٰ حسب ونسب پر کوئی دھبہ نہیں آتا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اسے روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

شفق کی لالی گاڑی پر ایسی چمک دمک سے پڑ رہی تھی کہ وہ سرخی میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

"مٹ جائے گی ابھی ابھی" انھوں نے اپنے ہاتھوں کی طرف [illegible]۔ واقعی

سورج اتنا نیچا ہو چکا تھا کہ اسی وقت ڈوب گیا۔ جب پہیوں میں لوہے کی بوجھل روک اٹکا دی گئی تو گاڑی آہستہ آہستہ ترائی میں اترنے لگی۔ دھول میں جلے ہوئے کوئلے کی بو تھی۔ سرخی مٹ گئی۔ جب پہیوں کی روک اٹکائی گئی تو روشنی بالکل غائب ہو چکی تھی۔

مگر سامنے تباہ حال وسیع علاقہ بے لگان پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی کے نیچے ایک چھوٹا سا گاؤں آگے کھلا ہوا میدان اور ایک ٹیلہ۔ ایک گرجا کی چوٹی۔ ہوائی چکی اور شکار کے لئے ایک جنگل اس کے آگے ایک کرارا جس پر بنی ہوئی گڑھی قید خانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ جوں جوں رات بڑھتی آ رہی تھی پھیلتی ہوئی تاریکی میں مارکوئیس صاحب کا چہرا اس شخص کا سا تھا جسے معلوم ہو کہ اب گھر قریب آ رہا ہے۔ گاؤں کی اپنی ایک نہایت غریبانہ گلی تھی جس میں ایک بہت معمولی سی شراب کی بھٹی تھی۔ چھوٹا سا چمڑے کا کارخانہ تھا۔ نہایت بدحال سی سرائے تھی اجاڑ سا اصطبل تھا۔ جہاں ڈاک کے گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ چھوٹا سا حوض اور چھوٹے موٹے مشاغل تھے۔ اس گاؤں میں چند غریب لوگ بھی تھے۔ چنانچہ سب ہی تو غریب تھے۔ اور اپنے اپنے دروازوں پر بیٹھے رات کے کھانے کے لئے پیاز وغیرہ چھیل رہے تھے۔ کچھ چشمہ پر گھاس پھوس اور جو کچھ جنگلی جڑی بوٹیاں کھانے کے قابل مل سکتی ہیں دھو رہے تھے۔ وہ کیوں غریب تھے اس کی وجوہات تھیں سرکاری ٹیکس۔ گرجے کا لگان۔ زمیندار کا لگان۔ عام ٹیکس اور خاص ٹیکس قانون کے مطابق کچھ ادھر دینا پڑتا تھا اور کچھ ادھر۔ ان ٹیکسوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ کوئی گاؤں نگلے جانے سے کیسے بچا ہوا ہے۔

بہت کم بچے نظر آتے تھے اور کتے تو سرے سے غائب تھے۔ مردوں اور عورتوں کے

لئے بس دو ہی راستے تھے۔ مرگر کر گھسٹتے رہیں یا کرائے پر بنے ہوئے قید خانہ میں حبس اور موت کا مقابلہ کریں۔

آگے آگے ہرکارہ اور اس کے پیچھے کوچوان سروں کے گرد سانپوں کی طرح ہنٹر لہراتے جیسے وہ غضبناک دیویوں کے ہم رکاب ہوں۔ مارکوئیس صاحب اپنی سفری گاڑی میں ڈاک گھر کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ ڈاک گھر چشمہ کے قریب ہی تھا۔ اور لوگوں نے انھیں دیکھنے کے لئے اپنا کام کاج چھوڑ دیا۔ انھوں نے لوگوں کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بغیر دیکھے معلوم کر لیا کہ آہستہ آہستہ ان کے پریشان حال چہرے اور جسم جیسے زندگی سے چھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس دُبلے پن کی وجہ سے انگریزوں نے فرانسیسیوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ قدرتی طور پر منحنی ہوتے ہیں۔ اصلیت بدل بھی جائے تب بھی سو سال تک لوگ وہی پرانی بات کہتے رہتے ہیں۔ مارکوئیس صاحب نے ان مسکین اور سرنگوں چہروں کی طرف دیکھا۔ خود ان جیسے لوگ بادشاہ کے آگے جھکتے ہیں۔ فرق اتنا تھا کہ یہ چہرے بجائے خوشامد کے کرب اور لاچاری کی وجہ سے جھکے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک جھبرو سا سڑکوں کی مرمت کرنے والا ان میں آن ملا۔

"اس شخص کو ہمارے پاس لاؤ" مارکوئیس صاحب نے حکم دیا۔

ٹوپی ہاتھ میں تھامے اسے سامنے پیش کیا گیا۔ لوگ اس کے گرد ایسے تماشہ دیکھنے جمع ہوگئے جیسے "پیرس کے چشمے" کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے۔ وہ جگہ جہاں لوگوں کو قتل کیا جاتا تھا پیرس کا چشمہ کہلاتی تھی۔ کیونکہ خون وہاں پانی کی طرح بہتا تھا۔

"سڑک پر ہم تمہارے پاس سے گذرے تھے؟"

"جی ہاں حضور۔ آپ نے میرے قریب سے گذرنے کی مجھے عزت بخشی تھی"

"پہاڑی پر چڑھتے وقت بھی اور اترتے وقت بھی"

"جی ہاں درست ہے سرکار"

"اتنا گھور گھور کر تم کیا دیکھ رہے تھے"

"سرکار آدمی کو دیکھ رہا تھا"

وہ تھوڑا سا جھک کر اپنی ٹوپی سے گاڑی کے نیچے اشارہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی جھک کر گاڑی کے نیچے دیکھنے لگے۔

"کیسا آدمی۔ سور! ۔۔۔ وہاں کیوں دیکھ رہا تھا"

"معاف کیجئے گا مالک۔ وہ کانٹے کے تلے زنجیریں پکڑے لٹک رہا تھا"

"کون" مسافر نے پوچھا۔

"حضور ۔۔۔ وہ آدمی!"

"ان احمقوں کو خدا غارت کرے۔ کیا نام تھا اس آدمی کا۔ تم تو اس علاقے کے سب آدمیوں کو جانتے ہو۔ وہ کون تھا"

"سرکار وہ اس علاقے کا آدمی نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اسے نہیں دیکھا"

"زنجیروں سے لٹک رہا تھا دم نہیں گھٹ گیا ہوگا"

"خداوند۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔ یہی تو تعجب کی بات تھی۔ اس کا سر ۔۔۔ یوں لٹک رہا تھا"

وہ گاڑی کی طرف ترچھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اور پیچھے جھک کر اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا دیا اور سر ایک طرف کو لٹکا دیا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ادب سے جھکا اور اپنی ٹوپی سے کھیلنے لگا۔

"کیسی صورت تھی ؟"

" حضور والا وہ آٹا پیسنے والے سے بھی زیادہ سفید تھا۔ بھوت کی طرح تمام مٹی میں اَٹا ہوا تھا۔ بالکل بھوت کی طرح لمبا !"

اس تفصیل نے مجمع کو بہت متاثر کیا۔ مگر سب کی آنکھیں بجائے ایک دوسرے سے سوال کرنے کے مارکوئس صاحب کو دیکھنے لگیں۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کے ضمیر پر کسی بھوت کا سایہ ہے یا نہیں۔

" خوب تم نے ایک چور کو ہمارے ساتھ لگے دیکھا۔ اور بتانے کے لئے اپنا بھاڑ جیسا منھ بھی نہ کھولا۔ ہونہہ ! الگ ہٹا ؤ اسے موسیو گیبل !"

موسیو گیبل پوسٹ ماسٹر بھی تھے اور کچھ لگان وغیرہ وصول کرنے سے بھی ان کا تعلق تھا۔ وہ بڑی تابعداری سے جرح میں امداد پہونچانے آئے تھے۔ اور افسرانہ انداز میں ملزم کی آستین تھامے کھڑے تھے۔

" اونہہ ــــ دُور ہو ! " موسیو گیبل نے کہا۔

" اگر وہ اجنبی آدمی آج تمہارے گاؤں میں رات بسر کرنا چاہے تو اسے فوراً پکڑ لینا اچھی طرح اطمینان کرلینا گیبل کہ وہ ایماندار آدمی ہے کہ نہیں !"

"حضور والا۔ آپ کا حکم بجالانا میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں"

کیا وہ آدمی بھاگ گیا۔ وہ کم بخت کہاں ہے؟"

وہ کم بخت اپنے نصف درجن ساتھیوں کے ساتھ گاڑی کے پیچھے گھسا ہوا تھوڑی سے زنجیروں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ دوسرے خاص نصف درجن دوستوں نے اسے فوراً گھسیٹ کر نکالا اور سانس پھولا ہوا ارکوئیس صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

"اے بدھو۔ جب ہم پہیوں میں روک لگانے کے لئے رُکے تھے تو وہ بھاگ گیا"

"حضور والا۔ وہ پہاڑی کے اس طرف سر کے بل ایسے کود گیا جیسے دریا میں غوطے مارتے ہیں"

"اس کی تفتیش کرو گیبال۔ گاڑی چلاؤ"

وہ نصف درجن جو زنجیروں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ابھی تک بھیڑیوں کی طرح پہیوں کے قریب گھسے ہوئے تھے۔ پہیے اچانک چل پڑے اور وہ ان کی لپیٹ میں آنے سے بال بال بچ گئے۔ وہ لوگ خوش نصیب تھے کہ ان کے پاس سوائے کھال اور ہڈیوں کے اور کچھ بچانے کو نہ تھا ورنہ ان کی خیر نہ تھی۔

گاڑی بڑی تیزی سے گاؤں سے روانہ ہوئی اور آگے چڑھائی پر چڑھتی چلی گئی مگر جب پہاڑی کا ڈھال شروع ہوا تو رفتار کم ہو گئی اور گاڑی دھیمے دھیمے ڈولتی قدم قدم چلنے لگی۔ رات کی سہانی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کوچوان اپنے ہنٹروں کے سرے کی مرمت میں مشغول تھے بجائے غضبناک دیویوں کے ان کے سروں پر چھکیلے پروانے نفیس روپہلا جال بن رہے تھے۔ خادم

گھوڑوں کے ساتھ چل رہا تھا۔ ہرکارے کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آگے دھندلکے میں گونج رہی تھی۔ جہاں پہاڑی پر گہرا ڈھال تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ ایک صلیب پر حضرت عیسیٰ کا مجسمہ نصب تھا۔ یہ لکڑی کا مجسمہ نہایت بھدا تھا۔ کسی ناتجربہ کار گنوار نے تراشا تھا۔ مگر شاید اس نے زندگی کا مشاہدہ کرکے مجسمہ تراشا تھا۔ یا شاید خود اپنی زندگی سے۔ کیونکہ مجسمہ نہایت سوکھا مارا تھا۔

یہ صلیب ایک اندوہناک ظلم کی نشانی تھی۔ جو بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی جارہا تھا۔ مگر ابھی انتہا تک نہیں پہونچا تھا۔ ایک عورت اس کے سامنے گھٹنے ٹیکے سرنگوں تھی۔ جب گاڑی قریب آئی تو اس نے مڑکر دیکھا۔ اٹھ کر بھاگی اور گاڑی کے دروازے کے قریب پہونچ گئی۔

"سرکار یہ آپ ہیں نا — حضور عالی ایک عرضی ہے"

بغیر چہرے کا رنگ بدلے انھوں نے باہر دیکھا اور عاجز آکر بولے۔

"اوہ لعنت! — کیا ہے جب دیکھو تب عرضیاں"

"حضور عالی — خدا کے واسطے — میرا شوہر جنگل کا نگہبان تھا"

"تو کیا ہوا تمہارے شوہر کو جو جنگل کا نگہبان تھا۔ تم لوگوں کو ہر وقت کچھ نہ کچھ بہانے سوجھا کرتے ہیں۔ کیا بات ہے۔ کیا لگان نہیں ادا کرسکتا ہے"

"لگان تو اس نے کوڑی کوڑی ادا کردیا سرکار — وہ مرگیا"

"چلو اس کا منھ بند ہوگیا۔ کیا اب میں تمہارے لئے اسے پھر سے زندہ کردوں"

"نہیں سرکار — افسوس — مگر وہ ادھر جلی ہوئی گھاس کے ڈھیر کے نیچے دفن ہے"

"تو پھر میں کیا کروں"

"سرکار یہاں تو ان گنت مٹی کے ڈھیر ہیں"

"اچھا تو پھر"

وہ جوان عورت تھی مگر بوڑھی نظر آرہی تھی۔ غم واندوہ سے وہ نیم پاگل ہورہی تھی۔ بڑے زور سے اپنے نسوں دار کھردرے ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ گاڑی کے دروازے پر رکھ دیا۔ جیسے وہ کسی انسان کا دھڑکتا ہوا سینہ ہو اور اس کی منت سماجت کو سنکر پگھل جائے گا۔

"سرکار ــ میری عرض سن لیجے سرکار! میرا شوہر مفلسی کی وجہ سے مرگیا مفلسی کی وجہ سے کتنے لوگ مر رہے ہیں اور کتنے ہی مرجائیں گے"

"اچھا پھر۔ کیا میں ان کے پیٹ بھر سکتا ہوں"

"حضور والا یہ تو پروردگار ہی جانے۔ . . میں تو یہ نہیں کہتی۔ میری تو بس یہ عرض ہے کہ جہاں مٹی کے ڈھیر کے تلے میرا شوہر دفن ہے اس پر لکڑی یا پتھر کا ٹکڑا لگا دیا جائے ورنہ وہ جگہ جلد ہی بھلادی جائے گی۔ اور پھر جب میں اسی دیار میں مبتلا ہو کر مروں گی تو مجھے کسی اور جھلسی ہوئی گھاس کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا جائے گا۔ یہ ڈھیر اتنے بہت سے ہیں۔ تیزی سے ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ کتنی غربت ہے سرکار ــ غریب نواز ــ!"

خدام نے اسے دروازے سے ہٹا دیا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کوچوان نے رفتار تیز کر دی۔ اور وہ بہت دور پیچھے رہ گئی۔ اور مارکوئیس پھر غضبناک دیویوں کے ہمراہ

چند میل کا سفر جوان کے اور گھر کے درمیان باقی تھا تیزی سے طے کرنے لگے۔

گرمیوں کی رات کی میٹھی میٹھی خوشبوان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور بارش کی طرح بغیر کسی تفریق کے ریت سے اٹھتے ہوئے ناتواں محنت کشوں کے گرد بھی پھیل گئی۔ جو قریب ہی چشمہ کے گرد جمع تھے۔ سڑک کی مرمت کرنے والا ابھی تک انھیں ٹوپی کے اشارے سے آسیب کے بارے میں تفصیل بتا رہا تھا۔ وہ ٹوپی اپنے مالک سے بہت زیادہ اہم تھی۔ اس کے بغیر اس کی ہستی کچھ بھی نہ تھی وہ اس بھوت کی لمبان اس وقت تک بڑھاتا رہا جب تک کہ وہ برداشت کر سکے۔ جب ان سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ ایک ایک کر کے اپنی جھونپڑیوں میں کھسک گئے چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ جب ان میں اندھیرا ہو گیا اور آسمان پر تارے نکل آئے تو ایسا معلوم ہوا جیسے زمین پر بجھائے ہوئے چراغ آسمان پر جا کر جگمگانے لگے۔

اس عرصہ میں مارکوئیس صاحب ایک بلند و بالا چھت والے عالی شان مکان کے قریب جھولتے ہوئے پیڑوں کے سائے میں پہونچ گئے۔ ایک مشعل کی روشنی نے اس تاریکی کو دور کیا۔ گاڑی رک گئی اور محل کے بلند دروازے ان کے لئے کھل گئے۔

"کیا موسیو چارلس جن کا ہمیں انتظار تھا انگلینڈ سے آگئے؟"

"حضور والا ابھی تو نہیں آئے۔"

نواں باب

"گارگن کا سر"

مارکوئیس صاحب کا محل پتھر کا بنا ہوا تھا۔ سامنے ایک سنگین احاطہ تھا۔ دو سنگین زینے اوپر جا کر ایک چبوترے سے مل جاتے تھے۔ پتھر ہی پتھر تھا۔ ہر چہار طرف بھاری پتھر کے ستون۔ پتھر کے کونڈے اور صراحیاں، پتھر کے پھول پتھر کے چہرے۔ پتھر کے شیروں کے سر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب مکان بن کر تیار ہوا تو گارگن نے اسے نظر بھر کے دیکھ لیا تھا۔ (گارگن وہ دیو تھا جو کسی پر بھی نظر ڈال دیتا تو وہ پتھر ہو جاتا تھا)

گاڑی سے اتر کر مارکوئیس صاحب چوڑے زینے پر چڑھتے گئے۔ آگے آگے مشعل تھی، جس کی روشنی نے دور پیڑوں میں چھپی ہوئی اصطبل کی چھت پر بیٹھے ایک الو کو پریشان کر دیا اور اس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ باقی تمام چیزوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک مشعل سیڑھیوں پہ ساتھ ساتھ لے جائی جا رہی تھی۔ دوسری دروازہ پر خادم کے ہاتھ میں تھی۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ دونوں مشعلیں بجائے کھلی فضا کے ایک بند کمرے میں جل رہی ہیں۔ الو کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی یا بس اس فوارے کی آواز تھی جس کا پانی پتھر کے طشت میں گر رہا تھا۔ یہ ایک ایسی رات تھی جو گھنٹوں سانس روکے پڑی رہتی ہے۔ پھر لمبی سی ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔ اور دم

سادھ لیتی ہے

مارکوئیس داخل ہوگئے۔ پھاٹک ایک کھٹکے سے ان کے پیچھے بند ہوگیا۔ وہ ہال میں سے گذرے جہاں سور کے شکار کے نیزے، تلواریں، شکاری چاقو، دیواروں پر آویزاں تھے اس کے علاوہ سواری کے بید اور ہنٹر بھی سجے ہوئے تھے۔ کتنے ہی کسانوں نے موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو جانے سے پہلے ان ہنٹروں کی چوٹ سہی تھی۔

بڑے بڑے کمرے رات کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ اور ان میں اندھیرا پڑا تھا مشعل بردار کے ہمراہ مارکوئیس صاحب اوپر کو سیڑھے پر گئے اور اپنے خاص تین آرام دہ کمروں میں چلے گئے۔ یہ اونچی چھت کے سرد کمرے تھے جن میں فرش نہیں بچھا ہوا تھا۔ آتش دان میں دو پتھر کے تپے ہوئے تھے۔ جن پر سردیوں میں لکڑیاں رکھ کر روشنی کی جاتی تھیں۔ کمروں کے ساز و سامان سے عیش و عشرت کا اظہار ہوتا تھا۔ قیمتی فرنیچر لوئی چہار دم کے زمانہ کا تھا۔ شاہی خاندان کا وہ تاجدار جس کے سلسلے کے منقطع ہونے کی کسی کو امید نہ تھی۔ اس کے علاوہ سجاوٹ کی اشیاء میں ایسی بھی چیزیں تھیں جو فرانس کی پرانی تاریخ پر روشنی ڈالتی تھیں۔

تیسرے کمرے میں دو آدمیوں کے لئے کھانے کی میز تیار تھی۔ یہ کمرہ ان چار کمروں میں سے تھا جن کی چھت کی برجیاں چلم کی وضع کی تھیں۔ ایک مختصر مگر آرام دہ کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں چوپٹ کھلی تھیں۔ مگر چوڑی پٹیوں کی بھورے رنگ کی چقیں پڑی تھیں اور رات صرف کالی کالی پٹیوں کی شکل میں چقوں میں سے نظر آرہی تھی۔

"ہمارے بھتیجے صاحب اطلاع ملی ہے کہ ابھی تک نہیں آئے! بچے ہوئے کھانے پر نظر

ڈال کر مارکوئیس نے کہا۔

واقعی ان کا بھتیجا نہیں آیا تھا۔ مگر امید تھی کہ آجائے گا۔"

"اوہ ــــ ممکن ہے کہ آج رات آجائیں۔ اس لیے میز ایسی ہی لگی رہنے دو۔ ہم پندرہ منٹ میں تیار ہو جائیں گے۔"

پندرہ منٹ میں مارکوئیس صاحب تیار ہو کر تنہا لذیذ اور مرغوب کھانوں کی میز پر بیٹھ گئے۔ ان کی کرسی کھڑکی کے مقابل تھی۔ وہ شوربہ پینے کے بعد شراب کا گلاس ہونٹوں سے لگانے ہی والے تھے کہ رک گئے اور گلاس رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" انھوں نے چک کی سیاہ اور بھوری پٹیوں کو غور سے دیکھ کر ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔

"سرکار ــــ کہاں؟"

"چک کے باہر ــــ چک کھولو۔"

چک کھولی گئی۔

"ہونہہ!"

"کچھ بھی نہیں حضور والا۔ پیڑ ہیں اور اندھیری رات۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

نوکر نے چک ہٹا دی تھی۔ باہر اندھیری رات میں گھور کر دیکھا پھر حکم کے انتظار میں مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی پشت پر رات کا گھپ اندھیرا تھا۔

"بہت خوب۔ چک بند کر دو۔" آقا نے نہایت پرسکون انداز میں کہا۔

حکم کی تعمیل کی گئی اور مارکوئیس صاحب خاصہ تناول کرتے رہے۔ بیچ ہی میں وہ پھر گلاس ہاتھ میں لئے رک کر گاڑی کے پہیوں کی آواز سننے لگے۔ گاڑی تیز رفتاری سے محل کے پھاٹک تک آگئی۔

"معلوم کرو کون آیا ہے؟"

مارکوئیس صاحب کا بھتیجا آیا تھا۔ سہ پہر میں وہ ان کے پیچھے پیچھے ڈاک گاڑی سے آرہا تھا۔ مگر تیزی سے اس نے درمیان کا فاصلہ کم کر لیا تھا۔ پھر بھی سڑک پر دونوں نہ مل سکے۔ ڈاک کے اڈے پر اسے ان کے متعلق معلومات حاصل ہو چکی تھی۔

مارکوئیس صاحب نے کہلوا بھیجا کہ کھانے پر اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ وہ جلد ہی کمرے میں داخل ہوا۔ انگلینڈ میں اسے لوگ چارلس ڈارنے کے نام سے پکارتے تھے۔

مارکوئیس نے بڑے تکلف سے اس سے ملاقات کی مگر مصافحہ نہیں کیا۔

"جناب آپ کل پیرس سے روانہ ہوئے تھے" میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے مارکوئیس سے کہا۔

"ہاں کل۔ اور تم؟"

"میں سیدھا آرہا ہوں۔"

"لندن سے؟"

"جی۔"

"تم نے آنے میں بہت دیر لگائی" مارکوئیس نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں صاحب میں تو سیدھا چلا آرہا ہوں۔"

"تم سمجھے نہیں۔ میرا مطلب سفر میں دیر کرنے سے نہیں بلکہ سفر کا ارادہ کرنے میں دیر لگانا ہے۔"

"چند وجوہات کی بنا پر مجھے رکنا پڑا" بھتیجے نے ذرا تکلف سے رک کر کہا۔

"بلاشبہ" مقطع چچا نے کہا۔

جب تک نوکر موجود رہا انھوں نے کچھ بات چیت نہ کی۔ مگر کافی حاضر کی گئی اور وہ اکیلے رہ گئے۔ تو بھتیجے نے چچا سے آنکھیں چار کیں۔ اور اس کے خول چڑھے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کی اُمید کے مطابق میں واپس آگیا ہوں۔ جس سلسلے میں میں گیا تھا۔ اس میں خلاف اُمید پریشانیاں اٹھانی پڑیں لیکن میرا مقصد اتنا مقدس تھا کہ اگر میری جان بھی چلی جاتی تو کوئی پروا نہ تھی۔"

"جان تو نہیں چلی جاتی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ جان چلی جاتی" چچا نے کہا۔

"مجھے شک ہے قبلہ۔ اگر واقعی میں موت کے غار کے دہانے تک پہونچ جاتا تو کیا آپ مجھے بچانے کی تکلیف گوارا کرتے؟" بھتیجے نے پوچھا۔

ناک کے نتھنے کے گڑھے گہرے ہوگئے۔ بے رحم چہرے کی لکیریں کچھ اور واضح ہوگئیں اور اونچی ذات کے مارکوئیس نے اس الزام پر احتجاج ظاہر کیا۔ مگر اثر کچھ پھیکا سا رہا۔

"یقیناً جناب نے ضرور یہ کوشش کی ہوگی کہ ان شبہات کو اور مستحکم بنایا جائے، جو

میرے خلاف پیدا ہو سکتے تھے۔

"نہیں نہیں قطعی نہیں" چچا نے نہایت خوش دلی سے کہا۔

"پھر بھی مجھے یقین ہے کہ آپ کی سیاست انتہائی سنگدلی سے مجھے اپنے مقاصد سے باز رکھنے میں کوشاں رہے گی۔ اور میرے خلاف ہر ہیچ حربہ کا استعمال روا سمجھا جائے گا"

بھتیجے نے چچا کو بے اعتباری سے دیکھ کر کہا۔

"عزیز دوست ــ ہم نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا ذرا مہربانی کر کے یاد تو کرو ہم نے تم سے کیا کہا تھا"

چچا کے نتھنے پھڑکنے لگے۔

"مجھے خوب یاد ہے"

"شکریہ" مارکومیں نے نہایت میٹھے سروں میں کہا۔ ان کی آواز ہوا میں کسی ساز کی جھنکار کی طرح معلق ہو گئی۔

"جناب ــ یہ میری خوش قسمتی اور آپ کی بدقسمتی ہے کہ میں اب تک پرسش کی جیل میں نہیں ڈالا گیا" بھتیجے نے کہا۔

"ہم قطعی نہیں سمجھے، تمہارا کیا مطلب ہے۔ ذرا کھل کر تفصیل سے بتاؤ" چچا نے کافی کی چسکی لے کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر دربار میں آپ معتوب نہ ہوتے اور گذشتہ کارناموں کی گردمیں گم نہ ہوتے تو میرے خلاف بس آپ کا ایک خط مجھے ساری عمر کسی قلعہ کے

قید خانہ میں دفن کر دینے کے لئے کافی ہوتا۔

نہ ہو سکتا ہے۔ خاندان کی عزت کی خاطر اگر ہمیں یہ تکلیف تمہیں پہونچانی پڑے تو ـــــ معاف کرنا۔ ہمیں کوئی دریغ نہ ہوگا" چچا نے نہایت سکون سے کہا۔

"یہ میری خوش قسمتی تھی ـــــ کہ پرسوں وہاں آپ کی زیادہ آؤ بھگت نہیں ہوئی"

"ہم اسے تمہاری خوش قسمتی نہیں سمجھتے" چچا نے نہایت مہذب اور نرم لہجہ میں کہا۔ "ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ اگر تنہائی میں غور و خوض کرنے کا موقع مل جائے تو تم اپنے مستقبل کو اس سے کہیں زیادہ روشن اور تابناک بنانے کے متعلق سوچ سکو گے۔ مگر اب اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم مجبور ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے سدھارنے کے طریقے یہ خاندانوں کی عزت اور شان کو برقرار رکھنے کے لئے شفقت میں ڈوبے ہوئے تادیبی طریقے یہ معمولی مراعات جن سے تمہیں تکلیف پہونچ سکتی ہے وہ صرف رسوخ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کتنے زیادہ لوگ اس طاقت کو حاصل کرنے کے خواہاں ہیں اور کس قدر قلیل تعداد کو یہ رعایت دی جاتی ہے۔ پہلے یہ حالت نہیں تھی اس معاملہ میں فرانس بہت ہی گر گیا ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کو اردگرد کے نیچ لوگوں کو مارنے یا زندہ رکھنے کا حق حاصل تھا۔ اس کمرے سے کتنے ہی ایسے ذلیل کتے لے جا کر پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ دوسرے کمرے میں یعنی میری خواب گاہ میں ایک آدمی کو اس لئے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ اس نے اپنی بیٹی کے بارے میں غیر مہذب بات منہ سے نکالی تھی ـ واضح رہے خود اپنی بیٹی کے بارے میں! ہم سے بہت سی مراعات چھین لی گئی ہیں۔ ایک نیا فلسفہ رائج ہو گیا ہے اور ہمیں اپنی

شان وشوکت قائم رکھنے کے لئے کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ فی الحال رکاوٹیں حائل ہیں مگر اندیشہ ہے کہ ہو جائیں گی۔ نہایت واہیات قطعی واہیات بات"

بارکوئیس نے ناس کی چٹکی لی اور موزوں حد تک دل گیر اور افسردہ ہو کر اس ملک کی حالت پر تاسف سے سر ہلایا۔ جہاں ان جیسے قابل انسان موجود تھے جو ملک میں دوبارہ جان ڈال سکتے تھے۔

"ہم نے اپنے حقوق کے حصول میں ماضی اور حال دونوں زمانوں میں وہ حرکتیں کی ہیں جن کی وجہ سے ہمارے نام سے پورا فرانس گھن کھاتا ہے۔" بھتیجے نے غمگین ہو کر کہا ــــ

"ان سے ہمیں یہی امید رکھنا چاہئے۔ نیچے لوگ جب سر برآوردہ لوگوں سے نفرت کریں تو لازمی طور پر اس کا مطلب ہے کہ وہ ان کی برتری کے آگے سر جھکاتے ہیں۔"

"اس ملک میں آس پاس مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جو میری طرف تعظیم سے دیکھے۔ سب کی نظروں میں خوف اور تاریک غلامی کا عجز وانکسار پایا جاتا ہے۔" بھتیجے نے اُداسی سے کہا۔

"یہ بات تو تمہارے خاندان کی شان اور بڑائی ظاہر کرتی ہے اور جس طرح ہم نے اپنی فضیلت ثابت کر دی ہے اس کی روشنی میں یہی زیب دیتا ہے۔" انھوں نے پھر ایک نازک ننھی سی ناس کی چٹکی لی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئے۔ جب بھتیجے نے ناامیدی سے دکھی ہو کر میز پر کہنیاں ٹکا دیں اور اپنی آنکھیں ہاتھوں سے ڈھانپ لیں تو خول چڑھا

ہوا چہرہ کنکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ چچا کی آنکھوں سے چالاکی ہوشیاری اور ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو وہ اس سے قبل تک تصنع کے پردے میں چھپائے ہوئے تھا۔

"سخت گیری ہی ایک ایسا فلسفہ ہے جسے ثبات حاصل ہے۔ یہ خوف اور عجز و انکساری میرے دوست۔ کتے کو ہنٹر کا غلام اس وقت تک بنائے رکھے گی جب تک آسمان کے نیچے یہ چھت قائم ہے" ممکن ہے یہ چھت اتنے دن قائم نہ رہے جتنے دن کی مارکوئیس کو اُمید تھی۔ اگر چند سال بعد جو کچھ ہوا اس کی تصویر کسی طریقے سے مارکوئیس کو اس وقت دکھائی جاتی تو وہ آگ میں جھلسے لٹے لٹائے محل کو پہچان بھی نہ پاتے اور وہ چھت جس کے بارے میں وہ شیخی بگھار رہے تھے کہ اس نے آسمان کو چھپا لیا ہے تو وہ بھی سچ ہی ثابت ہو گیا۔ کیونکہ واقعی ان آنکھوں کے سامنے سے آسمان روپوش ہو گیا۔ جن کے جسموں میں اس چھت کا سیسہ گولیوں کی صورت میں ہزاروں لاکھوں بندوقوں کے ذریعہ جھونکا گیا۔

"اس عرصہ میں اگر تم کچھ نہیں کرتے تو ہم خود خاندانی شان اور شکوہ کو قائم رکھیں گے۔ مگر تم بہت تھک گئے ہو۔ اب آج رات کے مباحثہ کو ختم کر دیا جائے" مارکوئیس نے کہا۔

"بس ایک لمحہ اور—"

"ایک گھنٹہ اگر تم چاہو تو—"

"جناب ہم نے غلطیاں کی ہیں اور ان غلطیوں کا پھل پا رہے ہیں" بھتیجے نے کہا۔

"ہم نے غلطیاں کی ہیں؟" چچا نے سوالیہ مسکراہٹ کے ساتھ پہلے بھتیجے کی طرف پھر اپنی طرف اشارہ کر کے دہرایا۔

"ہمارے خاندان نے۔ ہمارے باعظمت خاندان نے جس کی عزت کی ہم دونوں کو اپنے مختلف خیال کے مطابق فکر ہے۔ میرے والد کے زمانہ میں بھی ان گنت زیادتیاں کی گئیں۔ جو کبھی ہمارے عیش اور عشرت کے آڑے آیا ہم نے اسے تباہ کر دیا۔ وہ میرے والد کا نہیں آپ کا بھی زمانہ تھا۔ کیا میں اپنے باپ کے توام بھائی اور متحدہ وارث کو ان سے علیحدہ گن سکتا ہوں؟"

"موت نے ہمیں علیحدہ کر دیا" مارکوئیس نے کہا۔

"اور مجھے ایک ایسے قانون کے بندھنوں میں جکڑ دیا ہے کہ جس سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میرے اوپر ذمہ داری ہے مگر طاقت نہیں کہ میں اپنی پیاری ماں کی وصیت پوری کر سکوں؛ اپنی ماں کی آخری نگاہ کا حکم بجا لاؤں اور ان کے آخری الفاظ پر عمل کر سکوں۔ انھوں نے مجھ سے رحم کرنے اور تلافی کرنے کی التجا کی تھی۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بے کار امداد کی تلاش میں سر مار رہا ہوں"

"ان باتوں کی تم مجھ سے امید لگائے بیٹھے ہو بھتیجے۔ تو تمہارا یہ خواب ساری عمر پورا نہ ہوگا" چچا نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ دونوں اب آتش دان کے قریب کھڑے تھے۔ مارکوئیس کے سفید چہرے کی ہر شکن سے مکاری فریب اور بے رحمی عیاں تھی۔ وہ خاموشی نسوار کی ڈبیا ہاتھ میں لئے اپنے بھتیجے کی طرف گھور رہے تھے۔ انھوں نے پھر اپنی انگلی کو اس طرح اس کے سینے پر رکھا جیسے وہ اس کے سینے میں نازک سی تلوار کی نوک اتارنا چاہ رہے ہوں۔ پھر کہا۔

"عزیز من! میں اس رواج کو استوار کر کے مروں گا جس کی آغوش میں میں نے جنم لیا ہے اور زندگی گذاری ہے"

جب وہ یہ کہہ چکے تو بات ختم کرنے کے انداز میں انہوں نے آخری چٹکی نس کی چڑھائی اور ڈبیا اپنی جیب میں رکھ لی۔

"یہ بہتر ہے کہ انسان فراخ دلی سے اپنی تقدیر پر قانع رہے۔ مگر موسیو چارلس ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے تم گمراہ ہو چکے ہو۔" میز پر رکھی ہوئی چھوٹی سی گھنٹی بجاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہ فرانس سے سروکار ہے اور نہ اس جائداد سے۔ میں ان دونوں سے دست بردار ہوتا ہوں۔" بھتیجے نے اداسی سے کہا۔

"کیا وہ تمہاری ملکیت ہیں جو تم ان سے دست بردار ہو رہے ہو۔ فرانس ہوگا تمہاری ملکیت مگر کیا یہ جائیداد تمہاری ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ فی الحال تو یہ تمہاری نہیں۔"

"جو کچھ میں نے کہا اس سے میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ جائداد میری ہے۔ اگر آپ سے ورثہ میں مجھے ملے اور کل۔"

"جس کے بارے میں ہمیں خوش فہمی ہے کہ وہ کل اتنی جلدی نہیں آئے گی۔"

"میرا مطلب ہے خواہ بیس سال بعد۔"

"ہماری ہمت افزائی کر رہے ہو تم۔ ہاں ہمیں تمہارا یہ آخری اندازہ زیادہ پسند ہے۔"

"اس وقت میں یہ جائیداد لینے سے انکار کر دوں گا۔ کہیں اور۔ کسی اور وسیلے سے گذارہ کروں گا۔ ویسے یہ کوئی عظیم قربانی نہیں۔ یہاں رکھا ہی کیا ہے سوائے غربت اور تباہی کے۔"

"واہ" مارکوئیس نے آراستہ و پیراستہ کرے پر نگاہ ڈالی کر کہا۔

"بظاہر میں تو یہ خوش نما معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس کی بنیادی قیمت لگائی جائے اور دن کی روشنی میں آسمان کے نیچے اس کے وجود پر غور کیا جائے تو یہاں تباہی کے گرتے ہوئے مینار کے گرد بدانتظامی، جبر و تشدد، قرضہ رہن، زیادتی، بھوک، برہنگی اور دکھوں کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"واہ" مارکوئیس نے پھر نہایت مطمئن ہو کر کہا۔

"اگر یہ کبھی میرے قبضہ میں آیا تو کسی ایسے ہاتھوں کے سپرد کیا جائے گا جو اسے آہستہ آہستہ اس بوجھ سے آزاد کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ تاکہ وہ غریب اور مجبور انسان جو اس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اور جنہیں اتنا پیسا گیا ہے کہ قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔ شاید پھر ان لوگوں کی آئندہ پود اتنا دکھ نہ جھیلے۔ مگر یہ میرے ہاتھ میں نہیں۔ یہ زمین ہی منحوس ہے۔"

"اور تم؟ معاف کرنا۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کیا تم اپنے اس فلسفہ کے ساتھ باعزت طریقہ پر رہ سکو گے؟"

"مجھے اپنے گذارے کے لئے محنت کرنا ہوگی۔ جیسا کہ میرے ملک کے لوگوں کو خواہ امیر گھرانے سے ہوں ایک دن محنت مشقت سے روزی کمانا پڑے گی۔"

"انگلستان میں رہو گے؟"

"جی ہاں۔ اس ملک میں میرے خاندان کی ناک رہ جائے گی۔ خاندانی نام کو مجھ سے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ کیونکہ میں دوسرے ملک میں یہ نام اختیار نہیں کروں گا۔"

گھنٹی بجنے کے بعد پاس کی خواب گاہ میں روشنی ہو گئی تھی۔ بیچ کے دروازہ سے کمرہ منور نظر آ رہا تھا۔ مارکوئیس نے اس طرف دیکھا اور لوٹتے ہوئے خادم کے قدموں کی چاپ سنتے رہے۔

"انگلینڈ بہت پسند ہے تمہیں۔ اور وہاں تم کتنے مختلف طریقے پر ترقی کر گئے ہو" انہوں نے اپنا پرسکون چہرہ اپنے بھتیجے کی طرف پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا کہ میں اپنی وہاں کی ترقی کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں باقی پناہ لینے کے لئے وہی جگہ موزوں ہے"

"شیخی خورے انگریز کہتے ہیں کہ وہاں بہتوں کو پناہ ملی ہوئی ہے۔ تمہارا ایک ہم وطن بھی وہاں پناہ گزیں ہے"

"ایک ڈاکٹر — جانتے ہوا سے"

"جی ہاں"

"مع ایک بیٹی کے"

"جی ہاں"

"اچھا تم تھک گئے ہو۔ شب بخیر!" مارکوئیس نے کہا۔

انھوں نے شاہی آداب کے مطابق سر جھکا کر جب یہ الفاظ کہے تو عجیب پر اسرار تاثر انکے چہرے پر طاری تھا۔ ان کا یہ انداز بھتیجے کو کھٹکا۔ ان کی باریک سیدھی لکیروں، پتلے متوازی ہونٹوں اور طنز سے تنی ہوئی ناک کے نتھنوں نے مل جل کر ان کے چہرے کو بھیانک طور پر حسین بنا دیا۔

" ہاں " مارکوئیس نے پھر دہرایا ۔ ڈاکٹر اور اس کی لڑکی ــــ ہاں نیا فلسفہ یوں شروع ہوتا ہے ۔ تم تھک گئے ہو ۔ شب بخیر ! "

ان کے ساکت و جامد چہرے سے کسی قسم کا جواب حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے محل کے باہر نصب کئے ہوئے پتھر کے چہروں سے جواب مانگا جائے ۔

" شب بخیر ! صبح تم سے ملاقات کی پھر مسرت حاصل ہوگی ۔ آرام سے سو ــــ ہمارے بھتیجے صاحب کو ان کے کمرے تک روشنی دکھاؤ ۔ اور ہمارے بھتیجے کو اگر ہو سکے تو اس کے بستر میں جلا کر خاک کر دو " انھوں نے آخری جملہ دل میں کہا ۔ انھوں نے پھر چھوٹی گھنٹی بجائی اور خادم کو اپنی خواب گاہ میں طلب کیا ۔

رات خاموش اور گرم تھی ۔ خادم آکر چلا گیا ۔ مارکوئیس صاحب بڑے اطمینان سے سونے کی تیاری میں ادھر ادھر چہل قدمی کر رہے تھے ۔ ان کے نوکر خواب گاہ کے سلیپروں میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی ۔ وہ ایک مہذب چیتے کی طرح گھوم رہے تھے ۔ وہ زمانہ قدیم کے اس مکار رئیس کی طرح معلوم ہو رہے تھے جس پر اس کے گناہوں کی سزا میں جادو کر دیا گیا ہو ۔ جس کے زد سے یا تو وہ ابھی چیتے سے رئیس بن گئے تھے یا چیتا بننے والے تھے ۔

وہ اپنی شاندار خواب گاہ کے اس کونے سے اس کونے تک گئے ۔ بغیر ارادے کے دن بھر کے گذرے ہوئے واقعات کے ٹکڑے یاد آنے لگے ۔ غروب کے وقت پہاڑی پر گھستی ہوئی چڑھائی ڈوبتا سورج ، اتار ، پن چکی ، چشمہ کے گرد جمع دہقان ، اور وہ سڑک مرمت کرنے والا ۔ ٹوپی سے زنجیروں کی طرف اشارہ کر رہا تھا ۔ وہ پیرس کے چشمہ سے مشابہ چشمہ ! چھوٹی سی گھڑی ، سیڑھی پر

رکھی ہوئی۔ اس پر جھکی ہوئی عورت پر تو وہ بڑا سا لمبا سا آدمی خنف میں اپنے ہاتھ پھیلائے چلا رہا تھا ” مر گیا — !“

”اب کافی دماغ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب سونا چاہیے“ انہوں نے سوچا۔

آتش دان کے قریب ایک شمع جلتی چھوڑ کر انھوں نے اپنے گرد باریک پردے گرا لئے اور رات کو ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے سنا — اور سو گئے۔

تین بوجھل گھنٹے باہر پتھر کے چہروں نے اندھوں کی طرح سیاہ رات میں گھور گھور کر گذار دیئے۔ تین گھنٹے تک اصطبل میں گھوڑے اپنے تھان کو کھڑکھڑاتے رہے۔ کتے بھونکتے رہے اور الو کی آواز بالکل ویسی نہ تھی۔ جس کا شعرا اپنے شعروں میں ذکر کر چکے ہیں۔ مگر اس قبیل کے جانور کبھی وہ حرکت نہیں کرتے جو ان کے لئے پہلے سے مقرر کر دی گئی ہے۔

مسلسل تین بوجھل گھنٹے پتھر کے ترشے ہوئے انسانوں اور شیروں کے چہرے رات کی تاریکی کو اندھوں کی طرح گھورتے رہے۔ فضا میں موت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات کے بوجھل اندھیرے نے سڑکوں کی دم گھونٹتی ہوئی خاک کو خاموشی میں ڈبو رکھا تھا۔

قبرستان میں خاک کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا صلیب پر چڑھا ہوا مجسمہ اگر نیچے بھی اتر آتا تو پتہ نہ چلتا۔ گاؤں میں ٹیکس وصول کرنے والے اور ٹیکس ادا کرنے والے نیند میں غرق تھے۔ شاید بڑی بڑی ضیافتوں کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ جیسے تمام بھوکے دیکھا کرتے ہیں۔ یا جیسے بار برداری کے مویشی اور مظلوم غلام آرام و سکون پیٹ بھر کھانے اور آزادی کے خواب دیکھتے ہیں۔

گاؤں کا چشمہ نظروں سے اوجھل خاموش بہہ رہا تھا۔ محل کا چشمہ بھی تاریکی میں خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ دونوں ہی ان لمحوں کی طرح جو وقت کے دھارے سے ٹوٹ کر گم ہو جاتے ہیں خاموش تین گھنٹے سے بہہ رہے تھے۔

پھر دونوں چشموں کا پانی آسیبی خاکستری رنگ اختیار کرنے لگا۔ اور محل کے پتھریلے چہروں نے آنکھیں کھول دیں۔ دھیرے دھیرے رات کی سیاہی پھیکی پڑنے لگی۔ یہاں تک کہ سورج کی کرنوں نے خاموش درختوں کی پھنگیوں کو چھو لیا، اور اپنی روشنی پہاڑی پر بکھیر دی۔ سورج کی روشنی میں محل کے چشمہ کا پانی خون کی طرح سرخ لگ رہا تھا۔ اور پتھر کے چہرے لال ہو گئے تھے۔ چڑیاں اونچے سروں میں چہچہا رہی تھیں اور مارکوئیس کی خواب گاہ کی پرانی کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک ننھی سی چڑیا بیٹھی نہایت سریلا راگ الاپ رہی تھی۔ سب سے قریب والا پتھرایا ہوا چہرہ اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ تھا۔ اس کا منہ پھٹا ہوا تھا جبڑا لٹک گیا تھا اور چہرے پر وحشت کے آثار تھے۔

سورج اونچا ہو گیا اور گاؤں میں زندگی متحرک ہونے لگی۔ جھونپڑیوں کی کھڑکیاں کھلیں ٹیڑھے میڑھے دروازے چوپٹ ہو گئے۔ اور لوگ سردی سے ٹھٹھرتے تروتازہ ہوا میں نکل آئے۔ پھر گاؤں کے باسیوں میں محنت و مشقت کے کاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ چشمہ کی طرف چل دیئے۔ کچھ کھیتوں کو روانہ ہو گئے۔ کچھ عورتیں اور مرد کھودنے کھاد سنے پر جٹ گئے۔ کچھ مویشیوں کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ سوکھی ماری گایوں کو سڑک کے کنارے مٹھی بھر گھاس کی امید میں چرانے لئے جائیں۔ گرجے اور صلیب کے آگے چند ایک آدمی

جھکے ہوئے دعا میں مشغول تھے۔ چرنے کے لئے جاتی ہوئی گائیں اس کے نیچے ایک مٹھی گھاس کے لئے رک جاتیں۔

محل میں ذرا دیر سے جگار ہوئی۔ اپنی شان وشوکت کے مطابق آہستہ آہستہ بڑے اطمینان سے لوگ بیدار ہو رہے تھے۔ پہلے تو حسب معمول سورج کی کرنیں شکار کے بھالوں اور چاقوؤں پر روشنی پڑی اور وہ سرخ ہو گئے۔ پھر وہ صبح کی سفید روشنی سے چمک اٹھے۔ دروازے، کھڑکیاں، چوپٹ کھول دیئے گئے۔ گھوڑوں نے اپنے اصطبل سے گردنیں موڑ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جہاں سے صبح کی تازگی اور روشنی داخل ہو رہی تھی۔ لوہے کے جنگلوں والی کھڑکیوں پر بتیاں سرسراکر چمکنے لگیں۔ کتے اپنی زنجیروں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ اور آزاد ہونے کے لئے بے چین ہو گئے۔

یہ سب روزمرہ کے مطابق ہر صبح کا معمول تھا۔ مگر یہ ایک دم محل کے بڑے گھنٹہ کا بجنا قطعی روزانہ کا دستور نہ تھا! سیڑھیوں پر لوگ اتر چڑھ رہے تھے اور چھت پر ادھر ادھر پریشان تھے۔ ہر طرف ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کسی کا گھوڑے پر زین کس کر سرپٹ دوڑ جانا بھی روزمرہ کے قطعی خلاف تھا۔

یہی پھرتی اور گھبراہٹ کس رخ کی ہوا نے سڑک کی مرمت کرنے والے میں بھر دی تھی۔ وہ پہاڑی کے اوپر گاؤں سے ذرا آگے اپنے کام پر لگا ہوا تھا۔ اس کے کھانے کی پوٹلی جس میں کسی کوّے کی دلچسپی کے لائق بھی کوئی تر مال نہ تھا۔ پاس ہی پتھر پر پڑی تھی۔ کیا کسی چڑیا نے اپنی اڑان میں ایسے ہی اس کے سر پر گھبراہٹ کا بیج ٹپکا دیا تھا۔ جیسے عام طور پر چڑیاں بیج ادھر

اُدھر ٹپکا دیتی ہیں۔ جہاں وہ اُبھر آتے ہیں۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا جیسے اس کی جان کے پیچھے موت دوڑی چلی آرہی ہو۔ پہاڑی کے نیچے۔ گھٹنوں تک دھول میں بھاگتا ہوا وہ چشمہ کے قریب پہونچ گیا۔

گاؤں کے لوگ اداس اور مردہ دل چشمہ کے پاس کھڑے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر سوائے دہشت تجسس اور استعجاب کے اور کوئی تاثر نہ تھا۔ گایوں کو چراگاہ لے جاتے لے جاتے جلدی سے واپس لوٹا کر کسی بھی چیز سے باندھ دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ لوگ بھاگ نہ سکیں۔ وہ اپنی احمقانہ آنکھوں سے تک رہی تھیں۔ دو چار منھ راستہ میں مار لئے تھے اسی کی جگالی کر رہی تھیں۔

کچھ محل کے عملے کے لوگ اور کچھ ڈاک گھر کے افسر قریب قریب مسلح ہو کر سڑک کے اس پار بے مصرف بنے کھڑے تھے۔ سڑک کی مرمت کرنے والا اس عرصہ میں پچاس کے قریب خاص دوستوں کے گروہ میں گھس کر نیلی ٹوپی سے اپنا سینہ کوٹ رہا تھا۔

ان سب باتوں کا کیا مطلب تھا۔ یہ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور یہ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں موسیو گیبل ایک نوکر کے پیچھے گھوڑے پر سوار سرپٹ روانہ ہو گئے۔ حالانکہ گھوڑے پر دوگنا وزن لدا ہوا تھا۔ اس وقت انھیں دیکھ کر جرمنی کی لیونورہ کی داستان کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

دراصل ان باتوں کا یہ مطلب تھا کہ محل کے سنگین چہروں میں ایک اور چہرے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

رات کو گابرگن نے پھر محل کی عمارت کا معائنہ کیا تھا۔ اور اس پتھر کے چہرے کا اضافہ کر دیا تھا جس کا محل کو دو سو سال سے انتظار تھا۔

وہ پتھرایا ہوا چہرہ مارکوئیس صاحب کے تکیہ پر پڑا ہوا تھا۔ یہ چہرہ ایک نازک خول کی طرح تھا جیسے خوف سے چونک پڑا ہو اور پھر غصہ ہو کر پتھرا گیا ہو۔ اس چہرے سے جڑے ہوئے پتھریلے جسم کے دل میں ایک خنجر دستے تک اتار دیا گیا تھا۔ دستے کے گرد ایک کاغذ پھڑپھڑا رہا تھا جس پر لکھا تھا۔

"جلدی سے اسے قبر میں پہنچا دو۔ بہ طرف جیکوس۔"

دسواں باب

"دو وعدے"

بارہ مہینے سال بن کر آئے اور گذر گئے۔ مسٹر ڈارنے نے انگلستان میں فرانسیسی زبان کے اعلیٰ استاد کی حیثیت سے اپنا مقام بنالیا۔ انھیں فرانسیسی ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ آج کل کے زمانے میں انھیں پروفیسر مانا جاتا۔ اس زمانے میں وہ استاد کہلاتے تھے۔ وہ ان نوجوان طلبا کو درس دیتے رہتے تھے جنھیں ایک ایسی زندہ زبان سیکھنے کی فرصت تھی جو ساری دنیا میں بولی جاتی تھی۔ انھیں اس کے ادبی سرمائے اور علم میں دلچسپی تھی۔ وہ اس پر تنقید کر سکتے

تھے ۔ اور عمدہ انگریزی میں ترجمہ کرسکتے تھے ۔ ایسے عالم اس زمانے میں آسانی سے نہیں ملتے تھے وہ جو شہزادے تھے اور وہ جو بادشاہ بننے والے تھے علماء کے طبقے سے نہیں تھے ۔ اس وقت تک تباہ حال امراء اور رڈسار ٹیلس بینک کے زیر بڑے خارج ہو کر باورچی اور بڑھئی نہیں بنے تھے ۔ استاد کی حیثیت سے ان کی قابلیت طلباء کے لئے نہایت خوشگوار اور مفید تھی ۔ مترجم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے ترجموں میں لغت کے علم کے علاوہ خود اپنی معلومات سے بھی فائدہ پہونچایا ۔ اس لئے جلد ہی نوجوان مسٹر ڈار نے مشہور ہوگئے ۔ اور ان کی ہمت افزائی کی گئی ۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے ملک کے حالات سے بھی اچھی واقفیت تھی ۔ جن سے لوگوں کی دلچسپی روز بروز بڑھ رہی تھی ۔ چنانچہ اپنی لگاتار کوشش اور انتھک محنت کی بنا پر انھیں کامیابی نصیب ہوئی ۔

لندن میں نہ انھیں سونے کی سڑکوں پر چلنے کی توقع تھی نہ پھولوں کی سیج پر سونے کی امید اگر ان کی توقعات اتنی بلند ہوتیں تو شاید وہ پھل پھول نہ سکتے ۔ انھیں معلوم تھا کہ محنت کرنا پڑے گی ۔ اور انھوں نے محنت کی ۔ اس پر بھروسہ کیا ۔ اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز تھا ۔

کچھ وقت ان کا کیمبرج میں گذرتا تھا جہاں وہ انڈر گریجویٹ طلباء کو پڑھاتے تھے وہاں ان کی حیثیت چوری چھپے ممنوعہ مال درآمد کرنے والے تاجر کی سی تھی ۔ دراصل یونانی اور لاطینی زبانیں جائز راستے سے درآمد کی جاتی تھیں ۔ باقی ان کا وقت لندن میں گذرتا تھا ۔

اس زمانے سے لے کر جب جنت میں ہمیشہ خوشگوار گرمی کا موسم رہتا تھا آج تک جب کہ ٹھنڈے ملکوں میں ہمیشہ سردی پڑتی ہے مرد کا ایک ہی راستہ رہا ہے۔ وہ ہے چارلس ڈارنے کا راستہ یعنی محبت کا راستہ!

چارلس نے لوسی مینٹ سے اس وقت سے محبت کرنا شروع کی تھی جب اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ ایسی ہمدردی میں ڈوبی میٹھی آواز اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ ایسا نرم و حسین چہرہ اپنے مقابل اس وقت سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ اس قبر کے کنارے کھڑا تھا جو اس کے لئے کھودی گئی تھی۔ مگر اس موضوع پر اس نے ابھی تک لوسی سے بات چیت نہیں کی تھی۔ قتل اور محل کے اجڑنے کے بعد وہ بہی گردے اتی سڑک کا لمبا سفر اور وہ ٹھوس پتھر کا محل سب دھندلے خواب میں گم ہو چکے تھے۔ اس کو ایک سال گذر چکا تھا اور اس نے ایک لفظ بھی زبان سے اپنے دل کی حالت کے اظہار کے مقصد سے نہیں نکالا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی چند وجوہات ہیں گرمیوں کا موسم تھا وہ حال ہی میں کالج کی چھٹیوں کے موقع پر لندن آیا ہوا تھا۔ ایک دن اس کے قدم سوہو کے خاموش گوشہ کی طرف اٹھ گئے گرمیوں کا دن ڈھل رہا تھا اور اسے معلوم تھا لوسی مس پروس کے ساتھ گھر سے باہر گئی ہوگی۔

ڈاکٹر کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ طاقت جس نے بیک وقت انھیں قید کے زمانے میں مصائب کو برداشت کرنے کی ہمت بخشی اور ساتھ ساتھ ان کی تلخی کو دوچند بھی کیا اب آہستہ آہستہ واپس لوٹ آئی تھی۔ اب وہ واقعی ایک بڑے جاندار انسان ہو گئے تھے ارادے کی پختگی کے ساتھ عمل میں بھی چستی آگئی تھی۔ دوبارہ پائی ہوئی صلاحیتوں کے استعمال میں اکثر ایک

قسم کا اچانک پن اور جھجک پائی جاتی تھی۔ مگر حال ہی میں ان میں نمایاں فرق ہو چلا تھا۔ اور اب وہ پرانے دورے شاذ ہی پڑا کرتے تھے۔

وہ بہت مطالعہ کرتے تھے۔ اور کم سوتے تھے۔ آسانی سے زیادہ تھکن برداشت کر لیتے تھے اور برابر خوش و خرم رہتے تھے۔ جب انہوں نے چارلس ڈارنے کو آتے دیکھا تو کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"چارلس ڈارنے! تمہیں دیکھ کر بہت مسرت ہوئی! گذشتہ دو تین روز سے ہم تمہاری آمد کے منتظر تھے۔ مسٹر اسٹرائیور اور سڈنی کارٹن دونوں کل آئے تھے ان دونوں کا خیال تھا کہ تمہیں ضرور آنا چاہئے۔"

"اس دلچسپی کے لئے میں ان دونوں کا شکر گذار ہوں۔" ڈارنے نے ان دونوں سے متعلق سرد مہری برت کر نہایت گرمجوشی سے ڈاکٹر سے کہا۔ "مس مینٹ؟"

"اچھی ہے" ڈاکٹر نے کہا اور ایک دم رک گئے۔ "تمہارے آنے سے ہم سب کو خوشی ہوگی۔ وہ کسی خانہ داری کے سامان کے سلسلہ میں باہر گئی ہے۔ جلد ہی آجائے گی۔"

"ڈاکٹر مینٹ مجھے معلوم تھا کہ وہ گھر پر نہیں۔ میں قصداً ایسے وقت پر آیا۔ جب وہ گھر پر نہ ہوں۔ مجھے آپ سے اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کرنا ہے۔"

ایک بے معنی سی خاموشی چھا گئی۔

"اچھا" ڈاکٹر نے بہت رکتے رکتے کہا۔ "اپنی کرسی اوپر سرکاؤ۔ اور کہو۔"

ڈارنے نے کرسی تو سرکائی لیکن بات شروع کرنے میں بڑی جھجک محسوس ہوئی۔

"یہ میری خوش نصیبی ہے ڈاکٹر مینٹ کہ تقریب ڈیڑھ سال سے اس گھر میں بے تکلفی سے آتا ہوں"۔
آخر ہمت کر کے انہوں نے کہا "اس لئے جس موضوع پر میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ شاید زیادہ سے"
ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہاتھ واپس ہٹالیا۔
"تمہیں لوسی کے متعلق کچھ کہنا ہے"۔
"جی ہاں"۔
"کسی موقع پر بھی میرے لئے اس کے بارے میں بات چیت کرنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے
چارلس ڈارنے۔ جس لہجہ میں تم بات کر رہے ہو یہ بھی بہت تکلیف دہ ہے"۔
"ڈاکٹر مینٹ۔ میرے لہجہ میں پر جوش ستائش۔ سچی پرستش اور گہری محبت کے سوا اور
کچھ نہیں!" پھر ایک بے تکی سی خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر لوسی کے باپ نے کہا۔
"مجھے تم پر اعتبار ہے۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے"۔ ان کی
بے کسی اتنی عیاں تھی کہ اس سے متاثر ہو کر چارلس ڈارنے شش و پنج میں پڑ گئے۔
"کیا میں اپنی بات پوری کر سکتا ہوں جناب"؟
"ہاں ۔۔ ہاں کہے جاؤ"۔
"یہ تو آپ کو اندازہ ہوگیا کہ میں کیا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے دل کا راز جانے
بغیر آپ نہیں جان سکتے کہ یہ جذبہ کس قدر شدید ہے اور نہ ان پریشانیوں اور امید و بیم کی حالت
کا آپ کو اندازہ ہے جن کے خیال سے میرا دل بوجھل ہے۔ مہربان ڈاکٹر مجھے آپ کی بیٹی سے بے پناہ
بے غرض اور والہانہ محبت ہے۔ اگر دنیا میں محبت کبھی کی گئی ہے تو وہ میری محبت ہے۔ آپ نے

خود بھی کسی سے محبت کی تھی۔ اپنی محبت کا واسطہ میری محبت کو سہارا دیجئے"

ڈاکٹر منہ موڑے بیٹھے تھے ان کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ ان آخری الفاظ پر انہوں نے بے چین ہو کر جلدی سے روکا اور چیخ پڑے۔

"براہ کرم اس کا ذکر نہ کرو۔ ۔ ۔ ۔ اسے رہنے دو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ان یادوں کو زندہ نہ کرو"

ان کی چیخ میں جسمانی درد کی تھکان تھی۔ جب وہ خاموش ہو گئے تب بھی وہ چارلس ڈارنے کے کانوں میں گونجتی رہی۔ ہاتھ کے اشارے سے انھوں نے چارلس ڈارنے کو روک دیا۔ اس نے ان کا مطلب سمجھ لیا اور خاموش رہا۔

"مجھے معاف کر دو" تھوڑی دیر بعد انہوں نے نہایت بجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ انہوں نے اپنا منہ ڈارنے کی طرف موڑا۔ مگر نہ آنکھیں کھولیں اور نہ اس کی طرف دیکھا ان کے بال چہرے پر سایہ کئے ہوئے تھے اور تھوڑی ہتھیلی پر ٹکی ہوئی تھی۔

"تم نے لوسی سے بات کی ہے؟"

"نہیں"

"خط کے ذریعہ بھی نہیں"

"کبھی نہیں"

"تم نے جو اس معاملہ میں ضبط و تحمل سے کام لیا اگر اس کی ستائش نہ کی جائے تو تمہارے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ تم نے لوسی کے باپ کا اتنا لحاظ کیا اس کا وہ شکریہ ادا کرتا ہے"

انھوں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر آنکھوں نے ہاتھ کا ساتھ نہ دیا۔ وہ چپ کی رہیں ــــ

"مجھے معلوم ہے ڈاکٹر مینٹ، میں نے آپ کو اور آپ کی بیٹی کو ساتھ ساتھ دیکھا ہے۔ اور آپ کی محبت نہایت غیر معمولی اور دل گداز ہے کیونکہ جس ماحول میں یہ محبت پروان چڑھی اس کی مثال آسانی سے نہیں ملے گی۔ میں جانتا ہوں ڈاکٹر اور کس طرح اس بات کو نظر انداز کر سکتا ہوں کہ وہ یہ تمام خدمت گذاری فرض اور محبت جس کی ایک جوان بیٹی سے امید کی جاتی ہے اس میں انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کے علاوہ اس میں ان کی بچپن کی وہ ساری محبت بھی شامل ہے جس سے وہ ہمیشہ محروم رہی تھیں۔ میں جانتا ہوں بچپن میں والدین کا پیار ان کو نہ ملا۔ اس لئے ان کی محبت میں اس عمر کے جوش، عقیدت اور پیار کے علاوہ بچپن کا بھرو خود سپردگی اور لگاؤ بھی شامل ہے۔ وہ ان دنوں کی تلافی کرنا چاہتی ہیں جب آپ ان سے چھین لئے گئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر آپ دوسری دنیا سے واپس آکر انھیں مل جاتے تو وہ جتنا آپ کو مقدس بزرگ اور قابل وقعت مانتیں اتنا ہی اب مانتی ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ جب وہ آپ سے لپٹتی ہیں تو آپ کے گلے میں بیک وقت ایک بچی ایک لڑکی اور ایک عورت کی باہیں پڑی ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ سے محبت کرتے وقت وہ اپنی مرحوم ماں کی جوانی اور اپنے ستم زدہ بوڑھے باپ کے شباب سے محبت کرتی ہیں۔ اس ماں سے پیار کرتی ہیں جس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس باپ سے پیار کرتی ہیں جس پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے گئے اور جو اب انہیں واپس مل گیا ہے۔ جب سے میں آپ سے آپ کے گھر پر ملا ہوں دن رات جینے

غور سے ان چیزوں کا مطالعہ کیا ہے۔"

اس کا باپ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سانس ذرا تیز ہو گئی تھی۔ مگر گھبراہٹ کے دوسرے آثار انھوں نے چھپا لئے تھے۔

"عزیز ڈاکٹر یہ سب کچھ جانتے ہو جھتے آپ کو اور انھیں اس مقدس روشنی سے ن کیجئے کے بعد میں نے ضبط کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں نے ضبط کیا جتنا ایک انسان قدرتی طور پر ضبط کر سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے اور اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے درمیان اپنی یعنی خود میری اپنی محبت کو لا کبھی آپ پر بیتی ہوئی کہانی کی بلندی میں کمی کر رہا ہے مگر میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہے۔"

"میں یقین کرتا ہوں اس سے پہلے بھی میں نے سوچا تھا اور اب تو مجھے یقین ہے" ڈاکٹر نے نہایت غمگین آواز میں کہا۔

"لیکن اگر آپ کو شبہ ہے کہ شاید قسمت نے یاوری کی اور وہ مبارک دن آیا کہ وہ میری بیوی بن گئیں تو پھر میں ان کے اور آپ کے درمیان خلیج بن جاؤں گا تو کبھی یقین نہ کیجئے گا اور میں اپنی اس گفتگو کا ایک لفظ بھی کبھی منھ سے نہیں نکالوں گا۔ اس کے علاوہ میں اسے نہایت کمینہ پن سمجھوں گا۔ اگر کہیں میرے دل کی گہرائیوں میں کوئی چھپا ہوا خیال بھی ہو، کوئی دور کا شبہ بھی دل میں ہو کہ سالوں بعد اس خیال کے دل میں ابھرنے کا امکان ہوگا تو میں آپ کا یہ مقدس ہاتھ چھونے کی کبھی ہمت نہ کرتا۔"

یہ کہتے ہوئے ڈارنے نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"نہیں عزیز ڈاکٹر میں بھی آپ کی طرح خود اپنی مرضی سے ترک وطن کرکے فرانس سے آیا ہوں۔ وہاں آپ کی طرح میں بھی تباہیوں مظالم اور دکھوں سے بچ کر آیا ہوں۔ آپ کی طرح میں بھی وہاں سے دور اپنی محنت بازوے گذر اوقات کرکے اپنے مستقبل کی خوشیوں پر بھروسہ کرتا ہوں۔ میں صرف آپ کی خوشی اور غم میں شرکت چاہتا ہوں۔ آپ کی زندگی اور گھر میں شرکت کا آرزومند ہوں۔ اور زندگی بھر آپ کا تابعدار رہنا چاہتا ہوں۔ لوسی آپ کی صاحبزادی ہیں میں باپ بیٹی کی محبت کو تقسیم نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ ہوسکے تو اپنی محبت کو اس میں شریک کرکے انھیں اور آپ سے قریب تر کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کا ہاتھ اب تک اس کے باپ کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ انھوں نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کے دباؤ کا جواب دیا۔ سرد مہری سے نہیں۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ اپنی کرسی کے ہتے پر لٹکا لئے اور بات چیت کے درمیان میں پہلی مرتبہ ڈارنے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ان کے چہرے سے کشمکش کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کشمکش کے درمیان وہ بار بار اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تاریک شبہات اور ایک نامعلوم سا خوف تھا۔

"تمہارے الفاظ میں حدت اور مردانگی ہے۔ چارلس ڈارنے میں تہ دل سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور قریب قریب نہایت سچے دل سے تمہیں پسند کرتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ لوسی تم سے محبت کرتی ہے؟"

"نہیں، ابھی تک تو نہیں۔"

"تو کیا میں یہ سمجھوں کہ اس گفتگو سے تمہارا یہ مقصد تھا کہ میری اجازت سے تم فوراً اس کی تصدیق کر لو"

"یہ بھی نہیں شاید مجھ میں ہفتوں اس کی ہمت نہ پیدا ہو سکے۔ اور شاید غلط یا صحیح مجھ میں کل ہی اتنی جرأت پیدا ہو جائے"

"تم مجھ سے کوئی صلاح لینا چاہتے ہو"

"نہیں جناب۔ مگر مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو میری مدد فرما سکتے ہیں"

"مجھ سے کوئی وعدہ لینا چاہتے ہو"

"جی ہاں"

"وہ کیا"

"مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بغیر آپ کی مرضی کے میرے لئے کوئی امید نہیں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مس مینٹ کے معصوم دل میں میرے لئے تھوڑی سی جگہ ہے۔ واضح رہے میں نے صرف فرض کرنے کی ہمت کی ہے۔ پھر بھی ان کے باپ کی محبت کے مقابلہ میں میری کوئی حیثیت نہیں ہوگی"

"اگر یہ درست ہے تو تم کو معلوم ہوگا کہ حالات اگر مخالف ہوں تو کیا نتائج ہوں گے"

یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ اگر ان کے والد کسی بھی خواستگار کے حق میں ایک لفظ بھی

کہہ دیں تو وہ خود اپنی رائے اور ساری دنیا کی رائے کی پروا نہ کریں گی۔ اس لئے ڈاکٹر مینٹ اگر میری جان بھی خطرے میں ہو تب بھی میں اس ایک لفظ کے فرمانے کی آپ سے درخواست نہیں کروں گا۔" ڈارنے نے بڑے وثوق مگر انکسار سے کہا۔

" مجھے اس کا یقین ہے چارلس ڈارنے، کہ شدید محبت میں بھی ایسی ہی اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے جیسی اختلاف کی صورت میں۔ جہاں گہری محبت ہو وہاں یہ اجنبیت نہایت نازک اور لطیف ہوتی ہے۔ اس راز کی تہ کو پہونچنا دشوار ہے۔ اس معاملہ میں میری بیٹی میرے لئے ایک ایسا راز سربستہ ہے کہ میں اس کے دل کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ... آپ کے خیال میں انکے... " وہ ہچکچائے ڈاکٹر نے جملہ پورا کر دیا۔

" تمہارا مطلب ہے کوئی اور بھی خواستگار ہے۔"

" جی ہاں یہی مطلب تھا میرا۔"

جواب دینے سے پہلے لوسی کے والد نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر بولے،

" مسٹر کارٹن کو تو تم یہاں دیکھ ہی چکے ہو۔ کبھی کبھی مسٹر اسٹرائیور بھی آتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ہو تو ان ہی دونوں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔"

" شاید دونوں بھی ہو سکتے ہیں۔"

" میں نے دونوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اور نہ ہی اس کی کوئی امید ہے۔ تم

مجھ سے کوئی وعدہ لینا چاہتے ہو۔ بولو کیا ہے وہ؟"

"کہ اگر کبھی مس ہینٹ بھی میری طرح آپ کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کریں تو آپ ان باتوں کی گواہی دیں گے۔ جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں۔ نیز یہ بھی فرمائیں گے۔ کہ آپ کو ان پر اعتبار ہے میں امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہوں گے کہ میری مخالفت نہیں کریں گے۔ اس میں میں نے کیا کچھ داؤں پر لگایا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں۔ وہ بات جس کی بنا پر میں نے یہ درخواست کی ہے وہ میں ابھی آپ کے سامنے بیان کروں گا۔ اور آپ کو معلوم کرنے کا حق بھی ہے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں؟" ڈاکٹر نے کہا "اور بغیر کسی شرط کے وعدہ کرتا ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ تمہارا مقصد حقیقت میں وہی ہے جو تم نے ابھی بیان کیا۔ مجھے اس کا بھی اعتبار ہے کہ تم میرے اور میرے عزیز تر وجود کے درمیان محبت کے رشتہ کو قطع کرنے کی بجائے استوار کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اگر اس نے کبھی مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ تمہارا وجود اس کی خوشیوں کی تکمیل کے لئے لازمی ہے تو میں اسے تمہارے سپرد کر دوں گا۔ اگر کوئی وجہ —— یا کوئی خیال یا وہم کوئی خوف کچھ بھی —— نیا یا پرانا کسی بھی شخص کے خلاف ثابت ہوا۔ چارلس ڈارنے۔ تب بھی مجھ سے کوئی تکلف نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس فعل کی ذمہ داری اس کے سر نہ عائد ہوتی ہو؟"

نوجوان نے شکر گذار ہو کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں کے ہاتھ ملے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نے اپنا بیان جاری رکھا: "لوسی ہی میرا سب کچھ ہے۔ لوسی کے لئے مجھے ہر بات کو اپنے دماغ سے مٹانا ہوگا۔ ان دکھوں سے زیادہ پیاری ہے جو میں نے جھیلے۔۔۔ ان مظالم سے زیادہ

اہم جو میں نے برداشت کیے۔ مگر۔۔۔ یہ سب فضول باتیں ہیں!"

وہ نہایت پراسرار طریقہ پر بتدریج خاموش ہو گئے۔ اور جب وہ بول چکے تو ان کی آنکھیں عجیب طور سے منجمد ہو گئیں۔ اور جب انہوں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو ڈارنے کو محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو گیا ہے۔

"تم مجھ سے اور کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کیا بات تھی وہ؟"

ڈاکٹر مینٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

ڈارنے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ وہ کیا جواب دے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ایک شرط مقرر کی تھی۔ جیسے ہی اس کا دماغ اس طرف گیا اسے اطمینان ہو گیا اور کہا۔

"آپ نے جس طرح میرے اوپر اعتماد کیا ہے اس کا جواب یہی ہے کہ میں آپ کے اوپر کامل بھروسہ کروں۔ میرا موجودہ نام جو میری والدہ کے نام سے ذرا سا تبدیل کر کے لیا گیا ہے میرا اصلی نام نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنا اصلی نام اور انگلینڈ میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ بتانا چاہتا ہوں"

"ٹھیرو" بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ بتا دوں تاکہ آپ کے اعتبار کے قابل بن سکوں۔ میں آپ سے کوئی چیز راز میں رکھنا نہیں چاہتا"

"ٹھیرو!"

ایک دفعہ تو ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھ لئے۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ

ڈارنے کے ہونٹوں پر بھی رکھ دیئے ۔

"ابھی نہیں جب میں تم سے پوچھوں تب بتانا ۔ اگر تمہاری خواہش پوری ہوگئی اور لوسی تم سے محبت کرنے لگی تب تم اپنی شادی کی صبح مجھے بتانا ۔ اس بات کا وعدہ کرو گے ؟"

"بڑی خوشی سے ؟"

"مجھے اپنا ہاتھ دو ، اب وہ واپس لوٹنے ہی والی ہوگی ۔ اور بہتر ہے کہ آج کی رات وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ نہ دیکھے ۔ جاؤ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے ؟"

چارلس ڈارنے جب ان سے رخصت ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا ۔ اور ایک گھنٹہ بعد جب لوسی گھر لوٹی تو اندھیرا اور بڑھ گیا تھا ۔ وہ تنہا تیز قدموں سے کمرے میں آئی ۔ کیونکہ مس لوسی سیدھی اوپر چلی گئی تھیں ۔ ان کی پڑھنے کی کرسی خالی دیکھکر اسے تعجب ہوا ۔

"ابا ۔۔۔ پیارے ابا ۔۔۔" اس نے انھیں پکارا ۔

اسے کوئی جواب نہ ملا ۔ مگر خواب گاہ سے ہوتے ہوئے کچھ ٹھوکنے کی آواز آرہی تھی ۔ آہستہ سے بیچ کے کمرے سے گذر کر اس نے ان کے کمرے میں جھانکا اور خوفزدہ ہوکر پلٹ پڑی ۔ اس کی رگوں میں خون جم گیا اور آپ ہی آپ رونے لگی ۔

"ہائے اب میں کیا کروں ۔ اب میں کیا کروں ؟"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ تذبذب کی حالت ختم ہوگئی ۔ وہ جلدی سے واپس لوٹی اور آہستہ سے ان کے دروازے پر دستک دے کر پکارا ۔ اس کی آواز سنتے ہی کھٹکھٹ کا شور رک گیا ۔ فوراً وہ اس کے پاس آگئے اور دیر تک دونوں ساتھ ساتھ ٹہلتے رہے ۔

رات کو وہ اپنے بستر سے اٹھ کر انھیں سوتا ہوا دیکھنے آئی۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے جوتے بنانے کی کشتی مع اوزاروں اور نامکمل جوتے کے حسب معمول قریب رکھی تھی۔

گیارہواں باب

"ساتھ والی تصویر"

"سڈنی شراب کا ایک اور جام تیار کرو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" مسٹر اسٹرائیور نے اسی رات یا صبح کے وقت اپنے گیدڑ سے کہا۔

سڈنی نے اس رات دوگنا کام بھگتایا تھا۔ اس سے پہلے کی رات اور اس سے بھی پہلے کی رات بلکہ بہت سی راتوں سے متواتر وہ مسٹر اسٹرائیور کے کاغذات کو ٹھکانے لگانے میں مصروف رہا تھا۔ چھٹیوں سے پہلے یہ جمع شدہ کام ختم کرنا تھا۔ اور آخر کار کام ختم ہو گیا۔ مسٹر اسٹرائیور کے سارے الجھے ہوئے معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سلجھائے جا چکے تھے۔ نومبر میں پھر دہی مادی اور قانونی کہرا جمع ہو جائے گا۔ اور پھر چکی کے لئے نئے گھان موجود ہو جائیں گے۔

کثرت سے شغل کرنے کے بعد سڈنی نہ تو کچھ زیادہ خلیق ہو گیا تھا ورنہ اپنے

ہوش و حواس میں تھا۔ ساری رات کام کرنے کے لئے بہت سے بھیگے تولئے سر پر رکھنے پڑے۔ اس سے پہلے کافی مقدار میں شراب کا بھی سہارا لیا گیا تھا اس کی حالت بہت شکستہ ہو رہی تھی۔ اس نے سر پر سے گیلے تولیہ کی پگڑی اتار کر اس برتن میں پھینکی جس میں مسلسل چھ گھنٹے سے وہ اسے بھگو رہا تھا۔

"بھئی شراب کا دوسرا پیالہ تیار کر رہے ہو نا؟" بھاری بھرکم مسٹر اسٹرائیور نے اس صوفے پر سے جس پر وہ اپنی پیٹی میں ہاتھ اٹکائے چت لیٹے تھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"سنو ـــــ میں جو بات تمہیں بتانے والا ہوں اسے سنکر تم ذرا متعجب تو ہوگے اور تم مجھے اتنا ہوشیار نہیں کہو گے جتنا عام طور پر خیال کرتے ہو۔ میرا ارادہ شادی کرنے کا ہے"

"اچھا"

"ہاں ـــــ اور روپیہ کی خاطر نہیں کر رہا ہوں۔ بولو۔ اب کیا کہتے ہو؟"

"اس وقت کچھ کہنے کی قطعی سکت نہیں۔ کون ہے وہ ـــ"

"بوجھو!"

"کیا میں اسے جانتا ہوں"

"بوجھو!"

"اب میں صبح کے پانچ بجے قطعی پہیلیاں بوجھنے کو تیار نہیں۔ میرا بھیجا ویسے ہی کھد بد پک رہا ہے۔ اگر تم بجوا ہی چاہتے ہو تو مجھے کھانے پر مدعو کرو۔"

"خیر — بتائے دیتا ہوں" مسٹر اسٹرائیور نے آہستہ سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سڈنی۔ مجھے اپنا مطلب واضح کرنے میں ذرا ناامیدی ہو رہی ہے۔ کیونکہ تم اس قدر کوڑھ مغز تو ہو۔"

"اور تم اس قدر حساس اور شاعرانہ مزاج شخص ہو!" سڈنی نے شراب تیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو مانتے ہو کہ گو میں بہت رومنٹک ہونے کا نہ دعویٰ کرتا ہوں، اور نہ یہ میری خواہش ہے کیونکہ مجھے امید ہے کہ میں بخوبی جانتا ہوں۔ پھر بھی میں تم سے زیادہ لطیف طبیعت کا انسان ہوں" مسٹر اسٹرائیور نے ہنستے ہوئے شیخی ماری۔

"تمہارا مطلب ہے تم زیادہ خوش قسمت ہو۔"

"میرا یہ قطعی مطلب نہیں۔ میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ مجھ میں ۔ ۔ ۔ زیادہ"

"اب کہنے پر تلے ہو تو جانباز کیوں نہیں کہہ دیتے" کارٹن نے رائے دی۔

"خیر! جانباز ہی سہی۔ میرا مطلب ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو خوش مزاج رہنا پسند کرتے ہیں اور ہر دل عزیز بننے کی کوشش کرتے ہیں نیز عورتوں کی صحبت میں کس طرح انھیں متاثر کیا جاتا ہے۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"اور کچھ" سڈنی کارٹن نے کہا۔

"نہیں۔ مگر اور کچھ کہنے سے پہلے اتنی بات تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے گھر تم بھی اتنی دفعہ گئے ہو۔ جتنی دفعہ میں گیا ہوں۔ کبھی تمہیں وہاں یوں غم زدہ شکل بنا کر بیٹھنا کیا ضروری ہے۔۔۔ ایسے مرگھلے منہ پھیلائے پژمردہ بیٹھے رہنے پر کہ مجھے تو بھئی تمہاری وجہ سے۔ سڈنی۔ بڑی ذلت محسوس ہوتی ہے" اسٹرائیور نے کمینہ پن سے زک پہونچانے کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔

جو حرکتیں تم کرتے ہو ان پر تو بھری عدالت میں تمہیں شرمندہ ہونا چاہیے تمہیں میرا شکر گذار ہونا چاہیے" سڈنی نے جواب دیا۔

"ان باتوں سے تم بچو گے نہیں۔ نہیں سڈنی تمہیں آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور تمہارے منہ پر کہہ دینا ہی تمہارے لئے مفید ہوگا۔ کہ تم ایسی صحبتوں میں نہایت شیطان صفت اور ناموزوں ثابت ہوتے ہو تم نہایت بد مزاج انسان ہو"

مسٹر اسٹرائیور نے فوراً بات کو ایسا پلٹا دیا کہ سڈنی کو کندھا مارہی دیا۔

سڈنی نے اس شراب کا جو وہ تیار کر رہا تھا بڑا سا گلاس چڑھایا اور ہنسا۔

"میری طرف دیکھو" اسٹرائیور نے کندھے پھیلا کر کہا: "مجھے اتنی خوش مزاجی سے پیش آنے کی ضرورت نہیں جتنی تمہیں ہے۔ میں تم سے نسبتاً بہت زیادہ خود مختار ہوں پھر بھی میں مروت سے کیوں پیش آتا ہوں"

"میں نے تو تمہیں کبھی ایسا نہیں پایا"

"میں اس لئے مروت سے پیش آتا ہوں کہ یہ مصلحت کا تقاضا ہے میں اصولاً

اس پر عمل کرتا ہوں اور دیکھو میں کامیاب ہوں "

"مگر تم اپنی شادی کے بارے میں کچھ تفصیل بتانے میں قطعی کامیاب نہیں نظر آرہے ہو"

کارٹن نے لاپرواہی سے کہا "براہ کرم اس موضوع پر روشنی ڈالو۔ اور جہاں تک میرا سوال ہے کیا تم کبھی بھی اتنا نہیں سمجھ پاؤ گے کہ میں ایک گیا گذرا انسان ہوں "

یہ سوال اس نے قدرے حقارت کے لہجہ میں کیا۔

"تمہیں یوں گیا گذرا بنکا بننے کا کوئی حق نہیں" اس کے دوست نے کچھ زیادہ پیار بھرے لہجہ میں نہیں کہا۔

"مجھے معلوم ہے میرا وجود بھی حق بجانب نہیں !" سڈنی کارٹن نے کہا "وہ کون خاتون ہیں "

"اب دیکھو میرے اس اعلان پر جز بز ہونے کی ضرورت نہیں" نہایت دوستانہ طریقہ پر مسٹر اسٹرائیور نے سڈنی کو انکشاف کے لئے تیار کیا "میں جانتا ہوں تم جو کچھ کہتے ہو آدھا بھی تمہارا کہنے کا مقصد نہیں ہوتا۔ خیر اگر اس وقت تمہارا واقعی یہ مطلب تھا، تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید میں نے اس لئے ضروری سمجھی کہ تم نے ایک دفعہ اس خاتون کے بارے میں کچھ چھچھورے الفاظ استعمال کئے تھے "

"واقعی ؟"

"واقعی — بھئی اسی دفتر میں !"

سڈنی نے اپنے شراب کے پیالے میں دیکھا۔ پھر اپنے بامروت دوست کی طرف

دیکھا۔ جام چڑھالیا اور پھر اپنے با اخلاق دوست کی طرف دیکھا۔

"تم نے خاتون موصوفہ کو سنہرے بالوں والی گڑیا کہا تھا۔ وہ نوجوان خاتون مس میلنٹھ ہیں۔ اگر تم ذرا بھی حساس اور لطیف طبیعت کے انسان ہوتے تو ایسے الفاظ استعمال کرنے پر مجھے سخت اعتراض ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تم میں شائستگی کی شدت سے کمی ہے۔ مجھے قطعی اس بات پر غصہ نہیں آتا جب میں تمہارے الفاظ یاد کرتا ہوں۔ اگر کوئی مصوری کے فن سے بے بہرہ انسان میری تصویر کی برائی کرے یا کوئی کنسر امیری موسیقی کی برائی کرے تو مجھے قطعی پروا نہ ہوگی۔"

سڈنی کارٹن بڑی تیزی سے جام پر جام چڑھاتا رہا۔ اور اپنے دوست کی طرف دیکھتا رہا۔

"تو بھئی سڈنی ـــ اب تمہیں سب باتیں معلوم ہوگئیں۔ مجھے دولت کی پروا نہیں لڑکی خوبصورت ہے اور میں نے اپنی مسرتوں کی تکمیل کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس کی استطاعت رکھتا ہوں۔ اسے ایک ایسا شوہر مل رہا ہے جو کافی خوش حال ہے۔ تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور جس کی قدر و منزلت ہے۔ واقعی یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ مگر وہ خوش نصیبی کی حقدار ہے۔ کیا تمہیں تعجب ہو رہا ہے؟"

"مجھے آخر کیوں تعجب ہوگا؟" کارٹن نے جام چڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو تمہیں میری پسند سے اتفاق ہے؟"

"آخر مجھے تمہاری پسند سے کیوں اتفاق نہیں ہوگا؟" جام چڑھاتے ہوئے سڈنی

نے جواب دیا۔

"میری امید کے خلاف تم نے تو نہایت انسانیت سے اس بات کو سنا میرا خیال تھا کہ تم مجھے اپنا ہم خیال بنا دینے کی رائے دو گے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اب تو شاید تمہیں بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تمہارا یہ پرانا دوست انتہائی مضبوط ارادے کا انسان ہے۔ سڈنی اب اس قسم کی زندگی سے میرا جی بھر چکا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی نرالی بات ہی پیش نہیں آتی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک انسان کے پاس گھر کا ہونا بھی نہایت خوشگوار ہوتا ہو گا جب وہ جانا چاہے تو گھر جا سکتا ہے۔ نہ جانا چاہے تو کون سی زبردستی ہے۔ میرا خیال ہے مس مینٹ ہر حال میں میرے لئے بہت موزوں ثابت ہوں گی۔ اور ان کی ذات سے مجھے فائدہ پہونچے گا۔ لہٰذا اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور اب پیارے دوست سڈنی میں تمہارے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تم بری حالت کو پہونچ چکے ہو۔ واقعی تمہاری دُرگت بن گئی ہے۔ تمہیں روپیہ کی قدر کرنا نہیں آتی۔ تم بڑی ہنگامی زندگی گذار رہے ہو۔ کوئی دن جاتا ہے کہ تم ٹھوکر کھاؤ گے۔ بیماری اور غربت کے چنگل میں پھنس جاؤ گے۔ واقعی تمہیں تیمارداری کی جستجو کرنا چاہئے۔"

جس سرپرستی اور بزرگی کے انداز میں اسٹرائیور نے تقریر کی اس نے انھیں انکی اصلی جسامت سے دوگنا موٹا اور چوگنا تلخ زبان بنا دیا تھا۔

"میری رائے میں اب تم بھی حقیقت کا مقابلہ کرو۔ دیکھو بھئی ہم نے تو اپنے طریقہ سے اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈ لیا اب تم بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنا سہارا ڈھونڈ لو غلاوی

کرلو۔ کوئی ایسا ساتھی ڈھونڈھ لو جو تمہارا خرچ اٹھائے اس کی تم پرواہ نہ کرو کہ تمہیں عورتوں کی صحبت ہی سے دلچسپی نہیں۔ اور نہ کچھ اس بارے میں سمجھ بوجھ ہے اور نہ ہی ملکہ حاصل ہے۔ بس کسی کو تلاش کرلو۔ کوئی شریف عورت جس کے پاس تھوڑی سی جائداد ہو ڈھونڈھ لو کوئی مالکہ مکان قسم کی عورت یا جو کرے کرلے پر اٹھاتی ہے اور اس سے شادی کرلو تاکہ بڑے دنوں کا کوئی سہارا مل جائے۔ کچھ اس قسم کا انتظام تمہارے لئے ہونا چاہیئے۔ سڈنی۔۔ اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔"

"اچھا۔۔ غور کروں گا۔۔" سڈنی نے کہا۔

بارھواں باب

"مہذب انسان"

مسٹر اسٹرائیور نے ڈاکٹر کی بیٹی کی قسمت چمکانے کا فیصلہ کرنے کے بعد لمبی چھٹیوں میں شہر کے باہر جانے سے پہلے اس خوش خبری سے اسے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے طے کیا کہ تمام انتظامات مکمل کرلئے جائیں اس کے بعد وہ لوگ آرام سے یہ فیصلہ کرتے رہیں گے کہ وہ مائکلمس کی تعطیلات سے دو ایک ہفتہ پہلے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیں یا کرسمس اور ہلاری کے درمیان کی مختصر چھٹیوں میں یہ مبارک رسم ادا کر دی جائے۔

جہاں تک ان کے اپنے مقدمے کی مضبوطی کا سوال تھا اس میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی سامنے فیصلہ صاف نظر آرہا تھا۔ جیوری پر روشن تھا کہ دولت ہی دنیا میں ایک قابل توجہ حقیقت ہے یہ کھلا ہوا اور صاف معاملہ تھا اور اس میں کوئی نکتہ کمزور نہ تھا۔ انہوں نے خود کو مدعی کی طرف سے طلب کیا۔ ان کے بہم پہونچائے ہوئے ثبوت سے زیچ کرجانا محال تھا۔ مدعا علیہ کے وکیل نے ہار مان کر اپنی شلیں پھینک دیں اور جیوری نے غور کرنے کے لئے مہلت مانگنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے بعد وکیل اسٹرائیور کو اطمینان ہو گیا کہ اس سے آسان مقدمہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مسٹر اسٹرائیور نے چھٹیوں کی ابتدا کی رسم ادا کرنے کے لئے مس مینٹ کو واکس ہال گارڈن لے جانے کی تجویز نہایت پر تکلف طریقہ پر پیش کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہاں کامیابی نہ ہو تو رینلا میں۔ وہاں بھی اگر اتفاقیہ بات نہ بنے تب تو پھر ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ سوہو تشریف لے جائیں۔ اور وہاں اپنا منشا ظاہر کر دیں۔

اس لئے ٹیمپل سے مسٹر اسٹرائیور سوہو کی جانب شانے مارتے روانہ ہو گئے۔ طویل چھٹیوں کی دلچسپیاں آغاز ہی سے پوری بہار دکھارہی تھیں اگر کسی نے اس وقت انھیں سوہو کے راستہ میں ٹیمپل بار کی سینٹ ڈنسٹان والی سمت اپنے پورے طمطراق کے ساتھ فٹ پاتھ پر کمزور انسانوں کو دھکے مار کر چلتے ہوئے دیکھ لیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کتنے طاقتور ہیں۔

ان کے راستہ میں ٹیلسن بینک بھی پڑتا تھا۔ اور چونکہ وہاں ان کا حساب کتاب

بھی تھا۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ مسٹر لاری مینٹ خاندان کے بہت بے تکلف دوست ہیں۔ یہ بات مسٹر اسٹرائیور کے دماغ میں سما گئی کہ وہ بینک میں داخل ہو کر مسٹر لاری کو سوہو کی قسمت جاگنے کی خوش خبری سنا دیں۔ لہٰذا انھوں نے نزدیک کی ہچکی لیتا ہوا دروازہ کھولا۔ گرتے گرتے سنبھل کر دو سیڑھیاں نیچے اترے۔ اور بکتے ہوئے خزانچیوں کے پاس سے گذر کر اور شاندار کراس کوٹھڑی میں گھس گئے جہاں مسٹر لاری اعداد لکھنے کے لئے سطریں کھینچے ہوئے بھاری رجسٹر لئے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کی کھڑکی میں عمودی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی شاید اعداد لکھنے کے لئے ہی بنائی گئی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا آسمان کے نیچے کی سب چیزیں ایک عدد بن گئی ہیں۔ اور وہ عدد مسٹر اسٹرائیور کی شکل میں کھڑکی کے سامنے تحریر تھا۔

"ہلو" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔ "کیسے مزاج ہیں — امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔"

یہ مسٹر اسٹرائیور کی ایک شاندار خصوصیت تھی کہ وہ جس مقام پر جس جگہ بھی ہوتے اس کی وسعت کے لئے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ بڑے ثابت ہوتے تھے۔ ٹیلسن بینک کے لئے تو وہ اتنے زیادہ بڑے تھے کہ بڈھے کلرک دور کونوں میں دبکے انھیں شاکی نظروں سے گھور رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ان کو دیواروں سے بھینچ دیا ہو۔ منیجر نے بھی جو بڑی شان سے کونے میں الگ تھلگ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اخبار ہٹا کر انھیں ایسے دیکھا جیسے اسٹرائیور کا سر ان کی واسکٹ سے ٹکرا گیا ہو۔

مسٹر لاری نے موقع کی مناسبت سے نہایت روکھی آواز میں کہا "مزاج کیسا ہے

مسٹر اسٹرائیور ـــ کیسے ہیں جناب "۔ اور ہاتھ ملایا۔ ان کا ہاتھ ملانے کا طریقہ بھی ٹیلسن کے تمام کلرکوں کی طرح بڑا عجیب تھا۔ خاص طور پر جب منیجر وہاں موجود ہو۔ انہوں نے اپنی ہستی کو قطعی نظرانداز کرکے ایسے ہاتھ ملایا جیسے وہ ٹیلسن اینڈ کو کی طرف سے مصافحہ کررہے ہوں۔

"میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں مسٹر اسٹرائیور" انھوں نے اپنا کاروباری رول ادا کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں مسٹر لاری۔ میں آپ سے نجی طور پر ملنے آیا ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ تنہائی میں کہنا ہے" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔

"ارے واقعی" مسٹر لاری نے اپنا کان ان کے قریب کرکے کہا مگر ان کی آنکھیں منیجر پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں اپنے آپ کو جناب کی حسین اور خوش ادا کم سن دوست مس مینٹ کی خدمت میں شادی کے لئے پیش کرنے جارہا ہوں۔ مسٹر لاری ـــ" مسٹر اسٹرائیور نے بڑے وثوق سے ڈیسک پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ ڈیسک کافی بڑا تھا۔ پھر بھی مسٹر اسٹرائیور کے لئے ناکافی تھا۔

"خدا خیر کرے۔ جناب یعنی خدا خیر کرے سے آپ کا مطلب کیا ہے مسٹر لاری" مسٹر اسٹرائیور نے تعجب سے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"میرا مطلب قطعی دوستانہ اور پسندیدہ ہے نیز اس میں آپ کی ستائش بھی شامل ہے۔ میرا مطلب وہی سب ہے جو آپ چاہتے ہیں لیکن ـ آپ یقیناً جانتے ہیں کہ مسٹر اسٹرائیور"

پھر مسٹر لاری نے نہایت بے تکے پن سے اپنا سر ہلایا جیسے وہ اپنی مرضی کے خلاف دل ہی دل میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہوں کہ "واہ آپ تو بڑھتے جا رہے ہیں بہت بڑھتے جا رہے ہیں"

"خدا مجھ پر رحم کرے۔ خدا آپ پر رحم کرے۔ مسٹر لاری میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

مسٹر اسٹرائیور نے آنکھیں پھاڑیں۔ بھرپور سانس کھینچی اور زور سے اپنا جنگی ہاتھ ڈیسک پر مار کر کہا۔

مسٹر لاری نے فیصلہ کن انداز میں اپنا وگ دونوں کانوں پر جمایا اور قلم کا پر دانتوں میں دبالیا۔

"لعنت ہو ۔۔۔ جناب۔ کیا میں موزوں نہیں" مسٹر اسٹرائیور نے انہیں آنکھیں پھاڑ کر گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ معبود! یقیناً ۔۔۔ یقیناً آپ موزوں ہیں جہاں تک موزونیت کا سوال ہے آپ ضرور موزوں ہیں" مسٹر لاری نے کہا۔

"کیا میں دولت مند نہیں" اسٹرائیور نے پوچھا۔

"اوہ! اگر دولت کا ذکر کر رہے ہو تو آپ قطعی دولت مند ہیں" مسٹر لاری نے کہا۔

"اور ترقی کر رہا ہوں"

"جہاں تک ترقی کرنے کا سوال ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ کسی کو اس میں شک نہیں" مسٹر لاری خوش ہوئے کہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے کا ایک اور نکتہ ہاتھ لگا۔

"تو پھر آخر آپ کا مطلب کیا ہے" مسٹر اسٹرائیور نے قدرے پست حال ہو کر پوچھا
"اوہ ... میں۔ کیا آپ ابھی وہاں جارہے ہیں" مسٹر لاری نے سوال کیا۔
"سیدھا" مسٹر اسٹرائیور نے اپنی موٹی مٹھی ڈیسک پر جما کر کہا۔
"تب تو میرا خیال ہے کہ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو نہ جاتا"
"کیوں، اب میں آپ کو قائل کر کے چھوڑوں گا" مسٹر اسٹرائیور نے کہا۔ آپ کاروباری آدمی ہیں اور یقیناً آپ کے پاس اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ اپنی وجہ کی تشریح کیجئے۔ آپ کیوں نہ جاتے"
"کیونکہ جب تک میرے پاس کوئی ایسا معقول ثبوت نہ ہوتا کہ مجھے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہونے کی اُمید ہے تب تک میں قطعی نہ جاتا"
"لعنت! مگر یہ تو حد ہو گئی!"
مسٹر لاری نے دور بیٹھے منیجر کو دیکھا۔ پھر غصہ میں بھرے ہوئے اسٹرائیور کو دیکھا۔
"آپ کاروباری آدمی ہیں۔ عمر رسیدہ اور تجربہ کار ہیں۔ تین نہایت پختہ اسباب موجود ہیں جن کی وجہ سے مکمل کامیابی لازم ہو جاتی ہے اور آپ کہتے ہیں قطعی کوئی ثبوت نہیں۔ کیا خوب آپ کا دماغ تو ٹھکانے ہے"
مسٹر اسٹرائیور نے ایسا کہا جیسے اگر مسٹر لاری کا دماغ ٹھکانے نہ ہوتا اور وہ یہ بات کہتے تو قطعی تعجب نہ ہوتا۔
"جب میں نے کامیابی کا ذکر کیا تو میرا مطلب ہے خاتون موصوفہ سے شادی کے

مسئلہ پر کامیابی۔ اور جب میں نے وجوہات اور اسباب کا ذکر کیا تو میرا مطلب تھا وہ وجوہات اور اسباب جن سے نوجوان خاتون متاثر ہو سکیں۔ نوجوان خاتون۔ مہربان من۔ سب سے پہلے نوجوان خاتون کی مرضی کا سوال اٹھتا ہے" مسٹر لاری نے آہستہ سے مسٹر اسٹرائیور کا بازو تھپتھپا کر کہا۔

"کیا آپ مجھ پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں مسٹر لاری کہ آپ نے قصداً یہ رائے قائم کی ہے کہ نوجوان خاتون جن کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہے خالی الذہن اور احمق ہے" مسٹر اسٹرائیور نے اپنی کہنیاں پھیلا کر کہا۔

"قطعی نہیں ـــــ مسٹر اسٹرائیور، میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نوجوان خاتون کے خلاف میں کسی کے بھی منہ سے ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی ایسا شخص ہے ـــ گو مجھے امید ہے کہ کوئی نہیں ہے۔ ایسا آدمی جو اتنے گرے ہوئے مذاق کا ہو کہ میرے اس ڈیسک پر بیٹھ کر نوجوان خاتون کے بارے میں کوئی گستاخی کا لفظ استعمال کرے تو مجھے ٹیلسن کی بھی پرواہ نہ ہوگی۔ اور میں اسے کھری کھری سنانے سے باز نہیں آؤں گا"

نچی اور دبی ہوئی آواز میں بولنے پر مجبور ہونے کی وجہ سے خون کا دباؤ مسٹر اسٹرائیور کی رگوں پر خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ ویسے مسٹر لاری کی نسوں کا فعل نہایت صحت مند اور نپا تلا تھا مگر ان کے غصہ کی باری آئی تو ان کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں رہی۔

"جناب:۔ یہی میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ براہ کرم اس معاملے میں کسی قسم کی

غلطی نہ ہونے دیجئے گا " مسٹر لاری نے کہا ۔

مسٹر اسٹرائیور تھوڑی دیر تک ایک مسطر کا سرا چوستے رہے ۔ اور دانتوں کے بیچ میں سے ایک راگ الاپنے کی کوشش کرتے رہے جس کی وجہ سے شاید ان کے دانت میں درد اٹھ آیا ۔ انہوں نے اس بے تکی خاموشی کو یوں توڑا ۔

" یہ میرے لئے قطعی غیر متوقع بات ہے ۔ مسٹر لاری آپ مجھے ۔ مجھے یعنی شاہی عدالت کے اسٹرائیور کو عمداً یہ رائے دے رہے ہیں کہ میں اپنا پیغام لے کر سو ہو نہ جاؤں "

" کیا آپ میری رائے لینا چاہتے ہیں ۔ مسٹر اسٹرائیور ؟"

" یقیناً چاہتا ہوں "

" بہت اچھا ۔ تو میں نے رائے دیدی ۔ یعنی وہی جو ابھی آپ کہہ رہے تھے ۔ بالکل ٹھیک کہ نہ جائیے "

" اور اس کے بارے میں میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہاں تو جناب نے اپنے ماضی ، حال اور مستقبل کو بھی مات کر دیا ۔ ہا ہا ___ ہا " مسٹر اسٹرائیور جھینپ کر ہنسنے لگے ۔

" میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے ۔ ایک کاروباری آدمی کی حیثیت سے مجھے اس بارے میں کچھ کہنے کا حق نہیں ہے ۔ ایک کاروباری قسم کے انسان کی حیثیت سے میں ان باتوں کو سمجھتا بھی نہیں ۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے ایک ایسے بوڑھے انسان کی حیثیت سے کہا ہے جس نے مس مینٹ کو اپنے ہاتھوں میں کھلایا ہے ۔ جو مس مینٹ اور ان کے والد کا ٹھیک دوست ہے ۔ مجھے ان دونوں سے بے انتہا محبت ہے اور پھر یاد رہے آپ خود مشورہ لینے

آئے تھے۔ آپ کا خیال ہے میں غلطی پر ہوں"

"نہیں میرا یہ خیال نہیں" مسٹر اسٹرائیور نے سیٹی بجاتے ہوئے کہا "سمجھ بوجھ کے تعلق سے مجھے فریقین کو چھوڑ کر تیسرے شخص کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ فریق ثانی میں بھی سمجھداری کی کمی نہیں۔ آپ کھن ردی کو فضول باتیں سمجھتے ہیں۔ میرے لئے یہ نیا انکشاف ہے۔ شاید آپ کا خیال ہی درست ہو"

"میں جو کچھ فرض کرتا ہوں خود اس کا فیصلہ کرتا ہوں۔ اتنا سمجھ لیجئے۔ جناب ـــ ٹیلسن بینک میں بھی میں کسی متنفس کو اپنی خصلت کے بارے میں فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا"

"یہ لیجئے! صاحب میں آپ سے معافی چاہتا ہوں"

"یہ کوئی بات نہیں۔ شکریہ! تو مسٹر اسٹرائیور۔ میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ آپ کو یہ معلوم کرکے شاید تکلیف ہوگی کہ آپ کا اندازہ غلط تھا۔ شاید ڈاکٹر مینیٹ کو بھی آپ کے سامنے صاف جواب دیتے وقت تکلیف ہو۔ اور مس مینٹ کو بھی آپ کے سامنے عذر پیش کرتے ہوئے بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔ آپ جانتے ہیں میرے تعلقات اس خاندان سے کتنے خوشگوار اور استوار ہیں۔ یہ میری عزت افزائی اور خوش نصیبی ہے اگر آپ کہیں تو بغیر آپ کا حوالہ دیئے، بغیر کسی بھی طرح آپ کو شامل کئے میں خود اپنی طرف سے کسی اور طریقے سے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اندازہ لگاؤں کہ کس حد تک آپ کو کامیابی نصیب ہوگی۔ پھر آپ چاہیں تو خود دوبارہ اس کی تصدیق کرکے اپنا اطمینان کرلیں۔ اور اگر آپ کو میری اطلاع پر

یقین ہو تو آپ اور دوسرے لوگ خواہ مخواہ کی خجالت سے بچ جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں؟"

"مجھے شہر میں کتنے دن ٹھیرنا پڑے گا؟"

"بس چند گھنٹوں کی بات ہے۔ شام کو سوہو جاؤں گا وہاں سے واپسی پر سیدھا آپ کے آفس کو چلا آؤں گا۔"

"تب مجھے منظور ہے میں اس وقت وہاں نہیں جاؤں گا کیونکہ میرا دل کچھ زیادہ وہاں جانے کو نہیں چاہ رہا ہے۔ ہاں میں رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔ صبح بخیر!"

مسٹر اسٹرائیور مڑے اور دھڑا دھڑ کرتے باہر نکل گئے۔ سارا بینک اتنی زور سے لرزا کہ ڈیسک پر ادب سے جھکتے ہوئے دو پرانے کلرکوں کو اپنی جگہ کھڑے رہنے کے لئے اپنی ساری باقی ماندہ طاقت صرف کرنا پڑی۔ یہ بے چارے کمزور و ناتواں کلرک ہمیشہ ادب سے جھکنے کی خدمات ہی انجام دیتے نظر آتے تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ جب کسی سے رخصت ہوتے ہوئے گاہک کے سامنے ادب سے جھکتے ہیں تو بس خالی دفتر میں برابر جھکے جاتے ہیں یہاں تک کہ تازہ وارد گاہک خوش آمدید کہہ دیتے ہیں۔

اتنی عقل اور ہوشیاری تو وکیل میں تھی۔ کہ اندازہ لگا سکے کہ اگر اس بات کو یقین کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ نہ ہوتی تو مسٹر لاری اس شدت سے اصرار نہ کرتے۔ وہ اتنی کڑوی گولی کے لئے تیار نہ تھے۔ مگر جو ٹھا کر نگل ہی گئے۔

"اور اب اس جھگڑے سے خود کو صاف بچا کر نکالنے کا یہی طریقہ ہے کہ تم سب کو غلط

ثابت کر دیا جائے" انھوں نے ایک قانون داں کی طرح پورے بینک کی طرف تادیباً انگلی اٹھا کر کہا۔

پرانی عدالت نے کے باہر کی حیثیت سے یہ بھی ایک شاہکار تھا۔ اور انھیں اس خیال سے بڑی تقویت ملی "نوجوان خاتون! اس سے پہلے کہ آپ مجھے غلط ثابت کریں میں خود آپ کو غلط ثابت کر دوں گا"

چنانچہ جب رات کو دس بجے مسٹر لاری ان سے ملنے گئے تو وہ قصداً چاروں طرف کاغذ بکھیرے اس طرح بیٹھے تھے جیسے انھیں صبح کے معاملے کے بارے میں کچھ یاد بھی نہ رہا ہو۔ بلکہ مسٹر لاری کو دیکھ کر انجان سے بن گئے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ کام میں انتہائی مصروف اور کھوئے ہوئے ہیں۔

"تو پھر میں سو ہو گیا تھا" کوئی آدھ گھنٹہ مطلب کی بات پر آنے کی کوشش کے بعد آخر مسٹر لاری نے کہہ ہی دیا۔

"سو ہو گئے تھے اوہ — نہ جانے میں کیا سوچنے لگا تھا" مسٹر اسٹرائیور نے سرد مہری سے کہا۔

"اور مجھے قطعی کوئی شک نہیں رہا کہ میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اور میں اب بھی وہی صلاح دوں گا" مسٹر لاری بولے۔

"میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور اس بے چارے باپ سے بھی بڑی ہمدردی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ موضوع خاندان کے لئے ہمیشہ دکھتی رگ بنا رہے گا بخراب

اس ذکر کو بھول جانا چاہیئے" مسٹر اسٹرائیور نے نہایت اخلاص سے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" مسٹر لاری نے کہا۔

"واقعی ـــــ خیر کوئی بات نہیں، کچھ مضائقہ نہیں" مسٹر اسٹرائیور نے تسلی دینے کے انداز میں فیصلہ کن طریقہ پر کہا۔

"مگر یہ بات اہمیت رکھتی ہے" مسٹر لاری نے زور دیا۔

"نہیں۔ قطعی نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قطعی اہمیت نہیں رکھتی۔ جہاں سمجھ بوجھ ہوتی نہیں وہاں عقلمندی کی توقع کرنا اور جہاں قابل ستائش بلند خیالی کا وجود ہی نہ ہو وہاں قابل ستائش بلند خیالی کی امید رکھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میری غلط فہمی دور ہو گئی اور میں بال بال بچ گیا۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی حماقتیں نوجوان لڑکیوں سے سرزد ہو چکی ہیں اور پھر غربت اور کس مپرسی میں گم ہو کر پچھتانا پڑا ہے۔ نہایت غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے تو مجھے افسوس ہے کہ یہ معاملہ طے نہ ہوا کیوں کہ اس سے دنیاوی نقطہ نظر سے دوسروں کو فائدہ پہونچ رہا تھا۔ لیکن جہاں تک میری بھلائی کے خیال کا سوال ہے مجھے خوشی ہوئی کہ معاملہ ختم ہو گیا کیونکہ دنیا کے نقطہ نظر سے میرے لئے اس میں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ شاید یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ مجھے کچھ بھی فائدہ پہونچنے کا امکان نہ تھا۔ شکر ہے کہ کسی قسم کا نقصان نہ پہونچا۔ شکر ہے میں نے نوجوان خاتون کو پیغام نہیں دیا۔ اور آپس کی بات ہے اس لئے کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ مسٹر لاری۔ ان احمق خالی الذہن چھوٹی لڑکیوں کے نخرے اٹھانا بھی ایک الٹے بانس کی کہانی ہے۔ ایک دفعہ اس چکر میں انسان پھنس جائے تو بس سوائے کوفت اور پریشانی کے

کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مہربانی سے اس ذکر کو ختم کر دیجئے۔ مجھے دوسروں کے نقصان پر تو افسوس ہو رہا ہے۔ مگر اپنی ذات کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اور واقعی میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے براہ کرم مشورہ کی اجازت دی اور اتنی بیش قیمت نصیحت کی۔ واقعی آپ نوجوان خاتون کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ بالکل آپ نے صحیح کہا تھا۔ بات کبھی ٹھیک نہ بیٹھتی "

مسٹر لاری ششدر رہ گئے۔ اور جب مسٹر اسٹرائیور نے انھیں باقاعدہ کمرہ سے نکال دیا تو آنکھیں پھاڑ کے انھیں دیکھنے لگے۔

" مہربان من: آپ جیسے تیسے بھی ہو رفع دفع کیجئے " نہایت دریا دلی، مروت اور اخلاق سے مسٹر اسٹرائیور نے انھیں دروازے میں سے ٹہلتے ہوئے کہا " اس کا کہیں ذکر نہ کیجئے گا ـــ میں پھر ایک بار مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے مشورے سے مستفیض ہونے کا موقع دیا ـــ شب بخیر "

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے مسٹر لاری باہر نکل چکے تھے۔ مسٹر اسٹرائیور صوفے پر لیٹے چھت کی طرف آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔

تیرہواں باب

"غیر مہذب انسان"

ممکن ہے سڈنی کارٹن شاید کسی محفل میں کبھی چمک اٹھے ہوں۔ مگر ڈاکٹر مینٹ کے گھر میں تو ان کی شخصیت کبھی نہ ابھرنے پائی۔ سال بھر سے وہ برابر آیا کرتے تھے۔ مگر ہمیشہ خاموش اور پریشان بیٹھے رہا کرتے۔ جب وہ باتیں کرنا چاہتے تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے۔ مگر موماً ان پر لاابالی پن کے ایسے بادل چھائے رہتے تھے کہ ان کی باطنی خوش مزاجی کی روشنی اس المناک اندھیرے کو مشکل ہی سے چاک کر پاتی تھی۔ پھر بھی انھیں اس کوچے سے لگاؤ سا تھا جہاں وہ گھر تھا۔ گلی کے ان بے جان پتھروں سے عشق تھا جو اس راستے میں بچھے ہوئے تھے۔ اکثر راتوں کو جب شراب کا نشہ بھی انھیں عارضی مسرتیں پہونچانے سے معذور رہ جاتا تو وہ ان گلیوں میں نکل جاتے۔ اور اکثر طلوع آفتاب کے وقت وہاں گم سم تنہا کھڑے رہتے! یہاں تک کہ سورج کی روشنی بڑھ کر گرجا گھر کی برجیوں اور میناروں اور بلند و بالا عمارتوں پر سنگ تراش کے نمونوں کا حسن دوبالا کر دیتی۔ تب ان خاموش اور پرسکون لمحوں میں ان کے دماغ میں ان بھولی بسری حسین خواہشوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ جو ان کی دسترس سے دور تھیں! کچھ دنوں سے ٹیمپل کورٹ میں پڑا ہوا بستر زیادہ تر خالی ہی رہتا تھا

کبھی وقت بے وقت وہ گھڑی بھر کے لئے بستر پر گر جاتے۔ اور پھر اٹھ کر اسی کوچے کی خاک چھاننے لگتے"!۔

اگست کے مہینہ میں مسٹر اسٹرایپورنے اپنے گیدڑ کو بتایا کہ اچانک انھیں عقل آگئی اور انھوں نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور پھر وہ معہ اپنی جملہ لطافتوں کے ڈیون شائر تشریف لے گئے۔

اس وقت جب کہ پھولوں میں خوشبو باقی تھی۔ بیماروں کو شفا کی امید ہو گئی تھی اور بوڑھوں پر جوانی آرہی تھی۔ سڈنی کارٹن کے قدم برابر ان پتھروں کی خاک لے رہے تھے۔ ان کے قدم بجائے جھکنے اور ہچکچانے کے ارادے کی پختگی سے بے باک ہو گئے۔ اور اظہار حال کی تکمیل کے قصد سے وہ روانہ ہو گئے۔ اور ڈاکٹر کے دروازے پر پہونچ گئے"!

جب انھیں اوپر پہونچایا گیا تو اس وقت لوسی بیٹھی اپنے کام میں مشغول تھی۔ وہ ابھی تک ان سے بے تکلف نہ ہو سکی تھی۔ اس نے ذرا جھجکتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ وہ اس کی میز کے قریب بیٹھ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب اس نے غور سے انکے چہرے کی طرف دیکھا تو ایک عجیب قسم کی تبدیلی نظر آئی۔

"مسٹر کارٹن، خدا نہ کرے۔ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں"

"نہیں۔ مگر میں جس قسم کی زندگی گذارتا ہوں وہ صحت کے لئے قطعی مفید نہیں، اور بھئی ایک نکارہ انسان سے اور کیا امید کی جا سکتی ہے"!

"معاف کیجئے گا۔ کہ میں اتنی بات کہنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔

کیا آپ اس سے بہتر زندگی نہیں گذار سکتے "

"خدا جانتا ہے یہ بڑی شرم کی بات ہے!"

"تو پھر آپ اس زندگی کو بدل کیوں نہیں ڈالتے " اس نے بڑی ملائمت سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ سڈنی کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

اب وہ وقت نکل گیا۔ میں جیسا ہوں اس سے بہتر نہیں بن سکتا۔ اور دن بدن حالت بدتر ہوتی جائے گی۔ اور پستی کی طرف گرتا جاؤں گا۔"

انھوں نے لوسی کی میز پر کہنی ٹکا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ خاموشی طاری تھی اور میز لرز رہی تھی۔

لوسی نے انھیں کبھی یوں بے قابو ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے بے طرح پریشان ہو گئی۔ سڈنی نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا اندازہ لگا لیا۔

"براہ کرم۔ مجھے معاف کر دیجئے، مس مینٹ۔ میں جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں اس کے بوجھ سے میری ہمت جواب دے جاتی ہے۔ کیا آپ میری ایک عرض سنیں گی "

"اگر دل کی بات کہنے سے آپ کا جی ہلکا ہو کر سکون مل جائے تو بڑی خوشی سے فرمائیے۔"

"خدا آپ کو خوش و خرم رکھے اور اس ہمدردی کا صلہ دے " تھوڑی دیر بعد سڈنی نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے۔

"میں جو کچھ کہوں اسے سنکر ڈریئے گا نہیں۔ اور نہ نفرت سے دور بھاگئے گا۔ میں نے

اپنی تمام عمر یونہی برباد کردی۔ اور ایک ایسے شخص کی طرح ہوں جو بچپن ہی میں مر چکا ہو!"

"نہیں مسٹر کارٹن مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی زندگی کا بہترین اور خوشگوار حصہ ابھی آنے والا ہے۔ اور آپ اس کے اہل ثابت ہوں گے۔"

"میں اپنے دل کی گہرائیوں کے سارے بھید جانتا ہوں مگر چونکہ آپ یہ الفاظ کہہ رہی ہیں۔ میں انھیں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔"

لوسی کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جسم لرزنے لگا۔ اسے اس پریشانی اور الجھن سے نجات دلانے کے لئے سڈنی نے فوراً بات کو ایسا پلٹا دیا کہ یہ ملاقات اپنے قسم کی ایک ایسی انوکھی مثال قائم کر گئی جس کا کہیں اور جواب نہیں ملتا۔ "فرض کیجئے کہ یہ آپ کے لئے ممکن ہوتا کہ وہ شخص جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے اس کی محبت کا جواب آپ محبت سے دے سکیں تو یہ خود اپنے ہاتھوں تباہ و برباد انسان ۔۔۔ ایک بے مصرف شرابی ۔۔۔ خود کو انتہا سے زیادہ خوش نصیب انسان سمجھتا۔ مگر وہ شخص اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس محبت کے جواب میں وہ آپ کو رنج و غم۔ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ آپ کو تباہ کر دے گا۔ ذلیل کر دے گا۔ اور آپ کو اپنے ساتھ تنزل کے غار میں گھسیٹ لے جائیگا میں جانتا ہوں آپ کے دل میں میرے لئے رتی بھر جگہ نہیں۔ میں خواہشمند بھی نہیں۔ بلکہ ایک طرح سے شکر گذار ہوں کہ اس کا امکان بھی نہیں!"

"مسٹر کارٹن ۔۔۔ کیا اس کے علاوہ میں آپ کو کسی طرح تباہی سے نہیں بچا سکتی معاف کیجئے گا۔ کیا میں کسی طرح بھی آپ کو بہتر زندگی کی سمت نہیں موڑ سکتی۔ آپ کی اس رازداری کا

بدلہ کیا میں کسی طرح بھی نہیں چکا سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کا راز ہے مگر آپ اس کا تذکرہ امید کر کر کسی سے نہ کریں گے۔ کیا میں آپ کی بہتری کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی" مسٹر کارٹن اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے نہایت انکساری سے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں ــ مس مینٹ ــ آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اگر آپ ٹھنڈے دل سے میری رام کہانی سن لیں تو یہی وہ سب سے بڑی مہربانی ہے جو میرے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ میں اتنی بات بتانا چاہتا ہوں کہ آپ میری آشفتہ حال روح کا آخری جواب ہیں۔ مجھے زندگی میں اس سے پہلے کبھی اپنی ذلت کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا۔ جب میں نے آپ کو اور ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس گھر کو دیکھا جسے آپ نے اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے تو مجھے اپنی تمام محرومیوں کا احساس ہوا۔ اور وہ حسین قدریں جنہیں میں نے مردہ سمجھ لیا تھا، پھر سے زندہ ہو کر ابھر آئیں۔

جب سے میں آپ سے ملا ہوں میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ اور مجھ پر ملامت کر رہا ہے۔ پرانی بھولی بسری باتیں میرے کانوں میں سرگوشیاں کر کے مجھے شہہ دے رہی ہیں ـــ میرے دل میں ترقی کرنے کے مبہم سے منصوبے جاگ رہے ہیں۔ جو مجھے دوبارہ زندگی شروع کرنے پر اکساتے ہیں تاکہ میں لذت پرستی اور کاہل الوجودی کو جھٹک دوں۔ اور وہ کش مکش جو ادھر بیچ میں چھوڑ دی تھی دوبارہ شروع کر کے زندگی میں سرخروئی حاصل کروں۔ مگر یہ خواب ہیں ـــ محض خواب! اور خواب غفلت میں سونے والے کو خالی ہاتھ چھوڑ کر گم ہو جاتے ہیں ـــ صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی ہستی نے ان امنگوں کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا"

"تو کیا اب ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔" مسٹر کارٹن کچھ سوچے ـــ پھر سے

کوشش کیجئے!"

"نہیں مس مینٹ ۔ آج تک میں نے اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھا ۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں یہ کمزوری مجھ پر غالب آگئی! اور یونہی چھائی رہے گی ۔ ایک بار آپ کو اتنا بتلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس راکھ کے ڈھیر میں ایسی شدید آگ لگا دی ہے ۔ جو سلگ رہی ہے: وہ آگ جو مجھ سے جدا نہیں ہو سکتی ۔ نہ کسی چیز کو بھڑکاتی ہے نہ روشنی کرتی ہے نہ کسی قسم کا فائدہ پہونچاتی ہے ۔ بس سلگتی چلی جا رہی ہے!"

"میں بڑی بدنصیب ہوں کہ مجھ سے مل کر اور آپ کے دکھوں میں اضافہ ہو گیا ۔ مسٹر کارٹن"

"نہیں مس مینٹ ۔ ایسا نہ کہئے ۔ گو دنیا میں صرف آپ ہی مجھے بچا سکتی ہیں ۔ مگر میری تباہی کا تو کسی صورت سے بھی باعث نہیں بن سکتیں!"

"آپ کہہ رہے تھے کہ میں نے آپ کو متاثر کیا ہے تو کیا اس اثر کو میں آپ کی بھلائی کے لئے قطعی استعمال نہیں کر سکتی؟"

"زیادہ سے زیادہ بھلائی جو میرے حق میں ہو سکتی ہے وہی آج میں وصول کرنے آیا ہوں ۔ بس مجھے اپنی باقی روداد غم بھی سنا لینے دیجئے ۔ تاکہ یہ حسین یاد دل میں رہ جائے کہ ساری دنیا کو ایک طرف کر کے میں نے اپنا دل آپ کے سامنے چیر کر رکھ دیا تھا ۔ اور میرے دل میں اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے کہ آپ کو ہمدردی محسوس ہوئی اور مجھ پر رحم آیا"

"میں تہہ دل سے آپ سے التجا کرتی ہوں کہ یقین کیجئے دنیا میں آپ اس سے بہتر برتاؤ کے

حق دار ہیں مسٹر کارٹن !"

"مجھ سے یہ بات یقین کرنے کی استدعا نہ کیجئے مس مینٹ۔ میں اپنی ہستی کو خوب پہچانتا ہوں کیونکہ میرے پاس ثبوت موجود ہے۔ میں نے آپ کو بہت پریشان کر دیا۔ اب اپنی بکواس ختم کرتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گی کہ جب کبھی میں آج کی ملاقات کو یاد کروں تو یہ یقین کر سکوں کہ میرا آخری راز آپ کے پاک اور مقدس سینے میں محفوظ ہے اور وہیں دفن رہے گا اور آپ نے کسی کو شریک راز نہیں بنایا؟"

"اگر آپ کو اس سے تسلی اور تقویت پہنچتی ہے تو ضرور ایسا ہی ہوگا۔"

"خواہ وہ کوئی بھی ہو چاہے آپ کا عزیز ترین شریک زندگی ہی کیوں نہ ہو؟"

"مسٹر کارٹن راز آپ کا ہے۔ میرا نہیں۔ اور میں اسے ہمیشہ چھپائے رکھنے کا پختہ وعدہ کرتی ہوں" لوسی نے تھوڑی دیر ذہنی کش مکش میں مبتلا رہ کر کہا۔

"شکریہ۔ آپ پر خدا کی رحمت ہو!"

کارٹن نے لوسی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور دروازے کی طرف مڑ گئے۔

"مس مینٹ۔ خاطر جمع رہیے۔ اس گفتگو کا ایک لفظ بھی آئندہ آپ کے سامنے دہرایا نہیں جائے گا۔ میں کبھی اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اگر میں مر جاؤں تب بھی یہ بات اتنی پوشیدہ نہیں رہے گی جتنی میری زندگی میں ہے۔ موت کے آخری لمحوں میں یہی یاد میری زندگی کا آخری سہارا بنے گی اور تب شکر گذار ہو کر میرے دل سے آپ کے لئے دعا نکلے گی۔ میرا نام میرا آخری راز۔ میری کمزوریاں اور میرے غم کا فسانہ آپ کے نرم و نازک دل میں چھپا ہوا ہے! اے خدا اس دل کو شاد و

آباد رکھنا !"

آج وہ روز والا سڈنی کارٹن ایک اور ہی انسان نظر آرہا تھا۔ زبردستی چڑھایا ہوا خول اتر چکا تھا۔ یہ سوچ کر انتہائی دکھ ہوتا تھا کہ زندگی میں اس نے کیا کچھ کھو دیا۔ مثلاً الا کیسی کیسی اعلیٰ صلاحیتیں روزانہ کچل کر مسخ کر ڈالی گئیں۔ لوسی مینٹ اس کے لئے پھوٹ پھوٹ کر رو تی رہی اور وہ خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔

"خدارا نہ روئیے لوسی مینٹ! بخدا میں اس لائق نہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے کی بات ہے پھر وہی آوارہ احباب اور وہی پرانی ذلیل عادتیں جن سے میں نفرت بھی کرتا ہوں مگر ان سے بچ نہیں سکتا۔ اور پھر میں ان آنسوؤں کے لائق نہیں رہوں گا۔ روؤ نہیں۔ اندرونی حالت تو میری وہی رہے گی جو تم اس وقت دیکھ رہی ہو۔ مگر ظاہر میں وہی سڈنی کارٹن نظر آؤں گا جسے تم اتنے دن سے جانتی ہو۔ میری تم سے ایک التجا تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے اس وقت کہا ہے اسے یقین کر لو۔"

"میں یقین کرتی ہوں مسٹر کارٹن۔"

"میری دوسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ — اور اس کے بعد اس ملاقات سے نجات مل جائے گی۔ تمہارے اور اس ملاقاتی کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور اس کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں مگر اتنی بات ہے کہ یہ خیال میری روح کی گہرائیوں سے ابھر رہا ہے۔ تمہارے لئے اور وہ جو تمہیں عزیز ہوں ان کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میری زندگی شریفانہ گذرتی اور قربانی کے مواقع اور ہمت ہوتی تو تمہارے اور تمہارے عزیزوں کے لئے اس قربانی کو گلے لگا لیتا۔ کبھی اکیلے میں میرا خیال آئے، تو

خاطر جمع رہنا کہ میں اس معاملے میں انتہائی پرخلوص ثابت ہوں گا۔ وہ وقت بھی آئے گا۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب نئے بندھنوں میں بندھ جاؤ گی۔ وہ بندھن جن میں جکڑ کر اس گھر سے اور قریب ہو جاؤ گی۔ وہ پیارے بندھن جو مسرتیں اور بہاریں لائیں گے۔ مس مینٹ۔ جب خوش نصیب باپ کی شبیہ آپ کی طرف ہمک کر دیکھے۔ جب آپ کا اپنا پرنور حسن آپ کے قدموں کے قریب کھیلے تو کبھی کبھی اتنا ضرور یاد کر لیجئے گا کہ دنیا میں کوئی ایسا انسان بھی ہے جو اپنی جان اس ہستی کیلئے قربان کر سکتا ہے۔ جو آپ کو پیاری ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے کہا "خدا حافظ"

اور آخری بار دعا دی "خدا اپنی امان میں رکھے"

اور مڑ کر چل دیئے۔

چودھواں باب

ایماندار بیوپاری

مسٹر جیری کرنچر فلیٹ اسٹریٹ میں اپنے اسٹول پر بیٹھے تھے ساتھ میں ان کا جنگلی سا چھوکرا کھڑا تھا۔ روزانہ ان کی نظروں کے سامنے بڑی تعداد میں مختلف قسم کی چیزیں گذرا کرتی تھیں۔ فلیٹ اسٹریٹ کے کاروباری اوقات میں کوئی کسی بھی چیز پر بیٹھ جائے ناممکن ہے کہ وہ

ان دو جلوسوں کے غل سے بہرا اور پاگل نہ ہو جائے جو مسلسل ادھر سے نکلا کرتے تھے۔ ایک جلوس ہمیشہ سورج کے ساتھ مغرب کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا سورج کی مخالف سمت مشرق کی طرف جایا کرتا تھا۔ دونوں جلوس ہمیشہ ان میدانوں کی طرف جایا کرتے تھے جو سرخ اور نیلی حدود کے اس پار ہیں جہاں سورج ڈوبتا ہے۔

منہ میں گھاس کا تنکا دابے مسٹر کریچر بیٹھے اس دھارے کو ایسا تکا کرتے تھے۔ جیسے کوئی جنگلی گنوار صدیوں سے پانی کے دھارے کو اس امید سے بیٹھ کر تک رہا ہو کہ جب وہ خشک ہو تو پار اتر جائے۔ مگر جیری کو ان دھاروں کے خشک ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور نہ یہ آس لگانا دانشمندی ہوتی۔ کیونکہ ان کی آمدنی کا ایک اچھا خاصا حصہ انعام کی بدولت جمع ہو جاتا۔ وہ ٹیلسن بینک میں آنے والی بھولی خواتین کو جو عموماً پختہ عمر اور پختہ خیال ہوا کرتی تھیں۔ بینک والے کنارے سے کشتی میں بٹھا کر دوسرے کنارے تک پہونچا دیا کرتے تھے۔ مسٹر کریچر ان خواتین میں اس خدمت سے دلچسپی لینے لگتے تھے کہ ان کا جام صحت تک پینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اور انھیں کچھ بخشش اسی نیک کام کی بدولت مل جاتی تھی اور یہی ان کی اوپری آمدنی کا ایک ذریعہ تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

کسی زمانہ میں شاعر اسٹول پر بیٹھ کر سب کے سامنے غور و خوض کیا کرتے تھے۔ مگر چونکہ مسٹر کریچر شاعر نہیں تھے اس لئے وہ اسٹول پر بیٹھ کر بھی غور نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے چاروں طرف نظریں دوڑایا کرتے تھے۔

ایک دن اس طرح وہ بیٹھے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ مجمع کم تھا اور بوڑھی عورتیں سبھی

کم تھیں۔ ان کا ہاتھ بھی ان دنوں اتنا تنگ تھا کہ ان کے دل میں بار بار شبہ ہو رہا تھا کہ ضرور مسز کرنچر کسی خاص نیت سے سجدے ادا کر رہی ہونگی۔ اتنے میں ایک عجیب سا مجمع فلیٹ اسٹریٹ سے گذر کر مغرب کی طرف جانے لگا۔ انھوں نے فوراً اپنی توجہ ادھر منعطف کر دی۔ معلوم ہوا کہ کچھ جنازہ کے قسم کی چیز گذر رہی ہے۔ نیز اس جنازے کے خلاف عام لوگ احتجاج کر رہے تھے جس کی وجہ سے بہت غل مچ رہا تھا۔

"جیری بیٹے کچھ کفن دفن کا سلسلہ ہے!" مسٹر کرنچر نے اپنے نور نظر کی طرف مڑ کر کہا۔

"واہ واہ — ابا جی —" کمسن جیری خوشی سے چہکا۔

چھوٹے صاحب نے نہایت پر معنی اور پر اسرار طریقہ پر نعرہ مسرت لگایا۔ بڑے صاحب کو سخت ناگوار گذرا۔ اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے فوراً چھوٹے صاحب کے کان پر تھپڑ جڑ دیا۔

"ہیں۔ کیا کہہ رہا ہے۔ ابے واہ واہ کیسی تو اپنے باپ سے کیا نازیبا بات کہہ رہا ہے نکما کہیں کا۔ یہ لونڈا بڑے پر نکال رہا ہے!" مسٹر کرنچر نے اسے گھور کر کہا: "تو اور تیری واہ واہ کی ایسی تیسی! ابکے آواز نکالی تو مزا چکھا دوں گا سنا تو نے؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا!" چھوٹے جیری نے کان سہلا کر احتجاج کیا۔

"بس خاموش! مجھ سے ٹر ٹر نہ کرنا۔ چل اٹھ — ادھر چڑھ اور دیکھ مجمع کو اچھی طرح" بیٹے نے حکم کی تعمیل کی۔ مجمع بڑھتا رہا۔ لوگ ایک اجڑی سی ماتمی گاڑی میں رکھے ہوئے

ایک میلے سے جنازے کے گرد جمع تھے اور تھوتھو کر رہے تھے۔ صرف ایک سوگ منانے والا ملگجا ماتمی لباس پہنے تھا۔ جو موقع کی مناسبت سے ضروری تھا۔ موقع کی نزاکت سے وہ قطعی خوش نہ تھا۔ کیونکہ اس کے گرد جمع لوگ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ لعنت ملامت کر رہے تھے۔ منہ چڑھا رہے تھے اور مسلسل چلا رہے تھے ___ جاسوس ___ تھو ___ جاسوس ___ چھی۔ آخ تھو، اس کے علاوہ اور بھی تعریفی کلمات استعمال کئے جا رہے تھے۔ جو ضرورت سے زیادہ جوشیلے تھے اس لئے دہرائے نہیں جاسکتے۔

مسٹر کریم کو جنازوں سے ہمیشہ بے حد دلچسپی رہتی تھی۔ جب ٹیلس کے قریب سے کوئی جنازہ گذرتا تو فوراً ان کے جملہ حواس چونک پڑتے۔ اور انھیں جوش آجاتا۔ ظاہر ہے اس جنازے کو دیکھ کر جس کے ساتھ غیر معمولی بھیڑ تھی وہ بہت ہی جوش میں آگئے۔ پاس سے جو پہلا آدمی گذرا اس سے انھوں نے پوچھا۔

"کیا معاملہ ہے بھائی۔ یہ گڑبڑ کیسی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم ___ جاسوس لعنت ___ تھو۔ جاسوس!"

"کس کا جنازہ ہے؟" انھوں نے دوسرے آدمی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں!" مگر وہ بھی منہ پر ہاتھ مار مار کر نہایت جوش و خروش سے حیرت انگیز حد تک شدت سے چیخنے لگا "جاسوس ___ اخ تھو ___"

آخر کار ایک آدمی جو حالات سے واقف تھا ان سے ٹکرا ہی گیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ یہ جنازہ ایک جاسوس کا جنازہ ہے جس کا نام راجرس کلائی تھا۔

"جاسوس تھا؟" مسٹر کرنچر نے پوچھا۔

"پرانی کوتوالی کا جاسوس" مخبر نے جواب دیا۔ "اخ تھو ــــ جاسوس لعنت ــــ جاسوس!!"

"ارے ہاں ــ ٹھیک تو ہے" جیری نے اس مقدمے کو یاد کرکے کہا۔ جس میں انھوں نے امداد بہم پہونچائی تھی۔

"ارے میں نے اسے دیکھا تھا۔ کیا مرگیا"

"مرکے ڈھیر ہوگیا ــــ اس سے زیادہ اور کوئی کیا مرسکے گا۔ نکالو ان جاسوسوں کو ــــ لعنت جاسوسوں پر۔ گھسیٹ لو باہر ان جاسوسوں کو!" وہ شخص چلّایا۔

کوئی خاص رائے نہ ہونے کی صورت میں کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا یہ رائے سب کو پسند آئی۔ ایک دم مجمع نے اس جملہ کو فوراً لپک لیا۔ اور مردے کو گھسیٹ کر باہر نکالنے کے لئے چلانے لگے۔ چاروں طرف سے دونوں گاڑیاں ایسی گھر لیں کہ وہ رک گئیں۔ مجمع نے دروازہ کھولا تو ایک ماتم کرنے والا تو خود ہی باہر کو دیڑا دو چار لمحہ ہی پکڑ دھکڑ ہوئی ہوگی کہ اس نے اپنی پھرتی سے فائدہ اٹھایا اور دوسرے لمحے ڈبازو کی گلی میں پوری رفتار سے سرپٹ بھاگا جارہا تھا۔ راستہ میں وہ تمام ماتمی نشان مثلاً کوٹ ٹوپی کا کالا فیتہ مع ٹوپی چوغہ جیب کا سفید رومال وغیرہ نوچ نوچ کر پھینکتا جارہا تھا۔ لوگوں نے یہ چیزیں اٹھاکر پرزے پرزے کرڈالیں اور خوشی سے دیوانہ وار ہوا میں اچھال دیں۔ دوکانداروں نے جلدی جلدی دوکانیں بند کرنی شروع کردیں۔ کیونکہ ایسے موقعہ پر اندنوں مجمع کو کسی بات سے پرہیز نہ ہوتا تھا۔ اور ایک قابو سے

باہر خوفناک اژدہے کا روپ دھار لیا کرتا تھا۔ لوگ گاڑی کھول کر کفن کا بکس نکالنے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ ذہین اور طباع اصحاب نے رائے دی کہ بجائے کفن نکالنے کے گاتے ناچتے اسے منزل مقصود تک پہونچا دیا جائے۔ چونکہ عملی ترکیبوں کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس رائے کو بڑے جوش و خروش سے منظور کیا گیا۔ اور فوراً گاڑی میں آٹھ آدمی اندر اور درجن بھر باہر لدگئے۔ اتنے ہی گاڑی کی چھت پسہ جانے کس حیرت انگیز ترکیب سے چڑھ کر چپک گئے ۔۔ ان والنٹروں میں سب سے پہلے جیری کرنچر تھے۔ جو بڑے انکسار سے اپنا میخوں جیسے بالوں والا سر ٹیلسن کے عملے سے چھپائے ہوئے گاڑی کے سب سے اندرونی کونے میں گھسے ہوئے بیٹھے تھے۔

مقررہ کفن دفن کے ذمہ دار لوگوں کو رسومات کے اس رد و بدل پر قدرے اعتراض ہوا مگر چونکہ دریا قریب تھا اور چند لوگوں کا اصرار تھا کہ مذہبی رسم و رواج کے ان ذمہ دار صاحبان کو اگر ٹھنڈے پانی میں غوطہ دیدیا جائے تو ان کے حواس فوراً ٹھکانے پر آجائیں گے۔ جلوس یوں نئے طریقہ پر مرتب ہو کر آگے روانہ ہوا۔ ایک چمنی جھاڑنے والا جنازے کی گاڑی چلا رہا تھا۔ اصل کوچوان اس کے قریب ہی بیٹھا ہدایات دیتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی نانبائی کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ جلوس اسٹرینڈ کے قریب پہونچا تو ایک ریچھ والا جو کہ اس زمانے کا بڑا ہر دل عزیز کردار مانا جاتا تھا مزید سجاوٹ کے لئے شامل ہو گیا۔ اس کا ریچھ جو بہت سیاہ اور خارشتی تھا کفن دفن کے منتظمین کی سی شان جتاتا جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

اس طرح شراب پیتے۔ پائپ کا دھواں چھوڑتے چلا چلا کر گاتے بجاتے اور جھوٹ موٹ کا ماتم کرتے لوگ چلے جا رہے تھے۔ ہر قدم پر نئی بھرتی ہوتی جا رہی تھی اور جلوس کے

آگے آگے دکانیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

جلوس دور کھیتوں میں سینٹ پنکراس کے پرانے چرچ کو جارہا تھا۔ آخر کار جلوس وہاں پہونچ گیا۔ اور سب کے سب اندر قبرستان میں دھنسنے پر اصرار کرنے لگے۔ انجام کار انھوں نے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق مرحوم راجرس کلائی کو دفن کر دیا۔ مردے کو ٹھکانے لگانے کے بعد مزید تفریح کے لئے کسی نے تجویز پیش کی یا شاید اس طباع اور ذہین شخص نے رائے دی کہ سڑک پر سے گذرنے والوں کو پرانی کوتوالی کے جاسوس تصور کرکے ان پر مقدمہ دائر کیا جائے اور ان سے انتقام لیا جائے۔

بہت سے ان لوگوں کے پیچھے یہ غول جھپٹا جو کبھی زندگی بھر پرانی کوتوالی کے پاس نہیں پھٹکے تھے۔ اس تفریح کی تکمیل کے لئے انھیں خوب دوڑا کر پکڑا گیا۔ خوب دھکے دیئے اور نوچا کھسوٹا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر کھڑکیاں توڑنے اور عام عمارتیں لوٹنے پر عمل کیا گیا۔ آخر کار کئی گھنٹوں کے بعد جب کئی سائبان لوٹ کر اور جنگلے اور احاطے کے پھاٹک توڑ کر زیادہ فسادی طبیعت کے لوگ مسلح ہوگئے۔ تو یہ خبر مشہور ہوئی کہ محافظ پولیس آرہی ہے۔ اس خبر سے پہلے ہی مجمع بتدریج بکھر گیا تھا۔ پھر شاید محافظ پولیس آئی، اور شاید نہیں آئی۔ مگر عام طور پر ہجوم کا یہی طریقۂ کار ہوا کرتا تھا۔ مسٹر کرنچر نے آخری کھیلوں میں حصہ نہیں لیا۔ اور دفن کرنے والوں کو پرسا دینے کے خیال سے گرجا میں ٹھیر گئے۔ اس جگہ انھیں بہت سکون مل رہا تھا انھوں نے پڑوس کی سرائے میں ایک پائپ ادھار مانگ لیا اور بیٹھے پیتے رہے۔ وہ غور سے جنگلے کو دیکھ رہے تھے اور بڑی سنجیدگی سے جگہ کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

"جیری" انھوں نے حسب معمول خود سے مخاطب ہو کر کہا: "اس دن کلائی کو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان تھا!"

اپنا پائپ ختم کر کے تھوڑی دیر تک خیالات کی جگالی کرتے رہے۔ پھر واپس آگئے تاکہ ٹیلسن کے بند ہونے کے وقت سے پہلے پہونچ جائیں۔ شاید انسان کی بے ثباتی پر غور کرنے کی وجہ سے جگر کی کچھ شکایت ہو گئی۔ یا شاید ان کی عام صحت کچھ پہلے خراب ہو رہی تھی۔ خیر یہ کچھ زیادہ اہم بات نہیں تھی۔ مگر لوٹتے وقت وہ ذرا سی دیر کے لئے ینگی ڈاکٹر سے جو ایک مشہور سرجن تھا۔ کسی مشورہ کی غرض سے ضرور گئے۔

چھوٹے جیری نے والد صاحب کے جانے کے بعد ان کے بجائے ان کی جگہ قطعی نہیں سنبھالی بلکہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ تاکہ ٹیلسن کے بند ہونے سے پہلے بہ آسانی اپنی جگہ لوٹ سکے۔ بینک بند ہو گیا پرانے کلرک باہر نکل آئے۔ مقررہ چوکیدار تعینات ہو گیا۔ اور مسٹر کرنچر اور ان کا بیٹا چائے پینے گھر چل دیئے۔ انھوں نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی بیوی سے کہا۔

"دیکھو اب میں تمہیں صاف بتائے دیتا ہوں۔ اگر آج ایک ایماندار محنت کرنیوالے کی حیثیت سے مجھے ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو میں بغیر دیکھے یقین کر لوں گا کہ تم میرے خلاف دعائیں مانگتی رہی ہو۔ اور اسی اصول کے ماتحت تمہاری خبر لی جائے گی"

دل شکستہ مسز کرنچر نے سر ہلا دیا۔

"کیا تم میرے سامنے پھر وہی حرکت کر رہی ہو" مسٹر کرنچر نے خوف زدہ ہو کر غصہ سے کہا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا تو مراقبہ وغیرہ میں جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ مراقبہ میں جانے سے بہتر ہے سجدے ہی کر لو۔ ایک طرح نہیں تو دوسری طرح تمہیں میری مخالفت سے مطلب ہے بہتر یہ ہے کہ قطعی ارادہ ہی ترک کر دو۔"

"اچھا جیری۔"

"اچھا جیری" جانے کے لئے بیٹھتے ہوئے انھوں نے نقل میں دہرایا۔ "ہاں۔ خیر۔ اچھا جیری کہنے ہی میں بھلائی ہے یا۔"

اس اوٹ پٹانگ گفتگو میں در اصل جیری کوئی خاص بات نہیں کہہ رہے تھے۔ بلکہ ویسے بے کار دُہرا رہے تھے، جیسے لوگ عام طور پر غصّہ اور ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے تلخ الفاظ منھ سے نکال دیتے ہیں۔

"تم اور تمہارے — اچھا جیری! — میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں یقین کرتا ہوں۔" مسٹر کرنچر نے مکھن روٹی کا نوالہ دانت سے کاٹا اور تخیل میں ایک کستورا مچھلی کے لقمہ کے ساتھ حلق سے اتار لیا۔

"آج رات تم باہر جا رہے ہو جیری۔" جب انھوں نے دوسرا لقمہ لیا تو ان کی نیک بیوی نے پوچھا۔

"ہاں جا رہا ہوں۔"

"ابا — میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟" بیٹے نے جلدی سے پوچھا۔
"نہیں تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے۔ تمہاری ماں کو معلوم ہے میں مچھلی کا شکار کرنے جارہا ہوں۔ ہاں وہیں تو جارہا ہوں۔ مچھلی کا شکار کرنے۔"
"تمہاری بنسی ذرا زنگیا جاتی ہے ابا — ہے نا؟" بیٹے نے ان کی زنگ لگی انگلیاں دیکھ کر کہا۔
"تمہاری بلا سے۔"
"کیا تم مچھلیاں لاؤ گے ابا؟"
"اگر نہیں لایا تو تمہیں کھانے کو روکھا سوکھا ملے گا۔"
"اچھا اب بہت سوال کرلئے۔ جب میں جاؤں گا تو تم بڑی دیر کے سوئے ہوگے۔"
باقی کی شام انھوں نے مسز کریچر کی کڑی نگہبانی کرکے گذاری۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ مراقبے میں غرق ہوکر کوئی عرضی خدا کے حضور میں ان کے خلاف نہ روانہ کرسکیں وہ باربار انھیں ٹوکتے اور باتوں کا سلسلہ شروع کردیتے۔
انھوں نے اپنے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ اسی طرح باتیں کرکے مسز کریچر کو پریشان کرتے رہنے پر مامور کرلیا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ وہ ڈھونڈھ کر نکال لاتے اور مسلسل شکایتیں کئے جاتے تاکہ انھیں کچھ سوچنے کا موقعہ نہ ملے کوئی اہم سے اہم دعا بھی اس طرح دل کی گہرائیوں سے نہ مانگتا جس طرح وہ اپنی بیوی سے ڈر کر اسے ہلکان کررہے تھے ان کی مثال اس شخص کی سی تھی جسے بھوت پریت پر یقین نہ ہو۔ مگر بھوتوں کی کہانی سے ڈرے۔

"اور اتنا خیال رہے کہ جب ہم ایمانداری اور محنت کی کمائی سے کل کے کھانے پر گوشت کا انتظام کریں تو یہ نہیں ہوگا کہ تم ناک بھوں چڑھا کر اسے چھونے سے انکار کرو۔ اور سوکھی روٹی کھانے لگو۔ اگر ہم گاڑھی کمائی کے پیسے سے بیر لائیں تو تم پانی پر اکتفا کرنے لگو۔ جب روم جاؤ تو روم والوں کے دستور پر چلو۔ جو ایسا نہیں کروگی تو روم تمہاری دھجیاں بکھیر دے گا۔ اور واضح رہے کہ ہم تمہارے روم ہیں۔"

وہ پھر بڑبڑانے لگے ۔

"تم خود اپنے کھانے پینے کی مخالفت کرتی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں تم ڈھٹائی سے دعائیں مانگ مانگ کر اس گھر سے روٹی پانی کا وجود ہی مٹا دینے پر تل گئی ہو۔ اپنے بیٹے کی طرف دیکھو! یہ تمہارا ہی بیٹا ہے کہ نہیں سوکھ کر لکڑی ہو رہا ہے۔ تم اپنے آپ کو ماں کہتی ہو۔ مگر اتنا بھی نہیں جانتیں کہ ایک ماں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو موٹا تازہ کر کے پھلائے۔"

یہ وار چھوٹے جیری کی دکھتی رگ پر لگا۔ اس نے بھی اپنی ماں سے قسم لی کہ وہ آئندہ سے خواہ وہ اور تمام فرائض کو بھول جائے۔ مگر خاص طور پر ایک ماں کے فرائض کو انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے گی۔ بلکہ انھیں اس خوش اسلوبی سے نبھائے گی۔ جس کا ابھی اس کے والد نے نہایت خوبصورتی اور نزاکت سے ذکر کیا تھا۔

کرنچر کے خاندان نے یوں شام گذاردی۔ چھوٹے جیری کو سونے کا حکم مل گیا۔ اور اس کی ماں نے بھی اس حکم کی تعمیل کی۔ رات کا ابتدائی حصہ مسٹر کرنچر نے اکیلے پائپ پی کر گذارا اور اپنی مہم پر ایک بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوئے۔ اندھیری آسیبی رات گئے وہ اپنی کرسی پر

سے اٹھے۔ جیب سے کنجی نکالی اور الماری سے مختلف لوہے کی سلاخوں کا تھیلا۔ ایک رسی اور زنجیر اور اسی قسم کے دوسرے مچھلی کے شکار کے لوازم نکالے۔ ان ہتھیاروں سے اچھی طرح مسلح ہو کر انہوں نے ایک بار پھر بستر کر بچھر پر کڑی نظر ڈالی اور روشنی بجھائی اور باہر چلے گئے چھوٹا جیری جس نے جھوٹ موٹ کپڑے بدل کر سونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ باپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ اندھیرے میں چھپتا چھپاتا وہ ان کے پیچھے کمرے سے باہر نکلا۔ سیڑھیوں کے نیچے اتر کر صحن سے گذرا اور سڑک پر آیا۔ اسے واپس گھر جانے کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ عمارت کرایہ داروں سے بھری پڑی تھی۔ اور دروازہ ہمیشہ چوپٹ کھلا رہتا تھا۔ اپنے باپ کے مہذب پیشہ کے فن کا مشاہدہ کرنے اور اس کا بھید معلوم کرنے کا شوق اسے کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ گھروں کے دروازوں اور دیواروں سے لگا لگا وہ اپنے مقدس باپ کو نگاہ میں لئے چلا جا رہا تھا۔ اس کا شریف باپ شمال کی طرف کچھ دور ہو گا کہ اسے ایک اور آئزک والٹن کا پرستار ملا۔ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

آدھ گھنٹہ کے اندر وہ آنکھیں جھپکاتی روشنیوں کی قطار سے دور اور آنکھیں جھپکانے کی حد سے آگے گذرے ہوئے چوکیدار کی زد سے باہر ایک سنسان سڑک پر نکل آئے یہاں ایک اور مچھیرا ساتھ ہو لیا۔ یہ اتنے پراسرار طریقہ پر شامل ہوا کہ اگر چھوٹا جیری وہمی ہوتا تو سمجھتا کہ مچھلی کے شکار کے دوسرے شوقین آدمی کے ایک دم سے دو ٹکڑے ہو گئے۔

آگے آگے وہ تینوں اور ان کے پیچھے چھوٹا جیری۔ چلتے چلتے ایک چھجے کے نیچے رکے جو سڑک تک جھکا ہوا تھا۔ اس کنارے کے بالائی حصہ پر ایک نیچی سی اینٹوں کی دیوار تھی۔

جس پر لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا۔ دیوار اور کنارے کے درمیان تاریکی میں تینوں سڑک سے مڑ گئے اور ایک تنگ گلی میں چلنے لگے۔ جس کے ایک طرف ایک آٹھ دس فٹ اونچی دیوار تھی۔ کونے میں دبکا ہوا چھوٹا جیری گلی میں جھانک رہا تھا۔ بھیگے بھیگے بادلوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کے سامنے اس نے اپنے مہذب والد کے سائے کو پھرتی سے لوہے کے پھاٹک کو پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد دوسرا اور تیسرا بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ تینوں پھاٹک کے اندر زمین پر کود پڑے اور تھوڑی دیر دبک کر سننے کے بعد ہاتھ پاؤں کے بل چلنے لگے۔

اب چھوٹے جیری کی باری تھی وہ سانس روکے دبے پاؤں پھاٹک کے پاس پہونچا ایک کونے میں چھپ کر اس نے دیکھا۔ تینوں پھر سے رینگتے ہوئے لمبی لمبی گھاس سے گذر کر گرجے کی قبروں کے درمیان بڑھنے لگے۔ قبرستان کافی وسیع تھا۔ یہ لوگ سفید آسیبوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اور گرجے کا مینار ایک دیوزاد کی طرح کھڑا تھا۔ تھوڑی دور رینگنے کے بعد وہ رک کر کھڑے ہو گئے اور مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔

پہلے تو انھوں نے پھاوڑوں سے ماہی گیری کی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ والد بزرگوار نے ایک لمبی سی سلاخ کا کگ نکالنے کے پیچ کی طرح کسنی شروع کی۔ وہ جیسے بھی ہتھیاروں سے کام کر رہے تھے بڑی محنت سے کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ گرجے کی گھڑی نے گھنٹہ بجایا اور چھوٹا جیری مارے ڈر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے سر کے بال بالکل اس کے والد کے بالوں کی طرح سر پر کھڑے ہو گئے۔

مگر اس بات کی تہہ کو پہونچنے کے دیرینہ شوق نے اسے بھاگنے سے روک لیا۔ اور پھر

واپس کھینچ کر لے گیا۔ جب اس نے دوبارہ پھاٹک میں سے جھانکا تو وہ لوگ بڑی تندہی سے ماہی گیری میں مشغول تھے۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا تھا۔ نیچے سے کھڑکھڑاہٹ کی صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی۔ ان کی مڑی ہوئی انگلیاں جیسے کسی وزنی چیز سے کھینچ رہی تھیں آہستہ آہستہ وزنی چیز مٹی کی تہوں کو ہٹا کر اوپر آگئی۔ چھوٹے جیری کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ لوگ کیا نکال رہے ہیں۔ مگر جب والد بزرگوار اسے کھولنے لگے تو اسے بہت ڈر لگا۔ کیونکہ عمر میں پہلی دفعہ اس منظر سے سابقہ پڑا تھا۔ اس لئے وہ پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ایک میل سے زیادہ بغیر رکے بھاگتا چلا گیا۔

وہ سوائے سانس لینے کے اور کسی بھی اہم کام کے لئے راستہ میں رُکنے والا نہیں تھا۔ یہ آسیبی دوڑ تھی جسے اختتام تک پہونچانے کی خواہش بڑی شدید تھی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کفن جو ابھی اس نے دیکھا تھا اس کے پیچھے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ تصور میں اس نے دیکھا کہ کفن پتلے سرے کے بل کھڑا اس کے پیچھے کودتا چلا آ رہا ہے اور کوئی دم میں اس سے آگے نکل کر پہلو میں چلنے لگے گا۔

شاید اس کا بازو بھی تھام لے۔ ایسے تعاقب کرنے والے سے جان بچا کر بھاگنا ہی مناسب ہے۔ وہ ایک نہایت بے اصول اور ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہو جانے والا شیطان تھا ایسے تو وہ اس کے پیچھے رات کو بھیانک بنائے ہوئے تھا۔ چھوٹا جیری اندھیری گلیوں سے بھاگ کر بیچ سڑک پر آگیا۔ کیونکہ اسے ڈر لگا۔ کہیں وہ کسی بچے کے استسقار کے مرض سے پھولی ہوئی پر کٹی پتنگ کی طرح گلیوں سے نکل کر اس کے سامنے نہ پھدکنے لگے۔

کبھی ایسا معلوم ہوتا وہ دروازوں سے کندھا اڑائے چھپا کھڑا ہے۔ اور کانوں تک کندھے اچکا اچکا کر ہنس رہا ہے کبھی جیسے سڑک پر سائے میں چت لیٹا ہے۔ کہ جیری آئے تو اسے الجھا کر منھ کے بل گرا دے۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے پیچھے بھی برابر اچکتا چلا آرہا تھا۔ اور بس پکڑنا ہی چاہتا ہے۔ جب لڑکا اپنے گھر کے دروازے پر پہونچا تو ادھ موا ہو چکا تھا۔ تب بھی کفن نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بلکہ ہر سیڑھی پر دھم دھم کرتا چڑھا۔ اس کے ساتھ بستر پر بھی دھپ سے گر پڑا۔ اور جب جیری سو گیا تو وہ بوجھل بے جان کفن اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا۔

ساری رات جیری برے برے خواب دیکھتا رہا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا باپ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ چھوٹے جیری نے اندازہ لگا لیا کہ کچھ گڑبڑ ہو گی۔ کیونکہ والد بزرگوار اپنی اہلیہ کا سامان پکڑے اس کا سر پلنگ کی پٹی سے پھوڑ رہے تھے۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مزہ چکھا دوں گا۔" مسٹر کرنچر کہہ رہے تھے۔

"جیری۔ جیری۔" ان کی بیوی نے خوشامد کی۔

"تم میرے دھندے کی مخالفت پر تلی ہوئی ہو۔ میں اور میرے ساجھے دار نقصان اٹھاتے ہیں۔ تمہیں میرا حکم ماننا چاہئے تھا۔۔۔ تم نے کیوں نافرمانی کی کم بخت!"

"میں ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش کرتی ہوں جیری!" غریب عورت نے رو کر احتجاج کیا۔

"کیا اپنے شوہر کے دھندے کی مخالفت کرنا اچھی بیویوں کا شیوہ ہے۔ شوہر کی

مشقت کو تباہ کرنا اس کے ساتھ بھلائی ہے۔ کیا اس کے اہم کاروبار کے سلسلے میں اس کا حکم نہ ماننا بڑی فرمابرداری ہے۔"

"تم نے پھر وہی برا دھندا تو نہیں شروع کر دیا جیری۔"

"تمہارے لئے بس یہی غنیمت ہے کہ تم ایک ایماندار بیوپاری کی بیوی ہو۔ تم جیسی ناقص العقل کو یہ سوچنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ اور کیا نہیں کرتا۔ ایک فرمابردار اور اطاعت گذار بیوی کو شوہر کے کام کاج میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ ہونہہ بڑی اپنے آپ کو اللہ والی کہتی ہو۔ مگر تم جیسی مذہب پرست بیوی سے تو لامذہب اچھی۔ تمہارے بھیجے میں اتنی ہی عقل ہے جتنی دریائے ٹیمز کی تہہ میں پڑے ہوئے پتھر کے ڈھیر میں اس لئے لازم ہے کہ تھوڑی سی عقل اس میں ٹھونکی جائے۔"

یہ ساری چخ چخ دبی زبان میں کی جا رہی تھی۔ اور اس طرح ختم ہو گئی کہ ایماندار بیوپاری نے اپنے کیچڑ میں سنے ہوئے جوتے زور اتار پھینکے۔ اور فرش پر لمبا لمبا پڑ کر سو گیا چھوٹے جیری نے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا وہ سر کے نیچے اپنے زنگ لگے ہوئے ہاتھوں کا تکیہ بنائے سو رہا تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی لیٹ کر پھر سو گیا۔

ناشتے پر بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ بس مسٹر کرنچر کے غصہ کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ انہوں نے مسز کرنچر کی تنبیہہ کے لئے ایک لوہے کا چنگیر رکھ لیا تھا۔ تاکہ اگر ناشتہ پر خدا کا شکر کرتی نظر آئیں تو اسے پھینک کر مارا جا سکے۔ وقت مقررہ پر وہ نہا دھو کر تیار ہو گئے تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی دکھاوے کی نوکری پر پہونچ گئے۔

چھوٹا جیری بغل میں اسٹول دبائے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اس خوفزدہ جیری سے بالکل مختلف تھا جو کالی سنسان رات میں بھوت سے جان بچا کر بھاگا جا رہا تھا۔ اس کی مرکاری سوئے کی طرح تر و تازہ تھی۔ اور رات کے ساتھ اس کے سارے ڈر غائب ہو گئے تھے۔ اس معاملے میں وہ اکیلا نہیں تھا۔

شہر لندن کی اس فلیٹ اسٹریٹ میں اور بھی لوگ اس کے ہم خیال تھے۔

"ابا ـــ مُردوں کو جگانے والے کو کیا کہتے ہیں؟" جیری نے اپنے اور والد صاحب کے درمیان احتیاطاً اسٹول کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

مسٹر کرنچر اچانک سڑک پر ٹھٹک گئے۔

"ابا، میں سمجھتا تھا کہ آپ کو سب کچھ معلوم رہتا ہے" بھولے بچے نے کہا۔

"آہ ... وہ بھی ایک قسم کا بیوپاری ہوتا ہے" مسٹر کرنچر نے ہیٹ اتار کر سر پر سے کھڑی ہوئی میخوں کی نمائش کرتے ہوئے چلنا شروع کیا۔

"کون سا مال بیچتا ہے؟" تیز و طرار چھوٹے جیری نے پوچھا

"اس کے مال کا تعلق سائنس کی ایک شاخ سے ہے!" مسٹر کرنچر نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا۔

"لوگوں کے جسموں سے ہے نا ابا" شوخ بچے نے کہا۔

"میرے خیال میں ایسی ہی کوئی چیز ہے!" مسٹر کرنچر بولے۔

"ابا ... جب میں بڑا ہو جاؤں تو میرا جی چاہتا ہے میں بھی مُردوں کو جگانے

والا بنوں گا۔"

مسٹر کریچر کا فدا جی ٹھیر گیا۔ انھوں نے نہایت شائستہ انداز میں سوچتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

"اس کا انحصار تو تمہاری صلاحیتوں پر ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہاری صلاحیتیں کس طور پر ابھرتی ہیں اور کبھی کسی کو ضرورت سے زیادہ بات مت بتاؤ۔ اور ابھی سے کیسے کچھ کہا جا سکتا ہے کہ تم واقعی اس کاروبار کے لئے موزوں ہوگے، یا نہیں ۔۔۔"

اس ہمت افزائی سے خوش ہو کر چھوٹا جیری جائے مقررہ پر اسٹول رکھنے آگے چلا گیا۔ تب مسٹر کریچر نے خود سے کہا۔

"جیری۔ اے ایماندار بیوپاری ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکا تمہارے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہو۔ اور اپنی ماں کی کوتاہیوں کا بدلہ چکا دے۔"

پندرہواں باب

"بنائی"

موسیو ڈیفارج کی دوکان میں نسبتاً بڑے سویرے سے شراب کا دور چل رہا تھا۔ صبح چھ بجے سے زرد چہرے سلاخوں کے پیچھے جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پیچھے

اندر چہرے اندر بیٹھے ہوئے شراب کے گلاسوں پر جھکے نظر آرہے تھے۔ عام طور پر موسیو ڈیفارج کافی پتلی شراب بیچا کرتا تھا۔ مگر اس دن معلوم ہوتا تھا غیر ضرورت سے زیادہ پتلی شراب بچی تھی۔ اور شراب ترش کی تھی۔ جس نے پیے۔ ان کے منہ کھٹے کر دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر اور بھی مایوسی طاری ہوگئی تھی۔ موسیو ڈیفارج کی انگوروں سے نچوڑی ہوئی شراب میں سے نشہ کا شعلہ نہیں لپک رہا تھا۔ بلکہ اس کی تلچھٹ میں آگ دبی ہوئی تھی جو اندھیرے میں چھپی ہوئی سلگ رہی تھی۔

یہ تیسری صبح تھی جب کہ موسیو ڈیفارج کی دوکان میں مسلسل شراب پی جارہی تھی۔ پیر کے روز شروع ہوئی تھی اور آج بدھ کا دن تھا۔ شراب سے زیادہ تاریک خیالات دماغوں پر چھائے ہوئے تھے۔ بہت سے تو ایسے لوگ تھے کہ اگر اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے بھی شراب خریدنے پر مجبور ہوتے تو بھی ان کی جیب سے کھوٹی کوڑی نہ نکلتی۔ وہ دروازہ کھول کر آتے سرگوشیاں کرتے اور ادھر ادھر کھسک جاتے۔ مگر وہ بھی شراب کی دوکان میں اس قدر دلچسپی لے رہے تھے جیسے اگر چاہیں تو شراب کے پورے پیپے خرید سکتے ہیں وہ ایک کرسی سے دوسری کرسی پر کھسکتے کونے کونے میں گھوم رہے تھے۔ شراب کے بجائے پر شوق نگاہوں سے باتیں سن رہے تھے۔

حالانکہ غیر معمولی مجمع تھا۔ مگر شراب خانہ کا مالک موجود نہیں تھا کسی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ جو بھی اندر آیا اس نے اسے تلاش نہیں کیا نہ اس کے بارے میں کچھ پوچھا۔

کسی کو تعجب نہ تھا کہ صرف میڈم ڈیفارج ہی اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھی ہے۔ وہ شراب کے لین دین کی ذمہ دار ہے۔ سامنے ایک بوسیدہ پیالے میں سکے رکھے ہیں۔ وہ سکے بھی ان انسانوں کی پھٹی پرانی جیبوں میں سے نکل کر انسانوں کی طرح گھسے پٹے ہیں اور انسانیت کی چھاپ ان کے چہروں سے غائب ہو چکی ہے۔

جاسوسوں کو یہاں سوائے اس کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ ہر قسم کی دلچسپی مر چکی ہے اور لوگ کھوئے کھوئے سے نظر آرہے ہیں۔ اس زمانے میں بادشاہ کے محل سے لیکر شراب خانہ تک ہر جگہ مخبروں اور جاسوسوں کا زور تھا۔ ہر جگہ یہی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ جواریوں کے ہاتھ تھکے ہوئے تھے۔ شرابی میز پر چھلکی ہوئی شراب سے نقش و نگار کھینچ رہے تھے۔ میڈم ڈیفارج اپنا بنائی کا نمونہ بازو پر پھیلائے خلال سے اس کے گرے ہوئے خانے اٹھا رہی تھی۔ اور دور فاصلہ پر کسی نظروں سے اوجھل چیز کو گھور رہی تھی۔ اور خاموشی میں کچھ سن رہی تھی۔

سینٹ انٹائن کے شراب خانہ کا یہ نقشہ دوپہر تک یونہی قائم رہا۔ سمندر کے چڑھاؤ کا وقت تھا۔ سہ پہر کو دو آدمی سڑک پر سے گذرے اور لٹکتی ہوئی لالٹینوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے ایک تو موسیو ڈیفارج اور دوسرا نیلی ٹوپی اوڑھے سڑک کی مرمت کرنے والا تھا۔ جب وہ شراب کی دوکان میں پہونچے تو پیاسے اور دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ ان کی آمد نے سینٹ انٹائن کے سینے میں ایک قسم کی آگ بھڑکا دی جو زیادہ تر کھڑکیوں اور دروازوں میں جھانکتے ہوئے چہروں پر سلگ کر جھلملانے لگی۔ مگر کوئی ان کے تعاقب میں نہ آیا اور جب وہ شراب خانہ میں داخل ہوئے تو کسی نے ان سے بات نہیں کی۔ حالانکہ جتنے لوگ بھی وہاں موجود تھے

مڑکر انہیں دیکھنے لگے۔

"صبح بخیر صاحبو!" موسیو ڈیفارج نے کہا۔

یہ شاید زبان کھولنے کا اشارہ تھا۔ سب ایک دم یک زبان ہو کر چلا پڑے "صبح بخیر!"

"موسم بڑا خراب ہے حضرات!" ڈیفارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس پر ہر شخص نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر نظریں نیچی کر کے سب خاموش بیٹھ گئے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی اٹھا اور باہر چلا گیا۔

"بیوی۔ میں اس سڑکوں کی مرمت کرنے والے کے ساتھ کئی میل چل کر آ رہا ہوں۔ اس کا نام جیکوس ہے۔ پیرس سے ڈیڑھ دن کے راستہ پر میری اتفاق سے اس سے ملاقات ہو گئی۔ بڑا معصوم ہے یہ سڑک کی مرمت کرنے والا۔ جیکوس کو شراب دو۔ بیوی ـــ" ڈیفارج نے بلند آواز میں میڈم ڈیفارج کو مخاطب کر کے کہا۔

دوسرا آدمی اٹھا اور باہر چلا گیا۔ میڈم نے جیکوس نامی سڑک کی مرمت کرنے والے کے سامنے شراب رکھ دی۔ اس نے نیلی ٹوپی اتار کر سب کو سلام کیا اور پینے لگا۔ اس کی جاکٹ کی جیب میں کچھ سیاہ روٹی تھی جسے نکال کر وہ بیچ بیچ میں کھاتا جا رہا تھا۔ پھر میڈم ڈیفارج کی میز کے پاس بیٹھ کر روٹی چبا چبا کر شراب پیتا رہا۔ ایک تیسرا آدمی اٹھا اور باہر چلا گیا!

ڈیفارج بھی شراب پی کر تازہ دم ہو گیا۔ اس نے اتنی شراب نہیں پی جتنی اجنبی نے پی۔ کیونکہ شراب اس کے لئے مجوبہ روزگار نہیں تھی۔ پھر وہ انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اجنبی نے اپنا ناشتہ ختم کر لیا۔ اس نے کسی کی طرف نہیں دیکھا نہ کسی نے اس کی طرف دیکھا۔

میڈم ڈیفارج نے بھی نہیں جس نے اپنی بنائی اٹھا کر بننا شروع کر دیا تھا۔

" ناشتہ ختم کر لیا دوست " ڈیفارج نے موقع دیکھ کر کہا۔

" ہاں ـــ شکریہ ! "

" تو پھر آؤ۔ میں تمہیں وہ کمرہ دکھا دوں۔ جہاں تم ٹھیر سکتے ہو۔ تمہارے لئے بہت موزوں ثابت ہوگا "

شراب کی دوکان سے نکل کر گلی میں۔ گلی سے گذر کر صحن میں۔ صحن سے ہوتے ہوئے اوپر ایک زینہ پر سے چڑھ کر ایک کوٹھری میں پہونچ گئے۔ یہ وہی کوٹھری تھی جس میں ایک دن بوڑھا سفید بالوں والا آدمی نیچی بنچ پر آگے کو جھکا جوتے سی رہا تھا۔

مگر اب وہاں کوئی سفید بالوں والا بوڑھا نہیں تھا۔ ہاں وہ آدمی موجود تھے جو شراب خانے سے ایک ایک کرکے اٹھے تھے۔ ان میں اور دور رہنے والے سفید بالوں والے بوڑھے میں ایک چھوٹا سا رشتہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے دیوار کے سوراخ میں سے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔

ڈیفارج نے دروازہ بند کر دیا۔ اور نیچی آواز میں بولا۔

" جیکوس نمبر ایک، جیکوس نمبر دو، جیکوس نمبر تین۔ یہ وہی گواہ ہے جو وعدے کے مطابق مجھ سے یعنی جیکوس نمبر چار سے ملا۔ یہ تمہیں سب حالات بتائے گا۔ جیکوس نمبر پانچ اپنا بیان شروع کرو "

سڑک کی مرمت کرنے والا ٹوپی ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اپنی میلی پیشانی اس نے پونچھی اور کہا۔

"کہاں سے شروع کروں حضرات"

"بس ابتدا ہی سے شروع کرو"، موسیو ڈیفارج نے عقلمندی سے جواب دیا۔

"حضرات اس گرمی میں ایک سال پورا ہو گیا۔ جب میں نے اسے دیکھا تھا وہ مارکوئیس کی گاڑی کے نیچے زنجیریں پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ ذرا غور سے سنئے۔ میں سڑک پر کام ختم کرکے جا رہا ہوں سورج ڈوب رہا ہے۔ مارکوئیس کی گاڑی آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہی ہے۔ وہ زنجیروں سے ایسا لٹکا ہوا ہے"

سڑک مرمت کرنے والے نے پھر وہی پرانی نقل کرکے دکھائی۔ اب تو اسے اس کرتب میں مشاق ہونا چاہئے تھا کیونکہ پورے سال گاؤں والوں کی سب سے ہر دل عزیز تفریح کا ذریعہ یہ کرتب ہی تھا۔

جیکوس نمبر ایک نے پوچھا "کیا اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا تھا"

"کبھی نہیں" سڑک مرمت کرنے والے نے دوبارہ خط عمودی بن کر کہا۔

"تو پھر کیسے بعد میں پہچانا" جیکوس نمبر تین نے پوچھا۔

"اس کے لمبے قد سے!" سڑک مرمت کرنے والے نے ناک انگلی پر رکھ کر جلدی سے کہا "جب مارکوئیس صاحب نے شام کو پوچھا۔ بتاؤ وہ کیسا تھا۔ تو میں نے جواب دیا۔ بھوت کی طرح لمبا"

"تمہیں کہنا چاہئے تھا بونے کی طرح ٹھنگنا" جیکوس نمبر دو نے کہا۔

"مگر مجھے کیا معلوم تھا۔ جب تک واردات نہیں ہوئی تھی اور نہ اس نے مجھ سے کہا تھا

کچھ۔ ذرا غور کیجئے ان حالات میں بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔ ہمارے چشمہ کے پاس کھڑے ہو کر مارکوئیس صاحب نے کہا۔ اس بدمعاش کو ہمارے پاس لاؤ۔ لیکن ان کے اس حکم کے باوجود یقین مانیئے حضرات میں نے کچھ نہیں بتایا۔"

"جیکوس یہ ٹھیک کہتا ہے۔ آگے بتاؤ" ڈیفارج نے دخل انداز ہونے والے سے کہا۔

"خوب" سڑک بنانے والے نے پراسرار طریقہ سے کہا "لمبا آدمی غائب ہو جاتا ہے اسے تلاش کیا جاتا ہے۔ کتنے مہینے۔ نو، دس، گیارہ"

"تعداد کی کوئی اہمیت نہیں" ڈیفارج نے کہا۔ "اچھی طرح چھپا دیا گیا۔ مگر آخرکار بدقسمتی سے پکڑا جاتا ہے۔ پھر؟"

"میں پھر سڑک پر کام کر رہا ہوں۔ سورج ڈوبنے والا ہے۔ میں اپنے اوزار اٹھا کر نیچے گاؤں میں اپنی جھونپڑی کی طرف جانے لگتا ہوں۔ جہاں ابھی سے اندھیرا ہو گیا ہے جب میں نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو پہاڑی کے اوپر چھ سپاہی آتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے درمیان میں ایک لمبا شخص ہے جس کے ہاتھ ایسے بندھے ہیں"

اپنی ٹوپی کو مٹھیوں میں اس طرح بھینچ کر دکھایا جیسے کسی آدمی کو رسی سے جکڑ کر باندھ دیا گیا ہو۔

"حضرات۔ پتھروں کے ڈھیر کے پاس سپاہیوں اور قیدی کو گذرتا دیکھنے کے لئے ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ (کیونکہ یہ سنسان سڑک ہے جہاں ہر منظر اپنے اندر دلچسپی رکھتا ہے)

اور پہلے تو جب وہ آرہے تھے تو سورج ان کی پشت پر تھا۔ اس لئے سوائے کالے ہیولوں کے کچھ نہیں دکھائی دیا۔ بس یہ معلوم ہوا کہ چھ سپاہی ایک بندے ہوئے قیدی کو لئے آرہے ہیں صرف جس رخ سورج ڈوب رہا تھا ادھر روشنی پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ لال لال گوٹ سی لگی ہے اس کے علاوہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے لمبے لمبے سائے سڑک کے اس پار گھاٹی کے کنارے پر پڑ رہے ہیں۔ اور دیوزادوں کے سایوں کی طرح اوپر پہاڑی تک پہونچ رہے ہیں۔ اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دھول میں اٹ رہے ہیں۔ اور ان کے چلنے سے دھول اڑ رہی ہے۔ مگر جب وہ میرے قریب پہونچے تو میں نے لمبے آدمی کو پہچان لیا اور اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس وقت وہ ڈھلان پر سے لڑھک کر بھاگ جاتا تو اسے بڑا اطمینان محسوس ہوتا۔ جیسے کہ اس کے قریب کی جگہ سے اس شام بھاگ گیا تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ مجھے ملا تھا۔"

اس نے یہ سب کچھ ایسے بیان کیا جیسے وہ وہاں خود موجود ہے اور اپنی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ رہا ہے۔ شاید زندگی میں اس نے بہت کچھ نہیں دیکھا تھا۔ نہ میں نے سپاہیوں کو بتایا کہ میں اسے پہچانتا ہوں نہ اس نے بتایا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے۔ مگر ہماری آنکھوں نے بہت کچھ کہا اور سنا۔ "چلو — اسے جلدی سے اس کی قبر میں لے چلو" — اور وہ اسے تیزی سے چلانے لگے۔ میں ساتھ چلتا ہوں۔ اس کے بازو اتنے کس کر باندھے ہیں کہ سوج گئے ہیں۔ اس کے لکڑی کے جوتے بڑے بڑے اور بے تکے ہیں اور وہ لنگڑا رہا ہے۔ چونکہ وہ لنگڑا رہا ہے اس لئے دھیرے چل رہا ہے۔ وہ اسے الیسی اپنی بندوقوں سے ٹھیلتے ہیں۔"

اس نے اس شخص کی نقل کی جس کی کمر میں بندوق کا کندا اڑا کر دھکا دیا جا رہا ہو۔

جب وہ پہاڑی سے پاگلوں کی طرح دوڑ لگاتے اترتے ہیں تو وہ گر جاتا ہے وہ ہنس کر پھر اسے اٹھا لیتے ہیں۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے اور وہ چہرہ دھول میں لتھڑا ہوا ہے مگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنا منہ نہیں چھو سکتا۔ اس پر وہ اور ہنستے ہیں وہ اسے گاؤں میں لاتے ہیں۔ سارا گاؤں دیکھنے کو جمع ہو جاتا ہے۔ وہ اسے پن چکی کے پاس سے گذر کر قید خانے میں لے جاتے ہیں۔ سارا گاؤں دیکھتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں قید خانہ کا پھاٹک کھلتا ہے اور اسے لیے نگل لیتا ہے ؟

جتنا منہ کھل سکا اتنا کھول کر اس نے گھونٹ سے دانت بند کر لئے۔ اب چونکہ کھولنے سے اصلی واقعہ کا نقشہ بگڑ جاتا تھا اس لئے منہ کھولنے میں اسے لطف محسوس ہو رہا تھا۔ ڈیفارج نے کہا۔

"آگے کہو جیکوس۔ پھر کیا ہوا ؟"

" سارا گاؤں ۔۔ سڑک مرمت کرنے والے نے پنجوں کے بل چل کر دھیمی آواز میں کہا۔ " اندر چلا جاتا ہے ۔۔۔ سارا گاؤں چشمے کے پاس سرگوشیاں کرتا ہے۔ سارا گاؤں سوتا ہے اور سارا گاؤں چٹان پر ایستادہ قید خانہ کی سلاخوں کے پیچھے بدنصیب قیدی کے متعلق خواب دیکھتا ہے وہ کبھی وہاں سے نہ نکلے گا۔ صرف پھانسی کے لئے نکالا جائے گا۔ صبح کے وقت اپنی سیاہ روٹی کے ٹکڑے کھا کر اپنے اوزار کندھے پر رکھ کر کام پر جاتے ہوئے قید خانہ کا چکر لگاتا ہوں۔ میں اسے اونچے لوہے کے پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے گذشتہ شام کی طرح خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ اس کے ہاتھ آزاد نہیں کہ وہ میری طرف ہلا سکے۔

میں اسے پکارنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ ایک مردے کی طرح مجھے تکتا ہے۔"

ڈیفارج اور تینوں جیکوس غصہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب وہ سڑک مرمت کرنے والے کی کہانی سن رہے تھے۔ تو ان کی آنکھوں میں غصہ نفرت، گھٹن اور انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ ان سب کے رویے پُراسرار اور ساتھ ساتھ تحکمانہ بھی تھے۔ وہ ایک وحشیانہ عدالت کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ جیکوس نمبر ایک اور دو پرانے پیال کے بستر پر بیٹھے تھے۔ ان کی ٹھوڑیاں ہتھیلیوں پر ٹکی ہوئی تھیں، اور آنکھیں سڑک بنانے والے پر جمی تھیں۔ جیکوس نمبر تین ان کے پیچھے ایک گھٹنا ٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ بھی بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بار بار ناک اور منہ پر پھیلے ہوئے نسوں کے جال پر گھبراہٹ میں پھر رہا تھا۔ ڈیفارج ان کے اور بیان کرنے والے کے درمیان کھڑا تھا۔ جسے اس نے کھڑکی کی روشنی کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ وہ بار بار کبھی ان تینوں کی طرف اور کبھی سڑک مرمت کرنے والے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آگے بیان کرو جیکوس!" ڈیفارج نے کہا۔

وہ اپنے لوہے کے پنجرے میں کچھ دن رکھا جاتا ہے۔ پورا گاؤں چھپے چوری اسے دیکھتا ہے کیونکہ لوگ ڈرتے ہیں۔ مگر وہ ہمیشہ دُور سے قید کے پنجرے کو دیکھتے ہیں اور رات کو جب کام سے چھٹی ہو جاتی ہے لوگ چشمہ کے کنارے بات چیت کی خاطر جمع ہو جاتے ہیں تو سب کے سب کبھی ڈاک گھر کی طرف دیکھتے ہیں، اور کبھی جیل کی طرف۔ وہ چشمہ پر سرگوشیاں کرتے ہیں کہ اسے موت کی سزا مل چکی ہے۔ مگر وہ قتل نہیں کیا جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ پیرس ایک عرضی

کھیتی گئی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بچہ کی موت نے اسے غصہ سے پاگل بنا دیا تھا اور یہ عرضی خود بادشاہ کو پیش کی گئی ہے۔ مجھے کیا معلوم شاید یہ ممکن ہو۔ شاید نہ ہو۔"

"تو پھر سنو جیکوس۔ ایک عرضی بادشاہ اور ملکہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ سوائے تمہارے ہم سب نے بادشاہ کو عرضی لیتے دیکھا جب کہ وہ گاڑی میں ملکہ کے ساتھ گذر رہے تھے۔ ڈیفارج جسے تم دیکھ رہے ہو یہی اپنی جان خطرے میں ڈال کر گھوڑوں کے سامنے بھاگ کر عرضی ہاتھ میں لئے چلا۔" جیکوس نمبر ایک نے کرختگی سے کہا۔

"اور ایک بار یہ بھی سن لو کہ سوار اور پیدل محافظوں نے اسے گھیر لیا۔ اور خوب مارا۔ سنئے تو۔" جیکوس نمبر تین گھٹنوں کے بل جھکا بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں بڑی پھرتی سے نازک نازک رگوں پر دوڑ رہی تھیں اس کی آنکھوں میں ایک ایسی بھوک تھی جس کا کھانے پینے سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔

"میں سن رہا ہوں حضرات۔"

"آگے کہو" ڈیفارج نے کہا۔

"دوسری طرف لوگ چشمہ کے گرد یہ بھی سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ وہ ہمارے گاؤں میں اسی جگہ قتل کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ وہ تو یہ بھی سرگوشیاں کرتے ہیں کہ چونکہ اس نے مارکوئیس کو قتل کیا ہے اور مارکوئیس اپنے آسامیوں کا مائی باپ تھا آسامی یا غلام جو کچھ بھی کہہ لو۔ اس لئے اسکو ماں باپ کے قاتل کی حیثیت سے مارا جائیگا۔ چشمہ پر ایک بوڑھا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے سیدھے ہاتھ میں خنجر تھما کر اس کی آنکھوں کے سامنے جلایا جائے گا۔ اور اس کے ہاتھوں۔ سینے اور

انگلیوں میں زخم بنا کران میں کھولتا ہوا تیل، پگھلا ہوا سیسہ، پکتی ہوئی لاکھ، موم اور گندھک انڈیلی جائے گی۔ آخر میں چار مضبوط گھوڑوں سے باندھ کر اس کے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں گے۔ وہ بوڑھا آدمی کہتا ہے کہ اس آدمی کا جس نے پچھلے بادشاہ لوئی چہاردہم کی جان لینے کی کوشش کی تھی یہی حشر ہوا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم کہ وہ جھوٹ کہتا ہے یا سچ۔ میں کوئی عالم فاضل تو ہوں نہیں" دیہاتی نے کہا۔

"تو پھر ایک دفعہ اور سن لو جیکوس" اس آدمی نے جس کی انگلیاں بے چینی سے ہونٹوں پہ دوڑ رہی تھیں، اور جس کی آنکھوں میں شدید بھوک تھی کہا۔

"اس قیدی کا نام ڈامین تھا۔ اور یہ سب کچھ دن دھاڑے ہوا تھا۔ پیرس کی گلیوں میں اور تماش بینوں میں اتنا نمایاں کوئی نہ تھا، جتنی مہذب اور شائستہ خاندانی خواتین، جو آخر تک انتہائی دلچسپی لیتی رہیں۔ اور انجام — جیکوس — رات گئے جا کر ہوا۔ اس وقت اس کی دونوں ٹانگیں اور ایک ہاتھ ضائع ہو چکا تھا۔ مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ جب ہوا تھا تو — کیوں تمہاری کیا عمر ہے؟"

"پینتیس سال" سڑک مرمت کرنے والے نے کہا۔ حالانکہ وہ ساٹھ کا معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ سب کچھ جب ہوا تھا، اس وقت تم دس برس سے زیادہ کے تھے۔ تمہیں تو سب یاد ہوگا"

"بس اتنا کافی ہے۔ خدا شیطان کی عمر دراز کرے۔ آگے بیان کر دو" ڈیفارج

نے بے قراری سے کہا۔

"کچھ یہ کہتے ہیں کچھ وہ کہتے ہیں۔ سوائے اس کے کوئی دوسری بات نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے چشمہ بھی ان کا ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ آخر کار اتوار کی رات کو جب سارا گاؤں نیند میں غافل ہے سپاہی آتے ہیں جیل خانہ کی طرف گھوم کر جاتے وقت انکی بندوقوں کی جھنکار تنگ سی گلی کے پتھروں پر گونجتی ہے۔ مزدور کھودتے ہیں۔ ٹھوکا پیٹی کرتے ہیں۔۔ سپاہی ہنستے ہیں اور گاتے ہیں۔ صبح کے وقت چشمہ کے کنارے چالیس فٹ اونچی پھانسی ایستادہ چشمہ کے پانی میں زہر گھول رہی ہے۔"

سڑک مرمت کرنے والے نے کمرے کی [illegible] کی طرف دیکھنے کی بجائے اس کے اوپر [illegible] دیکھ کر اشارہ کیا جیسے پھانسی کہیں دور آسمان پر لٹک رہی ہو۔

"سب کا [illegible] گیا ہے۔ سب جمع ہو جاتے ہیں۔ کوئی گائیں چرانے نہیں لے جاتا۔ گائیں بھی ساتھ ہی کھڑی ہیں۔ دوپہر کے وقت نقارے کی آواز گونجتی ہے۔ رات ہی کو سپاہی جیل خانہ میں داخل ہوگئے تھے۔ وہ [illegible] سپاہیوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ پہلے کی طرح بندھے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس کے منہ پر ڈھاٹا بھی کس دیا ہے۔ اتنی زور سے باندھا ہے کہ اس کی باچھیں چر کر معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہنس رہا ہے۔" اس نے اپنے انگوٹھے منہ میں ڈال کر اپنا دہانہ کانوں کی طرف کھینچ کر تشریح کی۔ "پھانسی کے اوپر ایک خنجر نصب ہے جس کی نوک اوپر ہے۔ وہ چالیس فٹ اونچی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ وہ لٹکا ہوا — پانی میں زہر گھول رہا ہے۔"

منظر کی یاد تازہ ہونے سے اسے پسینہ آگیا تھا۔ جو اس نے اپنی نیلی ٹوپی سے پونچھ ڈالا۔

اس دوران میں سننے والے ایک دوسرے کو بڑے غور سے دیکھتے رہے۔

"کس قدر بھیانک بات ہے۔ انتہائی خوفناک ہے حضرات۔ عورتیں اور بچے کیسے پانی بھر سکتے ہیں۔ پھانسی کے سائے میں کون بیٹھ کر گپ شپ کر سکتا ہے۔ پیر کی رات کو جب سورج سونے کے لیے رخصت ہو رہا تھا اور میں گاؤں سے روانہ ہو رہا تھا تو میں نے پہاڑی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ پھانسی کا سایہ گرجا کے اوپر پڑ رہا تھا۔ پن چکی پر پڑ رہا تھا۔ جیل خانے پر سے گزر کر زمین کے اس کونے تک پڑ رہا تھا جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں" معجو کا آدمی اپنی ایک انگلی کتر رہا تھا اور دوسروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خواہش کی شدت سے اس کی انگلی کانپ رہی تھی۔

"بس۔ حضرات۔ اتنا ہی مجھے معلوم ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد میں روانہ ہو گیا جیسا کہ مجھے حکم ملا تھا۔ میں ساری رات اور دوسرے آدھے دن تک چلتا رہا۔ تب میں ان مہربان دوست سے ملا۔ جیسا کہ مجھے بتا دیا گیا تھا۔ اور ان کے ساتھ کبھی پیدل کبھی سواری سے کل کا باقی دن اور رات میں گزرا۔ اور اب آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"شاباش۔ تم نے اپنے قول اور فعل سے ثابت کر دیا کہ تم نہایت وفادار آدمی ہو کیا تم تھوڑی دیر باہر بیٹھ کر ہمارا انتظار کر سکو گے۔" کچھ دیر نفرت سے بھری خاموشی طاری رہی پھر جیکوس نمبر ایک نے کہا۔

جب وہ لوٹ کر آیا تو تینوں سر جوڑے کھڑے تھے۔

"کیا رائے ہے تمہاری۔ فہرست میں درج کر لیا جائے۔" جیکوس نمبر ایک نے پوچھا۔

"تباہ و برباد کئے جانے والوں کی فہرست میں درج کر دیا جائے" ڈیفارج نے کہا۔

"بہت خوب" خواہش سے مغلوب آدمی نے کہا۔

"محل اور ساری پود کو" پہلے شخص نے پوچھا۔

"محل اور ساری پود کو نیست و نابود کر دیا جائے"

بھوکے انسان نے پھر "لاجواب" کا نعرہ مارا اور اپنی دوسری انگلی چبانے لگا۔

"کیا تمہیں اچھی طرح یقین ہے کہ اس فہرست کے رکھنے کے طور طریقے سے کچھ مشکلیں تو نہیں اٹھ کھڑی ہوں گی" دوسرے جیکوس نے ڈیفارج سے پوچھا "ویسے محفوظ طریقہ تو ہے کہ ہمارے سوا کوئی اسے پڑھ ہی نہیں سکتا۔ مگر کیا ہم ہمیشہ اسے پڑھ سکیں گے۔ میرا مطلب ہے وہ ان نشانات کے معنی نکال سکے گی"

"جیکوس۔ اگر۔ میری بیوی فہرست کو اپنے دماغ میں رکھنے کا بھی فیصلہ کرلے تب بھی وہ ایک لفظ یا ایک حرف بھی نہیں بھولے گی۔ اس کی اپنی بنائی میں اپنے نشانات، وہ ایسی ایسی آسانی سے سمجھ سکتی ہے جیسے سورج کو۔ یہ بات میڈم ڈیفارج تک پہونچا دو۔ بزدل سے بزدل سپاہی کے لئے بھی خود اپنی ہستی کا مٹانا آسان ہوگا۔ مگر اپنے نام اور اعمال کا ایک حرف بھی میڈم کے اس بنے ہوئے رجسٹر سے نہیں مٹا سکے گا"

سب نے پسندیدگی اور رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ آدمی جو بھوکا تھا پوچھنے لگا۔ "کیا اس گنوار کو جلد ہی واپس روانہ کر دیا جائے گا۔ میرے خیال میں تو وہ انتہائی سادہ لوح ہے کیا اس میں اس کی طرف سے خطرہ نہیں ہے"

"وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ جو کچھ جانتا ہے اس کی بدولت وہ خود بڑی آسانی سے اتنی ہی اونچی پھانسی پر لٹک جائے گا۔ میں اسے اپنی نگہداشت میں رکھوں گا۔ اور واپس بھیج دوں گا۔ وہ بادشاہ ملکہ اور دربار کی شان وشوکت دیکھنا چاہتا ہے۔ اتوار کو اسے دکھا دیں گے۔" ڈیفارج نے کہا۔

"کیا!" جذباتی آدمی نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "کیا یہ کچھ اچھے آثار ہیں کہ وہ شہنشاہیت اور ریاستی شان کا نظارہ کرنا چاہتا ہے؟"

"جیکوس عقل مندی اسی میں ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ بلی کو دودھ کی خواہش بڑھے تو اسے دودھ دکھا دو۔ اگر کتے سے شکار کروانا چاہتے ہو تو اسے اس کا اصلی شکار دکھا دو تا کہ وہ اسے ایک دن دبوچ لے۔"

اس کے بعد کچھ نہیں کہا گیا۔ سڑک مرمت کرنے والا جو سیڑھیوں کے اوپر اونگھ گیا تھا اسے ہدایت کی گئی کہ وہ پھوس کے بستر پر آرام لے۔ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ پڑتے ہی سو گیا۔

اس شراب کی دوکان سے بھی بدتر جگہ پیرس میں اس درجے کے دیہاتی غلام کو بہ آسانی مل سکتی تھی۔ سوائے میڈم کی طرف سے ایک مبہم سے خوف کے ویسے اس کی زندگی قطعی نئی اور دلچسپ تھی۔ میڈم سارا دن میز پر بیٹھی رہتی اور قطعی طور پر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہ دے گی۔ اور اسے کسی بھی گہری سازش سے وابستہ نہیں شمار کرتی تھی۔ جب کبھی وہ اس کی طرف دیکھتی وہ خوف سے لرزنے لگتا۔ کیونکہ اسے ہر وقت ڈر لگتا رہتا تھا کہ کچھ اندازہ نہیں نہ جانے

کب وہ کوئی نیا فساد کھڑا کر دے۔ نہ جانے کب اس کے چمکیلے سجے ہوئے سر میں کوئی بات سما جائے اور وہ [illegible] پر قتل کا الزام لگا کر یہ تہمت تراشے کہ اس نے مقتول کی کھال کھینچی ہے، تو اسے کون روک سکتا ہے۔ وہ یقیناً پورا کھیل ختم کر کے ہی دم لے گی۔ چنانچہ جب اتوار آیا تو اسے یہ معلوم کر کے قطعی مسرت نہیں ہوئی کہ میڈم بھی اس کے اور موسیو کے ساتھ مارسیلز جائے گی۔ حالانکہ اس نے اپنی انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ اسے سخت وحشت ہو رہی تھی جب گاڑی میں سارے راستے بنتی رہی اور پھر جب بجیرہ میں بھی میڈم اپنی بنائی ساتھ لئے بنتی رہی جب کہ لوگ ملکہ اور بادشاہ کی گاڑی کے دیدار کے لئے جمع ہوئے تو اسے اور بھی وحشت ہوئی۔

"تم بڑی محنت کرتے ہو میڈم" اس کے قریب ایک آدمی نے کہا۔

"ہاں مجھے بہت کام کرنا ہے" میڈم ڈیفارج نے جواب دیا۔

"میڈم کیا بنا رہی ہے؟"

"بہت سی چیزیں"

"مثال کے طور پر"

"مثال کے طور پر کفن!" میڈم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

موقع پاتے ہی وہ آدمی وہاں سے سرک گیا اور سڑک مرمت کرنے والا [illegible] اور گن سے پریشان ہو کر اپنی ٹوپی سے پنکھا جھلنے لگا۔ اگر ملکہ اور بادشاہ کا وجود ہی اسے تقویت پہونچا سکتا تھا تو اس کی دوا قریب ہی تھی۔ جلد ہی چوڑے منہ والا بادشاہ اور خوبرو ملکہ ہنستی قہقہہ لگاتی جھلملاتی دربار کی خواتین اور چمکیلے شاہی نشان کی ہمراہی میں اپنی سنہری گاڑی میں بیٹھے گذرنے

لگے۔ اور وہ جواہرات، ریشم اور مخمل میں غرق تھے۔ ان کے عمدہ تراش کے لباسوں اور سجے سجائے حسین چہروں سے غرور اور گستاخی عیاں تھی۔ سڑک مرمت کرنے والا وقتی طور پر انھیں دیکھ کر ایسا مدہوش ہو گیا کہ "بادشاہ زندہ باد۔ ملکہ زندہ باد اور ہر کوئی اور سب زندہ باد" کے نعرے لگانے لگا۔ جیسے کہ اس نے ہر جگہ موجود رہنے والے جیکوس کی تقریر اپنی زندگی میں سنی ہی نہ ہو۔ پھر اس نے بڑے چوک بالاخانے فوارے سبز روشیں دیکھیں — بادشاہ اور ملکہ کو بار بار دیکھا۔ شاہی شان۔ لارڈ صاحبان اور لیڈیوں کو دیکھا۔ اور سب کو زندہ باد کہا۔ یہاں تک کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگا۔ اس پورے منظر کے درمیان جو قریب قریب تین گھنٹے اس کی نظروں کے سامنے گذرتا رہا۔ ڈیفارج نے اس کا گریبان پکڑے اسے قابو میں کئے رکھا۔ ورنہ وہ ان دیوتاؤں اور دیویوں پر جھپٹ کر ان کے پرزے اڑا دیتا۔

"شاباش۔ تم لاجواب آدمی ہو" ڈیفارج نے جلوس کے ختم ہو جانے کے بعد ایک خادم قوم کی حیثیت سے اس کی پیٹھ ٹھوک کر کہا۔ سڑک مرمت کرنے والے کو اب ہوش آرہا تھا اور اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آخر میں اس کا رویہ کچھ قابل اعتراض ہو گیا تھا۔ مگر نہیں۔

"تم جیسے انسانوں کی ہمیں ضرورت ہے" ڈیفارج نے اس کے کان میں کہا۔ "تمہیں دیکھ کر یہ بے وقوف سمجھتے ہیں ان کی ہمیشہ یونہی بنی رہے گی۔ تب وہ اور زیادہ گستاخ ہو جاتے ہیں اور منزل قریب تر آجاتی ہے"۔

"ارے واہ۔ یہ تو بالکل ٹھیک بات ہے" سڑک مرمت کرنے والے نے جھک کر جواب دیا۔

"یہ احمق کچھ نہیں جانتے۔ حالانکہ یہ تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اور تمہیں اور تمہارے جیسے سینکڑوں انسانوں کو اپنے کتوں اور گھوڑوں پر سے بے دریغ قربان کر دیں گے۔ مگر جو کچھ تم کہتے ہو اسے سچ سمجھتے ہیں۔ انھیں تھوڑی دیر اور دھوکا کھا لینے دو۔ یہ دھوکا زیادہ دن قائم رہنے والا نہیں"

میڈم ڈیفارج نے حقارت سے سڑک مرمت کرنے والے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم کوئی بھی غل غپاڑہ اور اودھم ہو اسی طرح چلا کر آنسو بہانے لگو گے۔ کیوں ہے نا یہی بات"

"واقعی میڈم میرا بھی یہی خیال ہے فی الحال تو۔۔!"

"اگر تمہیں بہت سی گڑیوں کو دکھا کر کہا جائے۔ جن جن کو چاہو توڑ پھوڑ کر مٹا ڈالو کیونکہ اسی میں تمہارا فائدہ ہے، تو تم سب سے قیمتی اور سجی ہوئی گڑیاں ہی منتخب کرو گے نا"

"یقیناً میڈم"

"اگر تمہیں پرکٹی چڑیوں کا ایک جھرمٹ دکھا دیا جائے اور تم سے کہا جائے اپنے مفاد کے لئے ان کے بال و پر نوچ ڈالو تو تم سب سے خوبصورت پروں والی چڑیاں ہی چنو گے"

"یقیناً میڈم"

میڈم نے اس طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا جدھر سے ابھی جلوس گذر

رہا تھا۔

"آج ہم نے گڑیاں اور چڑیاں دونوں دیکھ لیں ۔۔۔ اب گھر جائیے!"

سولہواں باب

مسلسل بنائی

میڈم ڈیفارج اور ان کے شوہر موسیو ڈیفارج خوش خوش سینٹ اینٹائن کی آغوش میں لوٹ آئے۔ اور ایک حقیر سا نکتہ ۔۔۔ نیلی ٹوپی اوڑھے ۔۔۔ تاریکی اور گرد میں سے گذرتا اور تھکا ہارا میلوں کا سفر کرتا۔ سڑک کے کنارے پگڈنڈیوں پر چلتا اس مرکز کی طرف جا رہا تھا جہاں آنجہانی مارکوئیس صاحب کا محل کھڑا پیڑوں کی سائیں سائیں سن رہا تھا اب ان پتھریلے چہروں کے پاس پیڑوں اور چشمے کی سرگوشیاں سننے کے لئے کافی وقت تھا۔ کیونکہ چڑیوں کو ڈرانے والے بیولوں کی شکل کے گنوار جو وہاں جلانے کے لئے سوکھی لکڑیاں اور کھانے کے لئے جڑی بوٹیاں جمع کرنے آیا کرتے تھے۔ وہ بالاخانے کی سیڑھیوں اور پتھر کے صحن کی طرف نہ نکل آتے تھے۔ ان عقل کے ماروں کا کہنا تھا کہ پتھریلے چہروں کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ گاؤں میں ایک خبر پھیل جاتی تو گاؤں والوں کے دھندلے وجود کی طرح وہ بھی واہمہ بن کر پھیلتی رہتی جب خنجر کا وار ہوا تو پتھریلے چہروں پر بجائے غرور کے غصہ اور تکلیف طاری ہوگئی۔ اور جب

قاتل کو چالیس فیٹ کی بلندی پر چھتے کے اوپر پھانسی کے لئے لٹکایا گیا تو وہ چہرے بے رحمی سے انتقام لئے جانے پر مطمئن نظر آنے لگے۔ اس خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس جہاں قتل ہوا تھا ایک پتھر کے چہرے کی ناک کے نتھنوں پر گڑھے بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جو ہر شخص پہچان گیا کہ وہاں اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ اور جب مجمع میں سے دو تین گنوار آدمی مارکوئیس صاحب کی لاش پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے آگے بڑھے تو کسی کی سوکھی ماری انگلی ایک منٹ بھی اس کی طرف اشارہ نہ کرنے پائی تھی کہ وہ سب ڈر کر گھاس پھوس میں ان خرگوشوں کی طرح دبک گئے جو ان سے زیادہ خوش قسمت تھے کہ وہاں سے اپنی خوراک تو حاصل کر سکتے تھے۔

محل اور جھونپڑی ـــــ پتھریلے چہرے اور پھانسی پر لٹکتا ہوا جسم ـــــ پتھر کے فرش پر سرخ دھبہ ـــــ گاؤں کے کنوئیں کا شفاف پانی ـــــ فرانس کا ایک پورا قصبہ ـــــ بلکہ پورا فرانس تاریک رات کے آسمان کے نیچے ایک باریک نکتہ پر مرکوز تھا۔ اسی طرح ساری دنیا مع اپنی وسعت اور اختصار کے ایک چھوٹے سے ستارے کی طرح ٹمٹماتی نظر آتی ہے۔ اگر ایک ادنیٰ انسان کی عقل روشنی کی کرنوں کو تقسیم کر کے ان کے مادے کا راز جان سکتی ہے تو ذہن رسا بھی ہماری دنیا کی دھندلی دمک اور اس پر بسنے والے ذمہ دار انسان کے عمل اور خیال برائی اور اچھائی کا پتہ لگا سکتا ہے۔

موسیو اور میڈم ڈیفارج ستاروں کی چھاؤں تلے کرائے کی گاڑی میں جھٹکے کھاتے پیرس کے بڑے پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کیونکہ یہی ان کی منزل مقصود تھی۔ وہی پرانے دستور کے مطابق انھیں روک کر سرحد کے محافظوں نے لالٹینیں گاڑی کے اندر معائنہ اور تفتیش کیلئے ڈالیں۔ میڈم اور موسیو ڈیفارج اترے۔ کیونکہ دو ایک محافظوں اور ایک سپاہی کو جانتے تھے

سپاہی سے کافی دوستی تھی۔ وہ ان سے بغل گیر ہوا۔

جب ڈیفارج پھر سینٹ انطائن کی میلی کچیلی آغوش میں واپس آ گئے اور سینٹ کے حدود میں اتر گئے اور اپنی گلی کی سیاہ کیچڑ اور غلاظت میں چل کر جانے لگے تو میڈم ڈیفارج اپنے شوہر سے بولی۔ بتاؤ دوست پولیس کے جیکوس نے تمہیں کیا بتایا؟"

"بہت کم۔ مگر جو کچھ بھی اسے معلوم تھا بتا دیا۔ اس نے کہا ہمارے محلے میں ایک نیا جاسوس تعینات ہوا ہے ممکن ہے اور بھی بہت سے ہوں مگر اسے صرف ایک کا پتہ ہے۔"

"اوہ ـــ اچھا تو پھر اس کا نام فہرست میں درج ہو جانا چاہئے۔ کیا نام ہے اس کا؟" میڈم نے کہا۔

"وہ انگریز ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"برساڈ" ڈیفارج نے نام حاصل کرنے میں بڑی ہوشیاری برتی تھی۔ اس نے بالکل صحیح ہجے کر کے فرانسیسی تلفظ کے مطابق بتا دیا۔

"برساڈ ـــ بہت اچھے ـــ پہلا نام کیا ہے" میڈم نے کہا۔

"جان"

"جان برساڈ" میڈم نے دو تین بار نام کو دہرایا "بہت خوب ـ صورت شکل معلوم ہے؟"

"عمر چالیس کے قریب۔ قد پانچ فٹ نو انچ۔ بال سیاہ رنگت سانولی۔ عام طور پر قبول صورت سمجھا جاتا ہے۔ سیاہ آنکھیں۔ چہرہ دبلا، لمبا اور مدد ـــ عقابی ناک مگر سیدھی نہیں۔

عجیب طریقہ پر بائیں گال کا نقرئی ... ی ہے اس نے دیکھنے میں صورت بھیانک ہے۔"

"بھئی واہ کیا تصویر کھینچی ہے۔ کل پہچان لیا جائے گا۔" میڈم نے ہنس کر کہا۔ دونوں شراب کی دوکان میں داخل ہوئے، جو کہ بند ہو چکی تھی۔ کیونکہ آدھی رات ہو گئی تھی۔ میڈم ڈیفارج فوراً اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ خوردہ جو ان کی غیر حاضری میں جمع کیا گیا تھا۔ گنا۔ مال کا جائزہ لیا۔ رجسٹر کے اندراج کو جانچا۔ کچھ خود درج کیا۔ شراب دینے والے کی طرف سے اچھی طرح اطمینان کیا۔ پھر اس سے جا کر سونے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد پھر خوردہ نکالا اپنے رومال میں رات کو حفاظت کے لیے۔ ... مختلف ... چھوٹی گانٹھیوں میں باندھا۔ اس عرصہ میں ڈیفارج منہ میں پائپ لئے ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ میڈم کو قدردانی اور ... برتری کے ساتھ دیکھتا رہا۔ مگر دخل بالکل نہیں دیا۔ یہ واقعہ بھی تھا کہ جہاں تک ... گھریلو زندگی اور بیوپار کے انتظام کا سوال تھا اس کا کام ادھر ادھر ٹہلنا ہی تھا۔

رات گرم تھی اور شراب کی دوکان چاروں طرف سے غلط پڑوس سے گھری ہوئی اور بند ہونے کی وجہ سے بدبوئیں بسی ہوئی تھی۔ ویسے موسیو ڈیفارج کی قوت شامہ بہت حساس بھی نہ تھی۔ مگر شراب میں مزاکم تھا۔ سڑاند بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ یہی حال رم برانڈی اور سونف کی شراب کا تھا۔ انھوں نے ملی جلی بدبوؤں کے بھبکے سے نفرت کا اظہار کیا اور بجھا ہوا پائپ رکھ دیا۔

"تم بہت تھک گئے ہو ورنہ یہ بدبوئیں تو وہی روزانہ کی ہیں۔" روپیوں کی گانٹھے باندھتے ہوئے میڈم نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

"میں کچھ تھک گیا ہوں" شوہر نے اعتراف کیا۔

"کچھ دل برداشتہ بھی ہو رہے ہو۔ اف یہ مرد ذات" میڈم نے کہا جو پیسوں کی طرف اتنے انہماک سے متوجہ نہیں تھی مگر اپنے شوہر کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"مگر — میری پیاری تٹ" ڈیفارج نے کہنا شروع کیا۔

"مگر میرے پیارے!!" میڈم نے سختی سے سر ہلایا "مگر میرے پیارے آج کی رات تمہارا دل ڈوبا جا رہا ہے میرے پیارے"

"بڑی مدت درکار ہے" جیسے زبردستی ڈیفارج کے سینے سے اس کے خیالات اگلوائے گئے ہوں گے۔

"مدت تو درکار ہوتی ہی ہے" اس کی بیوی نے دہرایا "اور مدت کب درکار نہیں ہوتی۔ انتقام اور تلافی کرنے کے لئے ایک زمانہ چاہیے"

"ایک شخص پر بجلی گرانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا" ڈیفارج نے کہا۔

"اچھا بتاؤ بجلی کا سرمایہ جمع کرنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے" میڈم نے اطمینان سے پوچھا۔ ڈیفارج نے سوچتے ہوئے سر اٹھایا۔ جیسے کہ واقعی اس میں کچھ تھا۔

"ایک زلزلے کو پورا شہر نگلنے میں دیر نہیں لگتی۔ ٹھیک — مگر بتا سکتے ہو کہ اس زلزلے کو تیار کرنے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے" میڈم نے کہا۔

"بہت وقت لگتا ہوگا میرا خیال ہے" ڈیفارج نے تسلیم کر لیا۔

"اور جب وہ تیار ہو جاتا ہے تو۔ وہ پھٹ پڑتا ہے۔ جو چیز اس کے سامنے

آ بلنے اسے پیس ڈالتا ہے۔ اس عرصہ میں گو دکھائی نہیں دیتا مگر وہ تیاریاں کیا کرتا ہے یہی تمہارا مہارا ہے اسے یاد رکھنا!" اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر ایک گانٹھ ایسے کس کر لگائی جیسے وہ کسی دشمن کا گلا گھونٹ رہی ہو۔

"میں تجھے بتائے دیتی ہوں،" زور دینے کے لئے اس نے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "گو بہت دور وہ سڑک پر چل رہا ہے۔ مگر بڑھتا ہی چلا آرہا ہے۔ میری بات مان ـــ وہ واپس نہیں لوٹتا۔ اور کبھی نہیں رکتا۔!

میری بات سن۔ وہ آگے بڑھتا ہی آرہا ہے۔ اپنے چاروں طرف دیکھ۔ اپنے گرد رہنے والی دنیا کی زندگی جسے ہم جانتے ہیں اس پر نظر ڈال۔ اس غصہ اور بے اطمینانی کی طرف دیکھو جو جیکوس کے فرقہ کی تقریروں میں دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہر گھنٹہ امید بڑھتی جارہی ہے۔ کیا یہ حال ہمیشہ اسی طرح قائم رہ سکتا ہے ـــ ہاہ ـــ مجھے تمہاری حالت پر ہنسی آتی ہے؛"

"میری بہادر شریک زندگی!" موسیو ڈیفارج اپنی بیوی کے سامنے سر جھکائے پشت پر ہاتھ باندھے ایسے کھڑا تھا جیسے ایک مسکین اور ہونہار طالب علم اپنے ممتحن کے سامنے کھڑا ہو۔ "مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ مگر بہت عرصہ سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ اور جانتی ہو بیوی بہت ممکن ہے کہ ہماری زندگیوں میں نہ آسکے؛"

"ہونہہ۔ خوب تو پھر؛" میڈم نے دوسری گانٹھ ایسے باندھی جیسے دوسرے دشمن کا گلا گھونٹ دیا۔

"تو پھر ـــ ہم فتح کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں گے؛" ڈیفارج نے کچھ

ترکا یڑا کچھ عذر کے طور پر کہا۔

"مگر ہم نے مدد تو کی۔ میڈم نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا ۔۔۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بیکار نہیں جائے گا۔ بلکہ میں تو اپنی روح کی گہرائیوں سے محسوس کرتی ہوں کہ ہم فتح کا منہ دیکھیں گے لیکن اگر مجھے یقین بھی ہو جائے کہ انقلاب نہیں آئے گا۔ پھر بھی اگر مجھے کسی اونچے طبقے کے ظالم کی گردن مل جائے تو اب بھی ۔۔۔ میں ۔۔۔"

"بس! " ڈیفارج نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے اسے بزدل کہا جا رہا ہے۔ اور اس کا منہ سرخ ہو گیا "پیاری۔ میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔"

"ہاں مگر یہ تمہاری کمزوری ہے کہ اکثر تمہیں جوش میں آنے کے لئے اپنا شکار اور موقع دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بغیر اس کے اپنا جوش قائم رکھنا سیکھو۔ جب وقت آئے تو ایک شیر۔ ایک شیطان کو ڈھیل دیدو۔ مگر ہمیشہ شیر اور شیطان کو تیار رکھو۔ آزاد نہ کرو ۔۔۔ مگر پوشیدہ طور پر تیار رکھو۔"

اس نصیحت کے ڈرامائی اختتام پر میڈم نے پیسوں کی گانٹھوں کی لمبی سی زنجیر کی لڑی بغل میں دابی اور فیصلہ کیا کہ سونے کا وقت ہو گیا۔ دوسرے دن دوپہر کو قابل قدر میڈم اپنی مقررہ نشست پر شراب خانے میں فردکش نظر آرہی تھیں۔ اور بڑے انہماک سے بنائی کر رہی تھیں اس کے قریب ایک گلاب کا پھول پڑا تھا۔ بغیر اپنے شغل میں رکاوٹ ڈالے وہ کبھی کبھی پھول کو دیکھ لیتی تھیں۔ چند گاہک بیٹھے پی رہے تھے۔ کچھ ادھر ادھر کھڑے یا بیٹھے تھے۔ یا گھوم رہے تھے۔ گرمی کافی تھی۔ مکھیوں کے ڈھیر شراب کے لالچ میں بڑے تجسس اور ہوس سے میڈم کے قریب

چھوٹے بڑے شراب کے گلاسوں میں ڈوب کر مر رہی تھیں ان کی موت سے زیادہ مکھیاں قطعی خائف نہ تھیں۔ جیسے وہ خود تو شاید ہاتھی یا اس قسم کے کسی جانور کی طرح محفوظ تھیں۔ اور خود اپنی دلیری، موت سے پہلے نہایت اطمینان سے مرنے والیوں کو بے حواس دیکھ رہی تھیں کس قدر احمق تھیں یہ مکھیاں! مگر اس موسم سرما کے روشن دن شاہی دربار کے حاضرین بھی ان سے کچھ کم بے حسی اور حماقت کا ثبوت نہیں دے رہے تھے۔

دروازے میں سے داخل ہوتے ہوئے ایک شخص کا سایہ میڈم پر پڑا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ سایہ کسی اجنبی کا ہے! اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے اپنی بائیں رکھی ہوئی اور گلابی پھول اٹھا کر بالوں میں لگا لیا۔

عجیب بات ہوئی۔ جیسے ہی میڈم نے پھول اٹھایا گاہک خاموش ہو گئے اور آہستہ آہستہ دوکان سے کھسک گئے۔

"صبح بخیر میڈم!" نو وارد نے کہا۔

"صبح بخیر موسیو!"

یہ تو اس نے زور سے کہا مگر بناؤ ٹالی اور اپنے دل میں دہرانے لگی۔

"آہ —! صبح بخیر — عمر چالیس کے قریب، قد تقریباً پانچ فٹ نو انچ، سیاہ بال۔ عام طور پر حسین چہرہ، سانولا رنگ، کالی آنکھیں، دبلا لمبا اور زرد چہرہ، عقابی ناک مگر سیدھی نہیں۔ عجیب انداز میں بائیں رخسار کی جانب جھکی ہوئی۔ جس کی وجہ سے چہرہ خرانٹ ہو گیا ہے۔ صبح بخیر — سب ایک ہی قطار میں!"

"برائے مہربانی ایک گلاس پرانی کونیاک قسم کی برانڈی اور ایک گھونٹ تازہ ٹھنڈا پانی عنایت کیجئے میڈم۔"

میڈم نے فرمائش پوری کر دی۔

"لاجواب کونیاک ہے یہ تو میڈم۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی تعریف کی گئی تھی۔ مگر میڈم ڈیفارج کو اس کی اصلی وجہ کا علم تھا اور وہ جھانسے میں نہیں آنے والی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا کہ "یہ کونیاک کی عزت افزائی ہے۔" اور پھر بنائی میں مشغول ہو گئی۔ ملاقاتی نے تھوڑی دیر اس کی انگلیوں کو دیکھا اور دوکان کا جائزہ لینے لگا۔

"بڑی پھرتی سے بنتی ہیں میڈم۔"

"مجھے عادت ہے بننے کی۔"

"نمونہ بھی اچھا ہے۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔" میڈم مسکرائی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یقیناً معلوم کر سکتا ہوں یہ کاہے کے لئے بنا رہی ہیں۔"

"وقت گذاری کے لئے۔" میڈم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی انگلیاں پھرتی سے چلتی رہیں۔

"استعمال کے لئے نہیں ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔ اگر کسی دن کام آ گیا ــــ تو استعمال کر لوں گی۔" میڈم نے سانس

کھینچ کر ذرا اکھڑے پن سے نخرہ کرتے ہوئے سر ہلایا۔

یہ کمال کی بات تھی۔ شاید سینٹ اینتھانی والوں کا مذاق میڈم کے بالوں میں پھول لگانے کے خلاف تھا۔

دو آدمی داخل ہوئے۔ شراب مانگنے ہی والے تھے۔ کہ انھوں نے میڈم کے سر کی سجاوٹ کو دیکھا اور ٹھٹک گئے۔ پھر یہ بہانہ کر کے کہ کسی دوست کی تلاش میں آئے تھے واپس لوٹ گئے۔ ان لوگوں میں سے بھی جو اس کے آنے کے وقت بیٹھے ہوئے تھے کوئی بھی نظر نہ آرہا تھا۔ وہ سب کے سب چلے گئے تھے۔ جاسوس کافی چوکنا ہو رہا تھا مگر وہ کوئی اشارہ بھی نہ پکڑ پایا۔ سب گاہک نہایت لاپروائی سے عزت کے مارے لوگوں کی طرح بالکل قدرتی انداز میں اٹھ کر کھسک گئے۔ اس پر ان کی کوئی گرفت نہیں کی جاسکتی تھی۔

"جان" کے حرفوں کو دھیان میں رکھ کر میڈم نے اپنی بنائی کے خانے کو جانچنے کے لئے گننا، اندھنے لگی۔ اس کی آنکھیں برساڈ پر جمی ہوئی تھیں "ذرا دیر اور ٹھیرے رہو۔ تو میں تمہارے جانے سے پہلے ہی برساڈ بھی بن لوں گی" اس نے اپنے دل میں سوچا۔

"آپ کے شوہر ہیں میڈم"

"جی ہاں"

"بچے"

"بچے نہیں"

"کاروبار کچھ اچھا نہیں چل رہا ہے؟"

"کاروبار مندا ہے۔ لوگ اتنے غریب ہیں!"

"آہ — بدنصیب — مصیبت زدہ لوگ! کتنے مظلوم ہیں جیسے کہ آپ کہہ رہی تھیں —"

"آپ کہہ رہے ہیں!" میڈم نے ناگواری سے تصحیح کی اور اس کے نام کے ساتھ کچھ اور ہی جوڑ لیا جو قطعی اس کے لیے [illegible] نہ تھا۔

"معاف کیجیے گا۔ کہا تو میں نے ہی لیکن آپ بھی قدرتی طور پر یہی سوچتی ہوں گی۔"

"یقیناً —"

"میں سوچتی ہوں!" میڈم نے زور دے کر کہا۔ "مجھے اور میرے شوہر کو یہ دکان چلانے کے لیے بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں سوچنے کی کہاں فرصت۔ بس ہم تو یہی سوچتے رہتے ہیں کہ گزر کیسے ہو۔ بس ہم تو اسی موضوع پر سوچتے ہیں۔ صبح سے شام تک یہ سوچنے میں وقت گزر جاتا ہے تو ہم دوسروں کے لیے سوچ کر کیوں اپنا دماغ خراب کریں۔ خوب — میں اور دوسروں کے لیے سوچوں۔ نہیں نہیں —"

جاسوس جو یہاں مخبری کرنے کے لیے آیا تھا۔ تاکہ یہاں سے کچھ دانے چگ کر کام بنائیں۔ اس نے اپنے خرانٹ چہرے پر اس ناامیدی کو نہ ابھرنے دیا جو یہاں کے حالات دیکھ کر دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے انداز سے یہ ظاہر کیا کہ وہ شوقین مزاج بات چیت میں مزہ لینے والا شخص ہے اور آہستہ آہستہ شراب کی چسکیاں لگاتا رہا۔

"گیسپرڈ جاتا ہے۔ میڈم بڑی نازیبا بات تھی۔ آہ۔ بے چارہ گیسپرڈ!" اس نے بڑی ہمدردی سے [illegible]۔

"تو پھر اگر آپ اپنے کاموں کے لئے چاقو استعمال کریں گے تو انھیں اس کا زیادہ محتاط رہنا چاہئے۔ اسے معلوم تھا ان کی اس عیاشی کی کیا قیمت ہو گی۔ اور اسے کو ادا کرنی پڑی۔" میڈم نے نہایت اطمینان سے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"بے شک یقیناً ہے" جاسوس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ اس کی آواز میں کچھ حصہ غم و غصہ کا تھا۔ ہمدردی کے جذبات تملا رہے تھے جس سے اس کا چہرہ اور مسخ ہو گیا تھا۔ "کسی سے ذکر نہ کیجئے لیکن یقین ہے کہ اس محلے میں اس غریب انسان کے لئے لوگوں کے دلوں میں بہت ہمدردی ہے اور لوگ خفا ہیں۔"

"اچھا؟" میڈم نے سادگی سے پوچھا۔

"کیا ایسا ضرور ہے؟"

"وہ دیکھئے میرا شوہر آگیا۔" میڈم ڈیفارج نے کہا۔

جیسے ہی شراب کی دکان کا مالک دروازے میں داخل ہوا۔ جاسوس نے اپنی ٹوپی چھو کر نہایت تپاک سے مسکرا کر کہا۔

"صبح بخیر جیکوس۔"

ڈیفارج رک کر اسے احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نظروں کے سامنے جاسوس ذرا کچھ سا گیا۔ لہذا اس نے ذرا دھیمی آواز اور نیم مردہ مسکراہٹ سے دہرایا۔

"صبح بخیر جیکوس!"

"آپ کو دھوکا ہوا ہے موسیو۔ آپ مجھے کسی دوسرے کے دھوکے میں مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ میرا نام نہیں۔ میرا نام تو ارنسٹ ڈیفارج ہے۔" ڈیفارج نے کہا۔

"وہ ایک ہی بات ہے۔ صبح بخیر۔" جاسوس ذرا اور شرمندہ پڑ گیا۔ مگر اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"صبح بخیر!" ڈیفارج نے رکھائی سے جواب دیا۔

"آپ تو تھے نہیں۔ میں خوش قسمتی سے آپ کی بیوی سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں۔ یہاں سینٹ انٹائن میں غریب گیسپرڈ کی المناک موت پر بہت غصہ اور ہمدردی محسوس کی جا رہی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔"

"مجھ سے تو کسی نے نہیں کہا۔ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم۔" ڈیفارج نے سر ہلا کر کہا۔

یہ کہہ کر وہ میز کے پیچھے چلا گیا اور اپنی بیوی کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس شخص کو دیکھنے لگا جس کے وہ دونوں دشمن تھے۔ اور نہایت خوشی اور اطمینان سے گولی سے مار دینا پسند کرتے۔

جاسوس اپنے پیشے میں ماہر تھا۔ اس نے اپنا بے توجہی کا انداز نہیں بدلا۔ اور اطمینان کے اپنا چھوٹا سا گلاس ختم کر کے تازہ پانی کا گھونٹ لیا۔ اور ایک اور گلاس کونیاک کی فرمائش کی۔ میڈم نے اسے گلاس انڈیل کر دیا۔ بنائی اٹھا کر بننے لگی اور ایک گیت بھی ساتھ ساتھ

گنگنانا شروع کر دیا۔

شاید مجھ سے زیادہ اس محلے کو تم جانتے ہو" ڈیفارج نے کہا۔

"قطعی نہیں۔ مگر امید ہے کہ جان جاؤں گا۔ مجھے یہاں کے غریب باشندوں سے از حد دلچسپی ہے۔"

"اوہ" ڈیفارج بڑبڑایا۔

"آپ سے گفتگو کر کے موسیو ڈیفارج۔ مجھے خیال آیا کہ آپ کے نام کے ساتھ مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا" جاسوس نے کہا۔

"واقعی" موسیو ڈیفارج نے انتہائی بے توجہی سے کہا۔

"ہاں واقعی مجھے معلوم ہے کہ جب ڈاکٹر مینٹ رہا ہوئے تھے تو آپ نے جو ان کے پرانے نوکر ہیں۔ انھیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ آپ کے سپرد کر دیے گئے تھے دیکھئے نا مجھے تمام حالات معلوم ہیں"

"واقعہ بھی یہی تھا" اس کی بیوی کی اچٹتی الفاتیہ اس سے چھوگئی اور اس نے اشارے سے اسے یہ سمجھا دیا کہ وہ اس بات کا جواب ضرور دے مگر بہت اختصار سے۔ ویسے وہ بڑی لاپرواہی سے گنگنائے جاری تھی۔

"ان کی بیٹی تمہارے ہی پاس آئی تھی۔ اور تمہاری ہی حفاظت سے وہ ان کو نکال کر لے گئی۔ اس کے ساتھ وہ بھورے کپڑوں والے صاحب بھی تھے۔ کیا نام تھا ان کا۔ وہی چھوٹا سا وگ پہنے!"

"ڈارنی۔ انگلستان کی موجودہ شاہی کے ایجنٹ سے" جاسوس نے کہا۔

"ڈارنے، ڈارنے" مادام ڈیفارج نے دہرایا۔

"بڑی دلچسپ چیز یاد آئی۔ انگلستان میں ڈاکٹر مینیٹ اور ان کی بیٹی سے میں واقف تھا۔

واہ اچھا!"

"آپ کو ان کے متعلق کچھ اطلاع نہیں ملتی" جاسوس نے کہا۔

"نہیں" ڈیفارج نے کہا۔

"بلکہ ہم ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنتے۔ پہلے ان کے آرام سے پہنچنے کی خبر ملی پر دو ایک خط اور آئے پھر شاید وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور ہم اپنی مشکلوں میں پڑ گئے اس کے بعد کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی" مادام بیچ میں بولی۔

"قطعی ایسا ہی ہوا ہوگا میڈم۔ ان کی شادی ہو رہی ہے" جاسوس نے کہا۔

"شادی ہو رہی ہے۔ وہ تو اتنی خوبصورت تھی کہ کبھی کی شادی ہو جانا چاہئے تھی۔ تم انگریز لوگ بہت سرد مزاج ہوتے" میڈم نے کہا۔

"اچھا آپ جانتی ہیں کہ میں انگریز ہوں؟"

"تمہاری زبان سے تو معلوم ہوتی ہے اور جیسی کی زبان ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے ویسا ہی آدمی بھی ہوتا ہے" میڈم نے جواب دیا۔

اسے یوں پہچانے جانے میں قطعی کوئی عزت افزائی نہ محسوس ہوئی مگر اس نے ہنس کر بڑی ہوشیاری سے بات پلٹ دی۔ شراب ختم کر کے اس نے کہا۔

وہاں مس بینٹ کی شادی مورہی ہے۔ مگر کسی انگریز سے نہیں۔ ایسے انسان سے ہورہی ہے جو اسی کی طرح فرانس میں پیدا ہوا تھا۔ اور بے چارا گیسپرڈ اس ذکر پر یاد آجاتا ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہوا۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ وہ جس شخص سے شادی کررہی ہے وہ اس مارکوئیس کا بھتیجا ہے جس کی وجہ سے گیسپرڈ کو اتنی بلندی پر لٹکا دیا گیا۔ وہ انگلینڈ میں نام بدل کر رہتا ہے اب وہ مارکوئیس نہیں ہے۔ اس کا نام وہاں مسٹر چارلس ڈارنے ہے ڈارنے اس کی ماں کے خاندان کا نام ہے۔"

میڈم نہایت مستعدی سے بنتی رہی۔ مگر اس خبر نے اس کے شوہر کو ہلا کر رکھ دیا اس نے بہت آڑلی۔ پائپ لگانے میں مشغول ہوگیا۔ مگر جاسوس ایسا بھی گیا گزرا نہ تھا۔ کہ اس کی حالت کا اندازہ نہ لگا پاتا۔ وہ سمجھ گیا اور اپنے دماغ میں اس بات کو محفوظ کر لیا۔

ایک تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ اسی کو اس نے غنیمت سمجھا۔ ویسے کوئی گاہک بھی نہیں آرہا تھا جس سے کچھ اور معلوم کرنے کی ہمت ہوتی۔ اس لئے اس نے جو کچھ پیا تھا اس کے پیسے ادا کئے۔ اور چلتے چلتے نہایت نرمی سے کہہ گیا کہ اسے امید ہے کہ موسیو اور میڈم ڈیفارج سے پھر ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔ جب وہ سینٹ انتائن کے بیرونی حصہ میں چلا گیا تب بھی کچھ دیر تک میاں اور بیوی اس خیال سے ویسے ہی بیٹھے رہے کہ کہیں وہ واپس نہ پلٹ آئے۔

"کیا یہ سچ ہوسکتا ہے جو کچھ اس نے مس بینٹ کے بارے میں کہا۔" ڈیفارج نے نیچی آواز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جیسے کہ وہ کہہ رہا تھا۔ اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید غلط ہو مگر ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو۔" میڈم نے اپنی ابرو میں خفیف سا تناؤ پیدا کر کے کہا۔

"اگر سچ ہے تو ___" ڈیفارج کہنے لگا۔ پھر رک گیا۔

"اگر سچ ہو تو کیا؟" بیوی نے دہرایا۔

"اور اگر وقت آگیا۔ ہم فتح کے اس لمحے تک زندہ رہے تو مجھے امید ہے کہ اس کی خاطر قسمت اس کے شوہر کو فرانس سے باہر ہی رکھے گی۔"

"اس کے شوہر کی قسمت اسے وہیں لے جائے گی۔ جہاں اسے جانا ہے اور اسی خاتمہ پر لے جائے گی جہاں اس کا خاتمہ برا ہے۔ بس اتنا تو میں جانتی ہوں" میڈم نے سکون سے کہا۔

"مگر کتنی عجیب بات ہے۔ خاص طور پر اب کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اس کے باپ کے اور خود اس کے لئے اتنی ہمدردی محسوس کرنے کے بعد اس کے شوہر کا نام تمہارے ہاتھوں اس کتے جاسوس کے نام کے ساتھ لکھا ہے۔ جو ابھی ہمارے پاس سے گیا ہے!" ڈیفارج نے خوشامد سے اپنی بیوی سے کہا تاکہ وہ اس سے اس بات کا اقرار کروائے۔

"جب وہ وقت آئے گا تو اس سے بھی عجیب باتیں ہوں گی۔ دونوں نام یہاں موجود ہیں اور دونوں اپنی ذاتی صفات کی وجہ سے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے" میڈم نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر اس نے بنائی لپیٹ دی۔ گلاب کا پھول سر پر بندھے رومال میں سے نکال لیا۔ یا تو سینٹ انٹائن کو غیب سے خبر مل گئی تھی کہ قابل اعتراض سجاوٹ اتار دی گئی۔ یا لوگ تاک میں تھے کہ کب میڈم پھول اتارے۔ اور خطرے کے ختم ہونے کا اعلان ہو۔ کیونکہ جیسے ہی پھول اترا

سینٹ اینٹائن کے رہنے والے دبے پاؤں شراب کی دوکان میں داخل ہوگئے اور خراٹے نے کی روزمرہ کی چہل پہل دوبارہ بحال ہوگئی۔

شام کو موسم کے حالات کے مطابق سینٹ اینٹائن کے باشندے اندر سے باہر نکل آیا کرتے تھے۔ اور دروازوں کی چوکھٹ پر کھڑکیوں کے کنارے گندی گلیوں اور صحنوں میں تازہ ہوا کھانے آ بیٹھے۔ میڈم ڈیفارج اپنی بنائی لئے ان کے درمیان ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے پاس ایک مبلغ کی طرح ٹہلتی پھرتی۔ اس جیسی اور بھی کئی ناقدری ہستیاں تھیں۔ سب عورتیں بنائی کرتیں۔ وہ بیکار کی چیزیں بنا کرتیں۔ گر یہ دستکاری کھانے پینے کا بدل تھا۔ جبڑوں اور معدے کا کام ہاتھ کرتے تھے۔ اگر سوکھی ماری انگلیاں بیکار رہتیں۔ تو خالی پیٹ کی پکار اور بھی ناقابل برداشت ہوجاتی۔

مگر انگلیوں کے ساتھ آنکھیں بھی چلتی تھیں ۔اور دماغ بھی۔ اور میڈم جب عورتوں کے ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ کے پاس جاتی تو تینوں طاقتوں کی رفتار تیز ہوجاتی۔

اس کا شوہر اپنے دروازے پر کھڑا پائپ پیتا اور اسے عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھتا اور کہتا۔

"ایک عظیم عورت! ایک طاقتور عورت! شاندار عورت! خوفناک حد تک شاندار عورت!"

اندھیرا بڑھتا گیا۔ اور پھر گرجے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ شاہی محافظوں کے نقارے پر چوٹ پڑی اور عورتیں بنتی رہیں۔ بنتی رہیں۔ تاریکی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیک

دوسرے قسم کی سیاہی بھی بڑھتی آرہی تھی۔ جب فرانس کے گلے پر [illegible] پڑ جائے گا [illegible] پگھلا کر گرجتی ہوئی توپیں ڈھالی جائیں گی۔ جب یہ نقارے مظلوم کی [illegible] کرنے کیلئے بجائے جائیں گے وہ رات آرہی تھی جب ان کی آواز اتنی ہی طاقتور ہوگی، جتنی کہ خوشی، آزادی اور زندگی کے تقاضوں کی بھرپور آواز ہو سکتی ہے۔ ان عورتوں کے قریب جو بیٹھی سلائی بن رہی تھیں بہت کچھ سمٹ کر جمع ہو رہا تھا۔ ان کے اپنے وجود اس عمارت کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ جو ابھی بنی نہ تھی۔ جہاں وہ بیٹھی مسلسل بن رہی تھیں اور گرتے ہوئے سر گن رہی تھیں۔

تیرھواں باب

"ایک رات"

غروب آفتاب کا منظر کبھی اتنا شاندار نہ ہوا ہوگا۔ جتنا اس شام کو تھا۔ جب ڈاکٹر اور اس کی بیٹی سوہو کے خاموش کونے میں پیڑ کے نیچے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ چاند نے لندن پر اتنی نرم و نازک کرنیں نچھاور کی تھیں جیسی پانی پر جو ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ پیڑ کی پتیوں میں سے چھن چھن کر پڑ رہی تھیں۔

اگلے دن لوسی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے اپنی کنوارپنے کی آخری شام اپنے باپ کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور دونوں اکیلے اس پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔

"پیارے ابا — آپ خوش تو ہیں؟"

"ہاں — میری بچی!"

گو وہ دونوں رات دیر سے بیٹھے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔ جب کافی روشنی تھی تب مجھ بلوری نے اپنا کام یاد کیا اور حسب معمول باپ کو پڑھ پڑھ کر سنایا۔ روزانہ ان ڈگلو رابنسن سے وہ اس پیڑ کے نیچے اپنے باپ کے پاس وقت گذارا کرتی تھی۔ مگر آج کا دن معمولی دن نہ تھا۔ اور نہ کوئی چیز اسے بہلا سکتی تھی۔

"اور میری آج بہت خوشی ہوئی ابا۔ وہ محبت جو خدا نے میرے اور چارلس کے دل میں ایک دوسرے کے لئے پیدا کی ہے میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے اگر میری زندگی اس کے بعد بھی آپ کی خدمت کے لئے وقف نہ رہتی اور اگر ہماری شادی کے چند گلیوں کا فاصلہ نہ میرے اور آپ کے درمیان ہوتا تو میں آپ کو بتا نہ سکتی۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا اور میرا ضمیر کتنی ملامت کرتا۔ حالانکہ اب بھی —"

پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

اداس چاندنی میں اس نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر سر ان کے سینے پر لٹکا دیا۔ چاندنی تو ہمیشہ اداس ہی ہوتی ہے مگر سورج کی روشنی بھی انسان کی زندگی کی روشنی کی طرح طلوع اور غروب کے وقت اداس ہو جاتی ہے۔

"عزیز اور پیارے ابا — اب آخری دفعہ بتا دیجئے۔ کیا آپ کو پورا پورا یقین ہے کہ میری زندگی میں کوئی بھی نئی محبت آجائے۔ کوئی نیا فرض مجھ پر عائد ہو جائے تو بھی آپ کی

فرمانبرداری اور خدمت گذاری میں کمی نہیں آئے گی۔ کوئی چیز ہمارے درمیان حائل نہیں ہو گی۔"

اس کے باپ نے نہایت پر مسرت لہجے میں کہا جو بلاشبہ بناوٹی نہیں تھا۔

"قطعی یقین ہے پیاری بیٹی ـــ بلکہ اس سے بھی زیادہ مجھے تو یہ یقین ہے کہ اب میرا مستقبل جتنا تابناک ہے ـــ اس سے پہلے کبھی اتنا روشن نہ تھا۔"

"اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے ابّا تو ـــ"

"یقین کرو جان پدر۔ واقعی یہ سچ ہے۔ ذرا غور کرو یہ کتنا قدرتی عمل ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ تم نوجوان اور فرمانبردار ہو۔ تم کیا جانو کہ کبھی کبھی مجھے کتنی فکر ہوا کرتی تھی کہ کہیں تمہاری زندگی میری خدمت میں تباہ نہ ہو جائے۔"

اس نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر انھوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"ہاں کہیں برباد نہ ہو جائے۔ میری بچی کی زندگی برباد نہیں ہونا چاہیئے۔ تم بے غرض محبت کرنے والی بیٹی ہو۔ تم سوچ ہی نہیں سکتیں کہ میرا دماغ کتنا اس بات پر پریشان رہا کرتا تھا۔ خود اپنے دل سے پوچھو اگر تمہاری مسرتوں کی تکمیل نہ ہوتی تو میں کیسے خوش رہ سکتا تھا۔"

"ابّا۔ اگر میں نے چارلس کو کبھی نہ دیکھا ہوتا تو میں آپ کے ہی ساتھ کتنی خوشی سے زندگی گذار دیتی۔"

اس نے انجانے طور پر اعتراف کر لیا کہ اگر وہ چارلس سے نہ ملتی تو ـــ مگر اب وہ

چارلس سے مل چکی تھی ۔ اور اس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی تھی ۔ وہ اس کے اس بھول پن پر مسکرا پڑے ۔

" میری پیاری بیٹی ۔ مگر تم ملیں اور چارلس سے ملیں ۔ اگر وہ چارلس نہ ہوتا تو کوئی دوسرا ہوتا ۔ اگر کوئی دوسرا نہ ہوتا تو یہ میری زندگی کا سب سے عظیم المیہ ہوتا کیونکہ پھر میں ہی اس کی وجہ ہوتا ۔ اور میری زندگی کا تاریک حصہ ــــ میرے وجود سے آگے بڑھ کر تمہارے اوپر سایہ ڈال دیتا "

ڈارنے کے مقدمہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے باپ کو ان دکھوں کی طرف اشارہ کرتے سنا ۔ جو انھوں نے جھیلے تھے ۔ ان الفاظ نے اسے عجیب طرح سے متاثر کیا اور وہ عرصہ تک انکے اثر کو نہ بھلا سکی ۔

" وہ دیکھو " بوڑھے کے ڈاکٹر نے چاند کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا " میں اپنے قید خانے کی کھڑکی سے اس کی طرف دیکھا کرتا تھا ۔ اس وقت مجھے اس کی روشنی برداشت نہ ہوتی تھی ۔ میں اس کی طرف دیکھا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ یہ چاند اس دنیا پر چمک رہا ہے ۔ جو مجھ سے چھوٹ چکی ہے اور میں اپنا سر قید خانہ کی دیوار سے ٹکرایا کرتا تھا ۔ میں اسے دیکھا کرتا تھا اور میری دماغی حالت اتنی ابتر اور ناقص ہو جاتی تھی کہ میں تخیل میں اس پر آڑی لکیریں کھینچا کرتا تھا ۔ پھر سیدھی لکیریں کھینچا کرتا تھا ۔ اس وقت میرا دماغ بالکل خالی ہو جاتا تھا " انھوں نے اپنے تھکے ہوئے اور بوجھل انداز میں چاند کی طرف دیکھ کر کہا " اور یہ لکیریں دونوں سمت سے بیس ہی ہوا کرتی تھیں اور بیسویں لکیر بڑی مشکل سے سماتی تھی "

ان کی باتیں سن کر لوسی کے جسم میں عجیب طرح کی سنسناہٹ پھیل گئی۔ وہ جس طرح اپنے گذشتہ دکھوں کا ذکر کر رہے تھے اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ صرف اپنی موجودہ مسرتوں کا گذشتہ دل آزاریوں سے موازنہ کر رہے تھے ؛ چاند کی طرف دیکھ کر میں ہمیشہ اس بچہ کا خیال کیا کرتا تھا جو ابھی رحم مادر میں ہی تھا۔ اور جس سے میں جدا کر دیا گیا تھا۔ بچہ زندہ پیدا ہوا یا ماں کے غم نے اسے مار ڈالا کیا وہ ایک بیٹا ہوگا جو ایک دن اپنے باپ کا بدلہ لے گا۔ (ایک وقت قیدخانہ میں ایسا بھی گذرا ہے جب انتقام کی خواہش ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
شاید اس بیٹے کو اپنے باپ کی کہانی بھی نہ معلوم ہو سکے اور شاید وہ یہ سوچے کہ اس کا باپ جان بوجھ کر اپنی مرضی سے غائب ہو گیا۔ اور شاید وہ لڑکی ہو جو ایک دن عورت بن جائے ؛

وہ ان کے اور قریب آئی اور ان کے گالوں اور ہاتھ کو بوسہ دیا۔

"اپنے دماغ میں جو میں نے اپنی بیٹی کی تصویر بنائی تھی۔ وہ میرے وجود سے قطعی ناواقف تھی۔ میرا خیال اس کے لاشعور میں بھی نہیں ہوگا۔ سال بہ سال میں نے اس کی عمر کے سالوں کو جمع کیا۔ میں نے تخیل میں ایسے شخص سے اس کی شادی ہوتے دیکھی جسے میری قسمت کے بارے میں علم بھی نہیں۔ ساری دنیا مجھے بھلا چکی تھی۔ اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے نئی نسل کے لئے میرا عدم اور وجود برابر ہے ؛

"ابا۔ اس لڑکی کا ذکر آپ کی زبان سے سنکر ایسا لگ رہا ہے کہ میں ویسی ہی لڑکی ہوں ؛

"تم لوسی! آج جو اس چاند کے نیچے میرے اور تمہارے درمیان کھل کر باتیں ہو رہی ہیں

یہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوئیں کہ تم نے اپنی محبت اور رفاقت سے مجھے دوبارہ زندہ کیا اور مجھے ذہنی اور جسمانی صحت بخش کر اس قابل بنایا کہ میں کچھ محسوس کر سکوں۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہ وہ آپ کو بالکل نہیں جانتی۔ اور آپ کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔"

"ہاں مگر کبھی اس چاندنی میں جب اداسی اور خاموشی کا میرے دل پر ذرا مختلف طریقے پر اثر ہوتا تھا۔ وہ جذبہ جس کی بنیاد ہی رنج و غم پر ہو وہ سوائے ایک اداس آسودگی کے اور کسی قسم کا سکون نہیں پا سکتا۔ اس وقت میں سوچا کرتا تھا کہ وہ میری کال کوٹھری میں آ گئی ہے اور مجھے قلعہ کی چہار دیواری سے باہر نکال لائی ہے۔ بارہا میں نے یوں ہی اس کی شبیہہ چاندنی میں دیکھی تھی۔ جیسے آج تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ فرق اتنا تھا کہ میں اسے کبھی آغوش میں نہیں لے سکا۔ وہ جنگلے اور دروازے کے بیچ میں کھڑی نظر آتی تھی۔ مگر یہ تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں اس بچی کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"وہ ـــــ وہ پرچھائیں۔ تخیل کی بنائی ہوئی تصویر۔"

"نہیں ـــــ یہ بالکل دوسری ہی شبیہہ تھی۔ وہ ہمیشہ میرے الجھے ہوئے دماغ کے سامنے موجود رہتی۔ مگر جنبش نہ کر سکتی تھی۔ وہ واہمہ جس کا میرا دماغ پیچھا کیا کرتا تھا وہ بالکل مختلف اور حقیقت سے قریب تھا۔ اس کی صورت شکل کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ماں کی شکل پر گئی ہو گی۔ مگر اس میں بھی وہی شباہت تھی جو تم میں ہے۔ مگر بالکل یہی نہیں تھی سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نہیں لوسی یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے ان الجھی

ہوئی باریکیوں کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے قید تنہائی بھگتی ہو۔"

انھوں نے نہایت وثوق اور دلچسپی سے یہ باتیں کہیں اور اپنی گزشتہ زندگی کی چیر پھاڑ کی مگر بیٹی کبھی ہوسی کا خوف سے خون جمنے لگا۔" اور جب میری حالت نسبتاً پرسکون ہوا کرتی تھی۔ تب میں تخیل میں دیکھتا تھا کہ وہ چاندنی رات میں میرے پاس آئی ہے مجھے باہر لے جا کر بتا رہی ہے کہ اس کی پرمسرت شادی شدہ زندگی اس کے گم شدہ باپ کی یاد سے خالی نہیں۔ اس کے کمرے میں میری تصویر لگی ہے اس کی زندگی خوشیوں ہنگاموں اور مصروفیتوں سے پُر ہے مگر اس پر اس کے باپ کی اندوہناک زندگی کا سایہ موجود ہے۔"

"میں آپ کے تخیل کی وہی بچی تھی۔ آپ کے تخیل کی بچی کی طرح ہی تھی ابا۔ اتنی قابل تعریف تو نہیں مگر جہاں تک محبت کا سوال تھا میں آپ کے تخیل کی بیٹی سے کم نہ تھی۔"

"وہ مجھے اپنے بچے بھی دکھاتی تھی۔ اور وہ سب میرے بارے میں سن چکے تھے اور انھیں مجھ سے ہمدردی کرنا سکھایا گیا تھا۔ جب وہ کسی سرکاری قید خانے کے پاس سے گزرتے تھے تو اس کی نفرت انگیز دیواروں سے دور دور چلتے تھے اور اس کی سلاخوں کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کرتے تھے۔ مگر وہ مجھے کبھی آزاد نہیں کرا سکتی تھی۔ تخیل میں مجھے یہ سب کچھ دکھا کر واپس لے آتی تھی۔ مگر آنسو بہہ جانے سے مجھے راحت مل جاتی تھی۔ اور میں گھٹنوں کے بل گر کر اسے دعائیں دیا کرتا تھا۔"

"مجھے امید ہے ابا کہ میں ویسی ہی بچی ثابت ہوں گی۔ ابا میرے جان سے پیارے ابا۔ آپ کل مجھے اسی طرح دعائیں دیں گے۔"

" لوسی آج میں ان تکلیف دہ باتوں کو اس لئے دہرا رہا ہوں کہ میں آج تم سے اتنا پیار کرتا ہوں کہ الفاظ اس کی ترجمانی نہیں کرسکتے۔ اور اپنی اس مسرت کے لئے خدا کا شکر گذار ہوں۔ میرے خواب خواہ وہ کتنے بھی بھرپور ہوتے تھے مجھے وہ مسرت کبھی نصیب نہیں ہوئی جو تمہارے ساتھ ملی ہے اور آئندہ بھی ملتی رہے گی "

انھوں نے اسے گلے لگا کر بڑی سنجیدگی سے خدا کو اس کا ضامن بنایا اور بڑے عجز سے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی رحمت کے صدقے اس جیسی بیٹی عطا کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گھر میں چلے گئے۔

شادی میں سوائے مسٹر لاری کے اور کسی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اور دلہن کی سہیلیوں میں بھی کوئی نہیں تھا سوائے بھاری وضع کی مس پروس کے۔ شادی سے ان کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ ڈاکٹر نے اوپر کے دو کمرے جن میں نظروں سے غائب رہنے والا پراسرار کرائے دار رہتا تھا اپنے گھر میں شامل کر لئے تھے۔ انھیں اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔ مختصر سی ضیافت کے موقع پر ڈاکٹر مینٹ بہت خوش تھے۔ کھانے پر تین اشخاص تھے اور تیسری مس پروس ہی تھیں۔ انھیں افسوس تھا کہ چارلس اس وقت موجود نہ تھا۔ انھوں نے مذاق میں شکایت بھی کرنی چاہی کہ وہ کسی شرارت کی وجہ سے غیر حاضر تھا۔ پھر بڑی محبت سے اس کا جام صحت پیا۔

اس طرح لوسی کو شب بخیر کہنے کا وقت آگیا اور دو جدا ہوگئے۔ رات گئے لوسی چپکے چپکے نیچے اتر کر ان کے کمرے میں گئی۔ اب بھی اس کے دل میں انجانے خوف سمائے ہوئے تھے۔

مگر ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر غافل سو رہے تھے۔ ان کے سفید خوش نما بال اطمینان سے تکیہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور ہاتھ آرام سے رضائی پر رکھے تھے۔ لوسی نے اپنی غیر ضروری شمع آڑ میں رکھدی۔ دبے پیر قریب آئی اور اپنے ہونٹ ان کے لبوں پر رکھدیئے۔ اور پھر جھک کر انھیں دیکھنے لگی۔

ان کے حسین چہرے پر سے قید و بند کے دکھوں کی لکیریں پرانی ہو کر جم چکی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی قوت ارادی سے انھیں چھپا لیا تھا۔ اور سوتے میں بھی معلوم ہوتا تھا۔ انھیں ان پر قابو حاصل ہے۔ اس رات کی عملداری میں کوئی بھی اتنا لاجواب اور حسین چہرہ نہ ہوگا جتنا ڈاکٹر مینٹ کا تھا۔ ان کی پیشانی پرسکون تھا۔ ایک انجانے حملہ آور کے خوف کے خلاف ضبط کی جد و جہد تھی۔

ڈرتے ڈرتے اس نے ان کے پیارے سینے پر ہاتھ رکھدیا۔ اور دعا مانگی کہ وہ ہمیشہ ان کی محبت اور وفاداری میں ایسی ہی ثابت قدم رہے۔ جیسی کہ اس کی دلی آرزو تھی۔ اور جو ان کے غم کی تلافی کے لئے لازمی تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ایک دفعہ اور ان کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اور واپس چلی آئی۔ سورج طلوع ہوا۔ درخت کی پتیوں کے سائے ان کے چہرے کو اسی طرح چوم رہے تھے۔ جس طرح ان کے لئے دعا کرتے وقت لوسی کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

اٹھارہواں باب

نو دن

شادی کا دن روشن اور چمکدار تھا۔ لوگ ڈاکٹر کے کمرہ کے دروازہ پر تیار کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اور چارلس ڈارنے اندر گفتگو میں معروف تے۔ حسین دلہن مسٹر لاری اور مس پروس گرجا جانے کو تیار کھڑے تھے۔ مس پروس بھی آہستہ آہستہ اب ہونے والی بات سمجھ کر اس شادی کے حق میں ہو گئی تھیں۔ صرف ایک خیال سے شادی کا سارا مزہ کرکرا ہوا جا رہا تھا۔ ان کے دل میں ابھی تک یہ خیال باقی تھا کہ اگر ان کا بھائی سالومن موجود ہوتا تو وہ ہر طرح سے بہتر دولہا ثابت ہوتا۔

" تو اس دن کے لئے میں تمہیں آبنائے کے اس پار لے کر آیا تھا۔ کیوں پیاری لوسی۔ کتنی ذرا سی بچی تھیں تم۔ خوب! اس وقت تو مجھے خیال بھی نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اس وقت مجھے قطعی پتہ نہیں تھا۔ کہ میں اپنے دوست چارلس ڈارنے پر کتنا بڑا احسان کر رہا ہوں"۔

مسٹر لاری نے کہا۔ دلہن کو دیکھ دیکھ کر ان کا جی ہی نہیں بھر چکتا تھا۔ وہ اس کے گرد چکر لگا لگا کر ہر زاویہ سے اس کے سادہ مگر خوبصورت لباس کی تعریف کر رہے تھے۔

"حماقت ہے! اس وقت بھلا آپ کو کیسے پتہ ہو سکتا تھا آپ اس وقت ان پر کیا احسان کر رہے تھے" عزیزہ باقی مس پروس نے کہا۔

"واقعی۔ مگر رو و مت" نرم مزاج مسٹر لاری بولے۔

"میں تو قطعی نہیں رو رہی ہوں۔ بلکہ آپ رو رہے ہیں" مس پروس نے کہا۔

"ارے واہ میری پروس میں رو رہا ہوں" اس عرصہ میں مسٹر لاری ان سے اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ کبھی کبھی مذاق کر بیٹھتے تھے۔

"ابھی آپ رو رہے تھے میں نے دیکھا اور اس میں کوئی تعجب کی بات تو نہیں — چاندی کے سامان کا جیسا تحفہ آپ نے دیا ہے اسے دیکھ کر کون آنسو روک سکتا ہے جب کل رات بکس آیا تو میں نے ہر کانٹے اور چمچے پر آنسو بہائے۔ یہاں تک کہ مجھے کچھ نہ دکھائی دیتا تھا" مس پروس نے کہا۔

"میں بے انتہا شکر گذار ہوں حالانکہ میرا قطعی ارادہ نہیں تھا کہ اس معمولی سے تحفہ کو کسی کی نظروں سے چھپایا جائے۔ بخدا یہ ایسا موقع ہے کہ انسان نے زندگی میں جو کچھ کھویا ہو اس پر داغ لگا دے۔ واہ واہ — ذرا سوچئے تو کہ قریب قریب پچاس برس کے عرصہ میں کسی مسز لاری کے وجود کا بھی امکان ہو سکتا تھا" مسٹر لاری نے کہا۔

"قطعی نہیں" مس پروس نے کہا۔

"تمہارا خیال ہے کہ مسز لاری کا وجود ممکن ہی نہیں تھا" مسٹر لاری نے پوچھا۔

"ہونہہ! آپ تو اپنے پالنے ہی سے کنوارے تھے" مس پروس نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے" مسٹر لاری نے مسکراتے ہوئے اپنا مختصر سا وگ سر پر جماکر کہا۔

"اور پالنے میں لٹانے سے پہلے ہی آپ کی تراش خراش بھر دکی زندگی کی مناسبت سے کی گئی تھی۔"

"تب تو میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی تھی۔ اور زندگی کا خاکہ تیار کرتے وقت مجھے بھی اپنی رائے کے اظہار کی اجازت ملنا چاہئے تھی۔ اچھا بس۔ میری پیاری لوسی" انھوں نے پیار سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "وہ لوگ کمرے سے نکلنے ہی والے ہیں اور میں اور مس پروس دو پر تکلف کاروباری انسانوں کی حیثیت سے تم سے کچھ کہنے سننے کا آخری موقع نہیں کھونا چاہتے۔ تم یہی تو سننا چاہتی ہو کہ تم جن لوگوں کے سپرد اپنے پیارے باپ کو کر جاؤگی وہ ان سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی تم خود کرتی ہو۔ پندرہ روز تک جب کہ تم وارو کشائر اور اس کے آس پاس رہوگی ان کی ہر طرح نگہداشت کی جائے گی۔ ان کے آگے ٹیلسن کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھی جائے گی۔ اس کے بعد جب وہ تمہارے اور تمہارے عزیز شوہر دونوں کے پاس پندرہ دن کی سیاحت کے لئے ویلز پہونچیں گے۔ تو تم انھیں خوش و خرم اور صحت مند پاؤگی۔ مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ مجھ جیسے بوڑھے بن بیاہے کو بھی جس کی بہترین تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں ایک بار چوم لینے دو پیاری بیٹی۔ پھر تو حقدار اپنا حق لینے آ ہی جائے گا۔"

چند لمحوں کے لئے انھوں نے اس کا حسین چہرا ہاتھوں میں لے کر آنکھوں میں بسائے ہوئے

پیشانی کے خاص اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ اور پھر چمکتا ہوا سنہرا سر اپنے چھوٹے بھورے بگ کے وگ سے بڑی محبت اور پیار سے لگالیا۔ یہ رسومات پرانی ہیں تو ہوا کریں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو شاید از آدم تا ایں دم یہی ہوتا رہا ہے

ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ چارلس ڈارنے کے ہمراہ باہر آگئے۔ ان کے چہرے پر موت کی سی زردی تھی۔ جب وہ دونوں اندر گئے تھے تو یہ حالت نہ تھی۔ اب تو ان کے چہرے پر کوئی رنگ ہی نہ تھا۔ مگر ان کے ضبط اور رکھ رکھاؤ میں وہی ٹھہراؤ تھا۔ گو یہ بات مسٹر لاری کی جہاندیدہ نظروں نے فوراً بھانپ لی۔ وہی پرانے خوف اور جھجک کا ایک ہلکا سا یرقانی جھونکا اس وقت انھیں چھو گیا ہے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کا بازو تھاما اور اسے لیکر نیچے اتر گئے۔ اور اس گاڑی میں سوار ہو گئے جو اس مبارک موقع کے لئے مسٹر لاری نے منگائی تھی۔ اور سب دوسری گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ قریب ہی چرچ میں جہاں اجنبی نظریں گھورنے کو موجود نہ تھیں چارلس ڈارنے اور لوسی مینٹ شادی کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔

ان ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے علاوہ جو اس چھوٹے سے گروہ کی مسکراہٹ کے درمیان آنکھوں میں ڈبڈبا آئے تھے کچھ بہت تابناک ہیرے دلہن کے ہاتھ پر بھی چمکنے لگے۔ یہ ہیرے ابھی وقت مسٹر لاری کی جیب کی تاریکی سے نکلے تھے۔ سب گھر واپس آگئے۔ ناشتہ کیا گیا اور بخیر و خوبی رخصتی کا وقت آگیا۔ گھر کے دروازے پر جدائی کے وقت پھر وہی سنہرے بال سفید بالوں سے گلے ملنے لگے۔ جو پیرس کی ایک کال کوٹھری میں غریب جوتے بنانے والے کے سفید بالوں میں گھل مل گئے تھے۔

جدائی کا منظر مختصر مگر بہت موثر تھا۔ مگر باپ نے اس کی ہمت بندھائی اور آخر کار اس کے ہاتھ جو اس کی گردن میں حمائل تھے جدا کر کے کہا۔

"لو چارلس اسے سنبھالو۔ یہ اب تمہاری ہوئی"

لوسی نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ گاڑی کی کھڑکی سے ہلایا اور وہ لوگ چلے گئے۔

یہ گوشہ چونکہ شارع عام سے دور تھا اس لئے بیکار اور متجسس اشخاص کی پہونچ سے باہر تھا۔ تیاریاں بہت سادگی اور خاموشی سے کی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر، مسٹر لاری اور مس پروس بالکل اکیلے رہ گئے تھے۔ جب وہ پرانے ہال کے آرام دہ اور خنک سائے میں پہونچے تب مسٹر لاری نے ڈاکٹر میں ایک اہم تبدیلی محسوس کی۔ جیسے دیوار پر منقش سنہرے ہاتھ نے ان پر ایک زہریلی اور کاری ضرب لگا دی ہو۔

قدرتی طور پر انھوں نے انتہائی ضبط سے کام لیا تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد جب ضبط کی ضرورت نہیں رہی تو کچھ نہ کچھ تبدیلی ان میں پیدا ہو جانے کا خیال تھا۔ مگر ان کی آنکھوں میں پھر وہی پرانا خوف عود کر آیا۔ جس نے مسٹر لاری کو پریشان کر دیا۔ اور جب وہ اوپر گئے تو ویسے ہی گھبرا کر بار بار اپنا سر پکڑے کھوئے کھوئے انداز میں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کو اس حالت میں دیکھ کر مسٹر لاری کو شراب کی دوکان کا مالک ڈیفارج اور تاروں کی چھاؤں میں گاڑی کا سفر یاد آگیا۔

"میرا خیال ہے" انھوں نے تھوڑی دیر پریشانی سے غور کرنے کے بعد مس پروس سے چپکے سے کہا "میرا خیال ہے۔ ہمیں فی الحال ان سے کوئی بات چیت نہ کرنی چاہئے۔ اور نہ

کسی طرح ان کے سکون میں مخل ہونا چاہئے ۔ مجھے ایک بار ٹیلسن جانا ہی پڑے گا ۔ مگر میں جاکر فوراً ہی لوٹ آؤں گا ۔ تب ہم انھیں دیہات کی طرف گاڑی میں لے جائیں گے ۔ وہیں کھانا کھائیں گے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

مسٹر لاری کے لئے ٹیلسن جانا آسان تھا مگر لوٹنا اتنا آسان نہ تھا ۔ وہاں انھیں دو گھنٹے لگ گئے ۔ جب وہ نوکر سے کچھ پوچھے بغیر سیدھے واپس لوٹے تو زینہ پر چڑھ گئے ۔ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف جاتے وقت وہ ہولے ہولے ٹھونکنے کی آواز سنکر ایک دم رک گئے ۔

" اوہ خدا ۔۔۔ یہ کیا قصہ ہے " انھوں نے چونک کر کہا ۔

مس پروس کا منہ فق تھا انھوں نے ان کے کان میں کہا ۔

" یا خدا ! یا میرے خدا ۔۔۔ سب تباہ ہو گیا ۔ اب میں اپنی ننھی بٹیا کو کیا جواب دوں گی ۔ وہ مجھے بھی نہیں پہچانتے جوتے بنا رہے ہیں "! مس پروس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا ۔

مسٹر لاری نے کچھ مس کراس کی ڈھارس بندھائی اور خود ڈاکٹر کے کمرے میں گئے ۔۔۔ بنچ روشنی کی طرف پھرائی گئی تھی ۔ ان کا سر ویسے ہی جھکا ہوا تھا جیسے سب سے پہلے انھوں نے انھیں جوتے بناتے دیکھا تھا ۔ وہ بے انتہا مشغول تھے ۔

" ڈاکٹر مینٹ ۔۔۔ عزیز دوست ڈاکٹر مینٹ ! "

ڈاکٹر نے ایک لمحہ کے لئے ان کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں کچھ تجسس اور کچھ مخاطب کئے جانے پر جھنجھلاہٹ تھی اور وہ پھر اپنے کام پر جھک گئے ۔

انھوں نے اپنا کوٹ اور واسکٹ اتار کر ایک طرف ڈال دی تھی۔ گریبان کھلا ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمیشہ یہ کام کرتے وقت کھلا رہتا تھا۔ بلکہ پھر وہی پرانی تھکان بڑھاپا اور مردنی چہرے پر واپس لوٹ آئی تھی۔ وہ سخت بے صبری سے محنت پر جٹے ہوئے تھے۔ جیسے درمیان میں کسی طریقہ سے کوئی مخل ہو گیا تھا۔

مسٹر لاری نے اس چیز کو دیکھا جو وہ بنا رہے تھے۔ وہی پرانی ناپ اور وضع کا جوتا تھا۔ انھوں نے قریب پڑا ہوا دوسرا جوتا اٹھا کر ان سے پوچھا "یہ کیا ہے"

"ایک نوجوان خاتون کا چہل قدمی کا جوتا۔ اسے بہت پہلے مکمل ہو جانا چاہیے تھا۔ اسے رکھ دو" بغیر اوپر دیکھے وہ بڑبڑائے۔

"مگر ڈاکٹر مینٹ — میری طرف دیکھئے"

انھوں نے وہی اپنے پرانے انکساری کے انداز میں بغیر کام روکے ہوئے اوپر دیکھا۔

"عزیز دوست آپ مجھے پہچانتے ہیں۔ پھر سوچئے — یہ آپ کا اصلی پیشہ نہیں۔ سوچئے عزیز دوست!"

لاکھ جتن کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولے۔ جب ان سے اوپر دیکھنے کو کہا جاتا تو وہ ایک لمحہ کیلئے نظریں اٹھاتے۔ مگر منھ سے انھوں نے ایک لفظ نہ کہا۔ خاموش وہ مسلسل کام پر جٹے رہے اور الفاظ کا کوئی اثر نہ تھا۔ جیسے ہوا میں بات تحلیل ہو جائے یا ایسی دیوار سے جا ٹکرائے جس میں بازگشت نہیں۔ بس تھوڑی سی امید کی گنجائش اس بات میں تھی کہ کبھی وہ بغیر کہے بھی پریشان ہو کر

نظریں اوپر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ ان کے اس رویہ میں ہلکا سا تعجب اور الجھن جھلکتی تھی جیسے وہ اپنے دماغ میں کچھ شبہات کی تشریح کر کے قائل ہو جانا چاہتے ہوں۔

مسٹر لاری کو فوراً دو چیزیں ضروری معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ لوسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے۔ دوسرے یہ کہ ان کے جان پہچان والوں کو بھی آگاہ نہ ہونے دیا جائے مس پروس کے مشورے سے انھوں نے فوراً یہ طے کیا کہ یہ بات سب سے کہدی جائے کہ ڈاکٹر کی طبیعت ٹھیک نہیں، اور چند روز مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اور از راہ مہربانی ان کی لڑکی کو بھی دھوکے میں رکھنے کے لیے مس پروس اسے خط میں لکھیں کہ ڈاکٹر اپنے پیشے کے سلسلہ میں باہر گئے ہوئے ہیں۔

نیز ان فرضی خطوں کا ذکر بھی کر دیا جائے جو ڈاکٹر نے لکھے ہیں۔ اور چند سطریں اس کے نام کی بھی اپنے قلم سے اس خط میں لکھدی ہیں۔

بہرحال ان تجاویز پر تو احتیاطاً عمل کرنا ہی تھا مسٹر لاری کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کے خود بخود ٹھیک ہو جانے کا انتظار کریں۔ اگر جلد ہی ان کے ہوش و حواس واپس آجائیں تو انھوں نے ایک اور بات سوچ رکھی تھی وہ یہ کہ وہ ڈاکٹر کی بیماری کی تشخیص کرائیں گے۔

صحت یابی کی صورت میں تشخیص کی آسانی کے لئے انہوں نے ڈاکٹر کا حتی الامکان چھپ کر بغور معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹیلس سے چھٹی لی اور ان کے کمرے میں کھڑکی کے پاس جم کر بیٹھ گئے۔

جلد ہی انھیں معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر سے بات کرنے کی کوشش فضول ہی نہیں ان کے لئے تکلیف دہ بھی ہے۔ کیونکہ جب ان سے بولنے کے لئے اصرار کیا جاتا تو وہ پریشان ہو جاتے پہلے ہی دن انھوں نے بات کرنے کا خیال چھوڑ دیا اور ان کے سامنے اس وہم کے خلاف خاموش بیٹھ کر احتجاج شروع کر دیا۔ جس میں وہ ڈوب گئے تھے۔ یا ڈوبتے جا رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے لکھتے یا پڑھتے رہتے اور ہر ممکن طریقے سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ ایک قید خانہ نہیں آزاد جگہ ہے۔

ڈاکٹر مینٹ کو جو کچھ بھی کھانے پینے کو دیا جاتا لے لیتے اور پہلے دن مسلسل کام کئے گئے۔ یہاں تک کہ اتنا اندھیرا ہوگیا کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور مسٹر لاری تو اس روشنی میں نہ لکھ سکتے تھے نہ پڑھ سکتے تھے۔ پھر بھی وہ آدھ گھنٹہ بعد تک کام پر لگے رہے۔ جب انھوں نے صبح تک کے لئے اوزاروں کو بیکار سمجھ کر ایک طرف رکھ دیا تو مسٹر لاری نے ان سے کہا۔

"باہر چلئے گا ؟"

انھوں نے اپنے پرانے انداز میں فرش پر دونوں طرف نظر ڈالی۔ اسی انداز میں اوپر دیکھا اور اسی پرانی آواز میں دہرایا۔

"باہر ؟"

"چہل قدمی کے لئے میرے ساتھ چلئے ـــ آخر کیوں نہیں"

انھوں نے نہ کوئی وجہ بتائی اور نہ کچھ جواب دیا۔ مگر مسٹر لاری نے سوچا اور سمجھ گئے ڈاکٹر شام کی دھندلی روشنی میں اپنے گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے ہاتھ میں سر تھامے بیٹھے کھونے

ہوئے انداز میں سوچ رہے تھے۔

"کیوں نہیں تجربہ کار درباری آدمی نے اس میں ہی اپنا فائدہ دیکھ لیا۔ اور وہیں قدم جمائیے۔

مس پروس اور مسٹر لاری نے رات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان پر نظر رکھنا شروع کی۔ قریب کے کمرے سے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آکر انھیں دیکھ جاتے لیٹنے سے پہلے ڈاکٹر دیر تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ مگر جب وہ لیٹے تو فوراً سو گئے۔ صبح اٹھتے ہی وہ فوراً سیدھے اپنی بنچ کی طرف گئے اور کام پر جٹ گئے۔

دوسرے دن مسٹر لاری نے بڑے اخلاق سے انھیں سلام کیا اور ان موضوعات پر بات کرنے لگے۔ جو ان دونوں کی مشترکہ دلچسپی کا باعث تھے۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر یہ ظاہر ہو گیا کہ جو کچھ کہا گیا وہ انھوں نے سنا اور اس کے متعلق الجھے ہوئے انداز میں سوچا بھی۔ اس سے مسٹر لاری کی ہمت بڑھ گئی انھوں نے دن میں کئی بار مس پروس کو اپنا کام لے کر کمرے میں آنے کو کہا۔ ان سے لوسی کے متعلق اور اس کے والد کے متعلق جو وہاں موجود تھے ایسے بے تکلفی سے باتیں کیں جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی ہو۔ یہ سب کچھ بغیر کسی دکھاوے کے کیا گیا۔ زیادہ دیر تک بلکہ اتنی دیر تک بھی نہیں کہ وہ پریشان ہو جاتے اور یہ دیکھ کر مسٹر لاری کا محبت بھرا دل ہلکا ہو گیا۔ کہ اس درمیان میں انھوں نے کئی بار متوجہ ہو کر دیکھا اور جیسے انھیں اپنے کمرے میں کسی بے ترتیبی اور گڑبڑ کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

جب رات ہو گئی تو مسٹر لاری نے پھر ان سے پوچھا۔

"عزیز ڈاکٹر ـــ باہر چلیں گے ؟"

اور انھوں نے پھر وہی جواب دیا ـــ "باہر"

"ہاں ـــ میرے ساتھ چہل قدمی کے لیے ـــ آخر کیوں نہیں"

اس دفعہ جب وہ کچھ جواب نہ پا سکے تو وہ دکھاوے کے لئے باہر چلے گئے ۔ اور ایک گھنٹہ تک غیر حاضر رہے ۔ اس عرصے میں ڈاکٹر کھڑکی والی نشست پر جا بیٹھے تھے ۔ مگر مسٹر لاری واپس آئے تو جلدی سے اپنی بنچ پر واپس آ گئے ۔

وقت بڑی سست رفتاری سے گذر رہا تھا اور مسٹر لاری کی امیدیں تاریکی میں ڈوبتی گئیں ۔ ان کے دل کا بوجھ پھر بڑھ گیا ۔ اور یہ بوجھ بڑھتا ہی گیا ۔ دن بدن بڑھتا گیا تیسرا دن آیا اور گذر گیا ۔ پھر چوتھا اور پانچواں ۔ پانچ دن ، چھ دن ، سات دن ، نو دن ! ناامیدی کی سیاہی بڑھتی گئی ۔ دل کا بوجھ بھاری پہ بھاری ہوتا گیا مسٹر لاری نے یہ دن بڑی پریشانیوں میں گذارے ۔ رازداری کامیاب ثابت ہوئی ۔ اور لوسی کو کچھ خبر نہ تھی ۔ وہ خوش تھی ۔ مگر مسٹر لاری کی نظروں سے بات پوشیدہ نہ تھی ۔ کہ جوتے بنانے والے کے ہاتھ جو شروع میں اتنے مشاق نہ تھے اب زیادہ پھرتی اور خوفناک مہارت حاصل کرتے جا رہے تھے اس سے پہلے وہ کبھی اتنے کام میں غرق نہیں ہوئے تھے اور نہ اتنے مشاق اور پھرتیلے تھے جیسے نویں شام کو نظر آ رہے تھے ۔

انیسواں باب

ایک رائے

پہرہ داری کرتے کرتے مسٹر لاری اپنی نشست پر سو گئے۔ دسویں صبح وہ یکایک چونک پڑے۔ ان کے کمرے میں جہاں وہ رات کو گہری نیند سوئے تھے دھوپ جگمگا رہی تھی۔ انھوں نے اپنی آنکھیں ملیں اور جاگ اٹھے۔ مگر جاگ کر بھی انھیں شبہ ہو رہا تھا، کہ کہیں، وہ سو تو نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر کے کمرے میں جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ جوتے بنانے کی بنچ ایک طرف رکھی تھی۔ اور ڈاکٹر مینٹ کھڑکی کے پاس پڑھنے میں مشغول تھے۔ وہ ابھی تک اپنا صبح کا لباس پہنے تھے۔ اور ان کا چہرا جو مسٹر لاری صفائی سے دیکھ سکتے تھے گو زرد ہو رہا تھا مگر نہایت پرسکون اور درک و فراست سے منور تھا۔

جب مسٹر لاری کو اپنے جاگنے کا یقین ہو گیا تب بھی وہ کچھ لمحے اسی تذبذب میں رہے کہ یہ جوتے بنانے کا قصہ کہیں ان کے اپنے الجھے ہوئے دماغ کا خواب تو نہیں تھا کیا وہ اپنے دوست کو ان کے روزمرہ کے کپڑوں میں حسب معمول مطالعہ میں مشغول نہیں دیکھ رہے تھے اور کیا کوئی ایسی نشانی ان کے پاس تھی جس سے ثابت ہوتا کہ واقعی ان میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی جس کے نشان تو اب بھی ان کے چہرے پر نظر آرہے تھے۔

یہ سوال چند لمحوں کے لئے اٹھا اور انھیں تعجب اور الجھن میں ڈال گیا۔ اس کے بعد تو تصدیق ہو گئی کہ اگران تاثرات کا حقیقی سبب نہیں تھا تو وہ اپنے سے پوچھنے لگے کہ مسٹر جارڈس لاری آپ خود اس گھر میں کیوں موجود تھے۔ آپ کیسے پورا لباس پہنے ڈاکٹر مینٹ کے معائنہ کے کمرے میں سونے پرانی گہری نیند سو گئے اور صبح تڑکے ڈاکٹر کے دروازے پر کھڑے ان خیالات میں کیوں الجھ رہے تھے۔

ذرا سی دیر بعد مس پروس نے اگران کے کان میں آہستہ سے کچھ کہنا شروع کیا۔ اگر ان کے دل میں ذرا سا بھی شبہ رہ جاتا تو مس پروس کی باتوں سے وہ فوراً ختم ہو گیا ہوتا مگر اس وقت تک ان کا دماغ بالکل صاف ہو گیا تھا اور کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ انھوں نے رائے دی کہ ناشتہ تک یوں ہی وقت گذرنے دیں اور پھر ڈاکٹر سے ایسے ملیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں۔ اگر وہ قطعی ہوش و حواس میں نظر آئے تو مسٹر لاری نہایت احتیاط سے ان کی علالت کی تشخیص کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

مس پروس نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور بڑی احتیاط سے اس پر عمل کیا گیا مسٹر لاری کے پاس نہانے دھونے اور تیار ہونے کے لئے کافی وقت تھا۔ لہٰذا ناشتہ پر وہ سفید قمیص اور صاف ستھرا پتلون پہن کر میز پر گئے۔ حسب قاعدہ ڈاکٹر کو بلایا گیا اور وہ آ گئے۔ مسٹر لاری خوب سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر مینٹ کو احتیاط سے بتدریج حقیقت سے روشناس کرانا ہی ان کی صحت کے لئے مفید ہوگا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھے کہ ان کی پیاری بیٹی کی شادی کل ہی ہوئی تھی۔ مسٹر لاری نے باتوں باتوں میں شادی کی اصلی تاریخ، دن اور

مہینے کا ذکر اتفاقیہ طور پر کیا تو وہ سوچ میں پڑ کر گننے لگے اور کچھ بے چین سے ہو گئے۔ اب وہ ہر طرح سے بالکل ٹھیک اور پرسکون نظر آرہے تھے۔ کہ مسٹر لاری نے فیصلہ کیا کہ ان کی علالت کے بارے میں خود انہی کی رائے معلوم کی جائے۔ چنانچہ ناشتہ کے بعد جب برتن اٹھائے گئے اور وہ ڈاکٹر کے ساتھ اکیلے رہ گئے تو انھوں نے بہت جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔

"عزیز مینٹ میں ایک معاملے میں نجی طور پر تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔ ایک عجیب قسم کا مریض ہے جس میں مجھے بہت دلچسپی ہے۔ میرا مطلب ہے میرے لئے وہ مرض عجیب ہے ممکن ہے آپ کے پاس چونکہ طبی معلومات کا ذخیرہ ہے اس لئے اتنا عجیب نہ معلوم ہو۔"

ہاتھوں پر جب نظر پڑی تو ڈاکٹر نے وہ رنگ دیکھا جو کام کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پر چڑھ گیا تھا۔ اور بے چین اور پریشان ہو گئے۔ مگر غور سے سنتے رہے اس عرصہ میں وہ کئی دفعہ اپنے ہاتھوں پر نظر ڈال چکے تھے۔

"ڈاکٹر مینٹ" انھوں نے بڑی شفقت سے ان کا بازو چھو کر کہا "یہ کیس میرے ایک بہت عزیز دوست کا ہے۔ مہربانی کر کے ذرا غور سے سنئے اور میرے اس دوست اور خاص طور پر ان کی بیٹی کی خاطر ذرا اپنی رائے دیجئے ڈاکٹر مینٹ"

"اگر میں غلط نہیں سمجھا تو شاید کوئی دماغی صدمہ ---" ڈاکٹر نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں"

"تفصیل سے بتاؤ — کوئی تفصیل رہ نہ جائے" ڈاکٹر نے کہا۔

مسٹر لاری نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا مطلب سمجھ رہے ہیں اسلئے کہا۔

"ڈاکٹر مینیٹ یہ ایک پرانا صدمہ ہے جس کا اثر طویل عرصے تک رہا ہے بہت ہی سخت حادثہ جس سے جذبات اور احساسات متاثر ہوئے ہیں اور — جیسا کہ آپ کہہ سکتے ہیں دماغ متاثر ہوا ہے بہت گہرا اور جانگداز صدمہ۔ دماغ کی یہ چوٹ کتنی پرانی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ مریض خود وقت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسے ذہنی زخم کا کیس ہے جہاں مریض جب اچھا ہوگیا تو اسے یہ تو پتہ قطعی نہیں چلا کہ وہ کب اور کس طرح روبصحت ہوا۔ میں نے خود اس کی تفصیل بڑے انوکھے انداز میں بیان کرتے ہوئے سنا تھا۔ یہ ایک ایسا مریض ہے جو صحت ہونے کے بعد دوبارہ نہایت اچھی طرح دماغی محنت و مشقت کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے علاوہ جسمانی تکان بھی بالکل غائب ہوگئی۔ اور علم کے اس بیش بہا خزانے میں جو پہلے ہی سے کافی وسیع تھا اور اضافے ہوگئے! مگر بدقسمتی سے . . . بیماری پھر خفیف سی عود کر آئی۔"

"یہ دوسرا حملہ کتنے دن رہا؟" ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"نو دن اور نو راتیں"

"بیماری ظاہر کیسے ہوئی میرا قیاس ہے شاید۔ اس نے پرانے صدمے سے تعلق رکھنے والا کوئی مشغلہ پھر شروع کر دیا؟" ڈاکٹر نے ہاتھوں کو دیکھ کر کہا۔

"واقعہ یہی ہے"

"اچھا۔ کیا تم نے کبھی پہلے اسے اس مشغلہ میں غرق دیکھا تھا"؛ ڈاکٹر نے نہایت خاطر جمعی سے اور صاف مگر اسی طرح دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں ایک دفعہ دیکھا تھا۔"

"اور جب دوبارہ حملہ ہوا تو اس کی حالت بالکل پہلے جیسی تھی۔ یا کچھ فرق تھا۔"

"ہر طرح ویسی ہی پہلے جیسی تھی۔"

"تم نے اس کی بیٹی کا ذکر کیا تھا۔ کیا اس کی بیٹی کو اس دوسرے حملے کا پتہ ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات اس سے چھپائی گئی۔ اور آئندہ بھی راز ہی میں رہے گی۔ صرف مجھے اور ایک شخص کو معلوم ہے۔ جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"یہ تمہاری بڑی مہربانی تھی۔ تم نے بہت خیال کیا۔"

مسٹر لاری نے بھی ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

"اچھا مسٹر مینٹ۔ میں بے چارا کاروباری آدمی ٹھہرا۔ ان پیچیدہ اور مشکل معاملات کا مقابلہ کرنے کے لئے۔ جس سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں۔ مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے دنیا میں اور کوئی ایسا نہیں جس کی رائے کو آپ کی رائے پر ترجیح دے سکوں۔ مجھے بتائیے یہ مرض کیونکر عود کرتا ہے۔ اور کیا ابھی دوسرے حملے کا خطرہ بھی ہے۔ کیا نئے حملوں کو روکنے کی کوئی ترکیب ہے۔ اگر پھر حملہ ہو تو کیا علاج کرنا چاہئے۔ بار بار اس مرض کے عود کر آنے کی کیا وجہ ہے۔ میں اپنے دوست کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے ترکیب معلوم

ہو جائے تو میں ہر طرح سے اپنے دوست کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس مرض کی روک تھام کیسے کرنا چاہئے۔ اگر آپ اپنی ذہانت علم اور تجربہ کی مدد سے مجھے صحیح راستہ پر لگا سکیں تو میں سب کچھ کر سکوں گا۔ بغیر بوجھے اور بغیر رہنمائی کے میں بہت کم مدد کر سکتا ہوں۔ براہ کرم مجھ سے اس معاملہ پر گفتگو کیجئے۔ ذرا تفصیل سے سمجھائیے۔ اور بتائیے میں کس طرح کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں" مسٹر لاری نے اپنے مخصوص نرم اور محبت بھرے لہجہ میں پوچھا۔

جب یہ پرجوش الفاظ ڈاکٹر مینٹ نے سنے تو وہ خاموش بیٹھے سوچ میں ڈوب گئے۔ مسٹر لاری نے بھی گفتگو جاری رکھنے پر اصرار نہیں کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ دوسرا حملہ جو ہوا جس کا ابھی تم نے ذکر کیا وہ مریض کے نقطہ نظر سے غالباً اتنا خلاف امید نہ تھا" ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے خاموشی کو توڑا۔

"کیا اسے پہلے ہی سے اس کا ڈر تھا" مسٹر لاری نے ہمت کر کے پوچھا۔

"بہت زیادہ" انھوں نے بے اختیار لرز کر کہا "تم نہیں جانتے کہ ایسے خوف کے مریض کے دماغ پر کتنا بوجھ ہوتا ہے اور جو تکلیف اس کا دم گھونٹے دیتی ہے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا مشکل ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں قطعی ناممکن ہے"

"کیا جب اس پر دوبارہ اس پریشانی کا حملہ ہوا اور وہ کسی کو اپنا رازدار بنا لے تو اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا"

"ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔ مگر میں نے جیسا ابھی کہا۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے بلکہ بعض

معاملات میں تو میں کہتا ہوں قطعی ناممکن ہے "

دونوں طرف تھوڑی سی خاموشی رہی۔ پھر مسٹر لاری نے نرمی سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھکر کہا "اچھا آپ اس حملے کی کیا وجہ بتا سکتے ہیں"

"مجھے یقین ہے کہ پرانے واقعات کی یادیں اور خیالات کی الجھنیں جن کی وجہ سے یہ مرض لاحق ہوا تھا۔ حیرت انگیز طریقہ پر دوبارہ تازہ ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کچھ نہایت پریشان کن واقعات حد سے زیادہ تکلیف دہ طریقہ پر دوبارہ نئی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دماغ میں عرصے سے کبھی نہ کبھی ان کے دوبارہ یاد دلائے جانے کا خوف چھپا ہوا ہو۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ میں قوت برداشت پیدا کرے۔ مگر بیکار۔ شاید برداشت کرنے میں جو طاقت صرف ہوئی اس نے اسے اور بھی برداشت کے ناقابل بنا دیا"

"کیا اسے یاد رہے گا کہ اس حملہ کے درمیان اس پر کیا بیتی" مسٹر لاری نے جھجک کر دریافت کیا۔

ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں۔ قطعی نہیں"

"اب کچھ مستقبل کے بارے میں" مسٹر لاری نے اشارۃً کہا۔

"مستقبل کے متعلق میں بہت پُرامید ہوں۔ کیوں کہ خدا نے اپنے رحم و کرم سے اسے اتنی جلدی صحت بخشی اس لئے مجھے بہت کچھ امید ہے۔ وہ عرصے سے ان واقعات کے رونما ہونے کا

منتظر تھا۔ جس کا خوف اور بوجھ اس کے دماغ کو ابھارنے اور بے دیکھے واہموں کی یورش سے تھکائے دے رہا تھا۔ وہ ان حالات کے آگے پست ہوگیا۔ مگر جب طوفان پھٹ پڑا اور پھر گذر گیا تو میں یہی امید کروں گا کہ برا وقت بھی گذر گیا۔"

"خوب۔ یہ بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ میں بہت شکر گذار ہوں" مسٹر لاری نے کہا۔

"میں بہت شکر گذار ہوں" ڈاکٹر نے سر جھکا کر وہی الفاظ بڑے ادب سے دہرائے۔

"دو اور باتیں ہیں جن کے بارے میں صلاح لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیا عرض کر سکتا ہوں؟" مسٹر لاری نے اجازت مانگی۔

"ضرور۔ اس سے بہتر خدمت تم اپنے دوست کی اور کیا کرسکتے ہو؟" انھوں نے مسٹر لاری کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مطالعہ کا بہت شوقین ہے۔ غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے پیشہ کے فن اور علم میں دلچسپی لیتا ہے۔ تجربات اور دوسری باتوں میں غرق رہتا ہے۔ تو کیا وہ ضرورت سے زیادہ کام کرتا ہے؟"

"نہیں۔ میرے خیال میں اس کے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اسے ہمیشہ کوئی شغل چاہئے۔ کچھ یہ بات پیدائشی ہوگی۔ اور کچھ اس ذہنی مرض کا نتیجہ ہوگی۔ اس کے دماغ کو جتنی کم صحت مند مصروفیت ملے گی وہ اتنا ہی زیادہ غیر صحت مند شغل کی طرف راغب ہوگا شاید خود کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اس نے یہ بات دریافت کی ہے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ اس کے ذہن پر ضرورت سے زیادہ بار تو نہیں پڑتا؟"

"کامل یقین ہے۔"

"میرے عزیز مینٹ۔ اگر اس وقت اس کے اوپر بہت بار پڑ رہا ہو تو ۔۔۔"

"عزیز لاری! میرا خیال ہے ایسا ہونا مشکل ہے۔ ایک طرف بڑا شدید وزن پڑ گیا تھا اب توازن درست کرنے کے لئے دوسری طرف بھی وزن پڑنا چاہیئے۔"

"معاف کیجئے گا۔ کاروباری آدمی ہوں اور جان کو آجاتا ہوں۔ فرض کیجئے اگر واقعی اس پر کام کا بہت بوجھ پڑ رہا ہے تو مرض کے پھر سے عود کر آنے سے یہ ظاہر ہو جائے گا۔"

"قطعی نہیں۔ میں سوچتا ہوں بالکل نہیں۔" ڈاکٹر مینٹ نے پورے وثوق سے کہا۔ "سوائے خاص واقعات کے ردعمل کے اور کسی چیز سے حملہ کا خوف نہیں۔ اور اب تو میرا خیال ہے کوئی غیر معمولی حادثہ ہی پھر وہی ردعمل پیدا کر سکتا ہے جس سے وہ مرض عود کر آئے۔ جو کچھ درپیش آچکا ہے اور اس سے صحت پالی ہے تو ایسی صورت میں مجھے یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ پھر دل کے ان نازک تاروں کو کوئی خوفناک جھٹکا لگے گا۔ مجھے بھروسہ ہے اور قریب قریب پختہ یقین ہے کہ مرض کے عود کر آنے کا اب کوئی موقع محل باقی نہیں رہا۔"

وہ ایک باخبر انسان کی حیثیت سے یہ کہہ رہے تھے۔ اور جانتے تھے کہ دماغ کی نازک مشین کا توازن ایک ذرا سے واقعہ سے بگڑ جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ ان کے الفاظ میں اس شخص کے تجربہ کا وثوق تھا۔ جو خود سب کچھ برداشت کرنے کے بعد دوبارہ اپنے حواس پر قابو پا چکا ہو اس یقین کو متزلزل کر کے ان کے دوست کا قطعی ارادہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے یقین سے زیادہ اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔ اور اب وہ اپنے دوسرے اور آخری سوال پر آئے۔ انھیں اس کا

ذکر سب سے زیادہ مشکل معلوم ہوا۔ لیکن جو باتیں مس پروس سے ہوئی تھیں اور جو کچھ ان دنوں میں دیکھا تھا اسے مدنظر رکھ کر اس کا ذکر کرنا بھی لازمی تھا۔

"میرے وہ دوست اس ذہنی علالت کے دوران میں جس سے اب انھیں خوش قسمتی سے افاقہ ہوگیا ہے وقت گذاری کے لئے فرض کیجئے آہن گری کے پیشہ کو اختیار کئے ہوئے تھے ہم یہ بھی فرض کئے لیتے ہیں کہ ان برے دنوں میں وہ لوہار کا کام ایک چھوٹی سی بھٹی کی مدد سے کیا کرتے تھے۔ مثال ہی کے طور پر فرض کر لیجئے کہ وہ پھر اس بھٹی میں کام کرتے ہوئے پائے گئے تو کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے۔ کہ وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں"، مسٹر لاری نے کھنکار کر کہا۔

ڈاکٹر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ کا سایہ کر لیا اور گھبراہٹ میں اپنے جوتے سے زمین کو ٹھکرانے لگے۔

"اس معاملے میں آپ کو مشورہ دیتے مشکل محسوس ہو رہی ہے"، مسٹر لاری نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ کافی دلچسپ سوال ہے ۔ اور میں سوچتا ہوں" انھوں نے اپنا سر ہلایا اور خاموش ہو گئے۔

"دیکھو۔ اس بدنصیب انسان کے دماغ کی انتہائی اندرونی کیفیت کی سلسلہ وار تشریح بہت مشکل ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب اسے بڑی شدت سے اس کام کی خواہش تھی۔ اور جب وہ کام اسے ملا تو بڑی تقویت پہونچی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے اس کے دکھ میں بہت کمی واقع ہو جاتی تھی۔ اس نے دماغ کی الجھنوں پر دبا ڈکم کرنے

کے لئے انگلیوں کو کام میں الجھا دیا ۔ اور جوں جوں مشق بڑھتی گئی انگلیوں کی تیزی نے دماغی دکھ کی شدت کو دھیما کر دیا ۔ اس وجہ سے وہ ان اوزاروں کو ہمیشہ کے لئے اپنی پہونچ سے دور کر دینے کی ہمت نہیں کر پاتا ۔ اور اب بھی جب کہ مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے اوپر اتنا بھروسہ ہے جتنا کبھی بھی نہ تھا ۔ اور وہ خود اپنے بارے میں نہایت وثوق سے گفتگو بھی کر سکتا ہے ۔ مگر اب بھی یہ خیال کہ شاید اس کو ان چیزوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہو اور وہ انھیں نہ پا سکے ۔ اس کے دل میں اچانک خوف پیدا کر دیتا ہے اس کا یہ خوف ایک گمشدہ بچے کے دل کے وہم کی طرح ہے ۔" ڈاکٹر نے تھوڑی دیر الجھن میں خاموش رہنے کے بعد کہا ۔

جب مسٹر لاری کی طرف انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ اپنے الفاظ کی مجسم تصویر معلوم ہو رہے تھے ۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔ واضح رہے کہ میں صرف ایک سیدھا سادھا کاروباری آدمی ہوں جس کا واسطہ صرف پاؤنڈ، شلنگ اور بینک کے نوٹوں ہی سے پڑتا ہے تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان چیزوں کے وجود سے اس خیال کا وجود بھی قائم رہتا ہے ۔ اگر وہ چیزیں وہاں سے ہٹا دی جائیں تو میرے عزیز مینٹ کیا وہ خیال بھی نہیں مٹ جائے گا ۔ قصہ مختصر کیا اس بھٹی کو وہاں رکھنا اس وہم کو بڑھاوا دینا نہیں ہے ؟"

پھر ایک دفعہ خاموشی چھا گئی ۔

"تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ ایک زمانے سے میرے ساتھ ہے ۔" ڈاکٹر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ۔

"مگر میں تو اسے نہ رکھتا" ڈاکٹر کو پریشان دیکھ کر مسٹر لاری کی اور ہمت بڑھ گئی "میں تو اس کے خلاف کی رائے دیتا۔ مجھے صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ مہربانی سے مجھے اجازت دیدیجئے۔ اس کی بیٹی ہی کی خاطر سہی۔ میرے عزیز دوست!"

وہ کشمکش جوان کے دماغ میں برپا تھی۔ اسے دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی۔

"بیٹی کی خاطر ان چیزوں کو ہٹا سکتے ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے مگر ایسے وقت ہٹاؤ جب وہ موجود نہ ہو۔ تاکہ دوست اور غمخوار کی جدائی کا احساس ذرا دیر سے ہو"

مسٹر لاری اس پر فوراً راضی ہو گئے۔ انھوں نے دیہات میں دن گذارا اور ڈاکٹر بالکل ٹھیک ہو گئے۔ تین دن تک وہ قطعی تندرست رہے اور چوتھے روز وہ لوسی اور اس کے شوہر کے پاس چلے گئے۔ انکی خاموشی کے بارے میں جو احتیاط برتی گئی تھی وہ مسٹر لاری نے انھیں بخوبی سمجھا دی تھی۔ انھوں نے لوسی کو اسی بنا پر خط لکھا تھا۔ اس لئے اسے کوئی شبہ نہیں ہوا تھا۔

جس رات وہ گھر سے روانہ ہوئے مسٹر لاری ایک کلہاڑی، آری، ہتھوڑی، اور چھینی لیکر ان کے کمرے میں گئے۔ مس پروس روشنی لئے ان کے ساتھ تھیں۔ وہاں دروازے بند کر کے مجرموں کی طرح مسٹر لاری نے کاریگر کی بنچ کے پرزے اڑا دیئے۔ مس پروس ڈھنی دکھا رہی تھیں گویا وہ کسی کے قتل میں مدد دے رہی تھیں۔ یوں بھی اپنی خرانٹ صورت شکل سے وہ اس جرم کے لئے ناموزوں نہیں تھی۔ تہہ تیغ کئے ہوئے ڈھانچے کو نذر آتش کرنے کی رسم

فوراً باورچی خانے میں ادا کی گئی۔ اوزار، جوتے اور چمڑہ باغ میں دفن کر دیا گیا۔ ایماندار انسانوں کو ہر قسم کی تباہی سے نفرت ہوتی ہے۔ مس پروس اور مسٹر لاری جب اس توڑ پھوڑ میں مصروف تھے انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی خوفناک جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

بیسواں باب

"ایک التجا"

جب دولہا دلہن گھر لوٹے تو سب سے پہلے سڈنی کارٹن مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ ان دونوں کی واپسی کے چند گھنٹوں کے بعد وہ وارد ہوئے تھے۔ ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی تھی۔ لیکن چارلس ڈارنے نے پہلی بار دیکھا کہ ان میں پر خلوص دوستی کا جذبہ کچھ زیادہ نمایاں ہے۔

کارٹن ایسے وقت کے منتظر تھے جب ان کی گفتگو کوئی دوسرا نہ سن سکے۔ وہ ڈارنے کو موقع پا کر دریچے کے پاس لے گئے اور کہا۔

"مسٹر ڈارنے میں چاہتا ہوں آئندہ ہم دونوں دوست رہیں۔"

"دوست تو ہم اب بھی ہیں۔"

"آپ رسمی گفتگو کے طور پر یہ کہہ رہے ہیں لیکن میرا مطلب رسمی گفتگو سے نہیں ہے۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں دوست رہیں بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ۔"

چارلس ڈارنے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور انھوں نے خوش مذاق اور دوستی کے لہجے میں وضاحت چاہی۔

"بخدا اپنی بات کا مطلب دوسرے کو سمجھانے سے خود سمجھنا آسان ہے۔" کارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا: "پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہے ایک دفعہ میں نے معمول سے بہت زیادہ پی لی تھی۔"

"ہاں مجھے وہ یاد ہے۔ وہ یادگار موقع جب آپ نے مجھے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا کہ آپ نشے میں ہیں۔"

"مجھے بھی وہ سب کچھ یاد ہے وہ ساری دکھ بھری یادیں میرے دل پر کندہ ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ جب میری زندگی کے دن ختم ہو چکیں گے تو میری ندامت کو بھی ملحوظ رکھا جائیگا گھبرایئے نہیں ــــ میں کوئی وعظ کرنا نہیں چاہتا۔"

"گھبرانے کی کیا بات ہے اب اس قدر خلوص سے کام لے رہے ہیں۔ بھلا میرے لئے گھبرانے کا یہ کونسا موقع ہے۔"

"اس وقت جب میں نشے میں چور تھا ہمیشہ سے زیادہ نشے میں چور تھا۔" کارٹن نے لاپروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ جیسے وہ عادتاً یہ حرکت کر رہا ہو۔ گفتگو جاری رکھی۔ میں اس وقت کیسی مہمل بکواس کر رہا تھا۔ کبھی میں یہ کہتا کہ آپ کو پسند کرتا ہوں۔ کبھی کہتا

آپ کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ وہ باتیں بھول جائیں۔"

"عرصہ ہوا میں بھول چکا ہوں۔"

"آپ رسمی گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن مسٹر ڈارنے میرے لئے بھولنا اتنا آسان نہیں ہیں نے وہ باتیں فراموش نہیں کی ہیں اور نہ آپ کے سرسری جواب کی وجہ سے انھیں فراموش کر سکتا ہوں۔"

"اگر آپ کے خیال میں وہ سرسری جواب تھا تو میں معافی چاہتا ہوں۔ مسٹر ڈارنے بولے۔" میرا منشاء سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ایک معمولی بات کو آپ اتنی اہمیت نہ دیں یقین کیجئے جب ایک شریف آدمی آپ کو باور کراتا ہے کہ وہ بات گئی گذری ہو چکی۔ اس میں رکھا ہی کیا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ اس دن آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا۔ اس کے بعد کیا اور کچھ یاد رہ سکتا ہے۔"

"جہاں تک اس احسان کا تعلق ہے۔" کارٹن نے کہا۔" وہ تو صرف کاروباری ہتھکنڈا تھا۔ اس وقت میں نے آپ کو بچانے کی خاطر ذاتی کوشش تھوڑی کی تھی۔ میرے الفاظ پر غور کیجئے — اس وقت — میں گذشتہ دنوں کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"آپ اپنے احسان کی اہمیت کو گھٹا رہے ہیں۔" ڈارنے نے جواب دیا۔" اچھا مجھے آپ کے اس سرسری جواب سے بحث نہیں۔"

"یقین مانئے۔ دل کی بات ہے۔۔۔ خیر میں موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔۔۔ میں آئندہ دوستی کا ذکر کر رہا تھا۔ اب آپ مجھ سے واقف ہو چکے ہیں۔ میری ناقابل اصلاح طبیعت سے

واقف ہو چکے ہیں۔ اگر اس میں کچھ شبہ ہے تو اسٹرائیور سے پوچھ لیجئے۔ وہ اس کی تصدیق کریں گے۔"

"بغیر ان کی مدد کے میں خود رائے قائم کر سکتا ہوں۔"

"درست، یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ میری زندگی ایک آوارہ کتے کی زندگی ہے۔ نہ میں نے کوئی اچھا کام کیا ہے اور نہ کبھی اس کی توقع ہے۔"

"توقع کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

"میں کہتا ہوں۔ اور آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہئے۔ اچھا اگر آپ کو ایک بیکار اور بدنام شخص کا وقت بے وقت آنا جانا گوارا ہو تو میں اس قسم کی آمد و رفت کی اجازت چاہتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک نکما آدمی بلکہ اگر میں آپ سے مشابہ نہ ہوتا تو کہتا ایک فضول چیز جو کبھی کام آتی تھی مگر اب نہ کار آمد ہے نہ خوش نما آپ کے مکان میں تھوڑی دیر کے لئے موجود ہے۔ میں اس اجازت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔ شاید سال میں دو چار مرتبہ آسکوں۔ لیکن مجھے یہ اطمینان رہے گا کہ جب چاہوں آ تو سکتا ہوں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ خاص امتیاز حاصل رہے گا۔ ڈارنے۔ بہت بہت شکریہ۔ کیا میں آپ کی اجازت کے حوالے سے یوں بے تکلف آجا سکتا ہوں۔"

"یقیناً کارٹن۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ وہاں سے رخصت ہوتے ہی سڈنی

پھر وہی کھوکھلا انسان نظر آرہا تھا۔ جو وہ پہلے دکھائی دیتا تھا۔

شام کو سڈنی کارٹن کی غیر موجودگی میں چارلس ڈارنے نے مس پروس، ڈاکٹر مینٹ اور مسٹر لاری سے مختصر اُدھر کی گفتگو کا تذکرہ کیا اور سڈنی کارٹن کو بے پروائی اور لاابالی پن کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا۔ لیکن اس کے لہجے میں تلخی یا مخالفت کا جذبہ نہیں تھا۔

اسے کیا خبر تھی یہ گفتگو اس کی حسین نوجوان بیوی کے دل پر نقش ہو جائے گی۔ لیکن جب وہ تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں اس سے ملا تو وہ اس کے انتظار میں متفکر کھڑی تھی۔

"بہت فکرمند ہو؟" ڈارنے نے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں پیارے چارلس۔ آج رات کو تھوڑی سی فکر لاحق ہے"۔ اپنے شوہر کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ کھوج لینے کے انداز میں اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"کیا ہے میری پیاری لوسی؟"

"وعدہ کرو کہ ایک سوال مجھ سے کبھی نہ کرو گے؟"

"وعدہ کروں! میں اپنی پیاری کے لئے، وہ کون سی چیز ہے جس کا وعدہ نہیں کروں گا"

ایک ہاتھ سے وہ سنہرے بالوں کو چہرے سے ہٹا رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ لڑکی کے سینے پر تھا۔ جہاں ایک ننھا سا دل اس کی محبت میں دھڑک رہا تھا۔

"پیارے چارلس۔ تمہیں مسٹر کارٹن کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کہنا چاہیے۔ وہ بے چارے اس سے زیادہ عزت و قدردانی کے مستحق ہیں"

"ڈارلنگ۔ کیوں یہ کس لئے؟"

"یہی ایک سوال تمہیں مجھ سے نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن میرا گمان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ عزت کے مستحق ہیں"

"منظور۔۔۔ اب یہ بتاؤ جان من کیا طور طریق اختیار کروں۔"

"ان کے ساتھ ہمیشہ فیاضی کا برتاؤ کرنا چاہئے نہ کہ ان کی غیبت۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ ان کے پہلو میں دل ہے جس پر گہرے زخم لگے ہیں۔ وہ خود چھپاتے ہیں مگر میں ان زخموں سے خون بہتے دیکھ چکی ہوں"

"مجھے اس خیال سے کوفت ہو رہی ہے کہ میں نے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے" چارلس ڈارنے نے کہا "میں نے کبھی ان کے بارے میں برا خیال نہیں کیا"

"پیارے شوہر یہ درست ہے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ کوئی چیز انھیں راہ پر نہیں لا سکتی اصلاح کی شاید ہی کوئی امید باقی ہو۔ نہ ان کا کردار بدل سکتا ہے نہ ان کی قسمت۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان میں صرف اچھے کاموں کی صلاحیت ہی نہیں۔ بڑے کارناموں کی قابلیت بھی موجود ہے"

ایک بدنصیب انسان پر اپنے پرخلوص اعتقاد کے فرط بخش سے اس کا چہرا چمکنے لگا۔ اور وہ اس قدر حسین نظر آ رہی تھی کہ اس کا شوہر گھنٹوں گھورتا رہتا تو عجب نہیں تھا۔

وہ اس سے لپٹ گئی اور اپنا سر اس کے سینے پر ٹکائے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کہنے لگی "آہ میرے پیارے یہ نہ بھولو کہ ہم دونوں فرط مسرت سے کتنے نہال ہیں اور وہ بار مصیبت سے کتنا نڈھال"

اس التجا کا اس کے دل پر اثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور وہ کہنے لگا "میری جان میں ہمیشہ

یاد رکھوں گا۔ میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔"

وہ سنہرے سر پر جھک پڑا اور گلاب سے ہونٹوں پر بوسہ چسپاں کرتے ہوئے اسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ اگر ایک بیکس آوارہ گرد جو اس وقت اندھیری گلیوں میں بھٹک رہا تھا اس کے معصوم انکشاف کو سن لیتا۔ اور ان پیار بھری نیلی نازک آنکھوں میں شدت رحم سے ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ لیتا جنہیں شوہر کے بوسے خشک کر رہے تھے تو وہ آوارہ گرد انسان پھر ایک بار پکار اٹھتا۔

"اس دل نواز رحم دلی کے صلے میں خدا اس کو شاد و آباد رکھے۔"

اکیسواں باب

قدموں کی چاپ

لوگوں کا کہنا ہے کہ جہاں ڈاکٹر مینٹ رہتے تھے اس جگہ اکثر بازگشت کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اس گھر کے کسی خاموش گوشے میں لوسی ہر وقت اپنے باپ شوہر اور اپنی بوڑھی رفیقہ اور منتظمہ کے ساتھ اپنی زندگی کو محبت کے سنہری بندھن سے باندھنے میں مشغول رہتی۔ اس پرسکون اور پرمسرت زندگی کے اکثر لمحے اس گوشہ عافیت میں بسر ہوئے جہاں گذرے ہوئے برسوں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز اس سکوت میں خلل انداز نہ ہوتی۔

ابتدا میں شباب اور ازدواجی خوشیوں کے باوجود کبھی کبھی اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں اور کام ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ کیونکہ بازگشت کی آوازوں میں کوئی ایسی کیفیت تھی کہ وہ ایسی موہوم غیر محسوس اور ماورائی کیفیت جو اس کے جذبات کو بہت زیادہ ابھارتی۔ ایسے موقعوں پر وہ امید و بیم کی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتی۔ کبھی وہ ایسی محبت کا خواب دیکھتی جس سے وہ ابھی تک نابلد تھی۔ کبھی اسے یہ دھڑکا ہوتا کہ شاید اس محبت سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ زندہ نہ رہے۔ ان دور کی آوازوں میں اسے کبھی اپنی ہی جوان مرگی کے مزار پر قدموں کی آہٹ سنائی دیتی۔ اور وہ تصور میں اپنے شوہر کو ماتم کرتے ہوئے دیکھتی اور اس کی تنہا اور برباد زندگی پر اس کے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا۔

وہ زمانہ بھی گزر گیا اور ایک ننھی سی لوسی سے اس کی گود بھر گئی اور پھر آگے بڑھتے والی آوازوں میں اس کے ننھے قدموں کی چاپ اور اس کے بھولے بول سنائی دیتے۔ دور کی صدائیں کتنی ہی بلند کیوں نہ ہوں پالنے کے پاس کھڑی ہوئی نوجوان ماں کو تو صرف وہی پیاری آوازیں سنائی دیتیں۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب کہ گھر کے سائے میں ایک بچے کی ہنسی دھوپ کی طرح چمکنے لگی۔ اور بچوں کے آسمانی دوست نے جسے اس نے اپنی تکلیف میں پکارا تھا اس بچے کو حسب عادت اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اس کے لئے مقدس خوشی کا سامان مہیا کر دیا۔

لوسی گھر والوں کو اپنی محبت کے سنہری بندھن سے باندھنے میں مصروف تھی۔ بغیر اپنی فوقیت جتائے وہ ان کی زندگیوں کو اپنی خدمت کے تانے بانے سے سنوار رہی تھی۔

گذرتے ہوئے برسوں کی صدائے بازگشت میں دوستانہ اور تشفی بخش آوازوں کے سوا لوسی کو کچھ اور نہیں سنائی دیتا تھا۔ اس کے شوہر کے قدم مضبوط تھے اس کے باپ میں بھی وہی ثابت قدمی تھی۔ اور وہ دیکھو مس پروس کو۔ وہ ایسی لگتی تھی جیسے ایک سرکش گھوڑا جسے منھ میں لگام دیکر کوڑوں سے درست کیا گیا ہو۔ نتھنوں سے آوازیں نکالتا ہوا باغیچے کے درختوں کے نیچے پاؤں سے زمین کھود رہا ہو۔

چند آوازیں غمناک بھی تھیں لیکن ان میں بھی تلخی اور بے رحمی نہ تھی۔ اس وقت بھی جب وہ سنہرے بال ایک ننھے سے پچکے ہوئے چہرے کے گرد تکیے پر ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا: پیارے ابّا۔ پیاری امّی۔ مجھے آپ دونوں سے بچھڑنے کا دُکھ ہے۔ اور اپنی اچھی بہن سے جدا ہونے کا افسوس۔ مگر مجبور ہوں۔ میرے لئے بلاوا آگیا ہے۔ مجھے جانا ہے"۔ اس وقت بھی جب روح پرواز کر رہی تھی تو نوجوان ماں کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں میں محض کرب ہی نہیں تھا۔ اُن ننھی جانوں پر روک ٹوک مت رکھو۔ وہ میرے آسمانی باپ کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ اے میرے آسمانی باپ!!"۔ کیسے مبارک الفاظ ہیں۔

غرض ایک فرشتے کے پروں کی سرسراہٹ دوسری آہٹوں میں گھل مل گئی۔ جو زمین ہی کی نہیں آسمانی آوازیں بھی تھیں۔ باغ کی ایک چھوٹی سی قبر پر چلنے والی ہواؤں کی سانسیں بھی ان میں گھل مل گئیں اور لوسی کو دونوں قسم کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ جب ننھی لوسی مضحکہ خیز طریقے پر صبح کے کام کرتی یا اپنی ماں کی تپائی پر بیٹھ کر گڑیوں کو کپڑے پہناتی اور دو شہروں

کی زبانوں کو گڈمڈ کر کے باتیں بگھارتی تو وہ دونوں قسم کی صدائیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے موسم گرما میں رتیلے کنارے پر سوئی ہوئی موجوں کی سانسیں۔ دھیمے سروں میں اپنے راگ الاپتی ہیں۔

فضا میں کئی آوازیں گونجتیں لیکن ان میں بہت کم سڈنی کارٹن کے قدموں کی آہٹیں شامل رہتیں۔ سال میں شاید پانچ چھ مرتبہ وہاں اس کا گذر ہوتا ہو۔ حالانکہ اسے پوری اجازت تھی کہ وہ جب جی چاہے آئے۔ وہ وہاں شام گذار کر چلا جاتا۔ جیسے سابق میں اس کی عادت تھی۔ لیکن نشے کی حالت میں کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھتا اور ایک بات اس کے بارے میں فضاؤں کی سرگوشیوں میں سنائی دیتی۔ ایک خاموش صدائے بازگشت جو صدیوں سے ایسے معاملات میں سنائی دیتی رہی ہے۔

کسی مرد کو کسی عورت سے سچی محبت ہو اور اس محبت کی ناکامی کے بعد بھی جب وہ دوسرے کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں بن گئی ہو اور اس شخص کے پاکیزہ اور پرخلوص جذبات میں فرق نہ آئے تو ایسی تمام صورتوں میں اس کی محبوبہ کے بچے ہمیشہ اس کے گرویدہ رہیں گے۔ اور ان کے دلوں میں اس کے لئے رحم کا نازک جذبہ پیدا ہونا فطری امر ہے۔ وہ کونسے لطیف پوشیدہ احساسات بیدار ہوتے ہیں کسی صدائے بازگشت سے پتہ نہیں چلتا لیکن ایسا ہوتا ہے اور اس مرتبہ بھی ایسا ہوا۔ کارٹن پہلا اجنبی تھا جس کو دیکھ کر ننھی لوسی نے اپنے تروتازہ ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور یہ رشتہ برسوں قائم رہا۔ ننھا بچہ بھی بستر مرگ پر اس کو یاد کر رہا تھا "بے چارے کارٹن! میری طرف سے انھیں پیار کرو"

مسٹر اسٹرائیور قانون کے میدان میں دوسروں کو دھکے دیکر آگے بڑھ رہے تھے وہ ایک ایسے انجن کی مانند تھے جو گندلے پانی کو چیر کر نکلنے کی کوشش میں ہو۔ اوران کے کارآمد دوست اس کشتی کی طرح جو پیچھے بندھی ساتھ چلی آئے۔ اس قسم کی کشتی عموماً مشکلوں میں پھنستی اور ڈوبتی رہتی ہے اس لئے ہر وقت سڈنی کے سر سے پانی اونچا ہوجاتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے سہل انگاری کی عادت اس میں اپنی نااہلیت یا ذلت کے احساس سے زیادہ قوی تھی۔ اور وہ اسی پر قانع رہا۔ جس طرح گیدڑ کبھی شیر کے پیچھے لگا رہے۔ اسٹرائیور مالدار تھا اور ایک بانطمطراق بیوہ سے شادی کی تھی جس کے اولاد اور جائداد تھی۔ اس عورت کے تینوں بچوں میں ان کے پیڈنگ جیسے سروں کے سیدھے بالوں کے سوا کوئی اور چیز درخشاں نہیں تھی۔

ان کم سن شریف زادوں کے ساتھ مسٹر اسٹرائیور جن کے رونگ رونگ سے نخوت ٹپک رہی تھی چلے جا رہے تھے۔ وہ تینوں بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے آگے سو ہو کے ایک خاموش گوشے کی طرف بڑھے مسٹر اسٹرائیور نے لوسی کے شوہر کو دیکھتے ہی لڑکوں کو بطور شاگردوں کے پیش کرتے ہوئے کہا "ہیلو، ڈارنے۔ تمہاری شادی کی پکنک میں یہ تین پنیر بھری روٹیاں خوب رہیں گی"۔ اور جب ان تین پنیر بھری روٹیوں کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا۔ تو مسٹر اسٹرائیور غصے سے بھر گئے۔ اور بعد میں تینوں کمسن شریف زادوں کو سبق آموز لہجے میں نصیحت فرمانے لگے کہ وہ اس استاد کے بچے جیسے کھکاریوں کے غرور سے بچتے رہیں۔ انھیں مسٹر اسٹرائیور کو بھی لکچر پلانے کی عادت تھی۔ اکثر وہ شراب نوشی کے بعد کہا کرتے تھے کہ کس طرح مسز ڈارنے

انھیں گھیرنا چاہتی تھی۔ اور کس خوبی سے وہ اس کی چالبازیوں کا جواب اپنی چالاکی سے دیکر بال بال بچ گئے۔ اسٹرائیورے کے بعض واقف کار جن کا شاہی عدالت سے تعلق تھا۔ جب کبھی اس کے ساتھ شراب پیتے اور یہ سفید جھوٹ سنتے تو یہ کہہ کر اسے معاف کر دیتے کہ وہ اتنی بار اس دروغ کو دہرا چکا ہے کہ اب خود بھی اسے سچ سمجھنے لگا ہے۔ اگر یہ خیال صحیح تھا تو پھر اس جرم کی نوعیت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ ایسی چھچھوری اور سرزوری دکھانے والے کو تو کسی غیر آباد مقام پر لے جا کر پھانسی دینی چاہیئے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری صدائیں لوسی کے کان میں پڑتی تھیں وہ کبھی اُداس اور کبھی خوش و خرم اپنے گوشہ عافیت میں زندگی بسر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ننھی لوسی کی عمر چھ سال کی ہو گئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بچی کے قدموں کی آہٹیں اور انتہا کے اپنے پیارے باعزم باپ کے اور عزیز شوہر کے قدموں کی آہٹیں اس کے دل سے کتنی قریب تھیں یہ بھی محتاج بیان نہیں کہ جس گھر کا انتظام وہ خوش اسلوبی سے سنبھال رہی تھی جہاں فضول خرچی سے زیادہ کفایت کو دخل تھا اس پیار بھرے گھر کی ہر ہلکی سی ہلکی آواز اسے دلفریب موسیقی سے کم نہ تھی۔ خاص کر جب اس کا باپ اس سے کہتا کہ وہ شادی کے بعد پہلے سے بھی کچھ زیادہ عقیدتمند بیٹی بن گئی ہے اور اس کا شوہر اسے بتاتا کہ کیسے ہی فرائض اور افکار کا بوجھ کیوں نہ ہو وہ بے کم و کاست اس کی مدد کرتی اور اس سے محبت کرتی ہے اور پھر وہ پوچھتا۔ "پیاری اس ہر عزیز کا کیا راز ہے تم ہر ایک کے لئے سب کچھ ہو جیسے کوئی دوسرا اس محبت کا شریک نہیں اور پھر بغیر کسی دشواری کے اطمینان کے ساتھ یہ کرشمہ دکھاتی ہوئی

پھر زور سے دوسری آوازیں آتیں یہ صدائیں بڑے خطرناک طریقے پر اس زمانے میں بلند ہورہی تھیں اور اب جب کہ ننھی لوسی کی چھٹی سالگرہ منائی جارہی تھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے فرانس میں کوئی بڑا طوفان آرہا ہے اور سمندر سے غضبناک شور اٹھ رہا ہے۔

۱۷۸۹ء کے جولائی کے مہینے کی درمیانی تاریخوں میں ایک رات دیر گئے مسٹر لاری ٹیلسن بینک سے لوسی اور اس کے شوہر کے گھر آئے اور دونوں کے ساتھ اندھیرے میں دریچے کے پاس بیٹھ گئے۔ گرمی کے باوجود وہ طوفانی رات تھی اور انھیں ویسی ہی کسی ایک اتوار کی رات یاد آرہی تھی جب اس جگہ سے انھوں نے بجلی اور کوندے کا تماشا دیکھا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ آج کی رات ٹیلسن بینک میں بسر ہوگی" مسٹر لاری نے بھورے رنگ کا وگ پیچھے سرکاتے ہوئے کہا "دن بھر ہم اتنے مصروف رہے کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں اور کون سا کام پہلے شروع کریں۔ پیرس میں اس قدر بے چینی ہے کہ سب لوگ پورے اعتماد کے ساتھ ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہمارے گاہک دھڑا دھڑ اپنی ملک وجائداد ہماری تحویل میں دے رہے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ انھیں تو اپنی دولت انگلستان کو منتقل کرنے کا خبط ہو گیا ہے"

"آثار برے ہیں" ڈارنے نے کہا۔

"میرے عزیز ڈارنے۔ تم کہتے ہو آثار برے ہیں۔ ٹھیک ہے لیکن اصل سبب سے کوئی واقف نہیں۔ لوگ ہمیشہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ کون جانے۔ ہم میں سے ٹیلسن بینک کے بعض کارکن بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اور ہم میں اتنی سکت نہیں کہ وقت بے وقت بلا وجہ کام کا زیادہ بوجھ اٹھا سکیں"

"پھر بھی آپ جانتے ہیں مطلع کس قدر تاریک اور خوفناک ہے" ڈارسے نے کہا۔

"یقیناً میں جانتا ہوں" مسٹر لاڈی نے اتفاق کیا۔ وہ دراصل اپنے آپ کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کا موڈ خراب ہے اور وہ بڑبڑا رہے ہیں۔ اس لئے وہ بولے "دن بھر کی دردسری کے بعد میں ذرا چڑچڑا پن دکھانا چاہتا ہوں۔ میننٹ کہاں ہیں؟"

"میں حاضر ہوں" ڈاکٹر نے اندھیرے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"شکر ہے آپ گھر ہی پر ہیں۔ دن بھر کی گرما گرمی اور وسوسوں سے میں بلاوجہ گھبرا گیا ہوں۔ آپ باہر تو نہیں جا رہے ہیں؟"

"نہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ چوسر کھیل لوں" ڈاکٹر نے خواہش ظاہر کی۔

"اس وقت جی نہیں چاہتا۔ سچ پوچھو تو آج رات کو میں اس قابل نہیں کہ آپ کا مقابلہ کر سکوں۔ لوسی کیا چائے کا سامان تیار ہے۔ مجھے تو نظر نہیں آتا؟"

"وہ تو آپ ہی کے لئے رکھ چھوڑا ہے"

"شکریہ۔ عزیز من۔ پیاری بچی آرام سے سو گئی ہے نا؟"

"مزے سے سو رہی ہے"

"ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے اور کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ خدا کا شکر ہے یہاں کسی اندیشے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن آج میرا مزاج کچھ ایسا برہم ہے اور پھر مجھ میں جوانی کا کس بل بھی تو نہیں رہا ـــ عزیز من ـــ میری چائے کہاں ہے۔ شکریہ ـــ اب ذرا قریب آجاؤ۔ تاکہ ہم سب ایک حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں۔ اور پھر خاموش بیٹھ کر دور کی وہ سب

آوازیں نہیں جن کے بارے میں تمہارا اپنا ایک نظریہ ہے۔"

"نظریہ نہیں۔ صرف ایک خیال تھا۔"

"اچھا ایک خیال ہی سہی، میری عقلمند چڑیا۔" مسٹر لاری لوسی کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولے "تاہم وہ آوازیں ان گنت اور پرشور ہیں۔ ہیں کہ نہیں۔۔ ذرا کان دھر کے سنو تو۔"

لندن کے تاریک دریچے کے پاس ادھر ادھر یہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے ادھر کوسوں دور سینٹ اینٹائن میں زور شور سے قدم بڑھ رہے تھے۔ تیز دیوانہ وار اور خطرناک قدم جو کسی کی زندگی کو روند کر خون آلود ہو جائیں تو پھر آسانی سے پاک صاف نہیں ہو سکتے۔

صبح ہوتے ہوتے سینٹ اینٹائن میں چڑیوں کو ڈرانے والے ہیولوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سروں کے اس تاریک سمندر پر فولادی شمشیریں اور سنگینیں دھوپ میں چمک چمک کر چاروں طرف روشنی کی چکاچوند کر رہی تھیں۔ سینٹ اینٹائن کے حلق سے ایک شور محشر اٹھا اور پھر موسم سرما کے ننگے درختوں کی شاخوں کی طرح لاکھوں برہنہ ہاتھوں کا جنگل جیسے نمودار ہو گیا۔ ہر ہاتھ کی انگلیاں عجب ہیجان کے ساتھ قسم قسم کے ہتھیاروں کو مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھیں۔ ہتھیار ہی نہیں کوئی بھی ہتھیار جیسی چیز کافی تھی۔ جو زمین کے تہہ خانوں سے دُور دُور تک اچھالی گئی ہو۔

ہتھیار انھیں کس نے دیئے۔ وہ کہاں سے آئے۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا۔ کس کے توسط سے یہاں بہ چکر بجلیوں کی طرح سروں پر گھمائے پھرائے اور چمکائے جا رہے تھے۔ ہجوم میں سے کسی کی آنکھوں سے یہ پتہ چلانا ممکن نہیں تھا لیکن بندوقیں تقسیم کی جارہی تھیں

کارتوس، گولی بارود، ڈنڈے، دستی، چھرے، کلہاڑیاں، بھالے غرض ہر ہتھیار جس کا تصور کیا جا سکتا تھا تقسیم ہو رہا تھا۔ جن لوگوں کو ہتھیار نہیں ملے وہ دیواروں سے اینٹ پتھر نکال نکال کر اپنے ہاتھ زخمی کر رہے تھے۔ سینٹ انٹائن کو تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ ہر دل میں شعلے کی حرارت اور ہر نبض میں بجلی کی سرعت تھی۔ ہر جاندار کو وہاں زندگی ہیچ نظر آرہی تھی۔ ہر شخص پر اپنی جان قربان کرنے کا جنون سوار تھا۔

ابلتے ہوئے پانی کے بھنور کا جیسے ایک مرکز ہوتا ہے اسی طرح یہ غیظ و غضب ڈیفارج کی شراب کی دوکان کے اطراف جوش کھا رہا تھا اور اس دیگ کا ہر انسان نما قطرہ اس سمت کھنچا چلا آرہا تھا۔ جہاں خود ڈیفارج پسینے میں شرابور اور بارود سے اٹا ہوا۔ احکام اور ہتھیار دے رہا تھا۔ وہ کبھی اس آدمی کو پیچھے ڈھکیلتا کبھی اس آدمی کو آگے سرکاتا۔ کبھی ایک سے ہتھیار لے کر دوسرے کو دیتا۔ غرض ہنگامے کے بیچوں بیچ وہی سب میں زیادہ سرگرمی دکھا رہا تھا۔

"جیکوس نمبر تین۔ میرے قریب رہو" ڈیفارج نے آواز دی "اور جیکوس نمبر ایک اور نمبر دو، تم ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ اور جتنے محبان وطن جمع ہو سکیں ان کی سرکردگی کرو۔ میری بیوی کہاں ہے؟"

"یہیں تو کھڑی ہوں" میڈم نے کہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاطر جمع تھی۔ لیکن آج بنائی نہیں ہو رہی تھی۔ مستقل مزاج میڈم کا سیدھا ہاتھ سلائیوں کے بجائے کلہاڑی سے شغل کر رہا تھا اور کمر بند میں ایک پستول اور ایک خونخوار چھرا بندھا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ بیوی؟"

"میں اس وقت تمہارے ساتھ چل رہی ہوں" میڈم نے کہا "تھوڑی دیر کے بعد عورتوں کا لشکر میرے پیچھے ہوگا"

"دوستو اور وطن کے پرستارو" ڈیفارج گرجا "چلو بیسٹیل چلیں" پھر تو ایک شور قیامت بپا ہوگیا۔ جیسے سارے فرانس کی سانس اس ایک قابل نفریں لفظ کے ادا کرنے میں صرف ہوگئی تھی۔ انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ موجوں پر موجیں تہ بہ تہ اٹھیں، اور سارے شہر سے ابھرتا ہوا یہ سیلاب اس نقطہ تک جا پہونچا۔ خطرے کے گھنٹے بج رہے تھے ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ بپھرا ہوا سمندر اپنے نئے کنارے سے گرج گرج کر ٹکرا رہا تھا۔ اس شان سے حملہ شروع ہوا۔

گہری خندقیں، دوہرے پل جو اٹھائے جا سکتے تھے۔ لمبی چوڑی سنگین دیواریں، آٹھ بڑے برج.. توپیں .. بندوقیں... آگ اور دھواں.... آگ میں سے گذرتا ہوا۔ دھوئیں میں سے گذرتا ہوا.... آگ کی لپیٹ اور دھوئیں کے بادل میں شراب فروش ڈیفارج جسے اس سمندر نے ڈھکیل کر توپ کے قریب پہونچا دیا تھا فی الفور توپچی بن گیا اور دو غضبناک گھنٹوں تک ایک بہادر سپاہی کی طرح کام کرتا رہا۔

"میری طرف آؤ" اس کی بیوی نے چلّایا "کیا ہم قلعہ پر قبضہ کرتے وقت مردوں کی طرح جانیں نہیں لے سکتے" اور سب عورتیں جو نادار اور انتقام کی آگ سے یکساں مشتعل تھیں گو ان کے ہاتھوں کے ہتھیار مختلف تھے میڈم کی طرف لپکیں۔

توپ ۔ بندوق ۔ آگ اور دھواں ۔ پھر بھی وہ گہری خندق اور وہ ایک پل ۔ وہ لمبی چوڑی سنگین دیواریں اور وہ آٹھ بڑے برج، جوں کے توں، زخمیوں کے گرنے سے غضبناک سمندر میں کچھ تھوڑا ادل بدل، چمکتے ہتھیار، سلگتی مشعلیں، گیلی گھاس کی دھواں دھار گاڑیاں ہرطرف پاس کے مورچوں پر ہماہمی چیخ پکار، گولیوں کی بوچھاڑ، لعنت لعنت کا شور انتہائی بہادری، گھن گرج، توڑ پھوڑ اور انسانوں کے سمندر کا فلک شگاف شور۔ پھر بھی وہی گہری خندق، وہی ایک پل، وہی لمبی چوڑی سنگین دیواریں، اور وہی آٹھ بڑے برج، شراب فروش ڈیفارج بھی اسی طرح توپ چلاتا ہوا، چار غضبناک گھنٹوں کی عرق ریزی کی وجہ سے پہلے سے زیادہ مشتعل . . . . ۔

قلعے کے اندر ایک سفید جھنڈی، غضب ناک طوفان کے درمیان کچھ صلح کی بات چیت کا سا نقشہ، گو ایک لفظ بھی کسی کو سنائی نہیں دیتا تھا پھر یکایک سمندر دور دور تک پھیلنے اور بڑھنے لگا۔ اور شراب فروش ڈیفارج کو نیچے اتارے ہوئے پل تک ڈھکیلتا لمبی چوڑی سنگین دیواروں سے آگے ان آٹھ بڑے برجوں کے اندر پہونچا دیا جن پر قبضہ ہو چکا تھا۔

جو سمندر اسے آگے ڈھکیل رہا تھا اس کی طاقت اتنی بے پناہ تھی کہ وہ نہ سانس لے سکتا تھا اور نہ پلٹ کر دیکھ سکتا تھا۔ جیسے وہ بحر جنوب کی موجوں سے ٹکر لے رہا ہو۔ بالآخر بیاسٹل کے بیرونی صحن میں پہونچا دیا گیا۔ وہاں دیوار کے ایک کونے کا سہارا لیکر اس نے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کی۔ جیکوس نمبر تین پاس ہی موجود تھا میڈم ڈیفارج

ہاتھوں میں پکڑے ہوئے عورتوں کے پیچھے کے آگے اندر کی طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ہر سمت شور و غل، مسرت کا جوش، کان بہرے کرنے والا، دیوانوں کا بازار، عجیب و غریب چیخ پکار اس کے باوجود حیرتناک حد تک ہر طرف غضبناک تماشا جیسے اشاروں کا کھیل ہو رہا ہو۔

"قیدی!"

"آج سے!"

"قید خانے کے خفیہ کمرے!"

"ایذا رسانی کے آلات!"

"قیدی!"

ان تمام نعروں اور دوسری قسم کی ہزاروں بے تکی آوازوں میں "قیدی" کا نعرہ سب میں زیادہ انسانی سمندر کی سطح پر گونج رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے زمان و مکان ہی نہیں، انسانوں کی تعداد بھی لامحدود ہے جب سب سے آگے کا سیلاب جیل کے افسروں کو گھیرے میں لئے انھیں تہہ خانوں کا پتہ نہ دینے کی صورت میں فوری موت کی دھمکیاں دیتا ہوا سامنے سے گذرا تو ڈیفارج نے اپنا مضبوط ہاتھ ان میں سے ایک بوڑھے مشعل بردار کے سینے پر رکھ کر اسے دوسروں سے الگ کر دیا۔ اور اس شخص کو اپنے اور دیوار کے بیچ میں دبوچ کر کہا۔

"شمالی برج کہاں ہے بتاؤ۔ جلدی بتاؤ!"

"جو حکم!" اس آدمی نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ چلئے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں!"

"ایک سو پانچ۔ شمالی برج کا کیا مطلب ہے؟" ڈیفارج نے پوچھا "جلدی بتاؤ"

"مطلب جناب؟"

"کیا اس سے مراد قیدی ہے یا قید خانہ۔ بتاؤ ورنہ میں تمہیں یہیں ڈھیر کر دوں گا"

"اسے مار ڈالو" جیکوس نمبر تین جو قریب آگیا تھا چلایا۔

"جناب وہ تہہ خانہ ہے"

"مجھے وہاں لے چلو"

"ادھر سے آیئے"

جیکوس نمبر تین کا دل جو چاہتا تھا وہ نہ ہو سکا۔ اس گفتگو سے اسے بڑی کوفت ہوئی کیونکہ خون بہانے کی یہاں توقع نہ تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ڈیفارج کا بازو اور دوسرا جیلر کا بازو تھامے ہوئے تھا وہ تینوں اس قدر قریب کھڑے ہو کر بھی بمشکل ایک دوسرے کی بات سن سکتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی سمندر کا شور و شغب کس بلا کا تھا۔ اب وہ سیلاب قلعے میں داخل ہو کر دالانوں، برآمدوں اور زینوں میں طوفان مچا رہا تھا۔ باہر بھی چاروں طرف وہ دیواروں سے ٹکرا کر ایک ہنگامہ برپا کر رہا تھا جس کے درمیان چیخ پکار ہوا میں یوں ابھرتی تھی جیسے موجوں سے کف اٹھتا ہے۔

اندھیرے تہہ خانوں میں سے ہوتے ہوئے جہاں دن کی روشنی کبھی داخل نہیں ہوئی تھی۔ تاریک کٹہروں اور کال کوٹھریوں کے مہیب دروازوں سے گذرتے ہوئے خونخوار سیڑھیوں سے اترتے کھردرے اینٹ پتھر کے زینوں پر چڑھتے جو زینوں کے بجائے

خشک آبشار نظر آ رہے تھے۔ ڈیفارج جیلر اور جیکوس نمبر تین ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تیز تیز جانے لگے۔ شروع میں کہیں کہیں وہ سیلاب میں گھر جاتے لیکن جب وہ نیچے اتر چکے اور پھر پیچ در پیچ راستوں سے ایک برج پر چڑھ رہے تھے۔ تو وہاں کوئی اور نہ تھا۔ سنگین دیواروں اور کمانوں میں محصور ہو کر قلعے کے اندر اور باہر پرشور طوفان کی آواز اتنی مدھم معلوم ہوتی تھی کہ جیسے چیخ پکار سے ان کے کان بہرے ہو گئے ہوں۔

جیلر ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس رکا ایک زنگ آلود قفل میں کنجی گھمائی آہستہ سے دروازہ کھولا اور جب وہ سر جھکا کر اندر گھسنے لگے تو بولا۔

"ایک سو پانچ شمالی برج"

دیوار میں ایک چھوٹی سی بدرنگ کھڑکی اوپر کی طرف نکلتی تھی جس کے آگے پتھر کا اوٹ تھا جس کی وجہ سے آسمان کو دیکھنے کے لئے نیچے جھکنا پڑتا تھا۔ چند منٹ اندر کی طرف سلاخوں سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا دودکش تھا۔ آتش دان پر پرانی لکڑی کی راکھ تھی۔ ایک تپائی، ایک میز اور گھاس پھوس کا ایک بستر اور چارپائی۔ چار سیاہ دیواریں جن میں سے ایک پر زنگ آلود لوہے کا حلقہ نصب تھا۔

"مشعل دیواروں کے قریب لاؤ تاکہ میں دیکھ سکوں" ڈیفارج نے جیلر سے کہا جیلر نے حکم کی تعمیل کی اور ڈیفارج روشنی کے ساتھ غور سے دیواروں کے ہر حصے کو دیکھنے لگا۔

"ٹھیرو — جیکوس ادھر دیکھو"

"اے، ایم" جیکوس نمبر تین نظریں جما کر شوق سے پڑھتے ہوئے چلایا۔

"الکزنڈر مینٹ" ڈیفارج نے اپنی بارود بھری انگلیاں حرفوں پر پھیراتے ہوئے کان میں کہا "اور یہاں دیکھو اس نے لکھا ہے۔ غریب ڈاکٹر۔۔۔ یقیناً اس پتھر پر بھی اس نے کیلنڈر کی تاریخیں کندہ کی ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ سبل؟ لاؤ مجھے دیدو"

اس کے ہاتھ میں ابھی تک توپ کا فلیتہ تھا جسے ساتھی کو دے کر اس نے سبل لے لیا۔ اور کرم خوردہ تپائی اور میز کے فوراً ٹکڑے کر دیئے۔

"روشنی ذرا اوپر اٹھاؤ" اس نے جیلر سے برہم لہجے میں کہا اور پھر اپنے ساتھی سے بولا "ذرا ان ٹکڑوں کو اچھی طرح دیکھو، جیکوس۔ اور یہ لو میرا چھرا۔ اور اس بستر کو چیر کے گھاس میں ٹٹولو۔ . . . اے ذرا روشنی اوپر کی طرف دکھا"

جیلر کو دھمکا کر وہ آتشدان پر چڑھ گیا اور دود کش میں سے جھانکتے ہوئے سبل سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ اور پھر لوہے کی جالی کو توڑنے لگا۔ چند لمحوں میں کچھ گچی اور مٹی جھڑنے لگی۔ اپنے چہرے کو بچاتے ہوئے وہ کریدنے لگا۔ اور پھر دود کش کی دراز میں سبل ڈال کر ادھر ادھر ٹٹولا۔

"جیکوس۔ کیا لکڑی اور گھاس پھوس میں کچھ نہیں ملا؟"

"کچھ نہیں"

"یہ سب کوڑا جمع کر کے کمرے کے بیچ میں رکھیں گے۔۔۔ اے آگ کیوں نہیں لگاتا۔"

جیلر نے اس چھوٹے سے انبار کو آگ لگا دی۔ شعلے بھڑکنے لگے وہ اسی طرح اس کو

جلتا ہوا چھوڑ کر چھوٹے سے نددوانے میں سے جھک کر باہر نکل گئے۔ اور پھر صحن کا رخ کیا۔ جوں جوں وہ نیچے اترتے گئے کانوں میں آوازیں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ غضبناک سیلاب میں گھر گئے۔

اس بپھرے ہوئے سیلاب کو ڈیفارج ہی کی تلاش تھی۔ سینٹ انٹائن آوازے لگا رہا تھا۔ کہ اس کا شراب فروش ہی عوام کے قاتل بیسٹائل کے گورنر کے نگراں کار دستے کی سرکردگی کا اہل تھا۔ ڈیفارج کے بغیر کون گورنر کو ہوٹل ڈی ویل لے جاکر عدالت میں پیش کرسکتا تھا نہ وہ نہ ہو تو اس کا امکان تھا کہ گورنر فرار ہو جائے اور عوام کے خون کا جس کی کئی برس بعد قدر معلوم ہوئی تھی کوئی انتقام نہ لیا جائے۔

جوش وخروش اور جدال وقتال کی اس پرشور کائنات میں جہاں وہ بوڑھا ظالم افسر اپنے خاکستری کوٹ اور راعرانہ کے سرخ فیتوں سمیت گھرا ہوا تھا صرف ایک ہستی خاطر جمع تھی اور وہ ایک عورت تھی جو ڈیفارج کی طرف اشارہ کرکے کہہ رہی تھی: وہ دیکھو۔ وہ میرا شوہر ہے۔ ڈیفارج ادھر دیکھو! وہ بوڑھے ظالم کے پاس پرسکون انداز میں کھڑی رہی۔ پرسکون انداز میں اس کے ساتھ راستہ طے کیا جب کہ ڈیفارج اور دوسرے اسے دھکیلے جارہے تھے۔ پرسکون انداز میں اس کے قریب رکی رہی جب وہ منزل مقصود پر پہونچایا گیا اور اس پر پیچھے سے ماریں پڑنے لگیں۔ تیغ وخنجر کی بارش میں بھی وہ اسی پرسکون انداز میں پاس کھڑی رہی لیکن زخموں کی تاب نہ لاکر اس نے دم توڑ دیا تو یکایک اس عورت میں جیسے نئی جان پڑ گئی اور وہ اپنا پاؤں اسکی گردن پر جماکر اپنے خوفناک چھرے سے جو دیر سے تیار تھا اس کا سر کاٹ لیا۔

سینٹ اینٹائن اپنے ایک مہیب خیال کے ماتحت لالٹینوں کی جگہ انسانوں کو ستونوں
پر لٹکا کر اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ سینٹ اینٹائن کا خون جوش میں تھا اور ظلم اور آہنی
پنجوں کے اقتدار کا خون سرد پڑ رہا تھا۔ ایک طرف پارہ چڑھا ہوا تھا دوسری طرف گرا ہوا۔ ہوٹل
ڈی ول کی ان سیڑھیوں پر جہاں گورنر کا مردہ جسم پڑا تھا، میڈم ڈیفارج کے جوتوں تلے جن
سے وہ گورنر کے مردہ جسم کو مسل رہی تھی۔ تاکہ بعد میں اس کے پرخچے اڑائے جائیں۔ ہر جگہ پرانا
اقتدار پامال تھا۔ "لالٹین نیچے اتار دو" سینٹ اینٹائن کا نعرہ تھا۔ کیونکہ موت کا ایک نیا طریقہ
دریافت ہو گیا ہے "یہاں ایک سپاہی کو ڈیوٹی پر رہنا ہے" لٹکتے ہوئے محافظ کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر
سیلاب آگے بڑھ گیا۔

خوفناک تاریک سمندر۔ ہلاکت خیز موجوں کا دریا جس کی گہرائی کا کسی کو اندازہ نہیں۔ اور
جس کی طاقتوں سے کوئی واقف نہ تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں، انتقامی نعروں اور مصیبت کی
آگ میں تپے ہوئے بے رحم سنگدل چہروں کا سمندر۔

چہروں کے اس سمندر میں جہاں ہر قسم کے خوفناک جذبات نمایاں تھے۔ دو گروہ خاص
طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس قدر مختلف کہ شاید ہی کسی سمندر میں تباہی کے ایسے آثار
نظر آئے ہوں۔ ہر گروہ میں سات شکلیں تھیں۔ ایک طرف وہ سات قیدی جو طوفان کی آمد
پر اپنی قبروں سے نکالے گئے تھے اور اب عوام کے کندھوں پر سوار تھے۔ گھبرائے ہوئے کھوئے
کھوئے سے حیرت زدہ جیسے قیامت آگئی ہو۔ اور ان کے اطراف خوشیاں
منانے والے بھوت اور آسیب ہوں۔ دوسرے گروہ کے سات چہرے

نیزے کے اوپر، سات مردہ چہرے۔ جن کی پلکیں جھکی ہوئی اور ادھ کھلی آنکھیں روزِ حساب کی منتظر تھیں۔ بے حس چہرے جن میں ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی کچھ جان رہ گئی ہے۔ جیسے وہ اس خوفناک وقفے میں اپنی پلکیں اٹھا کر اپنے مردہ ہونٹوں سے گواہی دینگے "تو نے یہ سب کچھ کیا۔"

سات رہا شدہ قیدی، نیزوں پر سات خون آلود سر، منحوس قلعے کے آٹھوں مضبوط برجوں کی کنجیاں، پرانے قیدیوں کے چند خطوط اور نشانیاں جو دل شکستہ ہو کر کبھی کے مر چکے تھے۔ یہ اور اس قسم کا سامان سینٹ انٹائن کے ہاتھ لگا تھا۔ اور وہ اسے لے کر ۱۷۸۹ء کے جولائی کی درمیانی تاریخوں میں پیرس کی سڑکوں پر گشت لگا رہا تھا۔ خدا کرے لوسی ڈارنے کے وسوسے غلط ثابت ہوں اور اس جمِ غفیر کے قدم اس کی زندگی سے بہت دور رہیں۔ کیونکہ وہ قدم تیز، دیوانہ وار اور خطرناک ہیں۔ اور ڈیفارج کے شراب خانے کے دروازے پر جب پیپا ٹوٹا تھا اس کے کئی سال بعد بھی ان کے سرخ دھبّوں کو دھونا آسان نہیں۔

بائیسواں باب

طوفان کا زور

بدحال سینٹ انٹائن کو خوشیاں منانے کے لئے ابھی صرف ایک ہفتے کی مہلت ملی تھی جس میں وہ اپنی بچی کچی روکھی سوکھی روٹی کو ایک حد تک معانقوں اور مبارکبادوں کی چاشنی

دے سکتا تھا کہ ایسے میں ایک دن حسب سابق میڈم ڈیفارج سودا بیچنے کی
کی میز پر نظر آئی۔ وہ گاہکوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ میڈم ڈیفارج کے بالوں
میں کوئی گلاب نہ تھا۔ کیونکہ اس ایک مختصر ہفتے میں جاسوسوں کی وسیع برادری
ہوشیار ہو گئی تھی۔ اور ان میں سے کوئی بھی سینٹ انٹائن کے رحم و کرم پر بھروسہ
نہیں کر سکتا تھا۔ راستوں کی لالٹینیں بڑی لچک دکھا رہی تھیں اور ان کا اس طرح
لٹکنا کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

میڈم ڈیفارج سینے پر ہاتھ باندھے صبح کی روشنی اور تمازت میں شراب خانے اور راستے
کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ جہاں کئی پھٹے حال مصیبت زدہ گروہ سرگشت لگا رہے تھے۔ ان کے
چہروں پر پریشانی کے ساتھ قوت احساس نمایاں تھی۔ بدبخت سے بدبخت سر کا خراب سے خراب
کنٹوپ زبان حال سے کہہ رہا تھا "میں جانتا ہوں مجھے اپنی زندگی کتنی دوبھر ہے لیکن میں یہ بھی
جانتا ہوں کہ میرے لئے دوسرے کی زندگی کا خاتمہ کرنا کتنا آسان ہے" ہر لاغر اور برہنہ ہاتھ جو
اب تک بیکار رہا تھا اب اسے ہر وقت ایک کام مل سکتا تھا۔ اب وہ دوسرے پر حملے کے لئے
اٹھایا جا سکتا تھا۔ بنائی کرنے والی عورتوں کی انگلیاں بھی دوسروں کو نوچنے پھاڑنے کے لئے
بے قرار تھیں۔ اور سینٹ اینٹائن کی شکل بھی بدل گئی تھی۔ اس مجسمے میں کئی سال سے اس تبدیلی
کا رجحان تھا اور اب حال کی فیصلہ کن منزلوں کا اثر بشرے سے پوری طرح ظاہر ہو رہا تھا۔

سینٹ اینٹائن کی عورتوں کی رہنما میڈم ڈیفارج جسے کو دیکھ کر لیڈری کی شان
سے خوشنودی کا اظہار کر رہی تھی اس کی ایک ہم مسلک عورت پاس بیٹھی بنائی کر رہی تھی۔ وہ

ایک فاقہ زدہ مینا ری کی پست قد فربہ بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ میڈم کی اس مددگار کا نام طرف دنجنس (انتقام) تھا۔

"سنو" دنجنس نے کہا۔ "سنو کس کے قدموں کی آہٹ ہے۔"

سینٹ انٹائن کے بیرونی علاقے سے شراب خانے کے دروازے تک بارود بچھا کر اسے آگ دکھائی جاتی تو جو دھماکہ ہوتا بس اسی زور شور سے یہ افواہ چاروں طرف پھیل گئی۔

"وہ دیکھو ڈیفارج ہے" میڈم نے کہا۔ "دیس کے فدایو خاموش"

ڈیفارج کی سانس پھول رہی تھی۔ اس نے اپنی لال ٹوپی اتاری۔ اور ارد گرد نظر دوڑائی۔

"سنو سب لوگ" میڈم نے پھر کہا۔ "غور سے سنو کیا کہنے والے ہیں" منتظر آنکھوں اور کھلے منہ چہروں کے پس منظر میں ڈیفارج ہانپتا ہوا کھڑا رہا۔ کچھ لوگ دروازے کے باہر تھے اور کچھ شراب خانے کے اندر اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"کہو میرے شوہر کیا نئی خبر ہے"

"دوسری دنیا سے خبر آئی ہے"

"دوسری دنیا کیا معنی" میڈم نے حقارت سے کہا۔

"یاد ہے بوڑھا فاولن، جس نے بھوک کے ماروں سے کہا تھا کہ وہ گھاس کھائیں اور پھر وہ بوڑھا جہنم واصل ہو گیا"

"یاد ہے۔ سب کو یاد ہے" ہر حلق سے آواز نکلی۔

"اسی کے بارے میں خبر سنانے آیا ہوں۔ وہ ہم میں موجود ہے"

"مردہ اور ہم میں موجود؟" پھر ہر حلق سے آواز آئی۔

"وہ مرا نہیں تھا بلکہ ہمارے خوف سے مشہور کر دیا تھا کہ وہ مر گیا ہے اور جھوٹ موٹ کا ایک شاندار جلوس جنازہ بھی نکلوا دیا تھا۔ لیکن اب وہ زندہ پا لیا گیا ہے۔ جس گاؤں میں وہ چھپا ہوا تھا وہاں سے اسے شہر میں لایا گیا ہے۔ میں ابھی ابھی اس کو دیکھ کر آیا ہوں۔ اسے پابہ زنجیر ہوٹل ڈی ویل کی طرف لے جا رہے تھے میں نے کہا ہم سے اس کا خوف بجا تھا کہو بجا تھا کہ نہیں"

اگر وہ ستر برس کا پرانا پاپی اس سوال کے جواب سے واقف نہ بھی تھا تو۔۔۔ ان لوگوں سے سنکر اس کا دل گواہی دیتا کہ یہ سچ ہے۔

ایک لمحے تک خاموشی طاری رہی۔ ڈیفارج اور اس کی بیوی ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ وینجنس جھکی اور جونہی کاونٹر کے نیچے اس نے اپنے پاؤں سے ڈھول کو دھکا دیا اس میں سے کچھ آواز نکلنے لگی۔

"دیس کے فدائیو" ڈیفارج نے پر عزم لہجے میں کہا "کیا ہم سب تیار ہیں"

آن کی آن میں میڈم ڈیفارج کا خنجر اس کی کمر بند میں لٹکنے لگا۔ سڑک پر ڈھول یوں بجنے لگا جیسے ڈھول اور ڈھولچی جادو سے اڑ کر آ گئے ہیں۔ اور وینجنس چیختی چلاتی چڑیلوں کی طرح سر پر ہاتھ بجاتی گھر گھر جا کر عورتوں کو اکسانے لگی۔

مردوں کی شکلیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ خونخوار غصے میں بھرے ہوئے وہ

دریچوں سے جھانک رہے تھے۔ پھر یہ ہتھیار ہاتھ لگانے کہ نیچے اترے اور سڑکوں پر جمع ہو گئے لیکن عورتوں کا جوش تو اس غضب کا تھا کہ انھیں دیکھ کر بہادر سے بہادر مرد کا رنگ بھی فق ہو جائے۔ افلاس زدہ گھروں کے کام چھوڑ کر بچوں بوڑھوں اور بیماروں کو بھوک سے بیتاب ننگے بدن زمین پر ننڈھال چھوڑ کر بال بکھراتی ہوئی شور مچاتی ہوئی وہ گھروں سے نکل آئی تھیں۔ اور دیوانہ وار ایک دوسرے کو ابھار رہی تھیں۔ بہن۔ بدمعاش فاولن پکڑا گیا۔ اماں۔ بوڑھا فاولن پکڑا گیا۔ بیٹی۔ حرامی فاولن پکڑا گیا۔ پھر ان کے درمیان بیسیوں دوسری عورتیں چھاتیاں کوٹتی اور بال نوچتی چلا رہی تھیں۔ فاولن زندہ ہے۔ فاولن جس نے بھوکے عوام سے کہا تھا کہ وہ گھاس کھائیں۔ فاولن جس نے میرے بوڑھے باپ سے جس کو میں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دے سکتی تھی، کہا تھا کہ گھاس کھاؤ۔ فاولن جس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری سوکھی چھاتیوں میں دودھ نہیں ہے تو میرا شیر خوار بچہ گھاس کی پتیاں چوس سکتا ہے۔ اے بی بی مریم! یہ فاولن۔ اے خدا! ہماری مصیبتیں میرے بچے کی روح سے کہو۔ میرے لاغر بدن باپ سے کہو۔ میں زمین کے پتھروں پر گھٹنے ٹیک کر قسم کھاتی ہوں کہ فاولن سے بدلا لوں گی۔ شوہرو۔ بھائیو۔ اور نوجوانو۔ ہمیں فاولن کا خون چاہئے۔ فاولن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دفن کر دو تاکہ اس کے گوشت پوست سے گھاس اگے۔ ان نعروں کے ساتھ فرط غیظ سے اندھی ہو کر عورتیں بے اختیار بھاگ دوڑ کرتی ہوئی خود اپنے دوستوں کو ہنٹر مارتی اور ان کے کپڑے پھاڑتی ہوئی بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگیں۔ اور اگر ان کے رشتہ دار مرد انھیں راستے سے نہ ہٹاتے تو وہیں قدموں کے

نیچے وہ سب روندی جائیں۔

باوجود اس کے ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہیں پایا۔ سب کچھ آن کی آن میں ہو گیا فادلن ہوٹل ڈی ویل میں تھا اور جلدی نہ کرتا تو چھوٹ سکتا تھا۔ اگر سینٹ انٹائن کو گذشتہ مصیبتیں ذلتیں اور مظالم نہ بھولے ہوں تو ایسا کبھی نہ ہو گا۔ ہتھیار بند عورتیں اور مرد اس علاقے سے نکل کر اتنی تیزی سے اکٹھے ہو گئے اور بچے کچے لوگوں کو بھی اس سرعت سے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا کہ پاؤ گھنٹے کے اندر سینٹ انٹائن کے آغوش میں بوڑھوں اور بچوں کے سوا ایک فرد بشر بھی موجود نہیں تھا۔

اس وقت تک وہ سب تحقیقات کے ہال میں کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ جہاں اس بدشکل بدطینت بوڑھے کو لایا گیا تھا۔ جن لوگوں کو اندر جگہ نہیں ملی وہ باہر کے صحن اور سڑکوں پر جمع تھے۔ ڈیفارج اور اس کی بیوی۔ ونجنس اور جیکوس نمبر تین آگے کی صف میں ملزم سے کچھ زیادہ دُور نہیں تھے۔

"ذرا اس بوڑھے بدمعاش کو دیکھو کس طرح رسیوں سے بندھا ہے:" میڈم نے چھرے سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اوہ، اس کی پیٹھ پر گھاس کا تودہ بندھا ہے بہت اچھا کیا۔ ہا ہا۔ بہت اچھا کیا۔ کھانے دو اب خود اسے" میڈم چھرا بغل میں دبا کر تالیاں بجانے لگیں جیسے کھیل تماشوں میں ہوتا ہے۔

میڈم ڈیفارج کے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے یہ خوش خبری اپنے سے پیچھے کھڑے رہنے والوں کو سنائی اور پھر انھوں نے پچھلی صف کو اور اس صف نے اسی طرح

دوسروں تک یہ مژدہ پہونچا دیا۔ یہاں تک کہ آس پاس کی تمام گلیاں تالیوں کے شور سے گونجنے لگیں نیز دو تین گھنٹوں کی طویل بحث اور منوں الفاظ کی چھان بین کے دوران میں میڈم ڈیفارج کی چپے صبری کے فقرے حیرت ناک تیزی کے ساتھ دور دور تک پہرائے جا رہے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میڈم ڈیفارج کے بعض واقف کار نہایت چالاکی سے بیرونی دیواروں پر چڑھ کر اندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اور میڈم اور باہر کے مجمع کے درمیان تار برقی کا کام انجام دے رہے تھے۔

بالآخر دن اتنا چڑھا کہ بوڑھے قیدی کے سر پر سورج کی شعاعیں یوں چمکنے لگیں جیسے وہ حفظ وامان یا امید کی کرنیں ہوں لیکن اس کی ایسی قسمت کہاں۔ فوراً گرد سے اٹھا ہوا ریلا جو دیر سے درمیان میں حائل تھا چاروں طرف پھیل گیا۔ اور قیدی سینٹ انطائن کے قبضے میں تھا۔

ایک سرے سے دوسرے سرے تک مجمع میں خبر پھیل گئی۔ ابھی ڈیفارج نے ایک میز اور کٹہرے کو پھاند کر بد نصیب شکار کو اپنے مہلک بازوؤں میں لیا تھا۔ میڈم ڈیفارج ابھی قیدی کی رسیوں کو ٹٹول ہی رہی تھی۔ دنجنس اور جیکوس نمبر تین ابھی وہاں پہونچے بھی نہ تھے اور دریچوں کے پاس کے لوگ ابھی اندر داخل بھی نہ ہوئے تھے اور یہ سب شکاری پرندے اپنی اپنی جگہ ہی پر تھے کہ سارے شہر میں یہ نعرہ گونجنے لگا: اسے باہر لاؤ۔ اسے لالٹین کے کھمبے کے پاس لاؤ۔

نیچے اور اوپر۔ سر کے بل سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا، کبھی اپنے گھٹنوں پر کبھی اپنے قدموں پر کبھی چاروں شانے چت۔ گھسٹتا ہوا۔ زخموں سے چھپے دم لہولہان وہ بار بار رحم کی درخواست کر رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھنے کے لئے جب حلقہ توڑ کر نزدیک آتے تو وہ سخت کرب کی

حالت میں کچھ ہاتھ پیر مارتا۔ اور پھر قدموں کے جنگل میں ایک سوکھی بے جان لکڑی کی طرح گھسٹتا چلا جاتا! ۔ اس طرح اسے قریب ترین گلی کے موڑ پر لایا گیا جہاں ایک جان لیوا لالٹین لٹک رہی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر میڈم ڈیفارج نے اسے چھوڑ دیا۔ جیسے بلی چوہے کو چھوڑتی ہے اور جب آخری تیاریاں ہونے لگیں تو خاموشی اور خاطر جمعی سے اس کی منت سماجت کی پروا کئے بغیر اسے گھورنے لگی۔ تمام وقت عورتیں جوش سے چلا رہی تھیں اور مرد زور زور سے چیخ رہے تھے کہ منہ میں گھاس ٹھونس کر اسے مارنا چاہئے۔ ایک بار اس کا جسم اوپر چڑھا۔ اور رسی ٹوٹ گئی اور وہ چیخنے لگا۔ اور لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ دوسری بار اسکا جسم اوپر چڑھا اور رسی ٹوٹ گئی اور وہ چیخنے لگا اور لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ تیسری بار رسی کو رحم آگیا اور اسکی گردن میں پھنسی رہی پھر اسکا سر نیزے پر تھا اور منہ میں اس قدر گھاس تھی کہ اسے دیکھ کر سارا سینٹ انٹائن رقص کر سکتا تھا۔

لیکن ابھی دن کی بداعمالیاں ختم نہیں ہوئی تھیں چیخ چیخ کر ناچنے کی وجہ سے سینٹ انٹائن کا خون گرم ہو گیا تھا۔ اور جب شام کو یہ خبر ملی کہ مہلوک کا عوام دشمن داماد بھی پانچسو سواروں کی نگرانی میں پیرس کو لایا جا رہا ہے تو رگوں میں خون کھولنے لگا۔ سینٹ انٹائن نے اس کے جرائم کی فہرست مرتب کی اور اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اگر پوری فوج اس کی نگرانی کرتی تو بھی دوالے چھین کر فاولن کے ہمرکاب عدم کو بھجواتے۔ پھر اس کے سر اور دل کو نیزے پر چڑھا کر اس مال غنیمت کے ساتھ بھیڑیوں کا جلوس راستوں پر گھومنے لگا۔

جب رات ہو گئی تو مرد اور عورتیں سب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے جہاں بھوکے بچے بلبلا رہے تھے۔ پھر غریب نان بائیوں کی دوکانوں پر بھیڑ لگی اور لمبی لمبی قطاریں

صبر کے ساتھ خراب رزنی کے لئے منتظر کھڑی رہیں۔ اور خالی معدوں کے باوجود لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر دن کی کامیابیاں دہراتے اور لطف اٹھاتے جارہے تھے رفتہ رفتہ چیتھڑے لگے ہوئے انسانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ اور اونچے دریچوں میں مدھم روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ اور راستوں پر آگ جلا کر بڑی مشترکہ طور پر کھانا پکانے لگے تاکہ بعد میں اپنے اپنے گھر لے جاکر کھا سکیں۔

وہ کھانا بھی کیا تھا۔ نہ گوشت نہ مسالہ۔ صرف سوکھی روٹیاں جن سے پیٹ بھی نہ بھرے تاہم انسانوں کی رفاقت سے پتھر میں بھی غذائیت پیدا ہوجاتی ہے اور مسرت کی چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ ماں باپ اس دن کے بدترین اشغال میں حصہ لینے کے بعد اپنے کمزور بچوں سے شفقت کے ساتھ کھیلنے لگے۔ اور عاشق و معشوق نے ان حالات میں بھی امید و محبت کا دامن نہیں چھوڑا۔

قریب قریب صبح ہو چکی تھی کہ ڈیفارج کے شراب خانے کے گاہک رخصت ہونے لگے۔ اور موسیو ڈیفارج نے دروازہ بند کرتے کرتے اپنی بیوی سے بھی آواز میں کہا۔

"پیاری۔ آخر وہ دن آگیا۔"

"ہاں" میڈم نے جواب دیا "قریب قریب"

سینٹ انٹائن محو خواب تھا۔ ڈیفارج اور اس کی بیوی سوئے ہوئے تھے۔ وینجنس بھی اپنے فاقہ زدہ مہاری کے پہلو میں سوئی ہوئی تھی۔ ڈھول خاموش تھا سینٹ انٹائن میں بھی ایک آواز تھی۔ جو خون خرابے میں نہیں بدلی تھی اس ڈھول کی بجز انکار وینجنس اگر

اس کو اس وقت بجانے لگتی تو وہی آوازیں نکلتیں جو بیسٹل پر قبضے سے قبل اور بوڑھے فادلن کی ہلاکت سے پہلے نکلا کرتی تھیں۔ لیکن سینٹ انتائن کی آغوش میں جو عورتیں اور مرد محو خواب تھے! ان کی بھدی آوازوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

تئیسواں باب

"آگ کے شعلے"

گاؤں کا نقشہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ خاص کر فوارے کے قریب جہاں سڑک کی مرمت کرنے والا روزانہ راستے کے پتھروں پر ہتوڑا چلاکر روٹی کمانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس کے جسم زار اور جان ناتواں کا رشتہ قائم رہ سکے۔ گھاٹی پر تعمیر کیا ہوا قید خانہ اب سابق کی طرح شاندار نہیں رہا تھا۔ چند گنے چنے سپاہی اب بھی اس کی نگرانی کے لئے مامور تھے اور چند افسران سپاہیوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ لیکن کسی افسر کو خبر نہیں تھی کہ ان سپاہیوں کا کیا طرز عمل ہوگا۔ یا شاید توقع وہاں بے جا تھی۔

دور دور تک اجڑے ہوئے ملک میں تباہی کے سوا کسی اور پیداوار کا نشان نہیں تھا۔ درختوں کے پتے گھاس کی پتیاں اور اناج کے دانے سب غریب انسانوں کی طرح سوکھ گئے تھے۔ ہر چیز سرنگوں، مایوس، مظلوم اور شکستہ حال نظر آتی تھی۔ مکانات، احاطے، پالتو جانور،

مرد، عورتیں اور بچے، اور انھیں جھنے والی دھرتی سب نڈھال تھے۔

اکثر رئیس ذاتی طور پر شریف تھے۔ قوم کے لئے ان کا وجود فائدہ مند تھا۔ ان سے اولوالعزمی کی شان باقی تھی۔ وہ عیش و عشرت کی چکا چوند کے شائستہ نمونے اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ باوجود اس کے بحیثیت طبقے کے یہ ساری بربادی ان ہی کے کرتوت کا نتیجہ تھی۔ یہ عجیب تماشا تھا کہ وہ کائنات جو صرف رئیسوں کے لئے تخلیق کی گئی تھی اس قدر جلد خراب و خستہ ہو گئی تھی۔ یقیناً نظام عالم میں کوئی بنیادی نقص تھا۔ بہرحال معاملہ یونہی تھا۔ پتھروں پر ہتوڑے چلا چلا کر ممکنہ آذوقہ حاصل کیا جا چکا تھا۔ چارہ دان کو اس قدر گھمایا گیا تھا کہ اس کی چرخی ٹوٹ گئی تھی۔ اور وہ بغیر چارے کے گھوم رہا تھا۔ ایسے ذلیل اور مہمل حالات میں رئیسوں کے لئے راہ فرار کے سوا اور کونسا راستہ رہ گیا تھا۔

لیکن اس گاؤں میں اور اسی قسم کے بعض دوسرے علاقوں میں یہ سوال نہیں تھا کیونکہ اس گاؤں کو لوٹنے والے رئیس کئی برسوں سے یہاں رونق افروز نہیں ہوئے تھے۔ بجز اسکے کہ گاہے ماہے شکار کے لئے تشریف لائے ہوں۔ انسانوں کے شکار کے لئے اور کبھی جانوروں کے شکار کے واسطے جن کی حفاظت کی خاطر غیر آباد جنگلوں کو بارونق اور کارآمد مقامات میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن اب شکار کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اب اونچی ذات والے رئیسوں کے خوش رنگ آراستہ و پیراستہ چہروں کے غائب ہونے سے زیادہ اہم نیچ ذات کے نئے نئے چہروں کی آمد کا مسئلہ تھا۔

ان دنوں جب سڑک مرمت کرنے والا یکہ و تنہا گرد و غبار میں کام کر رہا تھا جب

اسے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ مٹی کا بنا ہوا ہے اور بالآخر مٹی میں جا ملے گا۔ جب اس کا سارا وقت اسی فکر میں صرف ہوتا تھا کہ اس کا کھانا کتنا کم اور اس کی بھوک کتنی زیادہ ہے۔ ان دنوں جب کبھی وہ اکیلے میں کام کرتے کرتے ذرا رکتا اور آنکھ اٹھا کر ارد گرد دیکھتا تو کوئی نہ کوئی عجیب و غریب ہیئت کا آدمی اس کی طرف قدم اٹھاتا ہوا نظر آتا۔ جوں جوں دن گزرتے اس قسم کی شکلیں زیادہ تعداد میں دکھائی دیتیں۔

جب یہ شکل آگے بڑھتی تو سڑک مرمت کرنے والا اطمینان سے دیکھتا کہ وہ ایک الجھے ہوئے بالوں والا وحشی انسان ہے۔ دراز قد، بھدے سے چوبی جوتے پہنا ہوا، کرخت ڈراؤنا تیرہ سر، گرد سے اٹا ہوا، کیچڑ میں لت پت، کئی نشیبی مقامات کی رطوبت سے تربتر اور کئی جھاڑیوں کے کانٹوں اور پتوں سے لدا ہوا۔

جولائی کی ایک دوپہر کو اسی قسم کا ایک شخص بھوت کی طرح آ دھمکا۔ سڑک مرمت کرنے والا اس وقت پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ٹیلے کی آڑ میں اولوں کی زد سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اجنبی نے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وادی کے گاؤں پر نظر ڈالی اور چکی اور گھاٹی کے قید خانے کا جائزہ لیا۔ جب ان مقامات کو اپنے کند ذہن میں شناخت کر لیا۔ تو پھر اپنی خاص زبان میں کہنے لگا۔

"کیا حال ہے جیکوس؟"

"ٹھیک ہے؟"

"ہاتھ لاؤ۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا اور وہ شخص پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

"رات کا کھانا نہیں ملتا؟"

"صرف شام کا کھانا ملتا ہے۔" سڑک مرمت کرنے والے نے کہا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔

"آج کل کا یہی رواج ہے۔ رات کے کھانے کا کہیں نام نہیں سنائی دیتا۔" اجنبی بڑبڑایا۔

اس نے ایک سیاہ رنگ کا پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھر کے چقماق کی چنگاریوں سے آگ دکھائی اور کش لینے لگا۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح سلگنے لگی۔ پھر اسے دُور ہٹا کر اس میں چٹکی سے کوئی چیز ڈالی۔ جس سے ایک شعلہ اٹھا اور فوراً دھوئیں میں غائب ہو گیا۔

سڑک مرمت کرنے والا ان باتوں کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔

"ہاتھ لاؤ۔"

دونوں نے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"آج رات کو؟" سڑک مرمت کرنے والے نے پوچھا۔

"آج رات کو۔" اجنبی پائپ منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"کہاں؟"

"یہاں۔"

وہ دونوں اسی طرح پتھروں کے ڈھیر پر خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے بیٹھے رہے۔ اودے سنگینوں کے ہلکے ہلکے گلوں کی طرح بیچ میں پڑ رہے تھے کچھ دیر کے بعد مطلع صاف ہونے لگا۔

"ذرا مجھے وہ جگہ دکھاؤ" مسافر نے ٹیلے پر چڑھ کر کہا۔

"ادھر دیکھو" سڑک مرمت کرنے والے نے انگلی سے اشارہ کیا "تم یہاں نیچے اتر و گے اور پھر گلی کے اس پار فوارے کے پرے۔۔۔"

"جہنم میں جائے وہ راستہ۔ میں گلی ولی کچھ نہیں جانتا اور نہ فوارے سے مجھے کام ہے" اجنبی بیچ میں چلایا اور پھر کہنے لگا "اچھا تو پھر"

"اچھا تو پھر گاؤں کے اوپر والی پہاڑی سے دو میل آگے"

"ٹھیک ہے تم کب کام ختم کرتے ہو"

"جب سورج ڈوبتا ہے"

"یہاں سے جانے سے پہلے مجھے جگا دینا۔ میں بغیر آرام لئے دو راتوں سے چل رہا ہوں۔ ذرا یہ پائپ پی لوں تو پھر گھوڑے بیچ کر سو جاؤں گا جاتے ہوئے مجھے جگا دو گے نا"

"ضرور"

مسافر نے پائپ پی کر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور پھر اپنے بڑے بڑے چوبی جوتے اتار کر پتھروں کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ دم بھر میں وہ دنیا سے بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ سڑک مرمت کرنے والا کام کرتے کرتے گرد سے اٹ گیا تھا۔ بادل چھٹ رہے تھے

سفید روشنی کی دھاریاں زمین اور آسمان پر چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہمارا کاریگر جواب نیلی ٹوپی کی جگہ سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ پتھروں کے ڈھیر پر سونے والے کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس قدر انہماک سے کہ اسے اپنے کام کی بھی سدھ بدھ نہ تھی۔ کانسے کا سا چہرہ۔ الجھے ہوئے سیاہ بال اور وہ اس کی ڈاڑھی، سرخ رنگ کی کھردری اونی ٹوپی، جانوروں کی کھال اور دستی پارچے سے بنا ہوا بھدا لباس، مضبوط جسم جو کافی غذا ملتی تو اور بھی مضبوط ہو سکتا تھا۔ نیند میں غصے اور ناامیدی سے بھینچے ہوئے ہونٹ، سڑک مرمت کرنے والے کو مرعوب کر رہے تھے۔ مسافر بہت دور سے آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں چھل گئے تھے اور ٹخنوں سے خون نکل رہا تھا۔ بڑے بڑے جوتے جس میں گھاس پھوس بھرا تھا کوسوں کا سفر کرنے کے لئے بہت زیادہ بوجھل تھے۔ اس کے کپڑوں میں سوراخ اور جسم پر خراشیں تھیں۔ سڑک مرمت کرنے والے نے جھک کر جیبوں میں چھپے ہوئے ہتھیاروں کا پتہ چلانے کی ناکام کوشش کی۔ مسافر کے ہاتھ سینے پر اس مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ جس مضبوطی سے اس کے ہونٹ بند تھے۔ سڑک مرمت کرنے والے کی نظر میں قلعہ بند شہر، فصیلیں، محافظ خانے، دروازے، خندقیں اور ان خندقوں کے پل سب اس شخص کے آگے ہیچ تھے۔ اور جب اس نے آنکھ اٹھا کر افق کی طرف دیکھا اور چاروں طرف نظر ڈالی تو اس کی کوتاہ بیں نگاہوں میں بھی ایسی کئی شکلیں ملک کے طول و عرض میں بے روک بڑھتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

• وہ شخص برابر سوتا رہا۔ نہ اس پر باد و باراں کا اثر ہوا نہ سورج کی شعاعوں کا، نہ

دھوپ کا نہ سائے کا۔ نہ جسم پر گرنے والے اولوں کا جو سورج کی روشنی میں ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ آفتاب غروب ہونے تک یونہی سوتا رہا۔ تب سڑک مرمت کرنے والے نے اپنا کام کرکے اوزار جمع کرتے ہوئے اسے جگایا۔

"ٹھیک ہے" اجنبی نے نیند سے جاگتے ہی کہا "پہاڑی کی چوٹی سے دو کوس آگے"

"قریب قریب"

"قریب قریب — ٹھیک ہے"

ہوا کے رخ کے ساتھ آگے آگے گرد اڑاتا ہوا سڑک مرمت کرنے والا گھر جاتے ہوئے فوارے پر پہونچا جہاں مویشی پانی پی رہے تھے۔ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ گاؤں والوں کے ساتھ وہ جانور بھی اس کی سرگوشیاں سن رہے تھے۔ جہاں گاؤں والے شام کا روکھا سوکھا کھانا کھا چکے تو وہ اس دفعہ حسب عادت سوئے نہیں۔ بلکہ دروازوں سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ اور ان میں سرگوشیوں کی وبا سی پھیل گئی اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف ایک خاص سمت میں دیکھنے کا مرض لاحق ہو گیا۔ گاؤں کے مکھیا موسیو گیبل پریشان تھے۔ وہ بھی اکیلے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر اسی جانب دیکھنے لگے۔ اور اپنے گھر کے دودکش کی آڑ لے کر فوارے کے ارد گرد جمع ہونے والوں کے برہم چہروں پر نظر ڈالنے کے بعد گرجا کے دربان کو کہلا بھیجا کہ گھنٹے بجانے کا وقت شاید قریب آگیا ہے۔

رات بڑھتی گئی۔ پرانے محل کے اطراف کے درخت ہوا کے زور سے یوں ہل رہے تھے جیسے وہ تاریک و تنہا عمارت کی وسیع بنیادوں کو دھمکیاں دے رہے ہوں۔ سیڑھیوں کے

بارش کا تانتا بندھا تھا۔ اور پانی دروازے پر شور مچا کر کسی تیز رو قاصد کی طرح اندر والوں کو جگا رہا تھا۔ ہوا کے جھکڑ قدیم پیڑوں اور پھروں سے بھرے ہوئے ہال میں داخل ہو کر زینے سے گزرتے ہوئے شور مچا مچا کر اس پلنگ کے پردوں کو بار بار ہلا رہے تھے۔ جس پر آخری رئیس نامدار کبھی محو خواب رہا کرتے تھے۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف سے جھاڑیوں کو روندتے اور گھاس کو مسلتے ہوئے چار بٹے کٹے بھونڈے اشخاص صحن کی سمت بڑھ رہے تھے۔ جہاں چار روشنیاں دکھائی دیں اور پھر وہ مختلف سمتوں میں حرکت کرتی ہوئی غائب ہو گئیں اور تھوڑی دیر کے لئے پھر اندھیرا چھا گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے لئے۔ جلد ہی محل کے بام و در نمودار ہونے لگے۔ جیسے وہ کسی اندرونی روشنی سے چمک رہے ہوں۔ پھر عمارت کے اگلے حصے روشن ہو گئے۔ اور یکے بعد دیگرے کھمبے کمانیں اور دریچے نظر آنے لگے۔ پھر روشنی اور ذرا بلندی پر پھیلی اور بیسیوں کھڑکیوں میں سے شعلے نکل نکل کر پتھر کے مجسموں کے مبہوت چہروں کو چمکانے لگے۔

دکان میں چند ہی لوگ رہ گئے تھے۔ ان میں کچھ ہل چل پیدا ہوئی اور ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اندھیرے میں کچھ ایڑ لگائے اور چھپ چھپ کرنے کے بعد گاؤں کے فوارے کے قریب موسیو گیبل کے دروازے پر گھوڑا رکا: ہماری مدد کرو۔ گیبل اور سب لوگ بھی ہماری مدد کو آئیں۔ گھنٹے لگاتار بجتے گئے۔ لیکن مدد کے لئے وہاں کوئی دوسرا تیار نہیں تھا۔ سڑک مرمت کرنے والا اور اس کے ڈھائی سو ساتھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے فوارے کے پاس سے آگ کے ستون کو دیکھتے رہے۔ "ہوگا کوئی چالیس فٹ اونچا"

انھوں نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

محل کا سوار اپنے تیز رو گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں میں سے گذر کر پہاڑی کے قید خانے تک پہونچا جہاں پھاٹک پر چند افسر اور تھوڑی دور پر کچھ سپاہی آگ کا تماشا دیکھ رہے تھے "افسر صاحبان۔ آپ ہماری مدد کریں۔ محل جل رہا ہے۔ بروقت امداد سے قیمتی سامان کو شعلوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ خدارا ہماری مدد کیجئے" افسروں نے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ سپاہی آگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انھیں حکم دینے کی بجائے کندھے ہلا ہلا کر ہونٹ چباتے ہوئے افسروں نے جواب دیا "وہ تو جل کے رہے گا"

سوار پہاڑی سے نیچے اتر کر جب گلیوں میں گھوڑا دوڑانے لگا تو سارا گاؤں روشنی کرنے میں مصروف تھا۔ سڑک مرمت کرنے والا اور اس کے ڈھائی سو دوست جسد واحد کی طرح جشن چراغاں کی تیاری میں دوڑ دھوپ کر کے اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیوں کے شیشوں میں موم بتیاں جلا رہے تھے۔ اور چونکہ ہر قسم کے سامان کی قلت تھی۔ اس لئے موسیو گیبل کو چار و ناچار موم بتیوں کے مطالبے پورے کرنے پڑے۔ اور جب اس کارکن نے ذرا تامل کیا تو سڑک مرمت کرنے والے نے جو کبھی از حد اطاعت گذار تھا دھمکی دی کہ گاڑیاں جلانے کے کام آسکتی ہیں اور گھوڑے بھونے جاسکتے ہیں۔

محل شعلہ پوش تھا۔ آتش زنی کے جوش و خروش میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ کی آگ محل کو اپنی جہنمی سانس سے پھونک دے گی۔ جوں جوں شعلے بھڑکتے پتھر کے مجسموں کی شکلیں یوں دکھائی دیتیں جیسے ان پر عذاب نازل ہو رہا ہو۔ جب بڑے بڑے پتھر

لڑھکتے اور وزنی چوبینے نیچے گرتا تو وہ چہرہ جس کی ناک میں شگاف تھا چھپ جاتا
اور پھر دھوئیں میں سے نمودار ہوتا گویا کہ وہ ظالم مارکوئیس ہے۔ جو کیسے پر زندہ جلایا
جا رہا ہو۔ اور جلتے جلتے آگ سے دست و گریباں ہو۔

محل جل رہا تھا۔ نزدیک کے درخت آگ سے جھلس گئے تھے۔ دور کے درخت
جنہیں ان چار غضبناک افراد نے آگ لگا دی تھی شعلہ پوش عمارت کے اطراف دھوئیں کا
ایک جنگل سا پھیلا رہے تھے۔ فوارے کے مرمریں حوض میں پگھلا ہوا لوہا اور سیسہ کھول
رہا تھا۔ پانی خشک ہو گیا تھا۔ برجوں کی آگ فرو کرنے والی چھتیں خود برف کی مانند گرمی
سے پگھل کر شعلوں کی دیواروں میں بوندوں کی طرح ٹپک رہی تھیں۔ مضبوط دیواروں میں
اتنے بڑے شگاف پڑ گئے تھے کہ وہ بلور کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ پرندے حدت سے
پاگل ہو کر ادھر ادھر اڑتے ہوئے اس بھٹی میں گر جاتے تھے۔ پھر وہ چار غضبناک افراد
مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف اندھیری سڑکوں پر اپنی ہی لگائی ہوئی آگ کی
روشنی میں دوسری منزل کی طرف آگے بڑھے۔ سارا گاؤں چراغاں تھا۔ اور گرجا کے گھنٹہ
گھر پر ناجائز قبضہ کر کے خوشی کے گھنٹے بجا رہا تھا۔

یہی نہیں بلکہ قحط آگ اور گھنٹوں کے شور سے بیخود ہو کر گاؤں والے دیوگیبل
کی خبر لینے پر تل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہی شخص لگان اور ٹیکس وصول کرتا ہے۔ حالانکہ
اس سال بہت کم ٹیکس وصول ہوا تھا۔ اور لگان تو کچھ بھی جمع نہیں ہوا تھا۔ بہرحال وہ
اس کے گھر کے اطراف اکٹھے ہو گئے اور اسے گفتگو کے لئے باہر نکلنے پر مجبور کرنے لگے۔ اس

گفتگو کے بجائے موسیوگیبل نے دروازے بند کرکے خود اپنے سے تنہائی میں گفتگو کرنے میں زیادہ مصلحت دیکھی اور اس خود کلامی کے نتیجے کے طور پر چھت پر چڑھ کر گھر کے دودکش کے پیچھے پناہ لی۔ موسیوگیبل کا مصمم ارادہ تھا کہ اگر کوئی دروازہ توڑکر اندر گھسے تو وہ کٹ گرے چھلانگ لگا کر اپنے ساتھ دو ایک کو لے مریں۔ وہ جنوب کے رہنے والے ایک معمولی آدمی تھے۔ ان کی طبیعت انتقام پر مائل تھی۔

رات بھر موسیوگیبل شاید اسی طرح چھت پر کھڑے رہے۔ دور جلتا ہوا محل آتشدان اور شمع دان دونوں کا کام دے رہا تھا۔ موسیقی کے بدلے دروازہ مارنے کی آوازیں تھیں۔ ان کے پھاٹک کے سامنے ایک لالٹین بھی کھمبے پر لٹک رہی تھی۔ سارے گاؤں کی آرزو تھی کہ لالٹین کی جگہ انھیں وہاں لٹکایا جائے۔ امید و بیم کی عجیب کیفیت ان پر طاری تھی۔ خطرات کے سمندر کے کنارے گرمی کی طویل رات گزارنا اور بوقت ضرورت نیچے کود پڑنے پر آمادگی موسیوگیبل کے لئے کوئی تفریح نہیں تھی۔ بالآخر امید کی صبح طلوع ہوئی۔ گاؤں کے جلدی میں جلائے ہوئے چراغ گل ہوتے ہی لوگ خوش قسمتی سے منتشر ہونے لگے۔ اور موسیوگیبل جان بھی لاکھوں پائے کا احساس لئے ہوئے نیچے اترے۔

وہاں سے سو میل کے اندر دوسرے شعلہ پوش مکانوں کی روشنی میں کئی اور کارکن اتنے خوش نصیب نہیں تھے۔ اس رات کو اور کئی راتوں کو بہتیرے بدبخت اپنے مکانوں کے آگے سڑکوں پر لٹکا دیئے گئے۔ ان سڑکوں پر جہاں کبھی انھوں نے پرامن حالات میں پرورش پائی تھی۔ صبح کی روشنی ان کے بے جان جسموں پر نوحہ خواں تھی۔ نیز بعض دوسرے

گاؤں والے اور شہری ہمارے سڑک مرمت کرنے والے اور اس کے ساتھیوں کی طرح خوش نصیب نہیں تھے اور انھیں کارکنوں اور سپاہیوں نے اٹھا اٹھا درختوں پر لٹکا دیا تھا۔ جو کچھ بھی ہو غضبناک افراد مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف برابر گھوم رہے تھے اور چاہے کسی کو بھی لٹکایا جائے، آگ پھیلتی جاری تھی۔ ایسی سولی جو اس آگ کو بجھانے میں پانی کا کام دے، کسی کارکن نے کسی ریاضی کی مدد سے ابتک دریافت نہیں کی تھی۔

چوبیسواں باب

مقناطیسی چٹان کی کشش

آتش و آب کا سیل بڑھتا جارہا تھا۔ زمین کی مضبوط سطح تہ و بالا ہو رہی تھی غضبناک سمندر کی موجیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں جنھیں دیکھ کر ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کے دل ہیبت و حیرت سے دھڑک رہے تھے۔ اس طرح تین طوفانی سال گذر گئے۔ اس عرصے میں ننھی لوسی کے گھر والوں کی پرسکون زندگی کے تانے بانے میں بھی بچی کی تین سالگرہوں کے سنہری بندھنوں کا اضافہ ہو گیا۔

کئی دنوں اور کئی راتوں سے اس گوشۂ عافیت میں قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان قدموں کی آہٹیں سُن سن کر گھر والوں کے دل بیٹھ رہے تھے وہ قدم اٹھتے

ذہنوں میں ایسے کروڑوں انسانوں کے قدم تھے جن کا سرخ پھریرا عوام کے سروں پر لہرایا
تھا۔ جن کا ملک خطرے سے دوچار تھا اور جنہیں سالہا سال کی وحشتناک جادوگری نے
جنگلی جانور بنا دیا تھا۔

بحیثیت طبقے کے رؤسا اپنی ناقدری کے ماحول سے علیحدہ ہو چکے تھے فرانس میں ان
سے اس قدر بیزاری تھی کہ اگر وہ وہاں سے نہ جاتے تو ملک ہی سے نہیں دنیا سے بھی انھیں
رخصت کر دیا جاتا اس گنوار کی طرح جو ایک کہانی میں بڑی مصیبتوں سے شیطان کو بلانے
میں کامیاب ہوتا ہے اور پھر خوف کے مارے بغیر کچھ پوچھے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ رئیس نامدار
بھی تسخیر شیاطین کے لیے بہت سے کارآمد عملیات کرنے اور کئی سال تک الٹی طرف سے
دعائیں پڑھنے کے بعد ابلیس کی صورت دیکھ کر ہیبت سے فرار ہو گئے۔

دربار کا چمکتا ہوا "چاند" غائب ہو چکا تھا ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ سے ایسی چاند
ماری ہوتی کہ خدا کی پناہ۔ شاہی آنکھیں یوں بھی خراب تھیں۔ کئی برس سے عزازیل کے بچہ اور
نینوا کے بادشاہ سارڈانے پلس کی سی عیاشی نے بینائی کو کمزور کر دیا تھا۔ اور اب تو آنکھیں
بالکل جاتی رہی تھیں۔ اندر سے باہر تک سازش، بددیانتی اور منافقی کے تمام رشتے گلے جیسے کٹ
چکے تھے۔ شاہی رخصت ہو چکی تھی اور قصر کا محاصرہ کیا گیا اور پھر آخری خبر یہ سننے میں آئی کہ
جہاں پناہ کو معطل کر دیا گیا ہے۔

۱۷۹۲ء کا اگست گزر چکا تھا اور رؤسا دور دور تک منتشر ہو چکے تھے۔
تھیلسن بینک لندن میں فرانسیسی رئیسوں کا اڈہ بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی

میں جسم جہاں عام طور پر رہنے کے عادی ہوں مرنے کے بعد روحیں انہی مقامات پر منڈلاتی ہیں رئیس نامدار کی گرہ میں ایک اشرفی بھی نہیں تھی مگر جس جگہ کبھی ان کی اشرفیاں رہا کرتی تھیں اس مقام کے وہ چکر کاٹنے لگے۔ علاوہ ازیں اس مقام پر تازہ ترین معتبر خبریں بھی مل جاتی تھیں۔ اور پھر ٹیلسن بینک کی فیاض دلی مشہور تھی اور شکستہ حال گاہکوں سے اس کا سلوک بے حد فیاضانہ تھا۔ نیز چند امراء طوفان کی آمد سے پہلے ضبطیوں اور لوٹ کھسوٹ کے اندیشے سے ٹیلسن بینک کو اپنا بہتیرا اثاثہ منتقل کر چکے تھے۔ ایسے امیروں کا پتہ ان کے نادار بھائیوں کو وہاں آسانی سے مل جاتا تھا۔ مزید برآں ہر فرانسیسی نووارد لازمی طور پر وہاں اپنی آمد کی اطلاع دیتا اور دوسری خبریں پہونچاتا۔ ان اسباب کی بنا پر ٹیلسن بینک اس زمانہ میں فرانسیسی خبر رسانی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پبلک اس سے پوری طرح واقف تھی۔ اور استفسارات کا سلسلہ اس قدر طویل ہوتا تھا کہ بعض دفعہ خود بینک والے تازہ ترین خبروں کا مختصر بلیٹن تیار کر کے دریچوں پر چسپاں کر دیتے تھے تاکہ ٹیمپل بار سے گزرنے والے اس کو پڑھ لیں۔

ایک کہر آلود شام کو مسٹر لاری اپنی میز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور چارلس ڈارنے اس میز پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ ان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کال کوٹھری جو کبھی ملاقات کا کمرہ کہلاتی تھی اب وہاں خبریں سننے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بینک بند ہونے میں آدھے گھنٹے کی دیر تھی۔

"مگر آپ دنیا کے سب سے نوجوان انسان ہوتے بھی تو میں مشورہ دیتا" چارلس ڈارنے نے رکتے رکتے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ کا مطلب کیا ہے۔ یعنی میں بہت بوڑھا ہوں" مسٹر لاری

نے کہا۔

"خراب موسم، لمبا سفر، آمد ورفت کے غیر یقینی حالات، ملک کی بدنظمی، اور ایک ایسا شہر جہاں آپ محفوظ بھی نہ رہ سکیں!!"

"عزیز چارلس" مسٹر لاری نے مسکراتے ہوئے خود اعتمادی سے کہا "یہ صحیح ہے — لیکن یہ دلیلیں تو میرے سفر کا جواز ہیں نہ کہ قیام کا۔ مجھے کیا خطرہ ہے جہاں ہزاروں نوجوان موجود ہوں وہاں مجھ جیسے اسّی برس کے بوڑھے پر کون روک ٹوک لگائے گا۔ اور اگر شہر میں بدنظمی نہ ہوتی تو ہماری اس شاخ سے وہاں کی شاخ کو کسی معتبر اور واقف کار آدمی کو جانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ جہاں تک آمد ورفت کے غیر یقینی حالات اور لمبے سفر اور موسم سرما کا تعلق ہے۔ اگر قدیم تعلق کے باوجود ٹیلسن کی خاطر میں تھوڑی سی تکلیف نہ اٹھاؤں تو پھر دوسرا کون اس کا مستحق ہے"

"کاش میں خود جاتا" چارلس ڈارنے نے فکرمندی سے کہا۔ جیسے وہ گفتگو نہیں بلکہ خود کلامی کر رہا ہو۔

"کیا خوب آپ کے اعتراضات اور مشوروں کا کیا کہنا" مسٹر لاری حیرت سے بول اٹھے "آپ جانا چاہتے ہیں!! آپ جن کا پیدائشی وطن فرانس ہے!! کتنے عقلمند ہیں آپ بھی!!"

"مسٹر لاری۔ عزیز دوست۔ میں فرانس میں پیدا ہوا ہوں۔ اسی لئے تو یہ خیال جو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بارہا میرے ذہن میں آیا ہے۔ جیسے غریبوں سے ہمدردی

رہی ہو اور جس نے ان کی خاطر کچھ قربانی بھی دی ہو" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اس شخص کی بات شاید وہ لوگ سن لیں اور کسی حد تک ضبط سے کام لیں۔ کل رات ہی کا ذکر ہے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد میں لوسی سے کہہ رہا تھا۔"

"آپ لوسی سے کہہ رہے تھے" مسٹر لاری نے بات دہرائی "آپ کو لوسی کا نام درمیان میں لاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس زمانے میں آپ فرانس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں"

"لیکن جا نہیں رہا ہوں" چارلس ڈارنے نے مسکراتے ہوئے کہا "سردست تو آپ فرما رہے ہیں کہ آپ جا رہے ہیں"

"واقعہ ہے" مسٹر لاری نے دور عمارت کی طرف نظر دوڑائی اور آہستہ سے کہا۔

"میرے عزیز چارلس سچ پوچھو تو تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ کس مشکل سے ہمارا کاروبار چل رہا ہے اور وہاں ہمارے حساب کتاب کے رجسٹر کس خطرے میں ہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے اگر ہماری بعض دستاویزیں دوسروں کے ہاتھ لگیں یا انھیں تلف کر دیا جائے تو کتنے لوگوں پر مصیبت نازل ہو۔ اور یہ کوئی ناممکن امر نہیں کسی وقت بھی پیرس کو لوٹا یا جلایا جا سکتا ہے چند منتخب تمسکات کو جلد سے جلد تہہ خانوں میں چھپانا یا کہیں منتقل کر دینا نہایت ضروری ہے اور یہ کام صرف میں انجام دے سکتا ہوں ٹیلسن والے اس سے واقف ہیں۔ اور مجھ سے اس کی خواہش ظاہر کی ہے۔۔۔ ٹیلسن والے جن کا ساٹھ سال تک میں نے نمک کھایا ہے۔۔۔ تو کیا میں اس لئے انکار کر دوں کہ میرے جوڑ ذرا اکڑ جاتے ہیں۔۔۔ ابھی جناب! بعض کھوسٹ بوڑھوں کے مقابلے میں تو ابھی میں لونڈا نظر آتا ہوں"

• مسٹر لاری ۔ میں آپ کی جوان طبیعت اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا "
• رہنے بھی دو، صاحب . . . میرے عزیز چارلس " مسٹر لاری نے پھر دور کی عمارت پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا " تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ آج کل کسی بھی سامان کو پیرس سے باہر لے جانا تقریباً ناممکن ہے ۔ میں تم سے راز میں کہہ رہا ہوں (اگرچہ مجھے تم سے بھی چھپانا چاہئے تھا) کہ آج ہی بعض کاغذات اور قیمتی اشیاء عجیب و غریب قاصدوں کے ذریعے وصول ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی جان سرحد پار کرتے ہوئے بال بال بچی ہے ۔ پرانے زمانے میں ایسے پارسل اتنی ہی آسانی سے ارسال کئے جاتے تھے ۔ جتنی سہولت سے خود انگلستان میں ہم کاروبار کرتے تھے ۔ لیکن اب ہر چیز کی ممانعت ہے "
• تو کیا آپ واقعی آج رات کو روانہ ہو رہے ہیں "
• میں واقعی آج رات کو روانہ ہو رہا ہوں ۔ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تاخیر ممکن نہیں "
• اور کیا آپ کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہوگا "
• میرے ساتھ جانے کے لئے کئی لوگوں کے نام لئے گئے ۔ لیکن میں نے صرف جیری کو منتخب کیا ہے ۔ برسوں سے جیری نے ہر اتوار کی رات کو میرے محافظ کے فرائض انجام دیئے ہیں ۔ اور میں اس کی سنگت کا عادی ہو چکا ہوں ۔ سب سمجھیں گے کہ جیری انگریزی بلڈاگ ہے اور اس کے دماغ میں سوائے اپنے مالک کے مدمقابل پر حملہ کرنے کے اور کوئی خیال آ نہیں سکتا "

• میں پھر کہتا ہوں آپ کی جوان طبیعت اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا "

"میں پھر کہتا ہوں ۔ واہیات ... واہیات . . . . جب میں اپنی یہ ڈیوٹی ادا کر دوں گا تو شاید ٹیلسن والوں کی تجویز کے مطابق پنشن لے کر آرام سے رہوں گا۔ اس وقت بڑھاپے کے بارے میں سوچنے کے لئے کافی وقت ملے گا۔"

یہ گفتگو مسٹر لاری کے میز کے پاس ہو رہی تھی۔ دو ایک گز کے فاصلے پر فرانس کے کئی رئیس نادار نابکار عوام سے انتقام لینے کی ڈینگیں مار رہے تھے۔ پناہ گزینی کی ناکام زندگی میں ان رئیسوں کا یہی ایک شغل رہ گیا تھا۔ ادھر انگریز قدامت پرستوں کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ مہیب انقلاب بغیر کسی وجہ کے رونما ہوا ہے جیسے یہ کھیتی آپ ہی آپ بغیر بوئے اور جوتے تیار ہو گئی ہے۔ جیسے فرانس کے کروڑوں بدنصیبوں کی حالت زار سے کوئی واقف نہیں تھا۔ اور ان کی فلاح و بہبود پر جو روپیہ خرچ ہونا چاہئے تھا اس کے بے دریغ اسراف کا کسی کو علم ہی نہیں تھا۔ اور جیسے کسی نے اس ناگزیر انجام کی پیش قیاسی نہیں کی تھی۔ جن لوگوں کو حقیقت حال کا علم تھا وہ اس قسم کے جوش و خروش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور نہ رئیسوں کی من مانی سازشوں پر خاموش رہ سکتے تھے۔ یہ رئیس اپنے ناگفتہ بہ حالات کو جو ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکے تھے واپس لانا چاہتے تھے۔ اس ادھیڑبن اور الجھن میں جو چارلس ڈارنے کو ہر وقت گھیرے رہتی اپنے ہم وطنوں کا جوش و خروش ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے خود اس کے کان بجنے کی آوازیں آ رہی ہوں۔

شاہی عدالت کا وکیل اسٹرائیور بھی انہی بکواس کرنے والوں میں تھا وہ بڑے عہدے کے لالچ میں اس مسئلے پر بہت زور شور سے بحث کرتا تھا۔ وہ رئیسوں کو ایسی تدبیریں بتاتا تھا کہ

بقول اس کے ساری قوم ایک دھماکے سے اڑ جائے اور سب عوام صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں۔ اور اسی قسم کی دوسری تدبیریں جن کی مثال ایسی تھی جیسے کوئی کہے کہ شکاری پرندوں کی دموں پر نمک چھڑکنے سے ان کی تمام نسلیں نیست و نابود ہو جائیں گی۔ ڈارنے کو اس کی باتیں قطعی ناپسند تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہاں سے چپ چاپ چلا جائے یا اپنی رائے ان لوگوں پر ظاہر کرنے کیلئے ٹھیرا رہے جب کہ پیشانی کا لکھا پیش آگے رہا۔

دفتر والے مسٹر لاری کے پاس آئے اور ایک بند لفافہ جس پر دھبے پڑے تھے پیش کرتے ہوئے پوچھنے لگے کہ مکتوب الیہ کا کوئی پتہ چلا ہے یا نہیں۔ دفتر والوں نے خط ڈارنے کے اس قدر نزدیک رکھ دیا کہ وہ پتہ پڑھ سکتا تھا اور چونکہ اسی کا اصلی نام لکھا تھا وہ اور بھی آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ پتے کا ترجمہ یہ تھا: جناب سابق مارکوئس سینٹ ایورمانڈ آف فرانس۔ بتوسط مسرز ٹیلسن اینڈ کمپنی، بنکرس، لندن، انگلینڈ۔"

شادی کی صبح کو ڈاکٹر مینٹ نے چارلس ڈارنے کو تاکید کی تھی کہ جب تک خود وہ اجازت نہ دے ڈارنے کا اصلی نام راز میں رکھا جائے۔ یہ بات کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھی۔ خود اس کی بیوی کو کبھی اس کا گمان بھی نہیں ہوا۔ پھر مسٹر لاری کیسے واقف ہو سکتے تھے۔

"کچھ پتہ نہیں" مسٹر لاری نے دفتر والوں کو جواب دیا۔ میں نے یہاں ہر شخص سے دریافت کیا۔ لیکن کوئی ان صاحب کا پتہ نہیں جانتا۔"

بنک کے کاروبار کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ مسٹر لاری کی میز کے قریب لوگوں کا شور

کافی تھا۔ وہ خط آگے بڑھا کر ہر ایک سے دریافت کرنے لگے۔ اور سب سابق رئیس جواب غصّے سے بھرے سازشی پناہ گزیں تھے فرانسیسی یا انگریزی میں روپوش مارکوئیس کے خلاف کچھ نہ کچھ اہانت آمیز جملے کہہ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ معزز مقتول مارکوئیس کا نابکار بھتیجا ہے"۔ ایک نے کہا۔ "خوش قسمتی سے میں اسے نہیں جانتا۔"

"ڈرپوک بھگوڑا جس نے چند سال پہلے اپنے فرائض سے گریز کیا"۔ دوسرے رئیس فرمانے لگے جنہیں پیرس سے باہر گھاس کی گاڑی میں نیچے سر اوپر ٹانگیں کئے ہوئے لایا گیا تھا۔

"نئے خیالات کے مرض سے متاثر تھا"۔ اپنے چشمے میں سے راستہ دیکھتے ہوئے تیسرے صاحب نے کہا "آخر مارکوئیس کی مخالفت کرتا رہا۔ ورثے میں جو جائیداد ملی اس سے دست بردار ہو کر اپنا سب کچھ بدمعاشوں کے حوالے کر دیا۔ اب میرے خیال میں وہ لوگ اس کو مناسب صلہ دیں گے۔"

"اچھا یہ بات ہے"۔ بلند آواز سے اسٹرائیور چلایا "کیا وہ اس قسم کا آدمی ہے ذرا میں دیکھوں تو اس بدنام شخص کا نام۔ جہنم میں جائے۔"

ڈارنے سے مزید صبر نہ ہو سکا، اور اس نے مسٹر اسٹرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں اس شخص کو جانتا ہوں۔"

"واقعی۔ بخدا" اسٹاپیڈر نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"کیوں؟"

"کیوں! مسٹر ڈار نے۔ یہ نہیں آپ نے اس کے کرتوت۔ اس زمانے میں کیوں کا لفظ منہ سے نہ نکالئے۔"

"لیکن میں پھر پوچھوں گا۔ کیوں؟"

"تو مسٹر ڈار نے میں پھر آپ سے کہوں گا کہ مجھے افسوس ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسے غیر معمولی سوالات کر رہے ہیں۔ ذرا اس شخص کو دیکھئے جس نے شیطنت کے سب سے زہریلے اور ملحدانہ اصول سے متاثر ہو کر اپنی جائداد روئے زمین کے بدترین قاتلوں کے حوالے کر دی اور آپ پوچھتے ہیں کہ کیوں۔ مجھے افسوس ہے کہ نوجوانوں کا ایک معلم اس شخص سے واقف ہے۔ اچھا۔ تو سنئے میرا جواب۔ مجھے اس لئے افسوس ہے کہ میں باور کرتا ہوں کہ اس بدمعاش کا مرض متعدی ہے۔ سمجھے آپ؟"

ڈار نے کو راز فاش ہونے کا ڈر تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے ضبط کیا اور صرف اتنا کہا: "آپ اس شریف آدمی کے احساسات کو نہیں سمجھتے۔"

"مسٹر ڈار نے۔ میں اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ کو کس طرح قائل کیا جائے۔" مردم آزار اسٹرائیور نے کہا۔ "اور میں کر کے دکھاؤں گا۔ اگر یہ شخص شریف آدمی ہے تو میں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ آپ میری طرف سے اسے تحفتاً یہ پیام پہونچا دیں۔ آپ یہ بھی کہہ دیں کہ اپنی دولت اور پوزیشن ان قصابوں کے حوالے کرنے کے بعد مجھے حیرت ہے وہ ان کا سردار کیوں نہیں بنا۔

لیکن صاحبو!" اسٹرائیور چاروں طرف دیکھ کر چٹکی بجاتے ہوئے بولا "میں انسانی فطرت سے کسی قدر واقف ہوں اور میں آپ سے کہتا ہوں اس قسم کے لوگ ایسے نایاب چیلے چانٹوں کے رحم وکرم پر بھروسہ نہیں کرتے۔ نہیں صاحبو۔ وہ ہر وقت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے گا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی فرار ہو جائے گا۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے آخری بار چٹکی بجا کر مسٹر اسٹرائیور نے لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے ادھر فلیٹ اسٹریٹ کی راہ لی۔ اور ادھر سامعین نے ان کی تقریر کی دل کھول کے داد دی جب لوگ بنک سے جا چکے تو ڈارنے اور مسٹر لاری میز کے پاس تنہا رہ گئے۔

"کیا یہ خط آپ کے حوالے کر دوں [illegible] آپ کو پتہ معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم ہے۔"

"کیا آپ واقعات بتادیں گے۔ یہ [illegible] محض ایک اندازے پر شاید ہمیں پتہ معلوم ہو۔ یہ ہمارے توسط سے بھجوایا گیا ہے [illegible] سمجھ کر چند دنوں سے یہ خط یہیں رکھا تھا۔"

"میں ضرور بتادوں گا۔ کیا آپ پیرس [illegible] سے روانہ ہوں گے؟"

"یہیں سے آٹھ بجے۔"

"میں آپ کو خدا حافظ کہنے کے لئے [illegible] آؤں گا۔"

خود اپنے سے غیر مطمئن۔ اسٹرائیور [illegible] سے غیر مطمئن۔ ڈارنے کسی طرح ٹیمپل کی خاموش فضا میں پہونچ کر خط [illegible] جس کی عبارت یہ تھی:۔

" ایبے کا قید خانہ، پیرس۔

۱۲؍جون ۱۷۹۲ء

جناب سابق مارکوئیس صاحب

مدت تک گاؤں والوں کے ہاتھوں جان کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ پھر مجھے ماریپیٹ اور ذلت کے ساتھ گرفتار کرکے کوسوں پیدل چلاتے ہوئے پیرس لایا گیا۔ راستے میں مجھے بڑی تکلیفیں پہونچیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا گھر مسمار کر دیا گیا ہے۔ بالکل زمیں دوز ہوگیا ہے وہ۔

سابق مارکوئیس صاحب! جس جرم کی پاداش میں مجھے قید کیا گیا ہے۔ اور جس کے لیے [illegible] عدالت [illegible] پیش ہو کر [illegible] سے اپنی صفائی [illegible] گا بجز اس کے کہ آپ مجھے [illegible] وہ جرم [illegible] وطن کی مدد کرکے عوام کی مخالفت کی ہے۔ اور اپنی مقتدر قوم سے غداری کا مرتکب ہوا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آپ کے احکام کی تعمیل کرکے عوام کی تائید کی ہے نہ کہ مخالفت۔ مگر میری شنوائی نہیں ہوتی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ تارکان وطن کی جائداد تحویل عدالت میں آنے سے پہلے میں نے وہ سب ٹیکس معاف کر دیئے تھے جو یوں بھی وصول نہیں ہو رہے تھے اور یہ کہ میں نے کوئی لگان نہیں جمع کیا اور نہ کوئی قانونی کارروائی کی۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ بس ایک ہی راگ الاپا جاتا ہے کہ میں ایک تارک وطن کا نمائندہ ہوں وہ تارک وطن کہاں ہے پتہ بتاؤ۔

آہ، میرے سب سے بڑے مشفق۔ جناب سابق مارکوئیس صاحب۔ وہ تارک وطن

کہاں ہے۔ میں خواب میں چلاتا ہوں وہ کہاں ہے۔ میں خدائے برتر سے پوچھتا ہوں کیا وہ مجھے بچانے کی خاطر نہیں آئے گا۔ کوئی جواب نہیں ملتا۔ آہ، جناب سابق مارکوئیس صاحب، اس امید میں کہ شاید ٹیلسن بینک کے توسط سے جو پیرس میں اس قدر مشہور ہے، آپ کے کانوں تک میری آواز پہونچ جائے۔ میں اپنی نالہ وزاری کو سمندر پار بھجوا رہا ہوں۔

جناب سابق مارکوئیس صاحب۔ آپ کو خدا کا واسطہ، انصاف۔ فیاضی، اور خاندانی عزت وشہرت کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میری مدد فرماکر مجھے رہائی دلائیے میرا قصور یہ ہے کہ میں آپ کا وفادار رہا ہوں۔ آہ، سابق مارکوئیس صاحب میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ اسی خلوص کا برتاؤ کیجئے۔

سابق مارکوئیس صاحب۔ اس ہیبتناک قید خانے سے جہاں میں روز بہ روز ہلاکت سے قریب تر ہوتا جارہا ہوں اپنی بدنصیب خدمات کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔

مصیبت زدہ
گیبل

اس خط سے ڈارنے کے ذہنی اضطراب میں انتہائی شدت پیدا ہوگئی۔ اور اب اس میں عمل کا جذبہ بیدار ہوگیا۔ ایک قدیم اور نیک خادم جس کا جرم بس اتنا ہی تھا کہ اس نے اپنے مالک اور اس کے خاندان سے وفاداری کی تھی۔ خطرے میں گھر گیا تھا اور ایسی ملامت آمیز نظروں سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آئندہ طرز عمل پر غور کرتے ہوئے ٹمپل میں چہل قدمی کرتے کرتے راہ گیروں سے اپنا منہ چھپا لیتا تو عجب نہ تھا۔

وہ خوب جانتا تھا کہ اس گھناؤنی حرکت کی وجہ سے جو خاندان کی بدنامی اور بدکاری کی انتہا تھی۔ اپنے چچا کے خلاف غصہ اور بدگمانی کے باعث اور اس بوسیدہ نظام سے نفرت کی بنا پر جس کا وہ نگہبان سمجھا جاتا تھا اس نے کوتاہی سے کام لیا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ لوسی کی محبت میں اس کا اپنے سماجی مرتبے کو قربان کر دینا چاہے کتنا ہی اس کی دلی خواہش کے مطابق ہو۔ عجلت اور کوتاہی سے خالی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے یہ کام باقاعدگی کے ساتھ اپنی نگرانی میں کروانا چاہئے تھا اور اس کا ارادہ بھی یہی تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

انگلستان میں اس کی خانہ آبادی۔ ہر وقت مصروف رہنے کی ضرورت، حوادث کی تیز رفتار، حالات زمانہ کی تبدیلیاں، جن نے ہر ہفتے ایک نیا موقف اور ہر روز ایک نئی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ ایسے واقعات تھے جن کے آگے وہ مجبور ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گو اس نے خاموشی سے سپر نہیں ڈالی، لیکن پھر بھی جیسا چاہئے تھا اس نے ان مجبوریوں کا مقابلہ نہیں کیا اس نے کچھ دنوں تک عملی اقدام کے لئے انتظار کیا تھا مگر ماہ و سال گذرتے اور بدلتے گئے یہاں تک کہ وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور فرانس کے امراء ہر بڑے چھوٹے راستے سے فرار ہونے لگے ان کی جائداد پر قرقی اور تباہی آنے لگی اور ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹنے لگا۔ وہ ان امور سے اتنا ہی واقف تھا جتنا کہ فرانس کے نئے حاکم جن کے حکم سے خود اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔

لیکن اس نے کسی پر ظلم نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کو قید نہیں کیا تھا۔ زبردستی لگان وصول کرنا ایک طرف وہ تو اپنی مرضی سے تمام مطالبات سے دست بردار ہو گیا تھا۔

اور اپنے بل بوتے پر کام کر کے اپنی روزی کما رہا تھا۔ موسیو گیبل اس مفلوک، اور مقروض جاگیر کی دیکھ بھال تحریری احکام کی بنا پر کر رہے تھے۔ انھیں ہدایت دی گئی تھی کہ رعایا سے کچھ نہ لیں اور جو کچھ بچے ان کے لئے چھوڑ دیں۔ فرض خواہ انھیں جاڑوں میں جتنا ایندھن اور گرمایں جتنا غلہ دے سکیں ان میں تقسیم کیا جائے۔ یقیناً موسیو گیبل کے پاس ان باتوں کا ذخیرہ ہوگا اور وہ اپنی سلامتی کے لئے مزد ا سے پیش کریں گے۔

پیرس کے سفر کا بے باک عزم چارلس ڈارنے کے ان خیالات سے اور بھی مستحکم ہو گیا بلاشبہ پرانی کہانی کے جہازراں کی طرح ہوائیں اور دھارے اسے مقناطیسی چٹان کے قریب لے آئے تھے اور وہ اب کھچا چلا جا رہا تھا۔ ذہن میں جو چیز بھی ابھرتی اس کو کشاں کشاں پوری قوت اور سرعت سے اس خوفناک مقام کی جانب بہلے جاتی۔ اسے ہمیشہ اس خیال سے تکلیف ہوتی تھی کہ اس کے بدنصیب وطن میں بڑے مقاصد کے لئے برے ذرائع اختیار کئے جا رہے تھے۔ اور اس جیسے نیک دل اشخاص خونریزی کو روک کر انسانیت اور رحم دلی کے مطالبے منوانے کے لئے وہاں موجود نہ تھے اس کش مکش میں کبھی وہ اپنے اضطراب کو روکتا اور کبھی خود کو ملامت کرتا۔ اور کبھی اپنا مقابلہ اس بہادر مرد سے کرتا جسے فرض کا ایسا شدید احساس تھا اس موازنے میں خود اس کا پلہ گر جاتا اور پھر رئیسوں کی تلخ طعن تشنیع اور اسٹرائیور کی زہریلی بدمزاجی کا خیال اور بھی تکلیف دہ ہو جاتا۔ سب سے آخر میں گیبل کا خط تھا۔ ایک بے گناہ قیدی جس کی جان خطرے میں تھی اسے انصاف عزت اور نیک نامی کا واسطہ دے رہا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ پیرس کا سفر اس کے لئے ناگزیر تھا۔

بلاشبہ مقناطیسی چٹان اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ تباہی کی طرف جارہا تھا۔ لیکن اسے نہ کسی چٹان کا علم تھا نہ کسی خطرے کا احساس۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ فرانس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اہل فرانس شکریے کے ساتھ اس کی خدمات کا اعتراف کریں گے جو نامکمل ہی سہی لیکن نیک ارادوں سے انجام دے گئی تھیں۔ اور پھر اچھے کاموں کا وہ حسین تصور اسے پنے لگا جو پاکیزہ ذہنوں کے لئے امیدوں کا سراب ہے اور اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ شورش و انقلاب کی بے راہ رو ... میں عوام کی کچھ نہ کچھ رہنمائی کر سکے گا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ چہل قدمی کرنے لگا۔ جانے سے پہلے وہ لوسی اور اس کے والد کو اس معاملے سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ لوسی کو جدائی کی گھڑی کے صدمے سے بچانا ضروری تھا۔ اور اس کے والد کو جو ہمیشہ ماضی کے خطرناک تجربوں کو بھلانا چاہتے تھے۔ سفر کرنے کے بعد اطلاع دی جائے تو توقع تھی کہ وہ امید و بیم کی کشاکش سے بچ جائیں گے اس مذبذب موقف کا تعلق کس حد تک ڈاکٹر مینٹ کے دل سے فرانس کی المناک یادیں مٹانے سے تھا۔ اس پر اس نے غور نہیں کیا۔ لیکن وہ چیز بھی اس کے منصوبوں میں دخیل تھی۔

وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا ٹہلتا رہا اور پھر مسٹر لاری سے رخصت ہونے کے لئے ٹیلسن بینک کا رخ کیا۔ پیرس پہونچتے ہی وہ اس قدیم دوست کا دروازہ کھٹ کھٹائے گا لیکن اس وقت کچھ نہیں کہنا چاہئے۔

بینک کے پھاٹک پر ڈاک گاڑی تیار تھی اور جیری بھی اپنی وردی پہنے ہوئے سازوسامان سے لیس تھا۔

"میں نے وہ خط پہونچا دیا ہے" چارلس ڈارنے نے مسٹر لاری سے کہا۔

"تحریری جواب مناسب نہیں۔ شاید آپ کو زبانی پیام پہونچانے میں عذر نہ ہو"

"ضرور۔ بشرطیکہ وہ کوئی خطرناک پیام نہ ہو" مسٹر لاری بولے۔

"نہیں ایسا تو نہیں۔ گو پیرس کے ایک قیدی کے نام ہے"

"کیا نام ہے اس کا" مسٹر لاری نے کھلی ہوئی نوٹ بک ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"گیبل"

"گیبل!۔ اس بدنصیب قیدی کے نام کیا پیام ہے"

"یہی کہ اس کا خط پہونچ گیا۔ اور وہ صاحب خود آنے والے ہیں"

"کس وقت"

"وہ کل صبح روانہ ہو جائیں گے"

"کسی خاص شخص کا تذکرہ"

"نہیں"

مسٹر لاری نے کئی گرم کوٹ اور لبادے زیب تن کئے۔ اس کام میں ان کی مدد کر کے ڈارنے ان کے ساتھ قدیم بنک کے گرم کمروں سے نکل کر فلیٹ اسٹریٹ کی کہر آلود ہوا میں سانس لینے لگا۔ "لوسی اور ننھی لوسی کو میری طرف سے پیار کرنا" مسٹر لاری رخصت ہوتے ہوئے بولے "میری واپسی تک ان دونوں کی اچھی طرح نگرانی کرنا" جیسے ہی گاڑی روانہ ہو گئی چارلس ڈارنے مشتبہ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلانے لگا۔

چودہ اگست کی رات کو وہ بہت دیر گئے جاگتا رہا۔ اس نے دو جذباتی خط لکھے ایک لوسی کے نام جس میں پیرس جانے کے اہم فرض کی وضاحت اور اپنے اس اطمینان کی صراحت تھی۔ کہ وہاں اس کے لئے کوئی شخصی خطرہ نہیں تھا۔ دوسرا خط ڈاکٹر کے نام تھا۔ جس میں لوسی اور ننھی بچی کو ان کے سپرد کرتے ہوئے پرزور طریقے پر وہی اطمینان کی باتیں دہرائی گئی تھیں۔ دونوں کو اس نے لکھا تھا کہ فرانس پہونچتے ہی اپنی خیروعافیت کی فوری اطلاع دے گا۔

وہ دن بڑا کٹھن تھا۔ دونوں کی مشترکہ زندگی میں پہلی بار وہ ذہنی تناؤ کے ساتھ دن گذار رہا تھا۔ اس معصوم دھوکے کو چھپانا جس کا انھیں مطلق شبہ نہیں تھا مشکل بات تھی۔ لوسی کی خاموش اعانت کے بغیر کوئی کام کرنا اس کے لئے غیر معمولی چیز تھی۔ اور وہ اصل واقعہ بیان کرتے کرتے رک گیا اور ایک شفقت بھری نظر اپنی مصروف اور خوش و خرم بیوی پر ڈال کر اخفائے راز کا پکا ارادہ کر لیا۔ وقت جلد جلد گذرتا گیا۔ شام کو اس نے لوسی اور اس کی پیاری ہم نام کو گلے لگایا اور کسی فرضی کام کا بہانہ کر کے اطمینان دلایا کہ وہ بہت جلد لوٹے گا۔ اس نے چپکے سے کپڑے وغیرہ باندھ لئے اور دل پر بوجھ لئے ہوئے سنگ بستہ سڑکوں کی بوجھل کہر میں چل نکلا۔

کوئی ان دیکھی قوت اسے کشاں کشاں اپنی طرف لے جارہی تھی۔ ہواؤں اور موجوں کا رخ تمام تر اسی جانب تھا۔ اس نے ایک بھروسے کے نوکر کو دونوں خط دیکر تاکید کی کہ آدھی رات سے کچھ پہلے انھیں پہونچا دیا جائے۔ اور فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر

ڈو ورکا راستہ لیا: "خدائے برتر کا واسطہ، فیاضی، عزت اور نیک نامی کا واسطہ" غریب قیدی کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ عزیز ترین ہستیوں کو چھوڑ کر مقناطیسی چٹان کی طرف خس و خاشاک کی طرح بہتے وقت بھی ایک خیال اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

تیسرا حصہ

طوفان کا راستہ

پہلا باب

راز کا قیدی

۱۷۹۲ء کے موسم خزاں میں انگلستان سے پیرس جانے والا مسافر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ سڑکیں بے حد خراب تھیں۔ گھوڑے نہایت نکمے اور ان کا ساز و سامان انتہائی ناقص تھا اس وقت فرانس کا بدنصیب معزول بادشاہ اپنی ساری شان و شوکت کے ساتھ تخت پر متمکن ہوتا تو بھی سفر کی یہ دشواریاں تاخیر کا باعث ہوتیں۔ لیکن اب تو بدلے ہوئے حالات میں ان کے علاوہ کچھ دوسری رکاوٹیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ ہر شہر کے پھاٹک پر اور ہر گاؤں کے چنگی گھر میں بھرمار دھار کو بندوقیں سنبھالے ہوئے پرستاران وطن کے جتھے ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ پہرہ دار تمام مسافروں کی آمد و رفت پر کڑی نگرانی رکھتے۔ ان سے پوچھ گچھ کرتے، راہداری کے پروانوں کو جانچتے، اپنی فہرستوں میں ان کے نام تلاش کرتے۔ اور پھر من مانے طور پر انھیں سفر کی اجازت دیتے، یا لوٹا دیتے یا اپنی حراست میں وہیں روک رکھتے اور اپنی دانست میں تصور کر لیتے کہ وہ آزادی برابری اور بھائی چارگی یا موت کی متحد اور غیر منقسم نوخیز ری پبلک کی خدمت بجالا رہے ہیں۔

فرانس کے سفر میں ابتدائی مرحلوں پر ہی چارلس ڈارنے کو پتہ چل گیا کہ پیرس کے حکام سے

جب تک اسے اچھے شہری ہونے کا صداقت نامہ نہ ملے واپسی کے لئے ان دیہاتی سڑکوں پر دوبارہ قدم رکھنا نصیب نہ ہوگا۔ جو کچھ بھی ہو سکے بڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہر بدحال گاؤں جس سے وہ گذرتا۔ ہر چنگی دروازہ جو اس کے گذرنے کے بعد بند ہو جاتا۔ انگلستان کی واپسی کے لئے ایک اور سدراہ تھا۔ چاروں طرف سے ہزار قسم کی نگرانی میں گھرا ہوا وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کسی جال میں پھنسا کر یا پنجرے میں بند کر کے اسے منزل تک پہونچایا جا رہا ہو۔

ہزار قسم کے نگران کا ہر مرحلے پر اسے راستے میں بیس دفعہ روکتے۔ بیس دفعہ اس کے پیچھے گھوڑے دوڑا کر اسے واپس لاتے یا اس کے آگے گھوڑے دوڑا کر اسے اپنی حراست میں لیتے۔ یونہی دن پہ دن گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ پیرس سے کئی میل دُور شاہراہ پر واقع ایک چھوٹے سے شہر میں وارد ہوا۔ اور وہاں تھکا ماندہ رات بھر کے لئے پڑا رہا۔

ابے کے قید خانے سے لکھا ہوا بدنصیب گیبل کا خط پیش نظر نہ ہوتا تو وہ اس مقام تک بھی پہونچنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس مختصر بستی کے حالات میں اسے اتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ سمجھ گیا۔ سفر کا نازک مرحلہ آپہونچا ہے۔ اس لئے جب اس چھوٹی سرائے میں جہاں اسے شب باشی کے لئے ٹھہرایا گیا تھا آدھی رات کے وقت اس کو جگایا گیا تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

جگانے والے آدمیوں میں ایک ڈرپوک مقامی افسر اور تین سرخ ٹوپیاں پہنے ہوئے مسلح پرستاران وطن تھے جو منہ میں پائپ لگائے ہوئے اس کے بستر پر آبیٹھے۔

"تارک وطن!" افسر نے کہا "میں تمہیں محافظوں کے ہمراہ پیرس بھجوانے والا ہوں"

"سٹیزن! میں پیرس ہی کا قصد رکھتا ہوں۔ لیکن محافظوں کی چنداں ضرورت نہیں"

"خاموش" ایک سرخ ٹوپی والا بندوق کا کندا لحاف پر مارتے ہوئے چلّایا "رئیس کے بچے زبان بند کر"

"معزز برادر وطن کا کہنا بالکل ٹھیک ہے" ڈرپوک افسر نے کہا "تم رئیس ہو، بغیر محافظ کے نہیں جا سکتے اور اس کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑے گا"

"جیسی آپ کی مرضی" چارلس ڈارنے نے جواب دیا۔

"جیسی آپ کی مرضی"! ذرا اور سنو" لال ٹوپی والا غصے سے بڑبڑایا "جیسے سولی پر چڑھنے سے بچانا کوئی احسان نہیں"

"معزز برادر (ان) وطن نے ٹھیک بات کہی ہے" افسر نے ہاں میں ہاں ملائی "تارک وطن! اٹھو کپڑے پہن لو"

اس حکم کی تعمیل کے بعد ڈارنے کو حوالات میں واپس لے جایا گیا۔ جہاں دوسرے پرستاران وطن الاؤ کے گرد بھدی سرخ ٹوپیاں پہنے پائپ کے کش لگاتے ہوئے شراب کے جام چڑھا رہے تھے۔ یا بے خبر سو رہے تھے۔ یہاں اسے محافظوں کے لئے بھاری رقم گرہ سے دینی پڑی اور پھر منہ اندھیرے وہ کیچڑ پانی سے بھری سڑکوں پر اپنے نگران کاروں

کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

اس کی دونوں جانب دو گھوڑوں پر سوار قومی شان سے مزین بندوقیں اور تیغے لئے ہوئے اس کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ محافظوں کے سروں پر تنگ طرے دار لال ٹوپیاں تھیں۔ ڈارنے کے گھوڑے کی باگ اس کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اس لگام سے ایک رسی بندھی تھی۔ جس کا سرا ایک پرستار وطن کی کلائی کے اطراف لپیٹ دیا گیا تھا۔ بارش کی بوچھاڑ میں سڑک کی پڑیوں پر کھٹ کھٹ کرتے راستے کے کیچڑ میں پھنستے پھنساتے وہ تینوں پویہ چال چلے جارہے تھے۔ اسی ایک انداز میں انھوں نے پائے تخت پہونچنے تک دلدل سے بھرے ہوئے کوسوں طویل راستے طے کئے۔ صرف گھوڑے بدلے گئے اور رفتار کم زیادہ ہوتی تھی، اور بس۔

وہ رات کے وقت سفر کرکے دن چڑھے ٹھہر جاتے۔ اور شام ہونے تک پڑے رہتے محافظوں کے جسم پر کافی لباس تک نہ تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے وہ اپنی برہنہ ٹانگوں اور چیتھڑے لگے بازوؤں پر گھاس پھوس لپیٹے ہوئے تھے۔ ایسے ساتھیوں کے ساتھ سفر کرنا تکلیف دہ ضرور تھا۔ خاص کر جب ان میں سے ایک پرستار وطن دن رات خطرناک حد تک نشے میں چور اپنی بندوق کو بڑی بے احتیاطی سے ساتھ رکھتا تھا تاہم چارلس ڈارنے کے دل میں ان پابندیوں کی وجہ سے بہت زیادہ خطرے کا احساس نہیں پیدا ہوا۔ وہ اس امر پر مطمئن تھا کہ ان انتظامات کو اس کے اپنے ذاتی مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ ابھی تمام واقعات ظاہر نہیں کئے گئے تھے اور نہ وہ شہادت پیش کی گئی تھی جس کی توثیق ایبے کے قیدی کی طرف سے فی الوقت

ممکن تھی۔

لیکن جب شام کو وہ بووے کے شہر میں داخل ہوئے جہاں سڑکوں پر خاصی چہل پہل تھی تب اس پر واضح ہوگیا کہ حالات بہت پریشان کن ہیں۔ ڈاک گھر کے صحن میں جب وہ گھوڑے سے اتر رہا تھا تو ایک خطرناک مجمع اکٹھا ہوگیا۔ اور "تارک وطن، مردہ باد" کی کئی آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔ وہ زین پر سے نیچے اترتے ہوئے رک گیا۔ اور پھر سنبھل کر مصلحتاً اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تارک وطن!! دوستو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں اپنی مرضی سے فرانس کو واپس آیا ہوں"

"مردود تارک وطن" مجمع میں سے ایک نعل بند نے ہتھوڑا لئے ہوئے غصے سے اس پر لپکتے ہوئے کہا "مردود رئیس"

نعل بند ڈارنے کے گھوڑے کی لگام پر ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ پوسٹ ماسٹر دونوں کے درمیان حائل ہو کر نرمی سے کہنے لگا "جانے دو۔ جانے دو۔ پیرس میں اس کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا"

"فیصلہ!" نعل بند ہتھوڑا لگاتے ہوئے بولا "ہاں غداری کی سزا مل کے رہے گی" مجمع نے چیخ چیخ کر اس کی تائید کی۔

پوسٹ ماسٹر ڈارنے کے گھوڑے کو صحن کی طرف موڑنا چاہتا تھا۔ بدمست پرستار وطن لگام سے بندھی ہوئی رسی تھامے اطمینان سے اپنی زین پر جما ہوا تھا۔ پوسٹ ماسٹر کو رکتے

ہوئے ڈارنے ذرا شور غل کم ہوتے ہی کہنے لگا۔

" دوستو۔ آپ کو دھوکا ہوا ہے یا دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ میں غدار نہیں ہوں۔"

" جھوٹا کہیں کا۔" لوہار چلایا۔ " لوگو یہ غدار ہے۔ سرکاری حکم کی رو سے اس کی زندگی اب عوام کے ہاتھ میں ہے۔ اس مردود کو اپنی زندگی پر اب کوئی حق نہیں رہا۔"

ڈارنے نے مجمع کے تیور دیکھے اور سمجھ گیا کہ اب اس پر حملہ ہوا چاہتا ہے۔ اسی وقت پوسٹ ماسٹر نے اس کے گھوڑے کو صحن کی طرف موڑ دیا۔ دونوں محافظ اس کے ساتھ تھے جب وہ اندر داخل ہوئے تو پوسٹ ماسٹر نے ہر دو لودے پھاٹک بند کر کے کواڑ لگا دیئے۔ نعل بند نے ان پر اپنے ہتھوڑے سے ایک ضرب لگائی اور مجمع نے کچھ شور مچایا لیکن اور کوئی بات ہونے نہ پائی۔

" لوہار سرکاری حکم کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔" ڈارنے نے شکریہ ادا کرنے کے بعد پوسٹ ماسٹر سے دریافت کیا جو پاس ہی کھڑا تھا۔

" وہ حکم تارکان وطن کی جائداد فروخت کرنے کے بارے میں ہے۔"

" یہ حکم کب جاری ہوا۔"

" چودھویں کو۔"

" جس دن میں انگلستان سے چلا تھا۔"

" ہر شخص کہتا ہے کہ ابھی ایسے کئی احکام جاری ہوں گے اور یہ کہ جلد ہی ایک قانون پاس ہوگا جس کی رو سے تمام تارکان وطن کو جلا وطن کر دیا جائے گا اور واپس لوٹنے پر موت

کی سزا دی جائے گی۔ جب ہی تو وہ شخص کہہ رہا تھا کہ تمہاری زندگی اب تمہاری زندگی نہیں رہی"
"لیکن ابھی تک تو ایسا کوئی حکم جاری نہیں ہوا"
"کیسے معلوم" پوسٹ ماسٹر نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا "حکم جاری ہو گیا یا ہونے والا ہے۔ وہ ایک ہی بات ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

آدھی رات تک ایک اصطبل میں گھاس پر آرام لینے کے بعد جب سارا شہر سو چکا تھا وہ دوبارہ آگے کی طرف روانہ ہوئے۔ جن وحشیانہ تبدیلیوں نے اس وحشیانہ سفر کو غیر حقیقی بنا دیا تھا ان میں نیند کا غائب ہو جانا بھی ایک اہم واقعہ تھا۔ غیر آباد سڑکوں پر دُھند دور تک تنہائی میں سفر کرنے کے بعد انہیں چند روشنی سے جگمگاتی ہوئی مگر خستہ حال جھونپڑیاں نظر آئیں۔ جہاں آزادی کے مرجھائے ہوئے درخت کے گرد آدھی رات کو بھوتوں کی طرح لوگ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رقص کرتے یا سب مل کر آزادی کا گیت گاتے نظر آتے تھے۔ خوش قسمتی سے اس رات کو بووے میں لوگ سوئے ہوئے تھے اور وہ آسانی سے وہاں سے نکل کر پھر اپنا تنہا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ بے وقت کی سردی اور بارش میں جب وہ اجڑے ہوئے بے برگ و بار کھیتوں اور جلے ہوئے گھروں کے سیہ رنگ در و بام سے گذرتے تو کبھی کبھی راستوں کی نگہبانی کرنے والے قوم پرستوں کے محافظ دستے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ان کا راستہ روک دیتے تھے۔

بالآخر صبح ہوتے ہوتے وہ پیرس کی دیواروں کے قریب پہونچ گئے۔ پھاٹک بند تھا اور اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔

"اس قیدی کے کاغذات کہاں ہیں؟" ایک دُشمن کے پٹے افسر نے جسے گارڈ باہر بلا لایا تھا دریافت کیا۔

قدرتی طور پر یہ بات چارلس ڈارنے کو بُری لگی اور اس نے افسر کو توجہ دلائی کہ وہ فرانس کے ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سفر کر رہا ہے اور ملک کی بدنظمی کے پیش نظر اس نے اپنے صرفے سے محافظ دستے کو ہمراہ رکھا ہے۔

"اس قیدی کے کاغذات کہاں ہیں؟" اس شخص نے بے پروائی سے پھر سوال کیا۔

"بدمست پرستار وطن نے اپنی ٹوپی سے وہ کاغذات برآمد کئے۔ گیبل کے خط پر جب افسر کی نظر پڑی تو اس معتدر ہستی کو کچھ الجھن اور کچھ اچنبھا سا ہوا، اور وہ غور سے ڈارنے کو دیکھنے لگا۔

پھر اس کو اور اس کے محافظوں کو وہیں چھوڑ کر بغیر کچھ کہے وہ افسر گارڈ کے کمرے میں چلا گیا۔ ادھر وہ لوگ اپنے گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے اسی طرح گیٹ کے باہر ٹھیرے رہے امید وبیم کی اس حالت میں چارلس ڈارنے نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور دیکھا کہ پھاٹک پر سپاہیوں اور قوم پرستوں کا ملا جلا پہرہ ہے جس میں قوم پرست زیادہ اور سپاہی کم ہیں، نیز کسانوں کی رسد لانے والی گاڑیوں اور اس قسم کی سواریوں کا داخلہ تو نسبتاً آسان ہے لیکن معمولی سے معمولی لوگوں کے لئے بھی شہر سے باہر نکلنا بے حد دشوار ہے۔ جانوروں اور گاڑیوں سے قطع نظر وہاں طرح طرح کے مردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ اور سب باہر نکلنے کے منتظر تھے۔ لیکن اس سے قبل شناخت کی کارروائی اس قدر سخت تھی کہ وہ دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے

پھاٹک سے نمودار ہو رہے تھے۔ ان میں سے چند یہ دیکھ کر کہ پوچھ گچھ کے لئے ان کی باری دیر میں آئے گی۔ زمین پر دراز ہو کر تمباکو کے کش یا نیند کے مزے لے رہے تھے اور بعض دوسرے اشخاص آپس میں گپ اڑا رہے تھے یا ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ عورتیں ہوں یا مرد، لال ٹوپیاں اور ترنگے طرّے عام تھے۔

گھوڑے پر بیٹھا ہوا کچھ دیر تک ڈارنے یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اسی افسر نے آگے بڑھ کر گارڈ کو پھاٹک کھولنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دونوں محافظوں کو جن میں ایک ہوش میں اور دوسرا نشے میں تھا۔ رسید دے کر افسر نے ڈارنے کو گھوڑے سے اترنے کی ہدایت دی۔ اسکے بعد دونوں پرستاران وطن اس کا تھکا ہارا گھوڑا ساتھ لے کر واپس روانہ ہوئے۔

ڈارنے اپنے رہبر کے ہمراہ حوالات میں داخل ہوا جو معمولی شراب اور تمباکو کی بو سے مہک رہا تھا۔ یہاں چند سپاہی اور قوم پرست خواب و بیداری اور مستی و ہشیاری کی مختلف حالتوں میں کہیں کھڑے ہوئے اور کہیں لیٹے ہوئے تھے۔ حوالات کی روشنی بھی جو کچھ تو چراغوں سے اور کچھ دن نکلنے کی وجہ سے پھیل رہی تھی۔ اسی طرح غیر یقینی تھی۔ میز پر کچھ رجسٹر بکھرے ہوئے تھے اور ایک ڈراؤنی شکل کا اجڈ افسر صدارت کی کرسی پر براجمان تھا۔

"سیٹیزن ڈیفارج" اس عہدہ دار نے پرچہ لے کر ڈارنے کے رہبر سے دریافت کیا۔ کیا مارک وطن ایورمونڈ یہی شخص ہے؟"

"یہی شخص ہے۔"

"ایورمونڈ تمہاری عمر کیا ہوگی؟"

"سینتیس سال"

"ایورمونڈ۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے"

"جی ہاں"

"کس مقام پر شادی ہوئی"

"انگلستان میں"

"بے شک ۔۔۔ لیکن تمہاری بیوی کہاں ہے ایورمونڈ"

"انگلستان میں"

"بے شک ایورمونڈ۔ تمہیں لافورس کے قید خانے میں رکھا جائے گا"

"خدا رحم کرے" ڈارنے حیرت سے بولا "کس قانون کے تحت اور کس جرم کی پاداش میں ۔۔۔"

افسر نے ایک لمحے کے لئے پرچے پر سے نظر اٹھائی۔

"تمہارے چلے جانے کے بعد نئے قوانین پاس ہوئے ہیں۔ ایورمونڈ۔ اور نئے جرائم کی فہرستیں بنی ہیں" اس نے ایک بے رحم مسکراہٹ سے جواب دیا، اور پھر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

"براہ کرم اس امر کو فراموش نہ کیجئے۔ کہ میں یہاں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ آپ کے سامنے میرے ہم وطن کا وہ خط موجود ہے جس کی التجا مجھے یہاں لائی ہے۔ میرا صرف اتنا مطالبہ ہے کہ مجھے جلد سے جلد اس سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ کیا مجھے اس کا حق

حاصل نہیں ہے"۔

"تارکان وطن کوئی حقوق نہیں رکھتے۔" ایورمونڈ کے اس مختصر جواب کے بعد افسر نے اپنی یادداشت ختم کرلی۔ پھر خاموشی سے اپنی تحریر پڑھ کر اسے ریتی سے خشک کیا اور ڈیفارج کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "راز کا قیدی"۔

ڈیفارج نے پرچے سے قیدی کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ قیدی نے اس حکم کی تعمیل کی اور دو مسلح وطن پرستوں کا محافظی دستہ ان کے ہمراہ ہولیا۔

حوالات کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر جونہی وہ پیرس کے شہر میں داخل ہوئے۔ ڈیفارج نے چپکے سے کہا۔ "اچھا۔ بیسٹل کے سابق قیدی ڈاکٹر مینٹ کی لڑکی سے تم ہی نے شادی کی ہے"۔

"ہاں"۔ ڈارنے نے حیرت سے اس کا منہ تکتے ہوئے بولا۔

"میرا نام ڈیفارج ہے۔ سینٹ انٹائن میں میری شراب کی دوکان ہے۔ شاید تم نے میرا نام سنا ہو"۔

"کیوں نہیں۔ میری بیوی اپنے باپ کو واپس لے جانے کے لئے تمہارے ہی گھر آئی تھی"۔

بیوی کے لفظ سے ڈیفارج کا تخیل کسی اور طرف بھٹکنے لگا اور اس نے بے صبری سے کہا۔ "اس بے رحم نوزائیدہ قتالہ عالم کا واسطہ جو مس گلوٹین کہلاتی ہے۔ تم فرانس کیوں آئے"۔

"ابھی ایک منٹ پہلے وجہ بتا چکا ہوں۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں؟"

"سچی بات تو ہے پر تمہارے لئے کوئی اچھی بات نہیں؟" ڈیفارج نے تیوری پر بل ڈالکر سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی میری عقل چکرا رہی ہے یہاں ہر طرف اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

"میں کچھ مدد نہیں کر سکتا؟" ڈیفارج نے ہمیشہ کی طرح سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میرے ایک سوال کا جواب دو گے؟"

"اس کا انحصار سوال کی نوعیت پر ہے کہو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مجھے جس قید خانے میں جبراً ٹھونسا جا رہا ہے کیا وہاں سے میں باہر والوں کو کوئی پیام بھجوا سکوں گا؟"

"معلوم ہو جائے گا؟"

"بیان صفائی کی اجازت دیئے بغیر فیصلہ سنا کر مجھے وہاں دفن تو نہیں کر دیا جائیگا؟"

"معلوم ہو جائے گا۔ . . لیکن اس میں نئی بات کونسی ہے سابق میں دوسروں کو اس سے بدتر قید خانے میں اسی طرح دفن کیا جا چکا ہے؟"

"لیکن سیٹیزن ڈیفارج۔ میں نے تو کسی کو اس طرح دفن نہیں کیا؟"

جواب دینے کے بجائے ڈیفارج نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے سنے خاموشی سے اپنی راہ چلتا رہا۔ اس کی خاموشی جس قدر بڑھتی گئی۔ اسی قدر ڈارنے کی

امیدیں کم ہوتی گئیں۔ ڈارنے کو اب نرمی کے برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے مزید انتظار کے بغیر وہ یوں مخاطب ہوا۔

"ٹیلسن بینک کے انگریز کارکن مسٹر لاری کو جو اس وقت پیرس میں ہیں یہ اطلاع دینا بہت اہم ہے (تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ کس قدر اہم ہے) کہ مجھے لافورس کے قیدخانے میں بند کر دیا گیا ہے۔ بس صرف اتنی اطلاع پہونچانا ہے کیا تم میرے لئے اتنا بندوبست کر دوگے؟"

"میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا!" ڈیفارج نے قطعی طور پر کہا۔ "میں اپنے وطن اور اپنی قوم کا وفادار ہوں۔ دونوں کا سچا خادم اور تمہارا مخالف۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کروں گا۔"

چارلس ڈارنے نے محسوس کیا کہ مزید التجا کرنا فضول ہے۔ نیز اس کی خودداری کو ٹھیس لگی تھی۔ راستہ چلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ لوگ قیدیوں کی قطاروں سے کس قدر مانوس ہیں۔ بچے تک ان کا نوٹس نہیں لیتے تھے۔ چند راہ گیروں نے اس کی طرف آنکھ اٹھائی اور چند لوگوں نے انگلیاں اٹھا کر اسے محسوس کرایا کہ وہ رئیس ہے۔ ورنہ ایک خوش پوش آدمی کا جیل جانا! ایسی ہی معمولی بات ہو گئی تھی جیسے کہ کسی وردی پوش مزدور کا کام پر جانا۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں جہاں سے گذرتے وقت ایک جوشیلا مقرر تپائی پر کھڑے ہو کر بادشاہ اور شاہی خاندان کی عوام دشمنی اور جرائم سے متعلق ایک جوشیلے مجمع کو مخاطب کر رہا تھا۔ چارلس ڈارنے کے کانوں میں جو چند الفاظ پڑے ان سے پہلی بار اتنا پتہ چلا کہ بادشاہ قید میں ہے اور

تمام بیرونی سفیر پیرس چھوڑ چکے ہیں ۔ بودے کے علاوہ دوسرے کسی مقام پر اس نے اثنائے سفر میں کوئی بات نہیں سنی تھی ۔ عام نگرانی اور محافظوں کے دستے نے اسے دنیا سے منقطع کر دیا تھا ۔

اب اسے معلوم ہوا کہ انگلستان چھوڑتے وقت جن خطرات کا وجود تھا ان سے کہیں زیادہ خطروں میں وہ گھرا ہوا ہے ۔ اب اسے معلوم ہوا کہ دن بہ دن خطرے بڑھ رہے ہیں اور بڑھتے ہی جائیں گے ۔ وہ اپنے دل میں معترف تھا کہ اگر اسے ان حالات کا ذرا بھی اندازہ ہوتا تو وہ یہ سفر اختیار نہ کرتا ۔ تاہم اس کے اندیشے اتنے تیرہ و تار نہیں تھے جتنے کہ بعد کے حالات کی روشنی میں وہ نظر آتے ہیں ۔ مستقبل اس وقت پریشان کن ضرور تھا ۔ لیکن پھر بھی آنے والے واقعات کا علم نہ ہونے کے باعث اس اندھیرے میں روشنی کی کرن بھی تھی ۔ شبانہ روز وحشتناک قتل عام جو چند گھنٹوں میں زمین کو خون سے لالہ زار بنانے والا تھا اس کی نظر سے اسی قدر دور تھا جس قدر کوئی لاکھ برس بعد ہونے والا واقعہ ۔ اس کا تعارف ابھی اس نوزائیدہ تیز مزاج قتالہ عالم مس گلوٹین سے ہونے نہیں پایا تھا ۔ اور نہ عام طور پر دوسرے اس قتالہ عالم سے واقف تھے ۔ آنے والے ہیبتناک جرائم سے شاید ان کا ارتکاب کرنے والوں کے ذہن بھی خالی تھے ۔ پھر ایک رحم دل انسان کے دماغ پر ان کا سایہ کیسے پڑ سکتا تھا ۔

قید و بند کی سختیوں اور بیوی اور بچی سے جدائی کی مصیبتوں کا اسے اندیشہ ہی نہیں تھا ۔ اس کے علاوہ اور کوئی واضح خطرہ اس کے پیش نظر نہیں تھا ۔ بہرحال صحن زنداں کی

ویرانی کے لئے یہ انکار بھی کافی تھے۔ جن کا بوجھ لئے ہوئے وہ لافورس کے قید خانے میں داخل ہوا۔

ایک آدمی نے جس کا چہرا پھولا ہوا تھا مضبوط کھڑکی کھولی۔ ڈیفارج نے قیدی کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "تارک وطن ایورمونڈ"

"جہنم میں جائیں اور کتنے ہیں کم بخت" پھولے ہوئے چہرے والے نے کہا۔

ڈیفارج نے اس احتجاج پہ توجہ نہیں کی۔ اور رسید لے کر اپنے دونوں وطن پرست ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

"جہنم میں جائیں" جیلر نے اپنی بیوی سے کہا "میں پھر کہتا ہوں، اور کتنے ہیں کم بخت"

جیلر کی بیوی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لئے اس نے صرف اس حد تک تسلی دی۔

"پیارے انسان کو صبر سے کام لینا چاہیئے"

جیل کے تین نوکروں نے جو اس کی گھنٹی کی آواز سنکر آئے تھے ہاں میں ہاں ملائی۔ اور ان میں سے ایک نے موقع کی مناسبت کا خیال کئے بغیر نعرہ لگایا "آزادی کا بول بالا"

لافورس کا قید خانہ بڑا تاریک مقام تھا جہاں فضا میں اندھیرا اور گندگی اور سونے والوں کی بدبودار سانسیں سرایت کر گئی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ جن مقامات کی

دیکھ بھال نہیں کی جاتی ۔ وہاں کتنی جلدی بند کمروں میں سونے والے ہوا میں کتنا فنت پھیلا دیتے ہیں ۔

"راز کا قیدی" جیلر پرچہ دیکھ کر بڑبڑایا ۔ اب تک کیا کام کم تھا ۔ جواب یہ اور اضافہ ہوگیا"

اس نے بگڑ کر پرچہ فائل میں لگا دیا ۔ آدھے گھنٹے تک چارلس ڈارنے منتظر تھا ۔ کہ وہ کچھ کہے ۔ اس اثنا میں ڈارنے کبھی کمرے میں ٹہلتا اور کبھی ایک تنگ بستہ نشست پر بیٹھ جاتا ۔ بہر صورت اس کی شکل افسر اور ماتحتوں کی نظر میں جمی رہی ۔

"تارک وطن میرے ، ساتھ چلو" افسر نے اپنی کنجیاں سنبھالتے ہوئے کہا ۔

قید خانے کے دھندلے اور اداس ماحول میں نیا قیدی افسر کے ساتھ ساتھ کئی زینوں اور دالانوں سے گذرتا گیا ۔ کئی دروازے کھلے اور اس کے گذرنے کے بعد بند ہوگئے تب کہیں وہ دونوں ایک وسیع گزبست کمرے میں داخل ہوئے جہاں کئی عورتیں اور مرد قید تھے ۔ عورتیں ایک لمبی میز کے گرد بیٹھی ہوئی پڑھنے لکھنے ، سینے پرونے ، کشیدہ کاری یا بنائی میں مصروف تھیں ۔ مرد یا تو اپنی کرسیوں کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے ، یا کمرے میں ٹہل رہے تھے ۔

قیدیوں کا تعلق چونکہ عموماً شرمناک جرائم سے ہوا کرتا ہے ہمارا نو وارد اس مجمع کو دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا ۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہیں تھی ۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سب نہایت خوش اخلاقی اور حد درجہ شائستگی اور تہذیب کے ساتھ اسکے

استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تہذیب وشائستگی کے اس خوش نما منظر پر جیل کے عادات واطوار کے تاریک بادل منڈلا رہے تھے۔ اور غم واندوہ کی اس بھیانک فضا میں چارلس ڈارنے کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سب آسیب ہیں۔ اور وہ مُردوں کی دنیا میں پہونچا دیا گیا ہے جہاں بھوت پریت اور سائے بستے ہیں۔ حسن وجمال کے سائے، شان وشوکت کے سائے، اخلاق و آداب کے سائے، پیری و دانائی کے سائے۔ ساحل ویران کو خیرباد کہنے کے لئے منتظر، سب کے سب زندہ درگور، اپنی مردہ آنکھوں سے اس کی جانب نگراں!!!

وہ دم بخود ہو گیا۔ اس کے برابر کھڑا ہوا جیلر اور دوسرے جیلر جو ادھر اُدھر گشت کر رہے تھے۔ عام حالات میں یوں عجیب غریب نظر نہ آتے جیسے کہ وہ اب دکھائی دے رہے تھے۔ غمگین ماؤں اور حسین بیٹیوں، طرحدار نازنینوں، کم سن مہ جبینوں اور درمیانی عمر کی مہذب خواتین کے مقابلے میں یہ افسر حد سے زیادہ بھدّے اور گنوار معلوم ہوتے تھے۔ اور کمرے کی آسیب زدہ فضا ان کے وجود سے اور بھی غیر حقیقی بن گئی تھی۔ یہ سب سائے تھے۔ بے شک ڈارنے کا طویل اور غیر حقیقی سفر کسی بیماری کا دورہ تھا۔ جس نے اسے سایوں کی اس غمناک بستی میں پہونچا دیا تھا۔

"تمام شریک غم ساتھیوں کی طرف سے میں لافورس میں آپ کے خیر مقدم کی عزت حاصل کرتا ہوں" ایک معزز شخص نے شاہی دربار کے آداب واطوار کے ساتھ آگے بڑھ کر کہا "اس حادثۂ عظیم میں ہم سب اہل مجلس کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے یہ

مصیبت جلد مسرت سے بدل جائے۔ کسی اور جگہ یہ بدتمیزی کہلاتی۔ مگر یہاں قابل معافی ہے اگر میں آپ کا نام اور حالات دریافت کروں۔"

چارلس ڈارنے چونک پڑا اور مناسب الفاظ میں ضروری معلومات بہم پہونچائے۔

"لیکن مجھے امید ہے کہ آپ راز کے قیدی نہیں ہیں۔ معزز آدمی نے چیف جیلر پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا، جو کمرے سے گذر رہا تھا۔

"پتہ نہیں اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے۔ مگر میں نے یہی سنا ہے۔"

"آہ۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔ ہمیں اس کا بے حد رنج ہے۔ لیکن ہمت سے کام لیجئے۔ ہمارے اکثر رفیق راز کے قیدی تھے۔ لیکن بہت جلد معاملہ ختم ہو گیا۔" پھر بلند آواز میں اس نے کہا۔ "احباب کو یہ سنکر افسوس ہوگا کہ نو وارد ساتھی راز کے قیدی ہیں۔"

چارلس ڈارنے جب کمرے سے گذر کر ایک سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا جہاں جیلر اس کا منتظر تھا۔ تو مجمع نے درد مندی کا اظہار کیا۔ اور کئی آوازیں جن میں زیادہ تر عورتوں کی نرم اور ہمدردی سے لبریز آوازیں شامل تھیں نیک تمناؤں اور حوصلہ افزا جذبات کا اظہار کرنے لگیں۔ سلاخ دار دروازے پر پہونچکر وہ دلی شکریہ ادا کرنے کے لئے مڑا اور پھر جیلر نے دروازہ بند کر دیا اور وہ شکلیں ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں

کھڑکی سنگ بستہ سیڑھیوں کی طرف کھلتی تھی جن کا رخ اوپر کی طرف تھا جب وہ چالیس زینے چڑھے (آدھے گھنٹے کا قیدی ابھی سے سیڑھیاں گننے لگا تھا) تو جیلر نے ایک چھوٹا سا سیاہ دروازہ کھولا اور وہ قید تنہائی کی کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ وہاں

سردی اور نمی تھی مگر اندھیرا نہیں تھا۔

"تمہارا کمرہ" جیلر نے کہا۔

"مجھے قید تنہائی کی سزا کیوں دی جا رہی ہے"

"مجھے کیا معلوم"

"کیا میں قلم دوات اور کاغذ خرید سکتا ہوں"

"مجھے ایسے کوئی احکام نہیں دیئے گئے ہیں۔ تم معائنہ کرنے والے افسر سے پوچھ سکتے ہو۔ بالفعل تم اپنی خوراک خرید سکتے ہو اور کچھ نہیں"

کوٹھری میں ایک کرسی ایک میز اور ایک گھاس بھرا گدا تھا۔ باہر جانے سے پہلے جب جیلر نے ان چیزوں کا معائنہ کر لیا اور چاروں دیواروں پر نظر دوڑائی تو سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے ہوئے قیدی کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیلر کا چہرہ اور اس کا جسم اس بری طرح پھول گیا ہے کہ وہ کسی ڈوبے ہوئے شخص کا پانی بھرا لاشہ معلوم ہو رہا ہے۔ جیلر کے جانے کے بعد وہ اسی طرح بہکے ہوئے خیالات میں غرق رہا — اب مجھے مردے کی طرح دفن کر دیا گیا ہے۔ پھر گدے کی طرف دیکھ کر اس نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔ "اور ان رینگتے کیڑوں میں مردہ جسم کی سڑاند کا نقشہ نظر آتا ہے"

پانچ قدم لمبا ساڑھے چار قدم چوڑا۔ پانچ قدم لمبا ساڑھے چار قدم چوڑا، پانچ قدم لمبا ساڑھے چار قدم" قیدی کوٹھری میں ٹہلتے ہوئے اپنے قدم گننے لگا۔ اور شہر کا شور ایسا لگتا تھا جیسے کپڑا منڈھے ہوئے ڈھول کی آوازوں میں چیخ پکار کی صدائیں شامل ہو گئی

ہوں۔ وہ جوتے بناتا تھا۔ وہ جوتے بناتا تھا۔ وہ جوتے بناتا تھا" قیدی پھر کوٹھری کو ناپنے لگا۔ اور اس جلسے سے بچنے کے لئے قدم تیز کر دیئے" جب کھڑکی بند ہوگئی تو سائے غائب ہو گئے۔ ایک سایہ تھا سیہ پوش لڑکی کی شبیہہ۔ دریچے میں سے جھانکتی ہوئی اور اس کے سنہری بالوں سے روشنی کی کرنیں کھیل رہی تھیں۔ اور اس کی شکل تھی... جگمگاتے ہوئے گھاؤں میں سے خدا کے لئے چلے چلو۔ دیکھو کتنے لوگ بیمار ہیں! وہ جوتے بناتا تھا! ... پانچ قدم لمبا، ساڑھے چار قدم چوڑا" اس قسم کے پراگندہ خیالات قیدی کے ذہن کی گہرائیوں سے ابھر رہے تھے۔ اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جاتا تھا۔ اور گنتی پر مصر تھا اور شہر کا شور اب بھی کپڑا مڑھے ڈھول کی طرح سنائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی تھی کہ چیخ پکار کی صدائیں اس کی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھیں۔

دُوسرا باب

سان

ٹیلسن بنک پیرس کے سینٹ جرمین علاقے میں واقع تھا۔ ایک بڑی عمارت کا حصہ جس کے ملحقہ صحن کو ایک بلند دیوار اور مضبوط پھاٹک کے ذریعہ شاہراہ سے منقطع کیا گیا تھا۔ بنک کے لئے وقف تھا۔ عمارت کا مالک فسادات شروع ہونے پر اپنے

مکان سے باورچی کے بھیس میں سرحد پار فرار ہو گیا تھا۔ گو اب اس کی حیثیت شکاری کتوں کے خوف سے بھاگنے والے جانور کی سی تھی۔ لیکن اس ذہنی تبدیلی کے باوجود اس لباس میں وہی رئیس نامدار نظر آتے تھے جن کے چاکلیٹ کی تیاری کے لئے کسی زمانے میں مذکورہ باورچی کے علاوہ تین ہٹے کٹے نوکر مامور تھے۔

رئیس نامدار فرار ہو چکے تھے اور وہ تینوں ہٹے کٹے نوکر جنھیں کبھی بھاری بھاری تنخواہیں ملتی تھیں اب اپنے اس گناہ کے کفارے کے لئے آزادی برابری اور بھائی چارگی یا موت کی نوخیز ری پبلک کی قربان گاہ پر اپنے مالک کا گلا کاٹنے کے لئے غیر معمولی آمادگی دکھا رہے تھے رئیس نامدار کا مکان پہلے عدالتی تحویل میں لے لیا گیا اور پھر اسے ضبط کر لیا گیا حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے اور حکام یہ احکام اس قدر جلد جلد صادر ہو رہے تھے کہ ستمبر کی تیسری تاریخ کو موسم خزاں کی رات میں قانون کے وطن پرست نمائندے اس مکان میں ڈٹے ہوئے دیوان خانے کے ترنگے نشانوں کے درمیان برانڈی کے جام اڑا رہے تھے۔

پیرس کی طرح لندن میں ٹیلسن بینک اپنا کاروبار چلانا چاہتا تو بہت جلد اس کا دیوالہ نکل جاتا۔ بھلا کہیں انگریزوں کی شرافت اور ذمہ داری اس کو گوارا کر سکتی تھی کہ بینک کے صحن میں نارنگی کے درخت لہلہائیں اور سودا بیچنے کی میز پر کیوپڈ جلوہ دکھائے۔ مگر وہاں وہی نقشہ تھا۔ ٹیلسن نے کیوپڈ پر سفیدی چڑھا دی تھی۔ مگر وہ اپنے ٹھنڈے کپڑوں میں حسب عادت چھت پر سے آٹھ پہر رقم کی تاک میں لگا رہتا تھا۔ اگر لندن کے لمبارڈ اسٹریٹ والے علاقے میں اس کم سن بت کا فرکی یوں نمائش کی جاتی یا نوجوان دیوتا کے عقب میں

پردوں سے طاق و محراب کو آراستہ کیا جاتا۔ اور دیواروں میں آئینے نصب کیے جاتے یا بات بات پر وہ نوجوان کلرک سرراہ رقص کرتے۔ تو یقیناً بنک کا کاروبار بند ہو جاتا۔ لیکن فرانس میں ٹیلسن بنک پر ان باتوں کا مطلق اثر نہیں پڑا۔ اور نہ حالات کے قابو میں رہنے تک کسی نے گھبرا کر اپنی رقم نکالنے کی کوشش کی۔

آئندہ کونسی رقمیں ٹیلسن سے نکالی جانے والی تھیں۔ اور کونسی رقمیں وہیں طاق نسیاں میں پڑی رہنے والی تھیں۔ کونسے جواہرات اور کونسا قیمتی سامان تجوریوں میں سڑنے والا تھا۔ اور کتنے گاہک قید خانوں میں ایڑیاں رگڑنے والے تھے اور انھیں کب موت کے گھاٹ اتارا جانے والا تھا۔ ٹیلسن کے کتنے کھاتے اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے والے تھے اس رات کسی کو خبر نہیں تھی اور نہ باوجود غور و فکر کے مسٹر جارویس لاری بتا سکتے تھے۔ وہ آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں ابھی ابھی لکڑیوں کی آگ جلائی گئی تھی۔ (اس کم بخت بے فیض سال میں سردی بھی تو قبل از وقت شروع ہو گئی تھی) ان کے دیانت دار اور جرأت مند چہرے پر چراغ کی روشنی کے عکس یا دوسری چیز کی پرچھائیں سے زیادہ دہشت کا سایہ نمایاں تھا۔

بنک کی وفاداری کے تقاضے سے مسٹر لاری اس عمارت کے کمروں میں پڑے رہتے تھے جیسے عشق پیچاں کی بیل در و دیوار سے چمٹی ہوئی ہو۔ اصل عمارت پر قوم پرستوں کا قبضہ تھا اور اس حد تک بنک والوں کی حفاظت ہو جاتی تھی۔ مگر مسٹر لاری کے قیام کا اصل سبب ان کا خلوص تھا نہ کہ اس قسم کی مصلحت۔ ادائے فرض میں انھوں نے کبھی ان چیزوں کو اہمیت

پہنچی دی۔ صحن کی دوسری جانب گاڑیوں کے لئے وسیع سائبان تھے جہاں رئیس نامدار کی چند گاڑیاں اب بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دو ستونوں سے دو بڑی بڑی مشعلیں بندھی تھیں۔ جن کی روشنی میں ایک بہت ہی بھاری سان نظر آ رہی تھی جسے پاس کی کسی لوہار کی دوکان سے جلدی میں لاکر نصب کر دیا گیا تھا۔ اپنے دریچے سے ان بے ضرر چیزوں کو دیکھ کر مسٹر لاری کانپ اٹھے اور آتشدان کے قریب اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ انھوں نے پھر سے نہ صرف دریچے کا شیشہ چڑھا دیا بلکہ باہر کی جالی دار چلمن بھی بند کر دی اور اس کے بعد سر سے پاؤں تک لرزنے لگے۔

اونچی دیوار اور مضبوط پھاٹک کے اس پار سڑکوں پر شہر کی شبانہ زندگی کا دھیما شور سنائی دے رہا تھا جس میں کبھی کبھی ایک پراسرار ہیبتناک چیخ شامل ہو جاتی تھی۔ جیسے کوئی بھیانک غیر فطری صدا آسمان کی جانب بلند ہو رہی ہو۔

"خدا کا شکر ہے اس غدار شہر میں آج رات میرا کوئی عزیز موجود نہیں" مسٹر لاری نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "پروردگار! تو ہر ستم زدہ کے حال زار پر رحم فرما۔"

تھوڑی دیر میں پھاٹک کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور وہ سمجھے کہ وہ لوگ واپس آگئے ہیں اور آہٹ پر کان لگا کر بیٹھ رہے۔ لیکن صحن میں خلاف توقع کوئی گڑبڑ نہیں مچی پھاٹک بند ہونے کے بعد پہلے کی طرح سناٹا چھایا رہا۔

گھبراہٹ اور دہشت کے مارے ان کے دل میں بنک کے متعلق مختلف اندیشے پیدا ہونے لگے۔ جو انقلاب زمانہ میں اس قسم کے احساسات کا قدرتی نتیجہ تھے۔ بنک کی حفاظت

کا کافی انتظام تھا۔ اور وہ اپنے معتبر بہرہ دار مسٹر لوری کو دیکھنے کے لیے جانے والے ہی تھے کہ یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو شکلیں نظر آئیں جنہیں دیکھ کر وہ حیرت واستعجاب سے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

لوسی اور اس کے والد!! لوسی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا کر کچھ اس شدید جذباتی انداز میں دیکھا کہ جیسے اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی یہ چھاپ زندگی کے اس اہم ترین موقع پر اسے نئی طاقت عطا کرے گی۔

"میں کیا دیکھ رہا ہوں؟" مسٹر لاری کا بوکھلاہٹ میں دم چڑھنے لگا۔ "معاملہ کیا ہے۔ لوسی! مینٹ! کیا واقعہ ہے۔ تمہارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے۔ آخر کچھ تو بتاؤ؟"

زرد چہرے اور پریشان نظروں کے ساتھ لاری کے سینے سے لگ کر لوسی نے ہانپتی ہوئی آواز میں عاجزی سے کہا۔ "میرے عزیز دوست! میرا شوہر؟"

"کیا کہہ رہی ہو لوسی۔ تمہارا شوہر؟"

"چارلس!"

"کیا ہوا چارلس کو؟"

"یہاں!"

"یہاں پیرس میں!"

"چند دنوں سے شاید تین چار روز سے۔ پتہ نہیں کتنے دنوں سے۔ میرا دماغ اس وقت ٹھکانے نہیں ہے کسی غریب کی امداد کے لیے وہ یہاں ہمیں اطلاع دیئے بغیر

چلے آئے۔ انھیں سرحد پر روک کر جیل بھجوا دیا گیا۔"

یہ سنکر اس بڈ ہے کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اسی لمحے صدر دروازے کی گھنٹی پھر بجنے لگی اور قدموں کی آہٹ اور کئی آوازوں کا شور صحن کے اندر سنائی دینے لگا۔

"یہ شور کیسا ؟" ڈاکٹر نے دریچے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

"باہر مت دیکھو" مسٹر لاری چیخ کر بولے "باہر مت دیکھو، مینٹ۔ تمہاری جان کی قسم۔ جیلی کو ہاتھ مت لگاؤ۔"

ڈاکٹر مینٹ اسی طرح کواڑ پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت اطمینان سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"عزیز دوست۔ اس شہر میں کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں بیسٹیل میں قید رہ چکا ہوں۔ پیرس میں ایک بھی وطن پرست ایسا نہیں ملے گا۔ پیرس کیا سارے فرانس میں کوئی محب وطن یہ جانتے ہوئے کہ میں بیسٹیل میں قید رہ چکا ہوں مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا، یا اگر ہاتھ لگائے گا تو انھیں ہاتھوں میں بھینچنے کے لئے اپنے کندھوں پر بٹھا کر جلوس کے ساتھ لے جانے کے لئے۔۔۔ سابقہ تکلیف میری قوت کا راز ہے۔ جس کی بدولت میں سرحد پار کر کے یہاں تک پہونچا۔ اور مجھے چارلس سے متعلق معلومات بہم پہونچائی گئیں میں جانتا تھا کہ میں یہ کام کر سکوں گا۔ میں جانتا تھا کہ میں چارلس کی مدد کر سکوں گا۔ میں نے لوسی سے یہی کہا تھا۔۔۔۔۔ وہ آواز کیا ہے؟" ڈاکٹر کا ہاتھ پھر دریچے کی جانب بڑھا۔

"باہر مت دیکھو!" مسٹر لاری دیوانہ وار چلا اٹھے "نہیں پیاری لوسی۔ تم بھی

مت دیکھو . . . . گلے میں ہاتھ ڈال کر روکتے ہوئے : پیاری اتنی خوف زدہ مت ہو۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے چارلس کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں سنی ہے۔ بلکہ مجھے تو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس مہلک مقام پر ہے . . . اسے کس قید خانے میں رکھا گیا ہے "

" لافورس ! "

" لافورس ! لوسی۔ میری بچی۔ تم ہمیشہ دل مضبوط رکھکر دوسروں کے کام آئی ہو۔ اب بھی ہمت کے ساتھ میرے مشورے پر عمل کرو۔ تم نہیں جانتیں اور نہ تمہارے ہاتھ پاؤں مارنے سے کوئی فائدہ ہوگا۔ چارلس کی خاطر میں جو کچھ تم سے کہوں وہ بہت صبر آزما کام ہوگا۔ تمہیں بے چون و چرا میری بات ماننی ہوگی۔ اب تم پچھلے کمرے میں چپکے سے چلی جاؤ۔ تاکہ میں اور تمہارے والد چند منٹ تخلیے میں گفتگو کرسکیں۔ جلدی کرو۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے "

" میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ بھی مجھ سے یہی توقع رکھتے ہیں۔ میں آپ کے خلوص سے بخوبی واقف ہوں "

بڑے میاں نے اس کا بوسہ لیا اور جلدی سے اسے کمرے میں بند کرکے تالے میں کنجی پھرادی۔ پھر ڈاکٹر کی طرف تیزی سے لوٹے اور دریچے کے پٹ پوری طرح اور جھلملی کو تھوڑا سا کھول دیا اور ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر صحن میں دیکھنے لگے۔

باہر چالیس پچاس مرد اور عورتیں جمع تھیں جن سے صحن کم و بیش بھر گیا تھا۔ گھر کے باہر قابضوں نے انہیں اندر آنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور وہ پھاٹک میں سے اندر گھس کر سان کو گھما رہے تھے۔ وہ بظاہر انہی کی خاطر اس خاموش جگہ نصب کی گئی تھی۔

اف ۔ کیسا خوفناک کام اور کیسے خوفناک کام کرنے والے ۔ سان کے دو مینڈل تھے جنہیں دو آدمی دیوانہ وار گھمارہے تھے ان دونوں کے چہرے بدترین وحشیوں کے مہیب ترین بہروپ سے زیادہ بے رحم اور دہشتناک تھے ۔ ان کے چہروں پر مصنوعی ابرو اور مصنوعی مونچھیں چسپاں کی گئی تھیں اور ان کی خبیث شکلیں خون اور پسینے سے لت پت تھیں ۔ پھر اس پر ان کا چیخنا چلانا اور ان کی بے خواب آنکھوں کا انگاروں کی طرح چمکنا اور بھی ستم تھا ۔ جب یہ بدمعاش ہینڈل گھماتے تھے اور ان کے الجھے ہوئے بال کبھی سامنے آنکھوں پر اور کبھی پیچھے گردن پر پڑتے تو بعض عورتیں ان کے ہونٹوں کے پاس پیالے لے جاکر انھیں شراب پلاتیں ۔ اس وقت ایک طرف خون کے دھارے بہتے دوسری طرف شراب کے قطرے ٹپکتے اور تیسری جانب پتھر سے شرارے نکل نکل کر ہوا میں پھیلتے اور ساری گھناؤنی فضا آگ اور خون سے بھر جاتی ۔ اس مجمع میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں تھا جس کے جسم پر خون کے چھینٹے نہ گرے ہوں ۔ سان کے قریب پہونچنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے نیم برہنہ خون آلودہ جسم ۔ چیتھڑے لگے ہوئے انسان اور ان چیتھڑوں پر لہو کے دھبے ۔ عورتوں کی گوٹا کناری لئے ہوئے مردان آرائشی چیزوں کو شرارت سے خون میں رنگے ہوئے ۔ اور اسی قسم کے منظر دکھائی دیتے تھے ۔ کلہاڑیاں سنگینیں اور تلواریں جو تیز کی جارہی تھیں سب کی سب خون سے سرخ تھیں بعض ٹوٹی ہوئی تلواریں کپڑوں کے کترنوں کے ذریعے اپنے قابضوں کی کلائیوں سے بندھی ہوئی تھیں ان کا رنگ بھی وہی تھا اور جب ان ہتھیاروں کو گھمانے والے پاگل انھیں سان کی چنگاریوں میں سے نکال کر گلیوں میں دوڑتے پھرتے تو وہی لال رنگ ان کی خونخوار آنکھوں میں بھی جھلکتا ۔ وہ آنکھیں جنہیں گولی مارنے کی خاطر ہر شریف آدمی

اپنی زندگی کے بیس برس نذر کردے تو عجب نہیں۔

کسی ڈوبنے والے شخص کے تصورات یا کسی انسان کے ناگہانی انکشافات کی طرح آن کی آن میں انھوں نے یہ سب دیکھ لیا۔ وہ دریچے سے پیچھے ہٹ گئے اور ڈاکٹر نے اپنے دوست کے زرد چہرے پر ایک سوالیہ نظر ڈالی۔

بند کمرے کی جانب گھبراہٹ سے دیکھتے ہوئے مسٹر لاری سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"وہ لوگ قیدیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو امر واقعہ ہے۔ اگر بقول تمہارے ان پر تمہارا اثر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا اثر ہے تو ان شیاطین سے اپنا تعارف کرواؤ۔ اور ان کے ساتھ لافورس جاؤ۔ شاید وقت گزر چکا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے۔ بہر حال اب ایک منٹ کی دیر ہونے نہ پائے۔"

ڈاکٹر منیٹ نے لاری کا ہاتھ دبایا اور ننگے سر کمرے سے باہر نکل پڑے۔ مسٹر لاری کے دریچے کے پاس پہونچنے تک وہ صحن میں تھے۔

ان کے ہوا میں اڑتے ہوئے سفید بال، ان کا غیر معمولی چہرہ اور ان کی خود اعتمادی اپنا کام کر گئی۔ وہ ہتھیاروں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے اور فوراً سان کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں کے بیچ میں پہونچ گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی، پھر کچھ حرکت اور آوازیں۔ اور ان کی گفتگو جو دور سے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور پھر مسٹر لاری نے دیکھا کہ مجمع نے ڈاکٹر منیٹ کو گھیر لیا۔ کوئی بیس آدمی دوش بدوش نعرے لگاتے ہوئے باہر نکلے: بیسٹل کا قیدی زندہ باد۔ لافورس میں بیسٹل کے قیدی کے رشتہ دار کے لئے مدد درکار ہے۔ بیسٹل کے قیدی کے لئے راستہ

چھوڑ دو۔ لافورس کے قیدی   کو بچاؤ۔" اور اسی قسم کی ہزاروں آوازیں جو اٹھا بلند ہو رہی تھی۔
یہ دیکھ کر مسٹر لاری کا دل دھڑکنے لگا۔ انھوں نے فوراً جھلملی اور دریچہ بند کرکے پردہ چھوڑ
دیا اور پھر لوسی کے پاس پہونچے اور اسے خوشخبری سنائی کہ اس کے والد عوام کی مدد سے اس
کے شوہر کی تلاش میں نکلے ہیں۔ لوسی کی بچی اور مس پروس بھی وہاں موجود تھی اس وقت انھیں کوئی
تعجب نہیں ہوا لیکن بڑی دیر کے بعد رات کی خاموشی میں ان دونوں کی موجودگی پر انھیں حیرت
ہونے لگی۔

اس اثنا میں لوسی ان کا ہاتھ تھامے ہوئے ان کے قدموں پر بے ہوش پڑی تھی۔ مس پروس
نے بچی کو ان کے بستر پر سلا دیا تھا اور اس کا سر بھی ننھی حسینہ کے پاس تکیہ پر ڈھلک گیا تھا۔ اف
وہ طولانی رات۔ اور غریب بیوی کی وہ آہ و زاری۔ اف وہ طولانی رات جس میں نہ باپ کا کچھ پتہ
تھا اور نہ شوہر کی کوئی خبر۔

رات میں مزید دو مرتبہ صدر دروازے کی گھنٹی بجی۔ دو دفعہ ہجوم داخل ہوا اور سان کو
اسی طرح گھمایا گیا۔ "یہ کیا ہے؟" لوسی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "خاموش یہاں سپاہیوں کی
تلواریں تیز کی جاتی ہیں" مسٹر لاری نے جواب دیا۔ "پیاری۔ اب یہ مقام قومی ملک ہے اور
اسے اسلحہ خانہ بنا دیا گیا ہے۔"

مزید دو مرتبہ اور بس۔ آخری بار کام کی رفتار سست تھی۔ پھر جلد ہی دن نکلنے لگا
اور مسٹر لاری نے لوسی کا ہاتھ چھڑا کر احتیاط سے باہر دیکھا۔ ایک میدان جنگ کے کسی زخمی
سپاہی کی طرح جو آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا ہو خون میں نہایا ہوا ایک شخص سان کے قریب فرش

زمین سے اٹھ کر پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس تھکے ہوئے قاتل کی نظر اس دھیمی روشنی میں رئیس نامدار کی گاڑیوں پر پڑی۔ اور وہ لڑھکتا ہوا آ کر ایک شاندار گاڑی میں سوار ہو گیا اور اس کے پر تکلف گدوں پر آرام سے لیٹ گیا۔

جب مسٹر لاری نے دوبارہ اس طرف نظر ڈالی تو اس وقت زمین کی عظیم سان ایک چکر لگا چکی تھی۔ اور صحن میں سورج کی سرخ روشنی پھیل گئی تھی۔ صبح کی پرسکون فضا میں وہ دوسری چھوٹی سان وہاں اکیلی نصب تھی۔ جس کے سرخ دھبے نہ تو سورج نے کبھی لگائے تھے اور نہ کبھی انھیں مٹا سکتا تھا۔

تیسرا باب

"سایہ"

جب دفتر کا وقت ہو گیا تو کاروبار کے گھنٹوں میں مسٹر لاری کے کاروباری ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال چکر لگانے لگا کہ ایک تارک وطن قیدی کی بیوی کو بنک کی عمارت میں پناہ دے کر انھیں ٹیلسن کے موقف کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا۔ لوسی اور اس کی بچی کے لئے وہ بلا تامل اپنی سلامتی اور جان و مال کی بازی لگا سکتے تھے۔ لیکن جو عظیم امانت ان کے سپرد کی گئی وہ ان کی ذاتی ملک نہیں تھی۔ اسی کاروباری فرض کی حد تک وہ سخت قسم کے

کاروباری آدمی تھے۔

اوّلاً انھیں ڈیفارج کا خیال آیا اور وہ سوچنے لگے کہ شراب خانے کا پتہ چلا کر اس کے مالک سے دریافت کرنا چاہئے کہ موجودہ بدامنی میں شہر کا محفوظ حصہ کونسا ہے لیکن معًا انھوں نے محسوس کیا کہ یہ طریقہ مصلحت کے خلاف ہے کیونکہ ڈیفارج سب سے زیادہ فساد زدہ علاقے میں رہتا ہے اور وہاں اس کا بڑا اثر تھا۔ اور یقیناً اس کہاں ہنگاموں سے ساز باز ہے۔

دوپہر تک ڈاکٹر مینٹ کا انتظار کرنے کے بعد یہ دیکھ کر کہ ہر لمحے کی تاخیر سے ٹیلسن کی نیک نامی متاثر ہو رہی ہے۔ انھوں نے لوسی سے مشورہ کیا اس نے کہا کہ اس کے والد بنک سے قریب عارضی طور پر مکان کرائے پر لینے کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ کاروباری نقطۂ نظر سے یہ تجویز بری نہیں تھی۔ نیز مسٹر لاری جانتے تھے کہ چارلس کو بحیز وعافیت رہائی مل بھی جائے تو وہ پیرس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لئے وہ گھر کی تلاش میں نکلے اور بہت جلد انھیں ایک گلی میں موزوں مکان کا پتہ مل گیا جس کے گرد عمارتوں کی بند کھڑکیاں بتا رہی تھیں کہ وہاں سارے گھر خالی پڑے ہیں۔

سب سے پہلے انھوں نے لوسی اور اس کی بچی اور مس پروس کو نئی عمارت میں منتقل کر دیا اور جتنی ہمت اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کی ہمت بندھائی اور انکی حفاظت کے لئے جیری کو دربانی پر مامور کیا۔ جس کا سر پھوڑ کر اندر گھسنا آسان کام نہ تھا جب مسٹر لاری دوبارہ اپنے کاروبار میں مصروف ہوئے تو ان کے دل میں بہتری الجھنیں

تھیں اور طبیعت بھی اداس تھی۔ اس طرح سارا دن پہاڑ کی طرح بڑی مشکل سے کٹا۔

دن ڈھلتے ڈھلتے ان کی طبیعت بھی ڈھل گئی تھی۔ بنک بند ہوتے ہی وہ پچھلی شام کی طرح کمرے میں جا کر اکیلے بیٹھے رہے اور آئندہ کے لیے سوچ رہے تھے کہ سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چند لمحوں میں ایک شخص ان کے سامنے آکھڑا ہوا اور انھیں گھور کر دیکھتے ہوئے ان کا نام لے کر مخاطب ہوا۔

"میں آپ کا خادم ہوں" مسٹر لاری نے کہا "کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

وہ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ سر پر سیاہ گھنگھریالے بال تھے۔ کوئی پینتالیس یا پچاس برس کا سن ہوگا۔ جواب میں اس نے انھیں کے الفاظ دہرا دیئے۔

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"

"شاید میری شراب کی دوکان پر"

مسٹر لاری نہایت دلچسپی و اضطراب سے کہنے لگے "کیا آپ کو ڈاکٹر مینٹ نے بھیجا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں میرے لئے کیا پروگرام ہے؟"

ڈیفارج نے ان کے بے چین ہاتھ میں ایک کھلی چٹھی دیدی۔ ڈاکٹر کے قلم سے لکھی ہوئی یہ تحریر اس میں درج تھی۔

"چارلس صحیح سلامت ہے۔ لیکن ابھی میرا یہاں سے جانا خطرے سے خالی نہیں میں نے یہ رعایت حاصل کی ہے کہ حامل ہذا چارلس کی چٹھی لوسی کے نام لے جائے۔ اس شخص کو

آپ اس سے ملنے دیجئے!"

خط پر اسی دن کی تاریخ تھی۔ لافورس سے صرف ایک گھنٹہ پہلے روانہ کیا گیا تھا۔

"کیا آپ میرے ہمراہ مسز چارلس کے پاس چلیں گے": خط پڑھنے کے بعد مسٹر لالاری خوش ہو کر بولے۔

"ہاں" ڈیفارج نے جواب دیا۔

مسٹر لالاری نے ڈیفارج کے خشک لہجے اور روکھی گفتگو پر دھیان نہیں دیا اور ٹوپی پہن کر اسے ساتھ لے چلے۔ صحن میں دو عورتیں نظر آئیں جن میں ایک بنائی میں مصروف تھی۔

"میڈم ڈیفارج ــــ بلاشبہ": مسٹر لالاری نے کہا۔ آج سے سترہ برس پہلے موصوف نے اس عورت کو بالکل اسی حالت میں دیکھا تھا۔

"ہاں وہی ہے": اس کے شوہر نے کہا۔

یہ دیکھ کر کہ وہ بھی ان کے ساتھ قدم اٹھا رہی ہے۔ مسٹر لالاری نے پوچھا "کیا میڈم بھی ہمارے ہمراہ چلیں گی"؟

ڈیفارج کی رکھائی پر مسٹر لالاری مشتبہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔

دونوں عورتیں پیچھے تھیں۔ دوسری وینجنس (انتقام) تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے درمیانی راستوں کو جلد طے کر کے نئے مکان میں داخل ہوئے جہاں جیری نے ان کی رہنمائی کی۔ لوسی اکیلی رو رہی تھی وہ شوہر کے بارے میں تازہ خبر سنکر خوشی سے اچھل پڑی اور چٹھی دینے والے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے کیا خبر تھا

کہ رات کی تاریکی میں وہ ہاتھ چارلس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا اور اگر موقع ملتا تو کیا کچھ نہ کر گذرتا۔

"جانِ من! ہمت سے کام لو۔ میں اچھا ہوں۔ اور تمہارے والد کے یہاں بڑے اثرات ہیں۔ تم اس چٹھی کا جواب نہیں بھجوا سکتیں میری طرف سے ہماری بچی کو پیار کر دو۔"

بس اتنی ہی عبارت تھی۔ لوسی کے لئے یہ بھی بہت غنیمت تھی۔ اس نے ڈیفارج سے توجہ ہٹا کر اس کی بیوی کا وہ ہاتھ چوم لیا، جو بنائی میں معروف تھا۔ محبت اور احسان مندی کے اس جوشیلی نسوانی جذبے کا ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ہاتھ اسی سرد مہری کے ساتھ بنائی میں مصروف تھا۔

اس ہاتھ کے لمس میں کچھ بات تھی جو لوسی بھی کھٹک گئی۔ چٹھی اپنی چولی کے اندر رکھتے رکھتے رک کر اپنے ہاتھ گردن پر رکھے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے میڈم ڈیفارج کی طرف آنکھ اٹھائی۔ میڈم ڈیفارج نے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے دردی سے اس کی جانب دیکھا۔

"پیاری بچی!" مسٹر لاری سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ "سڑکوں پر آئے دن فساد ہوتا رہتا ہے اور اگرچہ تمہارے لئے کوئی اندیشہ نہیں پھر بھی میڈم ڈیفارج جن کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں انھیں آئندہ شناخت کے لئے نظر میں رکھنا ضروری ہے۔" مسٹر لاری نے تینوں نو واردوں کی سنگدلانہ ہیئت دیکھ کر ہکلاتے ہوئے جملہ ختم کیا۔ "کیوں سٹزن ڈیفارج

کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟"

ڈیفارج نے مایوسی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور رکھائی سے ایک ہوں کہہ کر خاموش ہو رہا۔

"لوسی" مسٹر لاری نہایت اخلاقی انداز میں بولے "تم اپنی پیاری بچی اور مس پروس کو یہاں لے آؤ۔ ڈیفارج۔ مس پروس انگریز خاتون ہیں اور فرانسیسی زبان سے ناواقف"

موصوفہ جنہیں تمام اجنبیوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا شدید احساس تھا مصیبت میں پست ہمت ہونے والی نہ تھیں۔ اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے ہوئے وہ انگریزی میں وجنس سے کہنے لگیں "دیدہ دلیر مجھے امید ہے تم تو خیریت سے ہو گی" میڈم ڈیفارج کو بھی ایک برطانوی کھانسی کا نمونہ دکھایا گیا۔ مگر ان دونوں نے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

"کیا یہ بچی اس کی ہے" پہلی مرتبہ میڈم ڈیفارج نے بنائی روک کر سلائی سے لوسی کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے تقدیر انگشت نمائی کر رہی ہو۔

"ہاں۔ میڈم" مسٹر لاری نے جواب دیا "یہ ہمارے غریب قیدی کی چہیتی بچی اور اکلوتی اولاد ہے"

میڈم ڈیفارج اور اس کے ساتھیوں نے کچھ ایسے وحشتناک انداز سے بچی کو دیکھا کہ لوسی سہم گئی اور بے اختیار زمین پر گھٹنے ٹیک کر اسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر میڈم ڈیفارج اور ساتھیوں کی وحشتناک نظریں ماں بیٹی دونوں پر پڑنے لگیں۔

"میرے شوہر۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ کافی ہے" میڈم ڈیفارج نے کہا "میں ان

لوگوں سے مل چکی۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

اس کے دبے ہوئے جذبات اندر ہی اندر سے کسی خطرے کی غمازی کر رہے تھے لوسی نے خوفزدہ ہوکر میڈم ڈیفارج کا دامن تھامتے ہوئے التجا کی۔

"تم میرے شوہر پر مہربان رہوگی نا۔ انھیں کوئی ضرر تو نہیں پہونچےگا۔ اگر ممکن ہو تو کیا مجھے ان سے ملنے کا موقع دیا جائےگا؟"

"تمہارے شوہر سے مجھے کوئی سروکار نہیں" میڈم ڈیفارج نے بڑے اطمینان کے لہجے میں کہا۔ "میرا واسطہ تم سے رہےگا۔ کیونکہ تم اپنے باپ کی بیٹی ہو۔"

"میری خاطر ہی سہی میرے شوہر پر رحم کرو۔ میری بچی کی خاطر۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تم سے رحم کی بھیک مانگےگی۔ دوسروں کی بہ نسبت تم دونوں سے ہمیں زیادہ ڈر لگتا ہے۔"

میڈم ڈیفارج کے لئے یہ امر باعث فخر تھا۔ اور وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈیفارج جو بوکھلاہٹ میں ناخن چباتے ہوئے اپنی بیوی کا منھ تک رہا تھا۔ اب ذرا سخت دلی دکھانے لگا۔

"تمہارے شوہر نے چٹھی میں لکھا ہے" میڈم ڈیفارج نے خطرناک مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا "اثرات! کچھ اثرات کا تذکرہ تھا۔"

"انھوں نے لکھا ہے کہ" لوسی نے جلدی سے کاغذ چولی سے نکال کر میڈم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "میرے والد کے یہاں بڑے اثرات ہیں۔"

"اگر ان اثرات سے وہ رہائی پا سکتے ہیں تو خیر ایسا ہی سہی" میڈم ڈیفارج نے کہا۔

"ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے میں تم سے التجا کرتی ہوں" لوسی نے التجا کی "مجھ پر رحم کرو۔ اور اپنے اثرات میرے بے گناہ شوہر کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے ان کی تائید کرو۔ بہن یاد رکھو میں ایک بیوی اور ایک ماں کی حیثیت سے التجا کرتی ہوں۔"

میڈم ڈیفارج نے سرد مہری سے درخواست گذار پر نظر ڈالی اور اپنی دوست دنجنس کی طرف پلٹ کر کہا۔

"جب ہم اس ننھی بچی کی عمر کے تھے اس وقت سے ہم نے جن بیویوں اور ماؤں کو دیکھا ان کا تو کسی نے لحاظ نہیں کیا۔ ہم نے ان کے باپ دادا اور ان کے شوہروں کو اکثر ان سے بچھڑتے اور قید میں سڑتے دیکھا ہے۔ تمام عمر ہماری بہنیں مصیبت جھیلتی رہی ہیں۔ وہ اور ان کے بچے افلاس، برہنگی، بھوک، پیاس، بیماری، تباہی، ظلم، زیادتی، اور ہر قسم کی آفتوں میں مبتلا رہے۔"

"اس کے سوا ہم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" دنجنس نے تائید کی۔

"ہم بہت دنوں تک یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے" میڈم ڈیفارج لوسی سے مخاطب ہوئی "انصاف کرو۔ ایک بیوی اور ایک ماں کی بپتا سے ہماری دانست میں کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس نے دوبارہ بنائی شروع کر دی۔ اور پھر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے پیچھے دنجنس تھی۔ آخر میں ڈیفارج نے باہر جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"پیاری لوسی ہمت سے کام لو" مسٹر لاری نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا "ہمت اور جرأت سے کام لو" ابھی تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ کئی غریبوں سے ہمارا حال بہتر ہے۔ مضبوط دل رکھو اور خدا کا شکر ادا کرو۔"

"میں ناشکر نہیں ہوں۔ لیکن اس موذی عورت کو دیکھ کر میری ساری امیدوں پر اوس پڑ جاتی ہے ایک سایہ سا ہر طرف نظر آتا ہے"!

"ہشت۔ اس چھوٹے سے بہادر سینے میں اتنی مایوسی" مسٹر لاری بولے "کیا کہا سایہ سا نظر آتا ہے ہاں وہ صرف سایہ ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں"!

باوجود اس کے ان کے دل پر بھی ڈیفارج اور میڈم ڈیفارج کی تاریک نظروں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اور رہ رہ کر وہ بے حد پریشان تھے۔

چوتھا باب

طوفان کے درمیان سکون

ڈاکٹر مینٹ چوتھے دن صبح کو لوٹے۔ اکثر واقعات اس خوبی سے پوشیدہ رکھے گئے تھے کہ فرانس سے واپسی تک لوسی کو خبر نہیں ہوئی۔ ایک عرصے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں کو ملا کر مختلف عمروں کے گیارہ سو بے بس قیدی عام لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ان چار دنوں اور چار راتوں میں قتل کا بازار گرم تھا۔ اور ساری فضا مقتولوں کے خون سے آلودہ تھی۔ اس وقت لوسی کو صرف اتنا علم تھا کہ قید خانوں پر دھاوے سے تمام سیاسی قیدیوں کی جان خطرے میں تھی۔ اور بعض کو مجمع نے باہر گھسیٹ کر قتل کر دیا ہے۔

مسٹر لاری کو ڈاکٹر مینٹ نے رازداری کی غیر ضروری تاکید کے ساتھ بتایا کہ مجمع کے ساتھ قتل وخون کے میدان میں سے گذرتے ہوئے وہ لافورس کے قید خانے تک پہونچے تھے قید خانے میں ججوں کی ایک خودساختہ کمیٹی قیدیوں کے لئے فرداً فرداً احکام صادر کرتی تھی۔ کسی کو قصاص کا، کسی کو رہائی اور چند ایک کو کال کوٹھریوں میں واپس بھجوانے کا فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر کو ہمراہیوں نے ان ججوں کے روبرو پیش کیا تھا جب انھوں نے بیان دیا کہ وہ بیسٹل میں اٹھارہ سال تک بغیر کسی الزام کے راز کے قیدی رہے تھے تو عدالت کے ایک رکن نے جس کا نام ڈیفارج تھا۔ اس امر کی توثیق کی تھی۔

میز پر رکھے ہوئے رجسٹر دیکھنے کے بعد ڈاکٹر کو پتہ چلا تھا کہ لن ہگا داماد قید میں زندہ ہے۔ اور یہ کہ ارکان عدالت سے جن میں بعض جاگتے تھے اور بعض سو گئے تھے چند قتل و خون سے داغدار اور چند بے داغ تھے۔ بعض نشے میں چور اور بعض ہوش میں تھے۔ مذکورہ قیدی نے اپنی رہائی اور جان بخشی کی درخواست کی ہے نیز سابقہ دور کے ایک ممتاز مصیبت زدہ کی حیثیت سے شروع میں ڈاکٹر کی اس گرم جوشی سے آؤبھگت ہوئی کہ ان کے کہنے پر چارلس ڈارنے کو اس خلاف قانون عدالت کے روبرو پیش ہونے کی اجازت بھی مل گئی۔ اسے رہا کیا جانے والا ہی تھا کہ غیر متوقع طور پر کچھ رکاوٹ پیدا ہوگئی جس کا مطلب سمجھنا دشوار تھا۔ اس سلسلے میں کچھ راز کی مشاورت ہوئی جس کے بعد صدر نے مطلع کیا کہ قیدی حوالات میں ہی رہے گا۔ لیکن ڈاکٹر کی خاطر اس کی سلامتی کا پورا بندوبست کیا جائے گا۔ چنانچہ قیدی کو فوراً جیل کے اندرونی حصے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس پر ڈاکٹر مینٹ نے پُر زور

التجا کی کہ انھیں بھی اپنے داماد کے ساتھ چند دن رہنے کی اجازت دی جائے تاکہ انھیں اطمینان ہو جائے کہ کسی بدنیتی یا غلط فہمی سے ان کے داماد کو قاتلوں کے مجمع کے حوالے نہ کر دیا جائے، جس کے شور و غل سے اکثر عدالت کی کارروائی رک جاتی تھی۔ انھیں اس کی اجازت مل گئی تھی اور وہ خطرہ دور ہونے تک اسی مقتل میں ٹھیرے رہے۔

نیند اور کھانے کے مختصر وقفوں کے علاوہ باقی اوقات میں جو نظارے انھوں نے دیکھے وہ ناقابل بیان ہیں۔ ایک طرف چند قیدیوں کی رہائی پر دیوانہ وار خوشی۔ دوسری جانب ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے بدنصیبوں کے خلاف مجنونانہ غیظ و غضب۔ ڈاکٹر کا بیان تھا کہ ایک رہا شدہ قیدی کو سڑک پر ایک وحشی نے غلطی سے بھالا مار کر زخمی کر دیا۔ جب وہ مرہم پٹی کے لئے اسی پھاٹک سے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ سامریوں کے سے نیک دل انسان زخمی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ وہی حضرات تھے جو اپنے مقتولوں کے سینوں پر چڑھ بیٹھے تھے۔ عجیب غیر فطری تضاد تھا کہ یہی لوگ معالج کی مدد کرتے ہوئے بڑی رحمدلی سے زخمی کو ڈولی میں بٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ اور واپس آکر اپنے ہتھیار سنبھال لئے اور قتل عام کا ایسا ہنگامہ بپا کیا کہ ڈاکٹر مینٹ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہیں بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اس راز کی گفتگو میں مسٹر لاری نے اپنے دوست کا چہرہ دیکھ کر محسوس کیا کہ باسٹھ برس کے سن میں اس قسم کے وحشتناک تجربوں کی وجہ سے پھر پرانی بیماری کے عود کرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس سے پہلے کبھی اپنے دوست کو ایسے موقف میں نہیں دیکھا تھا کبھی ان کے کردار کے اس پہلو پر نظر نہیں پڑی تھی۔ عمر میں پہلی بار ڈاکٹر کو اس کا احساس تھا کہ

ان کی سابقہ مصیبتیں ان کی موجودہ قوت کا راز ہیں۔ اسی آگ میں تپ کر وہ آہنی ارادہ وجود میں آیا ہے۔ جس سے وہ اپنے داماد کے قید خانے کا دروازہ کھول کر اسے رہائی دلا سکتے ہیں۔ وہ کام اچھا ہے جس کا انجام اچھا ہے۔ میرے دوست۔ میری مصیبتیں اکارت نہیں ہوئیں جس طرح میری عزیز بچی نے مجھے نئی زندگی بخشی۔ اسی طرح میں اس کی عزیز ترین متاع اسے واپس دلاؤں گا۔ خدا کی مدد سے میں یہ فرض ادا کروں گا۔" ڈاکٹر مینٹ یوں گویا ہوئے۔ اور جب جارویس لاری نے ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کا عزم و استقلال دیکھا تو انھیں یقین تھا کہ اس شخص کی زندگی جو رکی ہوئی گھڑی کی طرح کئی برس تک بیکار ہو گئی تھی اب پہلے سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آجائے گی۔

جن مخالف حالات کا ڈاکٹر مینٹ اس وقت مقابلہ کر رہے تھے ان سے بہت زیادہ مشکلات بھی ہوتیں تو ان کا عزم کامیاب ہوتا۔ بحیثیت طبیب کے ان کا معاملہ ہر انسان سے تھا۔ چاہے وہ آزاد ہو یا غلام۔ امیر ہو یا غریب، نیک ہو یا بد۔ انھوں نے اس دانش مندی سے اپنے شخصی اثر سے کام لیا کہ بہت جلد وہ تین قید خانوں کے نگران کار طبیب بن گئے۔ ان میں لافورس کا قید خانہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے لوسی کو اطمینان دلایا۔ کہ اس کا شوہر اب قید تنہائی میں نہیں ہے بلکہ عام قیدیوں کے ساتھ دن گذار رہا ہے وہ اپنے داماد سے ہر ہفتے ملاقات کرتے اور اپنی بیٹی کے اس کے لئے تسلی بخش زبانی پیامات سناتے۔ کبھی اس کا شوہر دوسرے ذرائع سے لوسی کو خط بھی بھجواتا لیکن وہ تحریری جواب نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ بے سروپا بدگمانیوں میں زیادہ تر قید خانوں کی ایسی سازشوں کے شبہات تھے جن میں تارکان وطن کے بیرونی افراد

ربط پیدا کرنے کا اندیشہ سب میں نمایاں تھا۔

بلاشبہ ڈاکٹر کی نئی زندگی میں پریشانیوں کی کمی نہ تھی۔ تاہم مسٹر لاری کی قیافہ شناسی نے اندازہ لگا لیا کہ ان میں اب ایک حوصلہ مندی کا احساس پیدا ہو گیا ہے فخر و مباحات کا ایک مزید جذبہ جو بالکل فطری امر تھا۔ مسٹر لاری کے لئے یہ انکشاف بہت دلچسپ تھا ڈاکٹر مینٹ جانتے تھے کہ اس وقت تک ان کی قید و بند کا زمانہ ان کی لڑکی اور ان کے دوست کی نظر میں محض ایک شخصی المیہ تھا لیکن اب اس کی نوعیت بدل گئی تھی اب انھیں احساس تھا کہ ان کی سابقہ مصیبت ہی ان کی موجودہ طاقت کا باعث ہے جس کے ذریعے وہ چارلس کو رہائی دلا سکتے ہیں ڈاکٹر مینٹ کا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا اور وہ ہر معاملے میں دونوں کی رہنمائی کرنے لگے تھے۔ جیسے طاقت ور انسان کمزوروں کی دستگیری کرتے ہیں۔ لوسی کا اور ان کا سابقہ موقف اب بدل گیا تھا۔ لیکن یہ تبدیلی احسان مندی اور محبت کے جذبات کے تحت ہوئی تھی۔ انھیں صرف ایک ہی چیز پر فخر ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنی بہترین مددگار اور عزیز لڑکی کی آج خود مدد کرنے کے قابل ہیں " نہایت دلچسپ معاملہ ہے " مسٹر لاری دانشمندانہ طور پر سوچنے لگے : " بالکل فطری اور حق بجانب۔ میرے دوست۔ رہنمائی کئے جاؤ۔ تم سے زیادہ کوئی اس کام کے لئے موزوں نہیں "

ڈاکٹر نے چارلس کو رہائی دلانے یا کم از کم اس کے مقدمے کی سماعت کے لئے لاکھ کوشش کی لیکن رائے عامہ کا دھارا اس تیزی سے ان کے خلاف تھا کہ انھیں فوری کامیابی نہ ہو سکی۔ نئے دور کا آغاز تھا بادشاہ پر مقدمہ چلا کر اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا تھا اور اس کا

سر تن سے جدا ہو چکا تھا۔ آزادی برابری بھائی چارگی یا موت! کی رَی پبلک نے برسرِ پیکار دنیا کے خلاف فتح یا موت کا اعلان کر دیا تھا۔ نا تر ڈیم کے اونچے برجوں سے دن رات سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔ روئے زمین کے ظالم حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی صلائے عام پر تین لاکھ رنگروٹ فرانس کے ہر علاقے سے ابل پڑے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آندھیاں بوئی گئی ہیں اور بگولے اُگ رہے ہیں۔ کہسار و میدان، پہاڑیاں اور بنجر زمینیں اور زرخیز علاقے، جنوب کے گرم خطے اور شمال کے ابر آلود حصے، دلدل اور جنگل، انگور کے باغ، اور زیتون کے بَن، چراگاہیں اور غلّے کے کھیت، ندیوں کے پار و کنارے اور سمندر کے ریتلے ساحل کہیں پناہ نہیں تھی۔ اس طوفان کا مقابلہ کسی فردِ بشر کے بس کی بات نہ تھی۔ آزادی کا پہلا سال تھا اور یہ سیلاب زمین کی سطح سے ابھرا تھا۔ آسمان کی چھت سے نہیں ٹپکا تھا۔ افلاک کے سارے دریچے بند تھے ایک بھی کھڑکی کھلی نہ تھی۔

بغیر کسی وقفے کے بے رحمی اور بدامنی کی فضا میں پل بھر کے لئے بھی آرام نہ تھا۔ وقت نا کا ہر پیمانہ ٹوٹ چکا تھا۔ گو دن اور رات کا چکر وہی تھا جو ابتدائے آفرینش میں رہا کرتا تھا اور صبح و شام بھی اسی طرح گذرتے تھے زمانے کی گردش کی دو سری پیمائشیں ختم ہو چکی تھیں۔ ساری قوم کو بخار چڑھ گیا تھا۔ کبھی سارے شہر کے غیر فطری سکوت کو توڑنے کے لئے جلّاد بادشاہ کا ناہوا سر دکھاتا۔ اور کبھی یہ معلوم ہوتا کہ اس آن میں حسین ملکہ کا سر پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کے بال آٹھ مہینوں کی بیوگی اور قید و بند کی مصیبت میں سفید ہو گئے ہیں۔

تاہم اگر اس قانون تضاد پر غور کیا جائے جو ان حالات میں ہمیشہ رونما ہوا ہے تو اس

برق کی سی تیز رفتار کے باوجود کافی وقت صرف ہوا۔ پائے تخت میں ایک انقلابی عدالت سامنے ملک میں چالیس پچاس ہزار انقلابی کمیٹیاں، مشتبہ افراد کا قانون جس کی رو سے جان و مال کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا اور کوئی بھی نیک دل انسان بد طینت مجرموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاسکتا تھا۔ بے گناہوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے قید خانے جہاں کسی کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ یہ چیزیں عام ہوگئیں اور چند ہفتوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قدیم زمانے سے ان کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔

خاص کر ایک خبیث شکل سے لوگ ایسے مانوس ہوگئے جیسے روز ازل سے وہ عوام کے پیش نظر رہا ہو اور اس تیز مزاج عورت کا نام تھا مس گلوٹین۔

وہ مزاحیہ فقروں کا عام موضوع تھی۔ درد سر کا بہترین علاج۔ بالوں کو سفید ہونے سے بچانے والی تیر بہدف دوا۔ چہرے کو سرخی دینے والا روغن، قومی حجامت کا تیز استرا۔ جس نے مس گلوٹین کا بوسہ لیا۔ دریچے سے جھانکنا اور تھیلے میں چھینکنا اس کے لئے لازمی تھا۔ وہ نسل انسانی کی حیات نو کا مژدہ تھی۔ صلیب سے زیادہ مقدس سینوں پر صلیب کی جگہ اس کے نمونے آویزاں تھے۔ صلیب کے منکر اس کے آگے جھکتے اور اس پر ایمان لاتے تھے۔

اس نے اتنے سر قلم کئے تھے کہ اس کا رنگ اور اس زمین کا رنگ جسے اس نے نجس بنا دیا تھا نہ صرف سرخ بلکہ گھناؤنا بن گیا تھا۔ کمسن شیطان کے کھلونے کی طرح کبھی اس کے ٹکڑے الگ کئے جاتے اور پھر انہیں حسب ضرورت جوڑ دیا جاتا۔ وہ چرب زبان مقرروں کا منہ بند کردیتی تھی۔ طاقتوروں کو مار گراتی تھی۔ اور نیکوں اور حسینوں کا خاتمہ کردیتی تھی۔ ایک صبح کو

بائیس منٹ میں اس نے بائیس سربلند دستوں کے سر کاٹے تھے۔ جن میں اکیس زندہ اور ایک مردہ آدمی شامل تھا۔ اس کے نگران کار کو انجیل مقدس کے عہد نامہ قدیم کے ایک سورما کا نام دیا گیا تھا۔ لیکن اس ہتھیار کی مدد سے وہ اپنے ہمنام سیمسن سے زیادہ طاقتور اور زیادہ اندھا تھا۔ اور ہر روز خدائے برتر کی عبادت گاہ کے دروازے توڑا کرتا تھا۔

ان ہیبتناک خطروں کے درمیان ڈاکٹر مینٹ خود اعتمادی کے ساتھ گزارا کر رہے تھے انھیں اپنی قوت پر بھروسہ تھا پھر بھی وہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ بالآخر وہ لوسی کے شوہر کو بچالیں گے۔ باوجود ان کے اطمینان اور اعتماد کے حالات کا دھارا اس قدر تند و تیز تھا کہ چارلس ایک سال ڈیڑھ مہینے تک قید میں پڑا رہا۔ دسمبر کے اس مہینے میں انقلاب کی طاقتیں اس حد تک شرپسند ہو گئی تھیں کہ جنوب کے دریا ہزاروں زبردستی غرق کئے ہوئے بدنصیبوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ اور شمال کے سرد علاقوں میں قیدیوں کو قطار در قطار گولی ماردی جاتی تھی۔ ان خطرات میں بھی ڈاکٹر کا دل مضبوط رہا۔ پیرس میں اس وقت ان سے زیادہ کوئی مشہور نہ تھا کسی کا موقف اتنا عجیب وغریب نہ تھا۔ ہر لحاظ سے وہ ہمیشہ آدمی تھے۔ کم سخن، نرم دل، اسپتال اور جیل میں یکساں مقبول۔ وہ اپنے فن سے قاتلوں اور گھائلوں کو بغیر کسی امتیاز کے مساوی فائدہ پہونچاتے تھے۔ اپنے پیشے کی پریکٹس میں بسٹیل کے قیدی ہونے کے تعلق سے ان کا خاص درجہ تھا ان پر شک وشبہ کرنا ایسا ہی تھا جیسے اٹھارہ برس پہلے سچ مچ قبر سے اٹھ کر آنے والے مردے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا یا کسی روح کے متعلق دریافت کرنا جو انسانوں کے درمیان گذر بسر کر رہی ہو۔

پانچواں باب
"آرہ کش"

پندرہ مہینے گذر چکے۔ اس عرصے میں لوسی کو ہر ساعت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب اس کے شوہر کی گردن، اڑا دی جائے۔ سزایافتوں سے بھری ہوئی گاڑیاں روزانہ سنگ بستہ سڑکوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی گذرتی تھیں۔ خوبصورت لڑکیاں اور ذہین عورتیں، کسی کی سیاہ پلکیں اور کسی کی بادامی یا بھوری لٹیں۔ نوجوان لڑکے، مضبوط مرد، اور بوڑھے انسان، مہذب شہری اور دیہات کے کسان، سب کا خون مس گلوٹین کے لئے سرخ شراب، سب کو قابل نفرت قید خانوں کی کال کوٹھریوں سے نکال کر روزانہ باہر روشنی میں لایا جا رہا تھا تاکہ اس قتالہ عالم کی خونخوار پیاس بجھے۔ آزادی، برابری، بھائی چارگی یا موت۔ آخرالذکر سب سے ارزاں تحفہ۔ آہ مس گلوٹین۔

ناگہانی مصیبت اور گردش ایام کے مقابلے سے مایوس ہو کر لوسی کا ارادہ مفلوج ہو جاتا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی۔ لیکن اس تاریخ سے جب اس نے سینٹ جیمز میں اپنے بوڑھے باپ کے سفید سر کو اپنے نوخیز سینے سے لگا لیا تھا، ادائے فرض میں اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ آزمائش اور ابتلا کے دور میں وہ اور بھی مستعدی سے اپنے فرائض ادا

کرنے لگی۔ جیسا کہ تمام نیک اور پرخلوص انسانوں کا قاعدہ ہے۔

نئے مکان میں منتقل ہوتے ہی اس کے والد اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ اور وہ گھر کا اسباب اسی طرح سلیقے سے جمانے میں مشغول ہو گئی جس طرح وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں کیا کرتی تھی۔ ہر چیز کی ایک مقررہ جگہ اور ہر کام کا ایک مقررہ وقت تھا۔ ننھی لوسی کی پڑھائی کا اتنا ہی خیال رکھتی جتنا کہ انگلستان کی زندگی میں رکھتی تھی۔ جب وہ سب ہنسی خوشی مل جل کر رہا کرتے تھے۔ مختلف ترکیبوں سے وہ اپنے آپ کو اس خوش فریبی میں مبتلا رکھتی کہ اس کا شوہر واپس آنے والا ہے۔ وہ اس کی جلد واپسی کی چھوٹی موٹی تیاریاں کرتی اور اسکی کرسی اور کتابوں کو قرینے سے رکھتی۔ اور راتوں کو تمام بدنصیب قیدیوں میں بطور خاص ایک محبوب قیدی کے حق میں دل سے دعا کرتی۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بس یہی چند طریقے رہ گئے تھے۔

اس کی ظاہری حالت کچھ زیادہ نہیں بدلی تھی۔ سادہ سیاہ پوشاک جو ماتمی لباس سے ملتی جلتی تھی اس کے اور اس کی لڑکی کے زیب بدن رہتی۔ راحت و آرام کے زمانے کی طرح اب بھی وہ کپڑوں کی صفائی کا پورا خیال رکھتی۔ البتہ چہرے کا رنگ کچھ زرد پڑ گیا تھا۔ اور وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ ورنہ اس کے حسن و جمال میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کبھی رات کو اپنے والد کی پیشانی کا بوسہ لے کر وہ زار و قطار رونے لگتی۔ اور کہتی کہ دنیا میں اس کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ وہ ہمیشہ اولوالعزمی کے ساتھ جواب دیتے "لوسی۔ میرے علم کے بغیر اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آسکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اسے بچا سکتا ہوں"

اس طرح رہتے ہوئے چند ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ اس کے والد نے ایک دن کہا۔

" پیاری۔ قید خانے کی دیوار میں ایک بالائی دریچہ ہے جہاں تک کبھی کبھار سہ پہر میں چارلس کی پہونچ ہو سکتی ہے۔ جب کبھی وہ مشکلات پر قابو پاکر وہاں تک پہونچ سکے اس کا کہنا ہے کہ اس وقت تم راستے پر ایک خاص جگہ ٹھیری رہو تو وہ تمہیں دیکھ سکے گا۔ لیکن تم اسے نہیں دیکھ سکو گی۔ پیاری بچی۔ اگر تیری نظر اس پر پڑے بھی تو کسی قسم کا اشارہ کرنا خطرناک ہوگا "

" ابا۔ وہ جگہ مجھے بتادو۔ میں روز وہاں جایا کروں گی "

اس دن سے ہر موسم میں لوسی وہاں دو گھنٹے انتظار کیا کرتی۔ دو بجتے ہی وہ وہاں پہونچ جاتی۔ اور چار بجے چار و ناچار واپس چلی آتی۔ بارش یا سردی زیادہ نہ ہو تو بچی کو بھی ساتھ لے جاتی ورنہ اکیلی جاتی۔ بہر حال کوئی دن ناغہ نہ ہوتا۔

ایک چھوٹی سی گلی کے تاریک اور گندہ موڑ پر جہاں ایک آرہ کش کی کوٹھری کے سوا کوئی مکان نہ تھا وہ دیوار سے لگی کھڑی رہتی تھی۔ تیسرے دن آرہ کش کی نظر اس پر پڑی۔

" آداب۔ خاتون سٹیزن "

" آداب۔ سٹیزن "

اس قسم کے تخاطب کے لئے سرکاری احکام صادر ہوئے تھے۔ ایک عرصے سے وطن پرست ایک دوسرے کو انہی الفاظ میں مخاطب کرتے تھے لیکن اب تو قانون بن گیا تھا۔

" خاتون سٹیزن۔ پھر ادھر چہل قدمی ہو رہی ہے "

"سٹیزن۔ تم خود دیکھ رہے ہو۔"

آرہ کش جو کبھی سڑک کی مرمت کیا کرتا تھا۔ مختصر قد کا آدمی تھا جسے ہاتھ نچا کر گفتگو کرنے کی عادت تھی۔ اس نے قید خانے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے چہرے پر رکھ کر سلاخوں میں سے جھانکنے والے کی شکل بنائی اور مسکرانے لگا۔

"مجھے ان باتوں سے کیا واسطہ۔" یہ کہکر وہ پھر آری سے لکڑی کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے دن وہ لوسی کا منتظر تھا اور اسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

"خاتون سٹیزن۔ پھر آپ یہاں چہل قدمی کر رہی ہیں۔"

"ہاں۔ سٹیزن۔"

"اچھا ایک بچی بھی ساتھ ہے۔ ننھی سٹیزن یہ تمہاری ماں ہے نا۔"

"کیا میں ہاں کہوں۔" ننھی لوسی نے اپنی ماں سے لپٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں پیاری۔"

"ہاں سٹیزن۔"

"خیر مجھے اس سے کیا واسطہ۔ مجھے اپنے کام سے کام۔ یہ آری دیکھنا۔ میں نے اس کا نام رکھا ہے چھوٹی گلوٹین۔ لا، لا، لا، لا، لا، لا، اور سر قلم۔"

لکڑی کا تختہ کٹ کر گرتے ہی اس نے ایک ٹوکری میں ڈال دیا۔

"یہ ایندھن کی لکڑی گلوٹین ہے اور میں اس کا سیمسن ہوں۔ دیکھنا۔ لو۔ لو، لو، لو لو اور سر قلم۔ اب ایک بچہ۔ ٹکل ٹکل۔ پکل پکل۔ سر قلم۔ پورا خاندان صفاچٹ"

اس نے جب دو تختے ٹوکری میں ڈالے تو لوسی کانپ اٹھی۔ لیکن جب تک وہ آرہ کش کام کرتا رہا یہ ناممکن تھا کہ وہاں ٹھہرنے والے اس کی نظر سے اوجھل رہیں۔ اس دن سے لوسی اس کو خوش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس سے گفتگو کرتی اور شراب پینے کے لئے اکثر اسے انعام دیا کرتی۔

وہ شخص ہر چیز کی ٹوہ میں رہتا تھا۔ کئی بار اس کے وجود سے بے خبر لوسی قیدخانے کی چھت پر نظریں جمائے اپنے شوہر کے خیال میں غرق رہتی تو وہ بڑبڑا کر اسے چونکا دیتا۔ بنچ پر گھٹنے ٹیکے آری ہاتھ میں لئے ہوئے وہ کہتا "مجھے اس سے کیا واسطہ" اور پھر آرہ کشی میں مصروف ہوجاتا۔

کوئی موسم ہو۔ سرما کی برف باری۔ بہار کی تند ہوائیں۔ گرمیوں کی تیز دھوپ، خزاں کی برساتیں، اور پھر از سر نو سرما کی برف باری، ہر موسم میں لوسی روزانہ دو گھنٹے یہاں گذارتی اور پھر روز واپس جاتے ہوئے قیدخانے کی دیوار کو بوسہ دیتی۔ اس کے والد کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا شوہر اسے کبھی ایک آدھ مرتبہ اور کبھی تین چار دفعہ دیکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی مہینے پندرہ دن تک دیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ یہی غنیمت تھا کہ کبھی نہ کبھی وقت اسے جھلک دکھائی دیتی تھی وہ اس امید پر ایک دن کیا ایک ہفتہ بھر وہاں ٹھہرنے کے لئے تیار رہتی۔

ان مصروفیتوں میں دن گذرتے گئے یہاں تک کہ دسمبر کا دہشتناک مہینہ آپہونچا

جب کہ تمام خطرات کے باوجود اس کے والد نے اپنا دل اسی طرح مضبوط رکھا۔ شام کا وقت تھا ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ مقررہ مقام پر پہونچی۔ اس دن جشن منایا جارہا تھا اور لوگ مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ آتے ہوئے اس نے دیکھا کہ مکانوں کو برچھیوں سے سجایا گیا ہے جن پر چھوٹی چھوٹی سرخ ٹوپیاں اور ترنگے فیتے لگائے گئے ہیں۔ ہر طرف وہی سہ رنگی تحریر نمایاں ہے ناقابل تقسیم ری پبلک آزادی، برابری بھائی چارگی یا موت۔

مفلس آرہ کش کی دوکان اس قدر چھوٹی تھی کہ وہاں اس رنگین داستاں کے لئے کافی جگہ نہیں تھی۔ بہرحال اس نے کسی سے یہ عبارت لکھوادی تھی۔ صرف موت کا لفظ بڑی مشکل سے غلط مقام پر ٹھونس دیا گیا تھا۔ ایک اچھے شہری کی طرح اس نے اپنی چھت پر برچھی اور ٹوپی لگادی تھی۔ اور کونے میں رکھی ہوئی اپنی آری پر "مقدس دلی چھوٹی گلوٹین" لکھدیا تھا۔ اس تیز مزاج قتالہ کو اب ولایت کا رتبہ مل گیا تھا۔ دوکان بند تھی اور آرہ کش وہاں موجود نہ تھا لوسی اطمینان سے اکیلی کھڑی ہوئی تھی۔

لیکن وہ بہت دور بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد لوسی کے کانوں میں چیخ پکار کی پریشان کن آوازیں پڑنے لگیں اور پھر قید خانے کی دیوار کے موڑ پر ایک مجمع نمودار ہوا۔ جس کے آگے آگے ونجنس اور آرہ کش ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے پانچ سو آدمی پانچ ہزار شیطانوں کی طرح ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے بس اسی حد تک موسیقی کا اہتمام تھا۔ وہ انقلابی گیت گاتے ہوئے اس طرح ناچ رہے تھے جس طرح کوئی غضبناک انسان ایک

ساتھ غصے سے دانت پیسیں۔ کچھ مرد عورتوں کے ساتھ ناچ رہے تھے۔ اور کچھ دوسرے مردوں کے ساتھ۔ چند عورتیں عورتوں کے ساتھ ناچ رہی تھیں غرض جس کو جو ساتھی مل گیا وہ اس کے ساتھ رقص میں مصروف تھا۔ پہلے پہل بھدی سرخ ٹوپیاں اور بھدے اونی چیتھڑے، طوفانی موجوں کی طرح ناچ رہے تھے لیکن جیسے ہی لوگ وہاں جمع ہو گئے اور لوسی کے قریب ناچنے کے لئے ٹھہر گئے۔ ایک مجنونانہ رقص کی سی شکل پیدا ہو گئی۔ وہ آگے بڑھتے پیچھے ہٹتے۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ ایک دوسرے کا سر پکڑتے۔ اکیلے چکر کاٹتے، جوڑے بن کر چکر کاٹتے یہاں تک کہ ان میں چند بے دم ہو کر گر پڑتے۔ تب دوسرے ناچنے والے ہاتھ میں ہاتھ دیکر چکر کاٹنے لگتے۔ پھر وہ حلقہ ٹوٹ جاتا اور دو دو چار چار کی ٹولیاں بنتیں اور ناچ شروع ہوتا۔ اور پھر رُک جاتا۔ پھر شروع ہوتا اور پھر رک جاتا۔ اور گھوم پھر کر سب الٹی طرف چکر کاٹتے۔ اور دوسری جانب نکل جاتے۔ یکایک وہ رک گئے۔ اور گلی کی ناپ سے قطاریں بنا کر سر جھکا کے اور ہاتھ اٹھائے ہوئے چیختے چلّاتے روانہ ہو گئے۔ بلاشبہ ایک تفریح اب شیطانی کھیل بن گئی تھی۔ ایک صحت مند مشغلہ خون کو کھولانے کا ذریعہ بن گیا تھا جس سے لوگوں کے دل پریشان اور دماغ پراگندہ ہو رہے تھے۔ اس رقص میں جو کچھ خوبی تھی وہ بھی بدنما معلوم ہوتی تھی۔ جیسے نیک و بد کے سارے پیمانے بدل گئے ہوں۔ دوشیزاؤں کے کھلے سینے کمسن حسیناؤں کی شوریدہ سری اور خاک و خون میں نازو انداز سے اٹھتے ہوئے نازک قدم دراصل یہ سب بے جوڑ حالات کے نمونے تھے۔

انقلاب پسندوں کے اس ناچ کا نام کارمینول تھا۔ بھیڑ چھٹنے کے بعد خوف زدہ

اور حیران لوسی آرہ کش کے دروازے پر بت بنی کھڑی رہی۔ آسمان سے پرندوں کے پر جیسے برف کے سفید ٹکڑے آہستہ آہستہ زمین پر گر رہے تھے ان پر ہنگاموں کا اثر نہیں پڑا تھا۔

اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹانے پر لوسی نے دیکھا کہ اس کے والد سامنے کھڑے ہیں۔

"میرے پیارے ابا!" اس نے کہا "کیسی بے رحمی کا تماشا ہے!"

"جان پدر، میں جانتا ہوں۔ کئی بار میں نے یہ نظارے دیکھے ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ کوئی تمہیں ضرر نہیں پہونچائے گا!"

"مجھے اپنے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ابا، مگر جب میں اپنے شوہر کا خیال کرتی ہوں اور ان لوگوں کی حرکتیں۔۔۔۔"

"ہم بہت جلد اسے ان لوگوں کے رحم و کرم سے آزاد کرا دیں گے۔ میں جب وہاں سے چلا ہوں تو وہ دریچے تک چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تمہیں اس کی اطلاع دینے آیا ہوں چاہو تو چھت کی طرف دیکھ کر تم اپنے ہاتھ کو بوسہ دے سکتی ہو!"

"ابا، یہ لیجئے۔ میں اپنے بوسے کے ساتھ اپنی روح بھی بطور پیام بھجوا رہی ہوں!"

"بیچاری لڑکی۔ کیا تو اس کو نہیں دیکھ سکتی!"

"نہیں، ابا، نہیں!" لوسی نے اپنے ہاتھ کو بوسہ دے کر روتے ہوئے کہا۔

برفیلے راستے پر قدموں کی چاپ۔۔۔ میڈم ڈیفارج۔۔۔۔" خاتون سٹیزن آداب!" ڈاکٹر نے کہا "سٹیزن آداب!" میڈم نے جواب دیا۔ اور اتنا کہہ کر سائے کی طرح وہاں سے سفید سڑک پر غائب ہو گئی۔

"جان پدر۔ اپنے ہاتھ سے مجھے سہارا دو۔ اس کی خاطر تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے ۔۔۔ شاباش!" وہاں سے جانے کے بعد انھوں نے کہا "محنت اکارت نہیں جائیگی۔ کل چارلس کی پیشی ہے۔"

"کل!"

ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔ میں پوری طرح تیار ہوں لیکن بعض بیش بندیاں عدالت کے روبرو ہی کی جا سکتی ہیں۔ ابھی اسے اطلاع نامہ نہیں ملا لیکن میں جانتا ہوں وہ کل طلب کیا جائے گا۔ اور اسے حوالات میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ مجھے بروقت اطلاع مل چکی ہے تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟"

"مجھے آپ پر اعتماد ہے" بمشکل وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

"ہاں۔ مجھ پر پورا اعتماد رکھو امید و بیم کی حالت اب ختم ہو چکی۔ جان پدر۔ وہ چند گھنٹوں میں تم سے آملے گا۔ میں نے مقدور بھر اس کی حفاظت کے انتظامات کر دیئے ہیں ذرا میں لاری سے مل لیتا ہوں۔"

"وہ رک گئے۔ قریب میں پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں اس کا مطلب خوب سمجھتے تھے۔ ایک، دو، تین، تین گاڑیاں اپنی بدنصیب سواریوں کو لئے ہوئے برف پر چلی جا رہی تھیں۔

"اب میں ذرا لاری سے مل لیتا ہوں" ڈاکٹر نے لوسی کو دوسری طرف جھکاتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔

وہ اولوالعزم پیر مرد ابھی اپنی مفوضہ جگہ پر ڈٹا ہوا اپنا فرض ادا کر رہا تھا جس جائداد کو ضبط کر کے قومی ملک بنا دیا جاتا اس کا حساب لینے کے لئے مسٹر لاری اور ان کے رجسٹروں کی اکثر ضرورت پڑتی۔ جو کچھ خانگی مالکوں کے لئے بچ سکتا تھا انہوں نے بچالیا۔ ٹیلسن کی امانتوں کا ان سے بہتر کوئی نگران کار نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ وہ بلا وجہ کسی سے جھگڑے نہیں مول لیتے تھے۔

سرخ و زرد آسمان پر کچھ کچھ تاریکی پھیل رہی تھی۔ دریائے سین سے کہر اٹھ رہا تھا مغرب کا وقت تھا ان کے بنک پہونچنے تک اندھیرا چھا گیا تھا۔ رئیس نامدار کا شاندار محل بالکل ویران ہو گیا تھا۔ صحن کے کوڑے کچرے کے ایک انبار پر تختی لگی تھی: قومی ملک، متحد اور غیر منقسم ری پبلک، آزادی، برابری، اور بھائی چارگی یا موت!

اپنا سواری کا کوٹ کرسی پر رکھ کر مسٹر لاری کے ساتھ کون چھپا بیٹھا تھا۔ یہ نو وارد دھڑکتے دل اور حیران آنکھوں سے اپنی محبوبہ کو گلے لگانے کے لئے کہاں سے آگیا تھا۔ اور اس محبوبہ کے الفاظ کس کے سامنے دہرا رہا تھا جب کہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دروازے کی طرف مڑ کر اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔

"حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔ اور کل عدالت میں پیش کیا جائے گا۔"

چھٹا باب

کامیابی

پبلک پروسکیوٹر۔ دُھن کے بے ارکان جیوری اور پانچ ججوں پر مشتمل قہرناک عدالت کا اجلاس روزانہ ہوا کرتا تھا۔ ان کی تیار کردہ فہرست ہر شام کو مختلف قید خانوں کو روانہ کر دی جاتی تھی۔ جہاں کے جیلر قیدیوں کو پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ عموماً ایسے موقعوں پر جیلر مذاق سے کہا کرتے "اندر بیٹھے کیا کر رہے ہو، باہر آؤ اور شام کے اخبار کی اطلاعیں سنو"

"چارلس ایورمونڈ عرف ڈارنے"

بالآخر لافورس میں شام کا اخبار یوں شروع ہوا۔

جب کوئی نام پکارا جاتا تو شخص مذکور آگے بڑھ کر اس مقام پر ٹھیر جاتا جو اس قسم کے بدنصیبوں کے لئے علاحدہ مختص تھا۔ چارلس ایورمونڈ عرف ڈارنے اس طریق کار سے واقف تھا۔ اس نے سیکڑوں آدمیوں کو اس طرح سدھارتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس کا موٹا تازہ جیلر جو چشمہ لگائے ہوئے تھا یہ دیکھ کر کہ قیدی نے اپنی جگہ سنبھال لی ہے فہرست کے دوسرے نام پڑھنے لگا۔ وہ ہر نام پر ٹھیر کر اپنا اطمینان کر لیا کرتا تھا۔

کل تیئیس نام پکارے گئے لیکن صرف بیس قیدی حاضر تھے۔ باقی تین میں سے ایک جیل میں مر چکا تھا۔ دوسرے دو کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ لیکن یہ باتیں ذہن سے اتر گئی تھیں فہرست اسی ہال میں پڑھی گئی جہاں ڈار نے قید خانے کے ساتھیوں سے پہلی رات کو ملا تھا۔ قتل عام میں وہ سب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ہر وہ شخص جس سے وہ مانوس تھا اس سے جدا ہونے کے بعد سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

خیر باد اور مہربانی کے چند لفظ کہہ کر سب رخصت ہو جاتے تھے۔ یہ روزمرہ کا دستور تھا اس شام کو لافورس کے کیمپ ایک کنسرٹ اور بعض جرمانوں کے کھیلوں کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ لوگ سلاخوں کے قریب جمع ہو کر بیٹھنے لگے۔ بہر حال بیس آدمیوں کی جگہ کھیلوں میں خالی ہو رہی تھی اور جلد کوئی دوسرا بندوبست کرنا تھا۔ کیونکہ کوٹھریوں میں بند ہونے کا وقت قریب تھا اور پھر وہ تالا اور بڑے کمرے راتوں کو نگرانی کرنے والے کتوں کے قبضے میں چلے جاتے۔ یہ نہیں کہ قیدی بے حس یا بے درد تھے ان کے طور طریق حالات کا نتیجہ تھے۔ اسی طرح گو اس سے کسی قدر مختلف وہ والہانہ جوش تھا جس کے اثر سے بعض لوگ خواہ مخواہ سولی پر چڑھ کر اپنی جان دیتے تھے۔ یہ کوئی جھوٹی شیخی نہ تھی بلکہ ایک عام ہیجان کا خاص مظاہرہ تھا۔ جیسے وبا کے دنوں میں چند لوگ دل ہی دل میں اس مرض کا شکار ہو کر مرنے کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ ہم سب کے سینوں میں اس قسم کے عجیب غریب جذبات پوشیدہ رہتے ہیں۔ جن کا حسب حال اظہار ہو سکتا ہے

حوالات کا راستہ تاریک اور مختصر تھا۔ کیڑے بھری ہال کوٹھریوں کی رات طویل اور

سرد تھی۔ دوسرے دن چارلس ڈارنے کا نام پکارنے سے پہلے پندرہ قیدیوں کو طلب کر کے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر سب کو سزائیں سنادی گئی تھیں۔

آخر کار چارلس ایوریمونڈ عرف ڈارنے کے الزام کی باری آئی۔

جج صاحبان پر دار ٹوپیاں پہنے ہوئے اجلاس کر رہے تھے۔ دوسروں کے سروں پر بھدی لال ٹوپیاں اور ترنگے طرے تھے۔ جیوری کے ارکان اور شر پسند حاضرین کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ الٹا زمانہ آگیا ہے اور بے ایمان مجرم ایمان دار بے گناہوں کی قسمت کا فیصلہ سنا رہے ہیں۔ شہر کے کمینوں ظالموں اور بدمعاشوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں جو سب سے زیادہ رذیل ظالم اور بدمعاش تھے ان کا اس تماشے میں سب سے زیادہ دخل تھا۔ تبصرہ، تعریف، مذمت، پیش بندی اور نتیجے ملول میں تعجیل کے تقاضوں کا شور برپا تھا۔ مرد زیادہ تر مسلح تھے۔ عورتوں میں بعضوں کے ہاتھوں میں چھرے اور خنجر تھے۔ اور بعض کھانے پینے میں مصروف تھیں۔ اکثر عورتیں بنائی کر رہی تھیں جن میں ایک عورت کے پاس بنائی کا زائد از ضرورت سامان تھا۔ وہ پہلی صف میں ایک شخص کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ جسے ڈارنے نے شہر میں داخل ہونے کے بعد کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یاد تھا کہ وہ ڈیفارج ہے۔ عورت اس سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ڈارنے تاڑ گیا کہ وہ اس آدمی کی بیوی ہے۔ لیکن تعجب اس پر تھا کہ وہ دونوں اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اس کا نوٹس نہیں لے رہے تھے وہ بڑی شدت سے کسی چیز کے منتظر تھے اور ان کی نظریں جیوری پر جمی ہوئی تھیں۔ پریذیڈنٹ کی کرسی کے نیچے کی نشست پر ڈاکٹر مینٹ حسب معمول سادہ لباس پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ جہاں تک ڈارنے معلوم کر سکتا تھا حاضرین میں وہ اور مسٹر لاری صرف

یہ دو حضرات ہی ایسے تھے جنہوں نے انقلاب کی بھدی وردی کے بجائے اپنی عادتی پوشاک زیب تن کی تھی۔

پبلک پروسیکوٹر کا مطالبہ تھا کہ قانون کی رو سے جو تارک وطن واپس لوٹے وہ سزائے موت کا مستوجب تھا۔ اس لئے چارلس ایورمونڈ عرف ڈارنے کو تارک وطن ہونے کی حیثیت سے موت کی سزا ملنی چاہئے۔ اس سے بحث نہ تھی کہ وہ قانون اس کی واپسی کے بعد نافذ ہوا تھا۔ بہرحال وہ وہاں موجود تھا اور وہ قانون بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ اور اسے فرانس میں گرفتار کیا گیا تھا۔ لہذا اس کا سر اڑا دینا چاہئے۔

"اس کا سر قلم کر دو" حاضرین نے شور مچایا "وہ پبلک کا دشمن ہے"!

پریذیڈنٹ نے لوگوں کو خاموش کرنے کے لئے گھنٹی بجائی اور قیدی سے پوچھا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ کئی سال تک انگلستان میں مقیم رہا۔

بلاشبہ وہ امر واقعہ تھا۔

کیا وہ تارک وطن نہیں تھا۔ اس کا نام کیا تھا۔

قانون میں اس اصطلاح کی جو تعریف کی گئی تھی اس کی رو سے وہ خود کو تارک وطن باور نہیں کر سکتا تھا۔

کیوں نہیں؟ پریذیڈنٹ وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے

اس لئے کہ اس نے اپنی خوشی سے اپنا ناپسندیدہ خطاب ترک کیا تھا۔ اپنی خوشی سے اپنا ناپسندیدہ عہدہ ترک کیا تھا اور اس وقت وطن چھوڑا تھا جب تارک وطن کی موجودہ

قانونی اصطلاح رائج نہیں تھی اور وہ فرانس میں رہ کر دولت اڑانے کے بجائے انگلستان جا کر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔

اس کے پاس اس کا کیا ثبوت تھا۔

اس نے دو گواہوں کے نام پیش کئے۔ ایک تھیوفیل گیبل اور دوسرا الگزانڈر مینٹ۔

لیکن اس کی شادی انگلستان میں ہوئی تھی۔ پریزیڈنٹ نے یاد دلایا۔

بے شک۔ لیکن انگریز عورت سے شادی نہیں کی تھی۔

کیا وہ فرانسیسی نژاد خاتون تھی۔

ہاں۔ اس کی پیدائش فرانس میں ہوئی تھی۔

اس کا نام کیا ہے اور وہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

لوسی مینٹ۔ ڈاکٹر مینٹ کی اکلوتی لڑکی۔ ڈاکٹر صاحب یہیں تشریف رکھتے ہیں۔

اس [illegible] پیار کا اثر ہوا۔ ڈاکٹر کی تعریف سے ہال گونج اٹھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ [illegible] کو پھاڑ کھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ ان کی تلوّن مزاجی کا یہ حال تھا کہ اب ان ہی پر رحم کے آنسو ٹپکنے لگے۔

خطرات کے نتائج کے باوجود چارلس ڈارنے نے قدم قدم پر ڈاکٹر مینٹ کے دانشمندانہ مشوروں پر عمل کرتا رہا۔ یہی محتاط صلاح ہر موقع پر اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔

پریزیڈنٹ نے دریافت کیا کہ وہ اس سے پہلے کیوں فرانس کو واپس نہیں ہوا۔

وہ اس سے پہلے اس لئے فرانس کو واپس نہ ہو سکا کہ یہاں وہ اپنی جائداد سے دست بردار ہو چکا تھا اور اس کا کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ تھا۔ برخلاف اس کے وہ انگلستان میں فرانسیسی زبان و ادب کا درس دے کر روزی کماتا تھا۔ اس وقت وطن واپس آنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک ہم وطن نے اسے لکھا تھا کہ اس کے غیاب میں اس غریب کی جان پر بن آئی ہے اور پرزور التجا کی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہاں آئے۔ وہ ایک شہری کی جان بچانے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں آیا ہے۔ اور خطرات کے باوجود سچائی کا انکشاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کیا ری پبلک کے نزدیک یہ جرم ہے۔

عوام نے شور مچایا "ہرگز نہیں" اور انھیں خاموش کرنے کے لئے پریذیڈنٹ نے گھنٹی بجائی لیکن وہ خاموش رہنے کی بجائے برابر "ہرگز نہیں" کے نعرے لگاتے رہے۔ یہاں تک کہ خود ہی تھک کر بیٹھ رہے۔

پریذیڈنٹ نے اس شہری کا نام دریافت کیا۔ ملزم نے جواب دیا کہ وہ شہری ملزم کا پہلا گواہ ہے۔ اس نے اعتماد سے اس کے خط کا حوالہ دیا جو چونگی پر لے لیا گیا تھا۔ لیکن جس کا پریذیڈنٹ کے روبرو پیش کئے ہوئے کاغذات میں شامل رہنا یقینی تھا۔

ڈاکٹر مینٹ نے اس کا انتظام کر دیا تھا اور اسے یقین دلایا تھا کہ وہ کاغذ موجود ہے کارروائی کی اس نوبت پر وہ تحریر پڑھی گئی۔ سٹیزن گیبل کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ سٹیزن گیبل نے نہایت احتیاط اور ملنساری سے اشارتاً عرض کیا کہ ری پبلک کے دشمنوں کے مقدموں کی کثرت کے باعث محب وطن ججوں نے شاید انھیں فراموش کر دیا ہے مطلب

یہ کہ ایبے کے قید خانے میں تین دن پہلے تک شاید کسی کو ان کا خیال نہیں آیا۔ فی الحال انھیں عدالت میں پیش کیا جا کر جیوری کے اس بیان پر کہ شیبرن ایورمونڈ عرف ڈارنے کی تحویل کے بعد اب ان پر کوئی الزام نہیں باقی رہا انھیں رہا کر دیا گیا۔

پھر ڈاکٹر مینٹ پر جرح کی گئی۔ ان کی تمام معقولیت اور صاف گوئی کا اچھا اثر پڑا۔ جب انھوں نے نہایت دانش مندی خلوص اور صداقت کے ساتھ جملہ واقعات بیان کئے اور بتایا کہ طویل قید سے ان کی رہائی کے بعد ملزم پہلا دوست تھا جس سے وہ ملے۔ نیز انگلستان کی جلاوطنی کے دوران میں ملزم ہمیشہ ان کا اور ان کی لڑکی کا وفادار رفیق رہا۔ اور وہاں کے امراکی حکومت نے اسے انگلستان کا دشمن اور امریکہ کا دوست قرار دے کر اس پر مقدمہ چلایا تھا۔ یہ سن کر جیوری بھی حاضرین کی ہم نوا بن گئی۔ بالآخر جب انھوں نے التجا کی کہ ان کے انگریز دوست مسٹر لاری سے جو وہاں موجود تھے اور جو انگلستان کے مقدمے کی روداد سے واقف تھے۔ ان امور کی توثیق کروالی جائے تو جیوری نے کہا کہ کافی شہادت مل چکی ہے۔ اور اگر پریذیڈنٹ چاہیں تو وہ رائے دہی کے لئے تیار ہیں۔

ارکان جیوری نے فرداً فرداً بلند آواز سے رائے دی۔ ہر رائے پر عوام تحسین و آفریں کا شور مچانے لگے۔ تمام آرا ملزم کے موافق دی گئیں۔ اور پریذیڈنٹ نے اس کی رہائی کا اعلان کر دیا۔

پھر وہ حیرتناک مظاہرے شروع ہوئے جن سے عوام اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ تلون مزاجی کہو یا رحم دلی اور فیاضی کے نیک جذبات یا اپنی ظالمانہ حرکتوں کی تلافی کا جذبہ یا

شاید ان تینوں محرکات کا نتیجہ سمجھو۔ بہرحال اس میں رحمدلی کا عنصر نمایاں تھا۔ رہائی کا فیصلہ صادر ہوتے ہی اس طرح آنسو ٹپکنے لگے جس طرح کبھی خون ٹپکتا تھا۔ اور راتنے مرد اور عورتوں نے اسے اپنے سگے بھائی کی طرح گلے لگایا کہ طویل قید کی خستہ حالی کے بعد وہ تکان سے بیہوش ہو کر گر پڑنے کے قریب تھا اس اظہار محبت کے باوجود وہ جانتا تھا کہ یہی لوگ غالباً کسی دوسرے جذبے کے زیر اثر اس پر ٹوٹ پڑتے اور اسی شدت احساس کے ساتھ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

دوسرے ملزموں کے لئے جن پر مقدمہ چلایا جانے والا تھا اسے وہاں سے ہٹنا پڑا اور اس طرح وہ مزید بغل گیری کی زحمت سے بچ گیا۔ پانچ ملزموں پر یہ الزام تھا کہ وہ ری پبلک کے دشمن ہیں کیونکہ انھوں نے قول و فعل سے ری پبلک کی مدد نہیں کی تھی۔ سزا دینے کا ایک موقع ابھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس لئے عدالت اور قوم کے نقصان کی تلافی کے لئے جج اتنے بے چین تھے کہ ان پانچوں کو فوری سزا سنا دی گئی کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ ان میں سے ایک نے جیل کے اشاروں کی زبان میں انگلی اٹھا کر ڈارنے کو اس کی اطلاع کر دی اور وہ سب ملزم ایک زبان ہو کر چیخے " ری پبلک زندہ باد"

اس میں شک نہیں ان پانچوں کے مقدمے کو طول دینے کے لئے کوئی حاضرین موجود نہ تھے۔ جب ڈاکٹر مینٹ اور ڈارنے باہر نکلے تو پھاٹک پر بھیڑ تھی جس میں عدالت کے سب حاضرین شامل تھے سوائے دو کے۔ جن کی تلاش بے سود تھی باہر نکلتے ہی مجمع دوبارہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ پھر وہی اشکباری وہی معانقے اور وہی نعرے۔ کبھی ایک ساتھ اور کبھی

علیحدہ علیحدہ دہرائے گئے۔ یہاں تک کہ کنارے کے جم غفیر کی طرح دریا کی موجیں بھی دیوانہ وار اچھلنے لگیں۔

عدالت کے ہال یا کسی دوسرے کمرے سے کچھ لوگ ایک بڑی کرسی اٹھا لائے۔ اور ڈارنے کو اس پر بٹھا کر کرسی پر ایک لال جھنڈی چڑھا دی اور برچھی پر سرخ ٹوپی جما کر پشت سے باندھ دی۔ ڈاکٹر کی التجائیں بھی اس وقت کارگر نہ ہوئیں اور جشن فتح کی شان سے مجمع ڈارنے کی کرسی اپنے کندھوں پر لئے ہوئے روانہ ہو گیا۔ سرخ ٹوپیوں کے اس سیلاب میں نہ جانے کتنے خستہ حال چہرے ابھر رہے تھے اور کیا ہنگامہ برپا تھا۔ جو بار بار ڈارنے کے پراگندہ خیالات میں یہ بات آرہی تھی کہ شاید اسے قیدیوں کی گاڑی میں بٹھا کر سولی پر چڑھانے کے لئے لیا جا رہا ہے۔

جلوس آپے سے باہر تھے راستے میں جو ملتا اسے گلے لگاتے اور ڈارنے سے روشناس کرلیتے۔ وہ سفید برفیلی سڑکوں پر پوری پبلک کا سرخ رنگ چھڑکتے ہوئے چلے جا رہے تھے برف کے نیچے بھی اس سے زیادہ گہری سرخی کے دھبے کسی اور سلسلے میں پڑ گئے تھے۔ اس طرح وہ ڈارنے کو اس عمارت کے صحن میں لے گئے جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ لوسی کے والد پہلے ہی اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔ جب شوہر کا سامنا ہوا تو وہ بے ہوش ہو کر اس کی باہوں میں گر پڑی۔

اس نے لوسی کی پشت مجمع کی طرف کرکے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا تاکہ اس کے آنسوؤں سے ان حسین ہونٹوں کو تر ہوتے ہوئے کوئی نہ دیکھ سکے۔ کچھ لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ فوراً دوسرے بھی رقص میں شامل ہو گئے اور صحن میں انقلاب کا ناچ شروع ہو گیا۔ پھر مجمع نے ایک نوجوان عورت کو آزادی کی دیوی بنا کر کرسی پر بٹھا دیا اور سب کے

سب جلوس کی شکل میں راستوں سے گزرنے لگے۔ اور دریا کے کنارے اور پل پر پہنچنے تک بھیڑ اور بھی بڑھ گئی اور انقلابی رقص میں سب دیوانہ وار مشغول ہو گئے۔

ڈارنے نے پہلے ڈاکٹر مینٹ سے ہاتھ ملایا۔ جو فاتحانہ انداز میں فخر کے ساتھ وہاں کھڑے تھے۔ پھر مسٹر لاری سے معانقہ کیا جو انقلابی رقص کے جھگڑے سے بچ کر ہانپتے ہوئے آئے تھے۔ پھر ننھی لوسی کو بوسے دیئے جس نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں۔ پھر وہ پر خلوص جوشیلی مس پروس سے گلے ملا جو بچی کو اٹھائے ہوئی تھی اور آخر میں لوسی کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔

"لوسی۔ جان من۔ میں صحیح سلامت ہوں۔"

"آہ پیارے چارلس۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی ہوں۔ آپ گھٹنے ٹیک کر مجھے اس کا شکر ادا کرنے دو۔"

سب عجز و انکساری کے ساتھ نہایت ادب و احترام سے جھک گئے۔ جب وہ دوبارہ ڈارنے کی آغوش میں آگئی تو اس نے کہا۔

"جان من۔ اب اپنے ابا سے گفتگو کرو۔ سارے فرانس میں اس کے سوا کوئی دوسرا میرے لئے یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔"

برسوں پہلے جس طرح ڈاکٹر مینٹ نے لوسی کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اسی طرح اب اس نے اپنے باپ کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔

وہ خوش تھے کہ انھوں نے اس محبت کا بدلہ دیا ہے انھیں اس کا احساس تھا کہ

مصیبت کا حل مل چکا ہے اور وہ اپنی طاقت پر فخر محسوس کر رہے تھے "جان پدر۔ کمزوری اچھی چیز نہیں" انھوں نے تسلی دی "تم کانپ رہی ہو۔ میں نے اس کی جان بچائی ہے"

ساتواں باب

"دستک"

"میں نے اس کی جان بچائی ہے" کہیں یہ بھی کوئی خواب تو نہیں جس میں اکثر وہ قید سے چھوٹ کر اس سے آ ملتا تھا۔ نہیں سچ مچ وہ آگیا ہے اس کے باوجود اس کی بیوی کانپنے لگی۔ اور ایک بے نام مگر شدید خوف اس پر طاری تھا۔

فضا اس قدر تاریک اور مکدر تھی، لوگ اتنے تلون مزاج اور انتقام پسند تھے معمولی سے شبہ پر بغض و عناد کے باعث بے گناہوں کو اس کثرت سے موت کی سزا دی جا رہی تھی اور اس کے شوہر جیسے نیک نفس اور محبوب انسان اتنی بڑی تعداد میں روزانہ اس ہلاکت کا شکار ہو رہے تھے جس سے وہ بچ گیا تھا کہ اس کی دلوں کا بوجھ پوری طرح ہلکا نہ ہوتا تھا۔ موسم سرما کی شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اور اب بھی راستوں پر وہی دہشتناک گاڑیاں چلی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے ذہن میں ان گاڑیوں کی سواریوں میں اپنے شوہر کو تلاش کرتے ہوئے چونک پڑی اور پھر وہ اس کے جسم سے اور بھی چمٹ گئی اور کانپنے لگی۔

اس کے والد کا اسے تسلی دینا اور اس کی نسوانی کمزوری کے مقابلے میں اپنی برتری ظاہر کرنا بہت پر لطف نظارہ تھا۔ اب نہ وہ کوٹھری تھی نہ وہ کھنٹی دروازی اور نہ وہ نمبر ایک سو پانچ شمالی برج۔ دل کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اپنا وعدہ پورا کر کے ڈاکٹر نے چارلس کی جان بچا لی تھی اب وہ سب ان کے دست نگر تھے۔

گھر کا خرچ بہت کفایت سے چلتا تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ دکھا دے سے لوگوں کی مخالفت نہ مول لی جائے۔ بلکہ وہ درحقیقت مالدار نہیں تھے۔ اور چارلس کو زمانہ قید میں اپنے خراب کھانے اور محافظوں کی تنخواہ اور غریب قیدیوں کی امداد کے لئے بہت کچھ خرچ کرنا پڑا تھا۔

کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ اپنے گھر میں کسی جاسوس کی موجودگی نہیں چاہتے تھے انھوں نے کوئی ملازم نہیں رکھا۔ صحن کے پھاٹک پر جو سٹیزن اور خاتون دربانی کے فرائض انجام دیتے تھے وہ کبھی کبھار ان کا کام کر دیا کرتے تھے۔ مسٹر لاری نے جیری کو ان کے ہاں بدل دیا تھا اور وہ ان کا مصاحب بنا ہوا رات وہیں گذارتا تھا۔

آزادی برابری اور بھائی چارگی یا موت کی متحد اور ناقابل تقسیم ری پبلک کا آرڈیننس جاری ہوا تھا کہ ہر مکان کے دروازے پر باہر رہنے والے کا نام ایک خاص ناپ کے حروف میں واضح طور پر کندہ کیا جائے اس لئے مسٹر جیری کرنچر کا نام نیچے کے دروازے کو زینت بخش رہا تھا شام کا وقت قریب تھا ایک پینٹر کی نگرانی کے بعد جسے ڈاکٹر مینٹ نے چارلس ایورمونڈ عرف ڈارنے کے نام کا اضافہ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ جیری خود وہاں نمودار ہوا۔

عالمگیر بربادی اور بے اعتمادی کی تاریک فضا میں زندگی کے سارے بے ضرر طریقے بدل گئے تھے۔ ڈاکٹر کے مکان کے لئے دوسرے مکانوں کی طرح روزمرہ ضروریات کی چیزیں ہر شام کو مختصر مقدار میں مختلف دوکانوں سے خریدی جاتی تھیں چہ میگوئیوں سے بچنے اور تہمت تراشوں سے محفوظ رہنے کی عام خواہش کی وجہ سے یہ طریقہ رائج تھا۔

چند مہینوں سے خرید و فروخت کا انتظام مس پروس اور مسٹر کرنچر کے سپرد تھا اول الذکر رقم لے جاتیں اور آخرالذکر ٹوکرا اٹھا کے لے آتا۔ ہر شام کو سڑکوں کی قندیلیں سلگنے کے وقت وہ گھر سے نکل کر بازار جاتے اور ضروری سامان خرید لے آتے۔ مس پروس عرصے تک ایک فرانسیسی گھرانے میں رہ چکی تھی اور اگر چاہتی تو اچھی طرح فرنچ سیکھ لیتی لیکن اس کا رجحان اس طرف مطلق نہیں تھا۔ اس لئے وہ مسٹر کرنچر کی طرح اس زبان یا بقول اس کے اس لا یعنی بکواس سے ناواقف تھی اس کا طریقہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ وہ بلا تمہید کسی چیز کے اسم ذات کو دوکاندار کے سر پر دے مارتی اور اگر وہ اس کا نام نہ ہوتا تو تلاش کر کے اس چیز کو اٹھا لیتی اور اس وقت تک واپس نہ کرتی۔ جب تک کہ اس کا مول تول نہ ہو جائے۔ واجبی دام کے بارے میں اس کا اصول یہ تھا کہ وہ دوکاندار جتنی انگلیاں بتائے وہ ایک انگلی کم بتاتی اور اس طرح سودا طے کرتی۔

"مسٹر کرنچر" مس پروس نے خوشی سے دیدے لال کر کے کہا۔ "تم تیار ہو تو میں بھی تیار ہوں"۔

جیری نے پھٹی آواز سے مس پروس کی خدمت کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ کئی دنوں پہلے اس کا زنگ صاف ہو چکا تھا لیکن اس سیخ دار سر کو کوئی نہیں جھکا سکتا تھا۔

"کئی چیزیں درکار ہیں" مس پروس نے کہا "بہت وقت لگے گا۔ علاوہ اور چیزوں کے ہمیں شراب خریدنا ہے۔ جہاں کہیں ملے۔ یہ لال سر والے خوب جام صحت اڑائیں گے۔"

"تمہارے لئے اس میں کیا فرق پڑتا ہے مس صاحبہ" جیری نے جواب دیا۔ "وہ تمہاری صحت کے جام نوش کریں یا بڑے میاں کے۔"

"بڑے میاں کون" مس پروس نے پوچھا۔

مسٹر کرنچر نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ ان کا اشارہ۔ بوڑھے نک کی طرف تھا۔

"آہا" مس پروس بولی "ان لوگوں کا مطلب معلوم کرنے کے لئے کسی ترجمان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے۔ فساد پھیلانا اور رات کے اندھیرے میں گلے کاٹنا۔"

"خاموش پیاری۔ خدارا احتیاط کرو" لوسی نے تاکید کی۔

"ہاں، ہاں، ہاں، میں احتیاط کرونگی" مس پروس نے کہا "لیکن آپس میں کہہ لینے میں کیا ہرج ہے۔ مجھے توقع ہے کہ پیاز کھا کر تمباکو پینے والے سڑکوں پر گلے نہیں ملیں گے۔ سنو۔ میری چڑیا۔ میری واپسی تک آتشدان چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ اپنے شوہر کا خیال رکھو۔ تم نے اسے کھو کر پایا ہے۔ میری واپسی تک اپنا سر اس کے کندھے سے جدا مت کرو۔ ڈاکٹر مینٹ جانے سے پہلے کیا میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔"

"تمہیں پوچھنے کی پوری آزادی ہے" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کے واسطے آزادی کا نام مت لیجئے۔ یہاں ضرورت سے زیادہ آزادی ہے۔"

مسں پروس بولی۔

"پیاری خاموش" لوسی نے التجا کی۔

"میری جان،" مس پروس نے سر ہلاتے ہوئے قطعی طور پر کہا۔ "مختصر یہ کہ میں ہز میجسٹی بادشاہ جارج سوم کی رعایا ہوں؛" مس پروس ادب سے جھک گئی۔ "اس لئے میرا مقولہ ہے ان لوگوں کی سیاست پہ لعنت بھیجو، ان کی بدمعاشیوں کا تدارک کرو۔ خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے، ہز میجسٹی سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔"

مسٹر کرنچر وفاداری کے جوش میں مس پروس کے الفاظ بار بار دہرانے لگے۔ جیسے گرجا میں الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم ایک جوشیلے انگریز ہو۔ کاش تمہارا گلا سردی سے خراب نہ ہوا ہوتا!" مس پروس نے تعریف کے لہجے میں کہا۔ "لیکن ڈاکٹر مینٹ سوال یہ ہے؟"

بیچاری ہمیشہ اہم امور کو اسی طرح سرسری طور پر بیان کرتی تھی تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں۔

"کیا یہاں سے نکل چلنے کی کوئی توقع ہے۔"

"ابھی نہیں۔ چارلس کے لئے یہ بات خطرناک ثابت ہوگی۔"

"ہونہہ۔ ہونہہ، ہونہہ،" آگ کی روشنی میں اپنی پیاری سنہری بالوں والی کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر مس پروس نے کہا۔ "تب تو ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہئے۔ بس اور کیا۔ ہمیں اپنا سر اونچا کرکے نیچے دیکھتے ہوئے رہنا چاہئے جیسا کہ میرا بھائی سالومن کہا کرتا تھا۔ چلو مسٹر کرنچر ــــ تو یہیں رہنا۔ میری چڑیا۔"

یہ دونوں باہر چلے گئے۔ لوسی، اس کا شوہر اور بچی اور ڈاکٹر مینٹ آگ کے پاس بیٹھے رہے۔ مسٹر لاری ابھی تھوڑی دیر میں بینک سے واپس آنے والے تھے۔ مس پروس نے چراغ جلا کر کونے میں رکھ دیا تھا کہ وہ آگ کی روشنی کا لطف اٹھاتے رہیں۔ ننھی لوسی اپنے نانا کا بازو تھامے ہوئے بیٹھی تھی۔ اور وہ اس کے کان میں چپکے چپکے ایک کہانی سنا رہے تھے جس میں ایک جاہ و جلال والی پری نے اپنے ایک محسن کو قید سے چھڑا لیا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اور لوسی بھی پہلے سے زیادہ مطمئن تھی۔

"وہ کیا ہے" اس نے چیخ کر کہا۔

"پیاری۔ ذرا دل مضبوط رکھو" اس کے والد نے اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "تم کس قدر بدحواس ہو۔ بات بات پر چونک پڑتی ہو۔ کوئی بات نہ بھی ہو تو گھبرا جاتی ہو۔ میری بیٹی ہو کر اتنا خوف!"

"ابا مجھے شبہ ہوا" لوسی سہمی ہوئی آواز میں ہکلانے لگی "کہ ــــ سیڑھیوں پر کسی اجنبی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے"

"جان پدر۔ سیڑھیوں پر موت کی خاموشی طاری ہے"

"اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ابا، ابا، یہ کیا ہو گیا۔ چارلس کو چھپاؤ۔ اسے بچاؤ"

"میری بچی" ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا "میں اس کی جان بچا چکا ہوں پیاری۔ ایسا بھی کمزور دل کس کام کا۔ ذرا دروازے کے پاس

جا کے دیکھوں تو ؟"

لالٹین لئے ہوئے درمیان کے کمروں میں سے گذر گئے انھوں نے دروازہ کھولا ۔ فرش پر کھٹا کھٹ چلتے ہوئے لال ٹوپی والے چار مسلح آدمی تھے اور پستولیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

"میشیرن ایورمونڈ عرف ڈارنے ؟" پہلے نے کہا۔

"کون اس سے ملنا چاہتا ہے ؟" ڈارنے نے دریافت کیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں ۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایورمونڈ ۔ میں تمہیں پہچانتا ہوں ۔ آج میں نے تمہیں عدالت میں دیکھا ۔ تم دوبارہ ری پبلک کے قیدی بنا لئے گئے ہو"

وہ وہیں کھڑا رہا ۔ اس کی بیوی اور بچی دونوں اس سے لپٹے رہے ۔ چاروں نو واردوں نے اسے گھیر لیا۔

"کس جرم کی پاداش میں مجھے دوبارہ گرفتار کیا جا رہا ہے ؟"

"بس بکواس مت کرو ۔ آج حوالات میں بسر کرو گے ۔ کل تمہیں معلوم ہو جائے گا ۔ تمہارا مقدمہ کل پیش ہوگا ۔"

ڈاکٹر مینٹ کا خون خشک ہو گیا تھا ۔ نو واردوں کی آمد پر وہ ہاتھ میں لالٹین لئے بُت بنے کھڑے رہے ۔ اس گفتگو کے بعد انھوں نے لالٹین فرش پر رکھ دی ۔ اور گفتگو کرنے والے کی اونی قمیص کا گریبان نرمی سے پکڑ کر کہا ۔

"تم نے کہا کہ تم اسے جانتے ہو ۔ کیا تم مجھے پہچانتے ہو ؟"

"ہاں ۔ میشیرن ڈاکٹر ، میں تمہیں پہچانتا ہوں ۔"

"ہم سب تم کو پہچانتے ہیں، سیٹیزن ڈاکٹر"۔ باقی تین اشخاص نے کہا۔
ڈاکٹر ژیوا گو ایک ایک کا منہ تکنے لگے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دھیمی آواز میں بولے: "کیا تم اس کے سوال کا جواب دوگے۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"سیٹیزن ڈاکٹر" پہلے نے تامل سے کہا "سینٹ اسٹائن کے علاقے میں اس کے خلاف مخبری ہوئی ہے" اور پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "یہ سیٹیزن سینٹ اسٹائن کا رہنے والا ہے"

"مذکورہ سیٹیزن نے سر کو جنبش دیتے ہوئے جملہ پورا کیا "سینٹ اسٹائن نے اس پر الزام لگایا ہے"

"کس قصور کا" ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

"سیٹیزن ڈاکٹر" پہلے نے اسی تامل سے کہا "اب اس سے زیادہ کچھ مت پوچھو۔ اگر ری پبلک تم سے قربانی کی طالب ہو تو یقیناً ایک محب وطن کی طرح تم خوشی سے راضی ہو جاؤگے۔ ری پبلک سب میں مقدم ہے۔ عوام کا اقتدار سب میں اعلیٰ ہے۔ ایورمونڈ۔ ہم زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے"

"بس اتنا بتادو" ڈاکٹر نے التجا کی "اس کے خلاف کس نے مخبری کی؟"

"یہ بات ضابطہ کے خلاف ہے۔ پہلے نے جواب دیا۔ لیکن تم سینٹ اسٹائن کے اس ساتھی سے پوچھ سکتے ہو؟"

ڈاکٹر نے اس آدمی کی طرف دیکھا جو بے چینی سے کچھ دیر تک قدم آگے پیچھے کرتا رہا اور

پھر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"واقعی یہ بات بتانا ضابطہ کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے خلاف بڑے سنگین الزامات ہیں۔ سیٹیزن ڈیفارج اور انکی بیوی نے مخبری کی ہے۔۔۔ اور ایک شخص"

"اور کون"

"سیٹیزن ڈاکٹر۔ آپ پوچھ رہے ہیں"

"ہاں"

"تب تو کل آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا" سینٹ انٹائن والے نے بڑے پراسرار لہجے میں کہا۔ "آج میری زبان بند ہے"

آٹھواں باب

تاش کی بازی

مس پروس اس اندوہناک مصیبت سے بے خبر تھیں۔ جوان کی غیر حاضری میں گھر پر نازل ہو چکی تھی۔ وہ پتلی گلیوں میں سے ہوتی ہوئی پونٹ نوف کے پل پر سے گذر کر دریا کے پار پہونچ گئیں ان کے دماغ میں سودے سلف کی وہ چیزیں بھری ہوئی تھیں جو انھیں لازمی طور پر خریدنا تھیں مسٹر کرنچر ایک ٹوکری لئے ان کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے دائیں بائیں قریب قریب تمام دکانوں میں

جھانکتے چلے آرہے تھے۔ جہاں لوگوں کا مجمع نظر آتا ادھر سے ذرا بچ کر نکل جاتے۔ اگر سڑک پر لوگ زور زور سے بحث مباحثہ کرتے نظر آتے تو وہ سڑک چھوڑ دیتے۔ اور کترا کر چلنے لگتے۔ شام بڑی خشک اور سرد تھی۔ دریا سے اٹھتے ہوئے کہر کے بادلوں نے آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ یہ شور ان کشتیوں میں سے اٹھ رہا تھا جو مختلف مقامات پر دریا میں لنگر انداز تھیں۔ اور جن میں جمہوری فوج کے لئے لوہار بندوقیں تیار کر رہے تھے۔ وہ شخص جو اس فوج سے کوئی چالبازی کرتا یا غلط رسوخ سے ترقی پا جاتا اس کا بس اللہ ہی حافظ تھا۔ خوش قسمت تھے وہ لوگ جن کی ڈاڑھیاں نہیں بڑھی تھیں اور قومی استرے سے ان کی حجامت نہیں ہوئی تھی۔

مس پروس نے تھوڑی بہت جنس کی چیزیں خریدیں۔ لیمپ کے لئے تیل لیا اس کے بعد شراب خریدنے کے لئے مختلف دوکانوں میں جھانکنا شروع کیا۔ وہ گوڈ ری پبلیکن پروٹس آف اینٹی کوئنٹ کے سائن بورڈ کے سامنے رک گئیں۔

یہ جگہ نیشنل پیلس سے بہت دور نہ تھی۔ پھر وہ ٹولریز کے قریب رکیں۔ جہاں انھیں کچھ چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہ جگہ نسبتاً کچھ پرسکون نظر آتی تھی۔ گو یہ جگہ بھی سرخ ٹوپیوں کے وجود سے سرخ ہو رہی تھی۔ مگر دوسرے مقاموں جیسی سرخ نہیں تھی۔ مسٹر کرنچر سے رائے لینے کے بعد انھیں اپنی رائے سے متفق پا کر وہ اپنے جانباز سپاہی کے ساتھ گوڈ ری پبلیکن پروٹس آف اینٹی کوئنٹ میں داخل ہو گئیں۔

انھوں نے دھوئیں میں گھٹی ہوئی روشنی میں پائپ دبائے میلے کچیلے تاشوں اور زرد

پانسوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے لوگوں کو غور سے نہیں دیکھا۔ ایک کالوچ میں اناچا مسزدور جس کا سینہ اور بازو ننگے تھے زور زور سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سن رہے تھے۔ کچھ لوگ ہتھیار سجائے بیٹھے تھے۔ کچھ نے اس غرض سے اتار دیئے تھے کہ ضرورت پڑے تو فوراً اٹھالیں دو تین گاہک اوندھے پڑے سو رہے تھے۔ جو اوچے شانوں کے ہر دلعزیز سیاہ رنگ کے کوٹ پہنے بالکل بھالوؤں اور کتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ یہ دونوں اجنبی گاہک میز کے پاس پہونچے اور اپنی ضرورت کی اشیار کی فرمائش کی۔

جب ان کی شراب ناپ کر نکالی جارہی تھی تو ایک کونے میں بیٹھے ہوئے گروہ سے ایک آدمی اٹھا اور باہر جانے لگا۔ جاتے وقت اس نے مس پروس کی طرف رخ کیا جیسے ہی مس پروس کی نظر اس پر پڑی وہ چیخ مار کر تالیاں بجانے لگیں۔ ایک دم سب کے سب کھڑے ہوگئے لوگوں کو خیال ہوا شاید کوئی قتل ہوگیا یا کسی کا مخالفت کی بحث کے سلسلہ میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر شخص لاش کو گرتا دیکھنے کی امید لگا رہا تھا۔ مگر انھوں نے دیکھا ایک مرد اور عورت کھڑے ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑے تک رہے ہیں۔ مرد ہر طرح سے ایک فرانسیسی جمہوریت پسند معلوم ہو رہا تھا۔ اور عورت قطعی طور پر انگریز لگ رہی تھی۔ گوڈ یفیلکین پروش آف اینٹ کونٹ کے شاگردوں کو جیسے اس کٹس پٹس انجام سے کچھ ناامیدی سی ہوئی۔ مس پروس اور ان کے نگہبان حالانکہ بڑے غور سے سن رہے تھے مگر ان کے کچھ بھی پلے نہ پڑا کہ وہ عبرانی بول رہے تھے یا کلدانی۔ بس اتنا اندازہ ہوگیا کہ جو کچھ انھوں نے کہا کافی طویل اور بلند آواز میں کہا۔ وہ لوگ مارے حیرت کے کچھ سن نہیں رہے تھے۔ اتنا خیال رہے کہ صرف

مس پروس ہی متعجب اور پریشان نہ تھیں مسٹر کریچر تو اپنی جگہ انتہا سے زیادہ متحیر تھے!

"آخر بات کیا ہے؟" وہ شخص جس نے مس پروس کو چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہایت آہستہ سے انگریزی زبان میں چڑھ کر بولا۔

"اوہ سالومن — میرے پیارے سالومن" مس پروس پھر تالی بجا کر چلائیں۔

"اتنے دنوں سے نہ تمہاری خیر خبر ملی نہ ملاقات ہوئی اور آج تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں"

"مجھے سالومن مت کہو۔ میری موت کا سامان کرنا چاہتی ہو؟" اس شخص نے خوف سے گھبرا کر کہا۔

"بھائی — میرے بھائی — مس پروس پھوٹ کر رو پڑیں" میں نے تمہارے اوپر کون سا ظلم کیا ہے جو ایسی بے دردی کی باتیں کر رہے ہو؟"

"تو پھر اپنی ہر بات میں دخل دینے والی زبان کو لگام دو۔ اور اگر مجھ سے کچھ کہنا سننا ہے تو باہر آجاؤ۔ شراب کی قیمت ادا کر کے باہر آجاؤ۔ یہ تمہارے ساتھ کون شخص ہے" سالومن نے کہا۔

"مسٹر کریچر" مس پروس نے آنسو بھری آنکھوں سے اپنے بے مروت بھائی کو دیکھ کر پھر تاسف اور ناامیدی سے سر ہلا کر کہا۔

"اسے بھی ساتھ لے آؤ۔ کیا یہ مجھے بھوت سمجھتا ہے؟"

مسٹر کریچر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے تو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھوت دیکھ

رہے ہیں مگر وہ قطعی خاموش رہیے۔ مس پروس نے روتے ہوئے بٹوے میں سے بڑی مشکل سے پیسے نکالے۔ اور دوکاندار کو شراب کے دام دینے لگی۔ اتنے میں سالومن نے مڑکر گوڈ ریپلکین آف اینٹی کوئٹی کے پیروں سے کچھ عذر کیا اور فرانسیسی میں کچھ تشریح کی۔ وہ لوگ پھر اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اور شغل میں غرق ہو گئے۔

"اب بتاؤ چاہتی کیا ہو" سالومن نے ایک اندھیری گلی کے کونے میں رک کر کہا۔

"کیسے ظالم اور بے مروّت بھائی ہو۔ تمہاری کسی حرکت سے بھی میری محبت میں کمی نہ آئی۔ اور تم اس طرح بات کر رہے ہو کہ ذرا بھی میرے لئے تمہارے دل میں محبت نہیں" مس پروس نے کہا۔

"اونہہ لعنت ۔۔۔ اچھا جانے دو" سالومن نے کھٹ سے مس پروس کے ہونٹ چوم کر کہا "بس اب تو تمہیں کوئی شکایت نہیں"

مس پروس خاموشی سے روتی رہیں اور بس سر ہلا دیا۔

"اگر تمہیں یہ امید ہو کہ میں تمہیں یہاں دیکھ کر متعجب ہوں گا۔ تو یہ بات فضول ہے مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں ہو۔ مجھے زیادہ تر لوگوں کے آنے جانے کے بارے میں خبر رہتی ہے اگر تم میری جان کے درپے نہیں جیسا کہ مجھے یقین ہو چلا ہے تو یہاں سے فوراً اپنا راستہ لو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں بہت مشغول ہوں۔ میں ایک افسر ہوں"

"میرا انگریز بھائی سالومن" مس پروس نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر کہا "جس کی ہونہاری کو دیکھ کر یہ امید ہوتی تھی کہ وہ اپنے وطن کا سب سے بلند مرتبہ انسان بنے گا آج

وہ غیر ملکیوں کا نوکر ہے اور غیر ملکی بھی کیسے ۔ اے کاش اس سے تو بہتر تھا میں لے مرتی ۔"

" وہ دیکھ لو ۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی سے پتہ تھا ۔ تم میری زندگی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو ۔ اچھی خاصی گزر ہونے لگی تھی کہ اب خود میری اپنی بہن میری تباہی کا باعث بن کر آگئی ۔"
مسٹر سالومن نے بات کاٹ کر کہا ۔

" خدا نہ کرے! اس سے اچھا ہے کہ میں کبھی بھی نہ ملوں ۔ میرے پیارے سالومن میں نے ہمیشہ تم سے سچی محبت کی ہے اور ہمیشہ کروں گی ۔ خدا کا واسطہ مجھ سے انسانیت اور پیار سے بات کرو ۔ بس ایک دفعہ مجھ سے کہہ دو تمہیں کوئی شکایت اور غیریت نہیں اور نہ مجھ سے غصہ ہو اور پھر میں تم سے رخصت ہو جاؤں گی ۔" مس پروس نے کہا ۔

غریب مس پروس ۔ جیسے یہ غیریت خود انہی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی ۔ کئی سال ہوئے مسٹر لاری کو سوہو کے پرسکون گھر میں یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا لاڈلا بھائی ان کا سارا پیسہ خاک میں ملا کر انھیں چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر انھیں اس کی کبھی کوئی پرواہ نہ تھی !

سالومن نے انھیں تسلی دی مگر ان کے الفاظ میں دلی محبت اور پیار کم احسان کرنے کا احساس زیادہ تھا ۔ اگر وہ ان کی جگہ اور یہ اس کی جگہ ہوتیں تو اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا دنیا بھر کا یہی قاعدہ ہے اتنے میں اچانک مسٹر کرنچر نے دخل در معقولات کی اور اس کا کندھا ہلا کر کہا ۔

" میں کہتا ہوں ، کیا آپ براہ کرم اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کا نام جان سالومن ہے یا سالومن جان ؟"

افسر چونک کر ان کی طرف پلٹا اور بڑے شک کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اب تک وہ چپ کھڑے رہے تھے۔

"اس میں تکلف کیا، جب جانتے ہو تو وہ اب کیوں نہیں دیتے؟" مسٹر کرنچر نے کہا۔ حالانکہ وہ خود نہیں بتا سکے تھے۔ "جان سالومن یا سالومن جان۔ یہ تمہیں کون کہہ رہی ہیں۔ تمہاری بہن ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہونگی۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارا نام جان ہے۔ اب یہ بتاؤ تمہارا کون سا نام پہلے آتا ہے اور پھر ذرا اس خاندانی نام پر دس کا بھی خیال رہے۔ سمندر پار انگلستان میں تو تمہارا یہ نام قطعی نہیں تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم میرا کیا مطلب ہے کیونکہ سمندر پار جو تمہارا نام تھا وہ میرے دھیان سے اتر گیا ہے۔"

"اتر گیا ہے؟"

"ہاں مگر میں قسم کھا سکتا ہوں کہ دو لفظوں سے بنتا تھا تمہارا پورا نام!"

"واقعی؟"

"ہاں۔ اور اس دوسرے شخص کا ایک لفظ کا نام تھا۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم وہی مخبر ہو جس نے کوتوالی میں گواہی دی تھی جھوٹوں کے باپ کا واسطہ۔ جو تمہارا باپ تھا۔ بتاؤ تمہارا اس وقت کیا نام تھا؟"

"برساڈ" پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا۔

"ہزار روپیہ کی شرط بھی تام تھا۔" مسٹر جیم ہاچ کا اُٹھے۔

بیچ میں بول پڑنے والا اسٹڈی کارش تھا۔ اس کے ہاتھ سولڈی کے کوٹ کے دامن میں پیٹھ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور وہ مسٹر کریجر کے پہلو میں ایسے لاپرواہی سے کھڑا تھا جیسے وہ سچ مچ کوتوالی ہی میں کھڑا ہوا ہو۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں مس پرڈس کل شام کو میں ایک دم مسٹر للڈی کے ہاں آن پہونچا۔ وہ بھی تعجب میں رہ گئے۔ یہ طے ہوا تھا کہ جب تک یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہوتے یا میری کوئی خاص ضرورت نہیں میں اپنی آمد کا اعلان نہ کروں۔ میں اس وقت آپ کے بھائی سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کاش آپ کا بھائی مسٹر برساڈ اس سے بہتر نوکری پر تعینات ہوتا۔ آپ کی وجہ سے یہ چاہتا ہوں کہ اچھا ہوتا جو مسٹر برساڈ قید خانہ کی بھیڑ نہ ہوتے۔"

جیلر کے ماتحت جاسوس کے لئے اس زمانہ میں "بھیڑ" کی اصطلاح رائج تھی جاسوس اس کا منہ پہلے ہی سے فق تھا اور بھی زرد پڑگیا اور کہنے لگا: "کسی کی کیا مجال جو مجھے جاسوس کہے"

"میں ابھی بتاتا ہوں۔ مسٹر برساڈ کوئی گھنٹہ بھر ہوا میں چہل قدمی کے بعد کینیسہ جیری کے قیدخانہ کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ آپ کا چہرہ ایسا ہے جسے دیکھنے کے بعد بھولنا آسان نہیں۔ اور میں چہرے کو ایک بار دیکھ کر کبھی نہیں بھولتا۔ جناب کو جیل خانہ سے وابستہ دیکھکر میں کھٹک گیا اس کی ایک وجہ بھی ہے جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میرے ایک بدنصیب دوست پر اس سے پہلے بھی ایک دفعہ مصیبت پڑی تھی جس میں آپ کی مہربانی بھی شامل تھی اس لئے

میں نے آپ کا پیچھا کیا۔ اور یہاں شراب خانہ تک ساتھ آیا۔ اور قریب ہی بیٹھ گیا۔ آپ بڑی آزادی سے اپنے مداحوں میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے اس لئے مجھے آپ کے پیشے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مشکل نہیں پڑی اور وہ حرکت جو میں نے یونہی بے ارادے کر ڈالی تھی مجھے ایک مقصد سے بہت قریب لے گئی۔ کیوں مسٹر برساڈ؟"

"کیسا مقصد؟" جاسوس نے پوچھا۔

"سڑک پر کھڑے ہو کر اس کی تشریح کرنا مشکل بھی ہے اور خطرناک بھی۔ کیا اکیلے میں آپ مجھ سے گفتگو کرنے کی تکلیف برداشت کریں گے۔ مثال کے طور پر اگر چند منٹ کے لئے ٹیلسن بینک چل سکتے ہیں؟"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"ارے دھمکی کس نے دی؟"

"تب میں کیوں جاؤں؟"

"واقعی مسٹر برساڈ اگر آپ نہیں جا سکتے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہنا نہیں چاہتے؟" مخبر نے ہچکچا کر کہا۔

"آپ میرا مطلب خوب سمجھ گئے۔ مسٹر برساڈ میں نہیں کہوں گا۔"

کارٹن کا لاپروائی کا انداز اور بے جگرے تیور۔ اس کی تیزی اور طراری کے پر زور مددگار ثابت ہوئے۔ وہ دل میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسے موقع پر ایسے شخص کے ساتھ اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں نے خوب اندازہ لگایا اور

مصلحت کو دیکھ کر وہی کیا جس کی ضرورت تھی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ اگر کوئی مصیبت پڑی تو تم اس کی ذمہ دار ہوگی"
مجرنے اپنی بہن کی طرف تادیبًا دیکھ کر کہا۔

"دیکھئے مسٹر برساڈ، اب ناشکراپن نہ کیجئے۔ اگر مجھے آپ کی بہن کا پاس نہ ہوتا تو میں یوں نرمی اور انسانیت سے معاملہ طے کرنے کا قطعی مشورہ نہ دیتا۔ آپ بینک چل رہے ہیں میرے ساتھ یا نہیں" کارٹن نے کہا۔

"ہاں میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو"

"میری رائے میں ہم پہلے آپ کی ہمشیرہ کو حفاظت سے ان کی گلی کے نکڑ پر پہونچا آئیں مجھے اپنا ہاتھ تھام لینے دیجئے۔ مس پروس۔ اس وقت یہ شہر محفوظ نہیں کہ آپ بغیر کسی محافظ کے باہر جائیں۔ کیونکہ آپ کا ہمراہی مسٹر برساڈ سے واقف ہے اس لئے میں اسے مسٹر لاری کے پاس اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تیار ہیں؟ آئیے چلیں"

اس کے کچھ ہی بعد مس پروس نے ذکر کیا اور زندگی بھر انھیں یاد رہا کہ اس وقت جب انھوں نے سڈنی کے بازو پر ہاتھ رکھکر ملتجی نظروں سے دیکھا تاکہ وہ سالومن کو نقصان پہونچانے کی کوئی حرکت نہ کرے تو اس کے بازو میں استقلال کا تناؤ تھا اور آنکھوں میں ایک قسم کا الہامی نور تھا۔ جو نہ صرف اس کے کھلنڈرے پن کی تردید کر رہا تھا بلکہ اسے نہایت باوقار بنا دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے بھائی کی سلامتی کی فکر میں غرق تھیں حالانکہ وہ بھائی ان کی محبت کے کسی طرح بھی قابل نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے سڈنی کے دوستانہ طریقہ پر اطمینان دلانے پر تقویت

محسوس کی۔ اس کے علاوہ کسی بات پر عمل نہیں کیا۔

انھوں نے انھیں گلی کے نکڑ پر چھوڑ دیا اور کارٹن مسٹر لاری کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے جو چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جان بر ساڈ یا سالومن پروس کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔

مسٹر لاری اسی وقت کھانا کھا کر آرام لینے آتش دان کے سامنے بیٹھے شاید ان شعلوں میں اپنی اس وقت کی شبیہ ڈھونڈ رہے تھے جب وہ ادھیڑ عمر تھے۔ اور اسی طرح سے ٹیلسن بینک کے مسافر خانے میں آگ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

"مس پروس کے بھائی مسٹر برساڈ!" سڈنی نے کہا۔

"برساڈ؟" اس بزرگ شخص نے دہرایا۔ "برساڈ اس نام سے معلوم ہوتا ہے، میں واقف ہوں اور چہرے سے بھی آشنا ہوں۔"

"میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ کا چہرا لاجواب ہے۔" کارٹن نے سرد مہری سے کہا۔ "براہ کرم بیٹھ جائیے۔"

"اس مقدمہ کا گواہ؟" کرسی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے مسٹر لاری کو وہ حوالہ دیا جس کی انھیں ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مسٹر لاری کو فوراً یاد آ گیا اور انھوں نے اپنے ملاقاتی کی طرف انتہائی نفرت سے دیکھا۔

"مسٹر برساڈ کو مس پروس نے پہچان لیا کہ وہ ان کے وہی بھائی ہیں جن کے بارے میں آپ سن چکے ہیں۔" سڈنی نے کہا۔ "اور انھوں نے اس رشتہ کا اقرار کر لیا ہے ایک اور خبر یہ کہ ڈارنے کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ دو گھنٹے ہوئے ہیں انھیں قطعی محفوظ اور آزاد چھوڑ کر آیا ہوں اور ابھی ان کے پاس جانے والا ہوں" خوف سے مفلوج ہو کر ضعیف آدمی نے کہا۔

"آپ کا ارشاد درست ہے لیکن انھیں گرفتار کر لیا گیا... کب ہوا یہ واقعہ مسٹر برساڈ"

"اگر گرفتار کیا گیا ہے تو ابھی کیا ہوگا"

"مسٹر برساڈ سے زیادہ اچھی طرح کوئی اس بات سے واقف نہیں جناب" سڈنی نے کہا "اور یہ اطلاع مجھے مسٹر برساڈ ہی سے ملی ہے یہ اپنے ساتھی کیپٹنوں کو شراب پیتے میں بتا رہے تھے کہ گرفتاری عمل میں آچکی ہے۔ یہ وارنٹ لانے والوں کو خود دروازے تک پہونچا آئے ہیں اور دربان کو دروازہ کھول کر انھیں داخل ہوتے دیکھا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا"

مسٹر لاری کی تجربہ کار آنکھوں نے سڈنی کے چہرے سے پڑھ لیا کہ اس بات کی تفصیل پوچھنا۔ وقت برباد کرنا ہے۔ وہ بہت پریشان ہو کر بھی بدحواس نہیں ہوئے۔ یہ سوچ کر کہ شاید ان کے ہوش و حواس قائم رہیں تو کچھ بہتری کی صورت نکل سکے۔ اس لئے انھوں نے ضبط کیا اور خاموش غور سے سنتے رہے۔

"اب مجھے امید ہے کہ کل ڈاکٹر مینٹ کا نام اور رسوخ چارلس کے حق میں کار آمد ثابت ہوگا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ کل وہ عدالت میں پیش کئے جائیں گے۔ کیوں مسٹر برساڈ"

"ہاں میرا بھی خیال ہے"

"جیسے آج وہ بچ گئے اسی طرح کل بھی چھڑا لئے جائیں گے۔ مگر مسٹر لاری، یہ بات

معلوم کر کے تو میرے چھکے چھوٹ گئے کہ ڈاکٹر مینٹ ان کی گرفتاری کا حکم منسوخ نہ کرا سکے گا"

"انھیں پہلے سے اطلاع نہ ملی ہوگی" مسٹر لاری نے کہا۔

"مگر یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے۔ یاد ہوگا آپ کو کہ ان کا اور ان کے داماد کا رشتہ ایک مشہور حقیقت ہے"

"یہ واقعہ ہے" مسٹر لاری نے پریشان ہو کر کارٹن کی طرف دیکھا اور گھبراہٹ میں اپنی ٹھوڑی کھجلاتے ہوئے اقرار کیا۔

"قصہ مختصر بڑا نازک زمانہ ہے۔ جب کہ نازک داؤ لگا کر خطرناک کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو ایسا داؤ لگانا چاہئے جو جیت سکے۔ ہاں میں ہارتی ہوئی بازی کھیل سکتا ہوں۔ کسی شخص کی زندگی بھی خون بہا دینے کے قابل نہیں۔ جسے آج لوگ رہا کروا کر گھر لے جائیں۔ کل پھر گرفتار ہو سکتا ہے۔ اگر حالات نازک ہیں تو میں نے ارادہ کیا ہے کہ ایک دوسرا ہی جوا کھیلوں۔ میرا مقصد ایک ایسے دوست کو جیتنا ہے جو کنسیر جیری سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ دوست مسٹر برساڈ ہیں"

"اس کے لئے آپ کے ہاتھ میں تاش کے اچھے پتے ہونے چاہئیں" مخبر نے کہا

"میں دیکھتا ہوں خدا کہ میرے ہاتھ میں کیا کیا ہے۔ مسٹر لاری آپ تو جانتے ہیں میں بڑا سخت اکھڑ آدمی ہوں۔ مہربانی سے مجھے تھوڑی سی برانڈی عنایت کیجئے"

برانڈی اس کے سامنے رکھدی گئی۔ اس نے ایک گلاس بھر کر چڑھایا۔ ایک اور چڑھایا۔ اور بوتل کچھ سوچتے ہوئے الگ سرکا دی۔

"مسٹر برساڈ" اس نے ایسا بولنا شروع کیا جیسے واقعی وہ ہاتھ میں تاش کے پتے لئے دیکھتا جارہا ہو "جیل خانہ کی بھیڑ — جمہوری کمیٹی کے نمائندے جو فی الحال جیل کے محافظ بنے ہوئے ہیں، کبھی قیدی رہے۔ مگر مستقل طور پر جاسوس اور پوشیدہ مخبر ہیں۔ یہ اور بھی کارآمد خوبی ہے۔ کہ انگریز نسل کے ہیں کیونکہ فرانسیسی لوگوں پر انگریزوں سے زیادہ جلدی شبہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اپنے آقاؤں کو غلط نام بتایا ہے یہ تاش کا پتہ کافی اچھا ہے۔ مسٹر برساڈ جو فی الحال فرانس کی جمہوری حکومت کے ملازم ہیں اس سے قبل انگریزوں کی راج شاہی سرکار کے پٹھو تھے۔ جو فرانس اور اس کی آزادی کی دشمن ہے۔ یہ پتہ تو لاجواب ہے اس شک وشبہ کے زمانے میں بڑی آسانی سے یہ لوگوں پر واضح کیا جاسکتا ہے کہ مسٹر برساڈ ابھی تک دراصل انگریز راج شاہی کے نوکر اور پٹ کے جاسوس ہیں۔ جمہوریت کا دھوکے باز دشمن اس کے کلیجے میں دبکا بیٹھا ہے انگریزی غدار اور سارے فساد کا ذمہ دار جو اتنا مشہور ہے اور ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ اس پتے کو کون کاٹ سکتا ہے۔ میری بازی آپ نے ملاحظہ کی مسٹر برساڈ"

"ہاں مگر تمہارا کھیل سمجھ میں نہیں آیا" مخبر نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔

"میں تو اکہ چلوں گا۔ قریب ترین کمیٹی کی شاخ میں جاکر مسٹر برساڈ کا پول کھول دیا جائے گا۔ اب آپ اپنی بازی پر نظر ڈالئے اور بتلایئے آپ کے ہاتھ میں کونسے پتے ہیں۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں" اس نے بوتل قریب سرکالی۔ گلاس برانڈی سے بھرا اور چڑھا گیا۔ اس نے دیکھا کہ مخبر ڈر رہا ہے کہ وہ شراب پی کر اس کا پول کھولنے کے لئے تیار

ہو رہا ہے یہ دیکھ کر اس نے ایک اور گلاس بھرا اور پی گیا۔

"اچھی طرح آرام سے اپنی بازی کی جانچ پڑتال کر لیجئے کوئی جلدی نہیں یہ بازی اس کے اندازے سے زیادہ کمزور نکلی۔ برساڈ نے سمجھا سڈنی کو پتہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ہارتے ہوئے پتے ہیں۔ ناکامیابی سے جھوٹی قسمیں کھانے کی وجہ سے اپنی باعزت نوکری سے نکالے گئے۔ اس لئے نہیں کہ وہاں ان کی ضرورت نہ تھی۔

انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آبنائے پار کر کے انھوں نے فرانس میں ملازمت کرلی تھی پہلے تو اپنے ہم وطنوں کو بہکانے اور چھپ کر ان کی باتیں معلوم کرنے پر مامور تھے پھر بتدریج وہ فرانسیسیوں کو ورغلانے اور چھپ کر ان کی باتیں سننے لگے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ گورنمنٹ جس کا خاتمہ ہو چکا تھا اس کے دور میں وہ سینٹ انٹائن میں ڈیفارج کی دوکان پر جاسوسی کے لئے تعینات کئے گئے تھے۔ وہاں انھیں پولس کے ذریعہ جملہ اطلاعات ملی تھیں۔ ڈاکٹر مینٹ کا قید ہونا پھر رہائی اور پوری داستان انھیں اس لئے بتائی گئی تھی کہ وہ ڈیفارج اور میڈم سے اچھی طرح کھل کر گفتگو کر سکیں۔ انھوں نے میڈم ڈیفارج پر نسخہ آزمایا تھا اور بڑی طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ہمیشہ یہ یاد کر کے لرزنے لگتے تھے کہ جب وہ اس سے باتیں کر رہے تھے تو وہ مسلسل بنے جارہی تھی۔ اور جب کہ اس کی انگلیاں جنبش میں تھیں تو اس نے ان کی طرف نہایت خوفناک نظروں سے دیکھا تھا اس کے بعد سے انھوں نے بارہا میڈم کو اپنی بنی ہوئی فہرست نکال کر لوگوں پر الزام لگاتے دیکھا تھا۔ اور سولی نے ان سب کو ہڑپ کر لیا تھا وہ اور اس کی طرح کے

دوسرے ملازم اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی جان کبھی محفوظ نہیں تھی۔ فراری کا بھی کوئی امکان نہ تھا کیونکہ وہ کلہاڑی کے نیچے جکڑا ہوا تھا۔ اور حالانکہ موجودہ خوفناک حکومت کے قیام میں اس نے پوری پوری مدد کی تھی۔ پھر بھی ایک لفظ اسے ختم کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اگر ایک بار اس پر وہ تمام الزامات لگا دیئے گئے جن کا ابھی کارٹن نے حوالہ دیا تھا تو وہ ظالم عورت جس کی سنگدلی کے وہ بہت سے ثبوت دیکھ چکا تھا ضرور اپنا بھیانک رجسٹر نکال کر اس کی زندگی کی آخری امید بھی کچل ڈالے گی۔ اس کے علاوہ خفیہ کام کرنے والے بڑی آسانی سے ڈر جاتے ہیں یہ تاش کے پتے ایک بازی کو ہرانے کے لئے کافی ہیں۔ اور کھلاڑی نے جب انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کا منہ تمتما اٹھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنی بازی کچھ زیادہ پسند نہیں آئی — پتا چلیں گے؟"
کارٹن نے بڑے سکون سے کہا۔

"جناب میرا خیال ہے —" اس نے انتہائی کمینے پن سے مسٹر لاری کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "میں آپ کی بزرگی اور نیک طبعی کا سہارا لے کر التجا کروں گا کہ آپ ان صاحب سے عمر میں بڑے ہیں۔ کیا آپ ان سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کیا شرط ہے جو انھیں اکہ چلنے سے روک سکتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں تو مخبر ہوں ہی۔ اس پیشے کو انتہائی حقیر سمجھا جاتا ہے مگر کسی کو تو یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ مگر مسٹر کارٹن تو مخبر نہیں ہیں۔ یہ کیوں مخبری کر کے اپنی عزت گھٹاتے ہیں؟"

"مسٹر برساڈ کوئی دم جاتا ہے جو میں اپنا اکہ بغیر کسی تکلف کے چل دوں گا" کارٹن نے انھیں اپنی طرف مخاطب جان کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"صاحبو مجھے امید تھی کہ آپ دونوں میری بہن کا تو خیال کریں گے" مسٹر برساڈ

مسٹر لاری کو بھی ساتھ لپیٹے لے رہے تھے۔

"آپ کی بہن کا آپ سے پیچھا چھڑا دیا جائے تو یہ انکی سب سے زیادہ عزت افزائی ہوگی" سڈنی کارٹن نے کہا۔

"آپ ایسا نہیں کریں گے"

"میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے"

مخبر کی چکنی چپڑی باتیں اس کے نہایت کھردرے لباس اور چہرے مہرے کے ساتھ قطعی نامناسب معلوم ہو رہی تھیں۔ کارٹن جنہیں بڑے عقلمند اور ایماندار بھی نہیں سمجھ پاتے تھے اب ان کی طراری نے جاسوس کو ایسا حواس باختہ کر دیا کہ اس کی ساری چالبازی پست ہوگئی کارٹن نے پہلے کی طرح اپنے ہاتھ میں تاش بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور ابھی غور کیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے پاس اور بھی ایک ترپ ہے جس کے بارے میں میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ دوست اور ساتھی "بھیڑ" جو اپنے متعلق کہتا تھا کہ گاؤں کے جیل خانے میں چرائی کرتا ہے وہ کون تھا؟"

"وہ ایک فرانسیسی ہے" "ہاں ہو تو سکتا ہے!" کارٹن نے بڑی لاپرواہی سے جیسے اس کے الفاظ دہرا دیئے اور بظاہر اس کی طرف سے بالکل بے توجہ رہا۔

"واقعی وہ فرانسیسی ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ حالانکہ یہ کوئی اہم بات نہیں" مخبر نے کہا۔

"ہونہہ۔ کوئی اہم بات نہیں" کارٹن نے اسی غیر جذباتی لہجے میں دہرایا "کوئی

اہم بات نہیں۔ نہیں بالکل اہم بات نہیں۔ نہیں۔ پھر بھی میں اسے پہچانتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے آپ نہیں پہچانتے۔ میں یقین دلاتا ہوں۔ ہو ہی نہیں سکتا۔" مخبر نے کہا۔

"ہو۔۔۔ ہی۔۔۔ نہیں سکتا۔" کارٹن نے پھر دہرایا اور اپنا گلاس جو خوش قسمتی سے چھوٹا ہی تھا پھر لبریز کر لیا۔ "ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھی فرانسیسی بولتا تھا۔ مگر غیر ملکی لہجہ تھا۔ میرا خیال ہے!"

"صوبائی لہجہ کہئے۔" مخبر نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ غیر ملکی!" کارٹن نے اپنی ہتھیلی زور سے میز پر مار کر کہا۔ ایک روشنی اس کے دماغ میں پیدا ہوئی۔ "کلائی! لعنت ہے۔ مگر وہی تھا۔ پرانی کوتوالی میں یہ شخص ہمارے سامنے موجود تھا۔"

"اب آپ سخت جلدبازی کر رہے ہیں جناب!" برساڈ نے مسکرا کر کہا جس سے اس کی ناک اور زیادہ ایک طرف کو جھک گئی۔ "اس معاملے میں یقیناً مجھے آپ پر فوقیت حاصل ہو گئی یہاں تک۔ آپ مجھ سے ہار گئے۔ کلائی جو میں اقرار کرتا ہوں کسی زمانہ میں میرا حصہ دار تھا۔ عرصہ ہوا مر گیا۔ میں نے اس کی آخری وقت تیمار داری کی۔ لندن میں سینٹ پنکراس ان دی فیلڈز میں وہ دفن کیا گیا تھا۔ غنڈوں کا گروہ اس سے اس زمانہ میں بہت ناراض تھا اس لئے میں اس کے دفن میں شریک نہ ہو سکا۔ مگر میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے کفن میں رکھا تھا۔"

اس وقت مسٹر لاری کو جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سے دیوار پر ایک نہایت غیر معمولی

پر یت کو جھنکار دکھائی دی۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ سایہ کس چیز سے پڑ رہا ہے انھوں نے دیکھا کہ مسٹر کرنچر کے سر کے اکڑے ہوئے کھڑے بال اور بھی اکڑ کر کھڑے ہو رہے ہیں۔

"ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اور ایمانداری سے کام لینا چاہئے۔ آپ پر یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ آپ کتنی غلطی پر ہیں اور آپ کے الزامات کس قدر بے بنیاد ہیں۔ میں آپ کو کلائی کے دفن کا سرٹیفکٹ دکھاتا ہوں۔ جو اتفاق سے جب ہی سے میری جیب میں پڑا ہے" جلدی سے انھوں نے جیب سے کتابچہ نکال کر کھولا: "یہ دیکھو ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ ذرا غور سے دیکھئے ۔۔۔ آپ دیکھئے تو۔ آپ ہاتھ میں لے کر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ جعلی نہیں ہے"

مسٹر لاری نے دیکھا کہ دیوار پر سایا لمبوترا ہوگیا۔ اور مسٹر کرنچر اٹھ کر آگے آئے۔ اگر ٹیڑھے سینگوں والی گائے جو اس گھر میں رہی تھی جو بیک نے بنایا تھا ان کے بال سنوارتی تب بھی وہ اتنی شدت سے نہ کھڑے ہو پاتے۔

مخبر نے نہیں دیکھا اور مسٹر کرنچر اس کے پہلو میں کھڑے تھے۔ انھوں نے موت کے فرشتہ کی طرح ان کا شانہ چھوا!

"وہ جو روجر کلائی تھا نا ۔۔۔" مسٹر کرنچر نے نہایت خشک اور کرخت چہرا بنا کر کہا ۔۔۔ "تو اسے تم نے کفن میں رکھا تھا؟"

"ہاں!"

"تو پھر اسے اس میں سے کون نکال لے گیا؟"

برساڈ کرسی پر پیچھے کی طرف ہو کر ہکلایا ۔۔۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا یہ مطلب ہے کہ وہ کبھی اس کفن میں رکھا ہی نہیں گیا۔ نہیں۔ قطعی نہیں رکھا گیا ہو تو میں اپنا سر قلم کرا دوں گا" مسٹر کریچر نے کہا۔

کریچر نے دونوں حضرات کی طرف مڑ کر دیکھا وہ دونوں جیری کو مسحور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں کہتا ہوں کہ تم نے پتھر اور مٹی اس بکس میں بند کر دی تھی۔ اب ذرا مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے بنانے چلے ہیں کہ کلائی کو تم نے دفن کے بکس میں لٹایا تھا۔ بالکل دھوکا تھا۔ میں اور دو اور آدمی خوب جانتے ہیں"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"تمہیں اس سے کیا" مسٹر کریچر غرائے "تم سے مجھے پرانی پرخاش ہے۔ بے شرم کہیں کے۔ بیوپاریوں کو دھوکا دیتے ہو۔ آدھی گنی کے بدلے میں میں تمہارا ٹینٹوا پکڑ کر دبا سکتا ہوں"

سڈنی کارٹن مسٹر لاری کی طرح حالات کے یوں پلٹ جانے سے متحیر بیٹھا تھا۔ اس نے مسٹر کریچر سے کہا کہ وہ ذرا ٹھنڈے دل سے تفصیل بیان کریں۔

"جناب پھر کبھی بتا دوں گا" انھوں نے کترا کر جواب دیا۔ "یہ وقت تفصیل میں جانے کے لئے موزوں نہیں۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ اس بکس میں کلائی ہرگز نہیں تھا۔ ذرا یہ ایک لفظ بھی تو اس بارے میں منہ سے نکال کر دیکھے۔ میں یا تو اس کا ٹینٹوا دبا دوں گا یا ابھی باہر جا کر اس کا پول کھول دوں گا" مسٹر کریچر نے آدھی گنی پر پھر فراخدلی سے زور دیا۔

"ہونہہ۔ اب پتہ چلا کہ میری بازی میں ایک ترپ اور بھی ہے" کارٹن نے کہا۔ "مسٹر برساڈ۔ اس غصے سے بھناتے ہوئے پیرس میں پول کھل جانے کے بعد آپ کا زندہ رہنا۔

قطعی ناممکن ہے۔ خاص طور پر جب آپ کی ایک دوسرے راج شاہی جاسوس سے راہ و رسم ہے جس کے متعلق یہ پُراسرار الزام بھی لگا ہے کہ اس نے اپنی موت کا جھوٹا اعلان کیا تھا۔ یہ پبلک کے خلاف جیل میں ایک غیر ملکی سازش کا ارتکاب اچھا مضبوط پتہ ہے۔ یقینی سولی کا ترپ کھیلیں گے ؟

"نہیں!" مخبر نے جواب دیا "میں پتے پھینکتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم دونوں سے غنڈے بہت خوش ہو چکے تھے۔ میں تو ڈبکیاں دے کر مار ڈالا جاتا مگر بچ کر انگلینڈ سے بھاگ نکلا۔ کلائی کے پیچھے اس بری طرح وہ لوگ لگے تھے کہ اگر وہ یہ چال نہ چلتا تو کسی طرح بچکر نہیں نکل پاتا۔ مگر بڑے ہی تعجب اور حیرت کا مقام ہے۔ اس شخص کو کیسے پتہ چل گیا ؟"

"بھلے آدمی اس معاملہ پر بیکار اپنا سر نہ کھپاؤ۔ یہ صاحب تمہیں دیئے ہی تالی ہڑتال کرنے والے ہیں۔ اور ایک دفعہ اور کان کھول کر سن لو۔ بس آدھی گنی کے عوض میں تمہارا ٹینٹوا دبا کر دم گھونٹ سکتا ہوں ؟"

مسٹر کرنچر نے فوراً بحث کی کاٹ کی اور اپنی فراخدلی کی نمائش کرنے سے باز نہ آسکے جیل کی "بھیڑ" نے ان کی طرف سے توجہ ہٹالی اور سڈنی کارٹن سے فیصلہ کن انداز میں کہا: "اب معاملہ طے ہونا چاہئے میں اپنے وقت سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتا مجھے اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے آپ کہہ رہے تھے آپ کی کوئی شرط ہے وہ کیا ہے مگر مجھ سے ناممکن چیز کی خواہش کرنا بیکار ہے اگر آپ مجھ سے موجودہ موقف میں ایسی بات کرنے کو کہیں گے جس سے

میری گردن اور بھی خطرے میں پھنس جائے تو پھر کیا فائدہ۔ بجائے آپ کی شرط پوری کرنے کے میں انکار کر کے قسمت کے فیصلہ پر قناعت کروں گا۔ مختصر یہ کہ مجھے کوئی فیصلہ تو کرنا ہی ہوگا۔ آپ ناامیدی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہاں ہم سب ہی امید کھو چکے ہیں۔ یاد رکھئے اگر میرے دل میں سما جائے تو میں آپ کی شکایت جڑ دوں اور میں قسمیں کھاتا، پتھر کی دیواروں کے آر پار گذر جاؤں۔ اور لوگ بھی میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اچھا تو آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"بہت زیادہ نہیں۔ تم قید خانے کی چابیاں رکھتے ہو؟"

"میں صاف کہے دیتا ہوں۔ بھاگ نکلنے کا کوئی موقع ہی نہیں؟" مخبر نے سختی سے کہا۔

"جو بات میں نے چاہی نہیں وہ تم مجھے بیکار کیوں بتا رہے ہو۔ تم چابیاں رکھتے ہو نا؟"

"ہاں کبھی کبھی؟"

"جب چاہو تب رکھ سکتے ہو؟"

"میں اندر آجا سکتا ہوں؟"

سڈنی نے شراب کا ایک اور گلاس بھرا۔ اسے آتشدان کے سامنے الٹ دیا اور غور سے دیکھتا رہا۔ جب گلاس خالی ہو گیا تو کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اب تک ہم نے ان دونوں کے سامنے بات چیت کی ہے تاکہ تاش کے پتوں کی

خوبیاں ہمارے اور تمہارے سوا دونوں پر بھی واضح ہوجائیں۔ ادھر تاریک کمرے میں آجاؤ، آخری بات چیت بھی ہوجائے۔"

نواں باب

"بازی جیت لی گئی"

ادھر سڈنی کارٹن اور جیل خانہ کی "بھیڑ" اندھیرے کمرے میں اتنے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے کہ ذرا سی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ادھر مسٹر لاری نے مسٹر کرنچر کو نہایت بے اعتباری کی نظر سے دیکھا۔ ایماندار بیوپاری جس طرح ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اسے دیکھ کر اس پر قطعی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کبھی ایک ٹانگ پر بوجھ ڈال کر کھڑا ہوتا، کبھی دوسری ٹانگ پر۔ معلوم ہوتا تھا اس کی پچاس ٹانگیں ہیں۔ جنہیں وہ بار بار بدل رہا ہے اس نے نہایت قابل اعتراض طریقہ پر بڑے غور سے اپنے ناخونوں کو گھورنا شروع کیا اور جب کبھی اس کی آنکھیں مسٹر لاری سے چار ہوجاتیں وہ فوراً اپنے ہاتھ کی مٹھی بنا کر ہونٹ ہونٹ کھانسنے لگتا۔ یہ بیماری عام طور پر صاف دل انسانوں پر حملہ آور نہیں ہوا کرتی۔

"جیری! ادھر آؤ" مسٹر لاری نے کہا۔

مسٹر لاری ترچھے ترچھے چل کر آگے آئے۔ ان کا کندھا ان سے پہلے آگے بڑھ آیا۔

"خبر رسانی کے علاوہ اور تم کیا کچھ کیا کرتے تھے؟"

تھوڑی دیر تک وہ اپنے خیال میں غرق مسٹر لاری کو تکتے رہے۔ پھر ایک دم ایک نہایت

درخشاں خیال ان کے دماغ میں چمکا۔ "کچھ کمینی بازی کی قسم کا کام۔"

"مجھے شبہ ہورہا ہے کہ تم نے ٹیلسن کے باوقار نام کو بطور ایک ٹٹی کے استعمال کیا، اور کوئی نہایت رذیل اور غیر قانونی حرکتیں کرتے رہے ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو انگلستان واپس چلنے کے بعد مجھ سے کسی قسم کی دوستی کی امید نہ رکھنا۔ اور نہ مجھ سے یہ امید رکھنا کہ میں تمہارا راز چھپاؤں گا اب تم ٹیلسن کو اور زیادہ اپنے مفاد کے لئے استعمال نہیں کرسکو گے۔"

"مجھے آپ کے چھوٹے موٹے کام کرنے کی عزت حاصل ہو چکی ہے اور مجھے تو یہی امید تھی کہ آپ کی خدمت گزاری میں بال سفید ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر اس بات میں کچھ حقیقت بھی تب بھی مجھے نقصان پہونچانے سے پہلے آپ ایک بار اور سوچ لیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ واقعی یہ بات سچ ہے۔ مگر فرض کیجئے ہو بھی تب۔ اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اگر ایسا ہوتا تب بھی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ہر بات کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں کما رہے ہوں۔ اور ایک ایمان دار بیوپاری کو پیسہ نہیں ملتا۔ بلکہ آدھا پیسہ بھی نہیں ملتا۔ ہوا کی طرح بینک میں پیسہ جمع کرانے آتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں چالاکی سے اس بیوپاری سے اشارے کرتے ہیں پھر اپنی ذاتی گاڑیوں میں آتے جاتے ہیں۔ زیادہ نہیں بس بالکل ہوا کی طرح۔ اب آپ یہ تو نہیں کرسکتے کہ مادہ بطخ کو تو مسالہ لگائیں اور نر کو نہ لگائیں۔ اب مسز کرنچر ہیں۔ بہرحال انگلینڈ میں تو تھیں ہی۔ اور کل پھر انھیں سے واسطہ پڑے گا۔ اور انھیں موقعہ ملا تو فوراً سجدے مارنا شروع کردیں گی۔ بیوپار کے خلاف دعائیں مانگ مانگ کر بیڑا غرق کردیں گی۔ برے سے بیوپار کا قلع قمع کرکے دم لیں گی۔ مگر ڈاکٹروں کی

بیویاں یوں سجدے نہیں مارتیں ۔ اور اگر مارتی بھی ہیں تو ان کے ہاں اور برکت ہوتی ہے زیادہ مریض آتے ہیں اور پھر ایک چیز سے دوسری چیز عمل میں آتی ہے ۔ کفن دفن کا انتظام کرنے والے گرجا کے محرر اور خادم اور پہرے دار سب کے سب اس میں حصہ دار ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی کرے بھی یہ کام تو پھر بھی کچھ نہیں بچے گا ۔ ایک غریب آدمی کو جو کچھ ملتا ہے اس سے وہ خوش حال بھی نہیں ہو سکتا ۔ مسٹر لاری پھر بھی اس میں برکت نہیں ۔ ہر کوئی اس دھندے سے نکلنا ہی چاہے گا ۔ اگر نکلنے کا کوئی راستہ ہو تو وہ یہ کام چھوڑنا ہی پسند کرے گا "

" اف مجھے تو تمہاری صورت سے ڈر لگ رہا ہے " مسٹر لاری نے کچھ نرم پڑ کر کہا ۔

" جناب میں نہایت عجز سے ایک تجویز آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ اگر واقعی یہ بات سچ ہوتی ـــــ میں یہ نہیں کہتا کہ سچ ہے " مسٹر کرنچر بولے ۔

" اب چالبازی مت دکھاؤ " مسٹر لاری نے کہا ۔

" نہیں صاحب میں ایسا نہیں کروں گا ۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ واقعہ ہے جو کچھ میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے ۔ بار کے پاس اسٹول پر میرا لڑکا بیٹھتا ہے ۔ پل بڑھ کر جوان مرد بن جائے گا ۔ آپ کا کام کیا کرے گا ۔ خط پتر لے جاتا ، اوپر کا ہلکا پھلکا کام ، اس وقت تک کرتا رہے گا جب تک کہ آپ الٹ نہ جائیں ۔ اگر یہ بات سچ ہوتی ۔ میں نے ایک اقبال تو نہیں کیا ہے کہ ایسی بات ہے ۔ (مگر میں آپ سے چال نہیں چلوں گا صاحب) اس لڑکے کو اس کے باپ کی نوکری پر رہنے دیجئے تاکہ وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال کر سکے ۔ اس لڑکے کے باپ کا تختہ نہ الٹے گا ۔ ایسا نہ کیجئے گا صاحب ۔ اور باپ کو باقاعدہ گورکنی کا کام کرنے دیجئے تاکہ وہ

اس غلطی کا بدلہ کرسکے جو اس نے قبر کھود کر اور کفن کھسوٹ کر کی تھی۔ کی نہیں بلکہ اگر ایسی بات ہوتی اور وہ غلطی کرتا تب ....

...... اس لئے ان حرکتوں سے باز آنے کے لئے وہ باقاعدہ گورکن ہے تاکہ وہ آئندہ مرنے والوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری محسوس کرے۔"

مسٹر کریچر نے آستین سے اپنا ماتھا پوچھا جس کا یہ مطلب تھا کہ ان کی تقریر ختم ہو رہی ہے۔" یہی میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ آج کل یہاں ہو رہا ہے اسے انسان ایسے تو نہیں دیکھ سکتا کتنے کاندھوں سے سر غائب ہو گئے۔ یا خدا، کھالوں کی اتنی بہتات ہے اور ان کی قیمت اس قدر گر گئی ہے کہ مزدوری کے دام بھی پورے نہیں نکلتے......

...... ہاں تو اگر ایسی بات سچ ہوتی تو میں یہی کہتا جو ابھی میں نے کہا...... تو میں آپ سے التجا کرتا کہ جو کچھ میں نے کہا اسے یاد رکھیں۔ ایک نیک اور مفید مقصد کے لئے میں نے خود اٹھ کر سب کچھ بتا دیا۔ اگر میں چاہتا تو مکر جاتا۔"

"کم از کم اتنی بات تو سچ ہے۔" مسٹر لاری نے کہا۔ اچھا اب کچھ مت کہو۔ اگر تم اس لائق ثابت ہوئے اور سچ مچ تم نے توبہ کر لی تو ممکن ہے میں اب بھی تمہارا دوست رہوں بس اب زیادہ بک بک نہیں سننا چاہتا۔"

مسٹر کریچر نے سلام کے لئے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔ اتنے میں سڈنی کارٹن اور مجبر اندھیرے کمرے سے نکل آئے۔

"خدا حافظ ـــ مسٹر برساڈ۔ اب سب معاملے ہو گیا اور تمہیں مجھ سے ڈرنے کی

کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ مسٹر لاری کے مقابل آتشدان کے سامنے بیٹھ گیا جب وہ تنہا رہ گئے تو مسٹر لاری نے پوچھا "تم نے کیا کیا؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ اگر ملزم پر برا وقت آن پڑا تو میں نے ایک بار ان سے ملاقات کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔"

مسٹر لاری کا منہ اتر گیا۔

"اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس سے زیادہ کی خواہش کرنے سے اس کی گردن کلہاڑی کی زد میں آجانے کا خطرہ تھا۔ جیسے کہ وہ خود کہہ رہا تھا کہ اگر اس کا پول کھول دیا گیا تب بھی دہی انجام ہوگا۔ اسے زیادہ بڑی سزا تو نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے کہ حالات موافق نہیں تھے۔ مجبوری ہے۔"

"لیکن اگر عدالت نے اس کے خلاف حکم صادر کر دیا تو ملنے سے اس کی جان تو نہیں بچ سکے گی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ جان بچ جائے گی۔"

مسٹر لاری پھر آگ میں گھورنے لگے۔ اپنی پیاری لوسی جس سے انہیں ہمدردی اور محبت تھی۔ چارلس کی دوبارہ گرفتاری سے جو شدید ناامیدی ہوئی تھی ان تمام باتوں نے بتدریج انہیں پست کر دیا۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ حال ہی میں خوف کی پڑی تھیں ان سے شل ہو کر آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"آپ بہت اچھے انسان اور وفادار دوست ہیں۔ معاف کیجئے گا اگر میں کہوں کہ آپ بہت متاثر ہو رہے ہیں۔ میں اپنے باپ کو یوں روتا دیکھ کر کبھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اور اگر آپ میرے والد ہوتے تب بھی میں آپ کے غم کی اتنی ہی قدر کرتا۔ شکر ہے آپ کو مجھ جیسے بیٹے کی طرف سے ذلت نہیں اٹھانا پڑی" کارٹن نے کہا۔

حالانکہ یہ آخری الفاظ اس نے اپنے خاص کھردرے انداز میں کہے۔ مگر اس کے لہجہ اور لمس دونوں میں سچے جذبات اور احترام پایا جاتا تھا۔ مسٹر لاری جنہیں کبھی اس کا بہتر رخ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا اور کارٹن نے اسے آہستہ سے دبایا۔

"غریب ڈارنے کے متعلق بس یہی عرض ہے کہ ان کی بیوی سے اس بات چیت اور انتظام کا ذکر نہ کیجئے گا۔ وہ جارلس سے ملنے نہ جاسکیں گی۔ وہ شاید سوچیں گی کہ سازش کی گئی ہے تاکہ حالات ناساز گار ثابت ہوں تو پہلے سے انھیں فیصلہ سننے کے لئے تیار کر دیا جائے۔"

اس بارے میں مسٹر لاری نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کے لئے چونک کر کارٹن کی طرف دیکھا کہ کیا وہ بھی یہی سوچ رہا تھا۔ واقعہ یہی تھا اس کی آنکھوں میں انھوں نے اپنا جواب پالیا اور سمجھ گئے۔

"وہ ہزاروں چیزیں سوچ سکتی ہیں" کارٹن نے کہا "ان کی پریشانی اور بڑھ ہی جائیگی۔ ان سے میرا ذکر بھی نہ کیجئے گا۔ جیسا میں نے آپ سے آنے کے بعد کہا تھا کہ بہتر ہے میں ان سے نہ ملوں جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا تھوڑی بہت مدد جو مجھ سے ہو سکے گی بغیر اپنے آپ کو ظاہر کئے کرتا رہوں گا

شاید آپ ان کے پاس جا رہے ہیں۔ آج کی رات وہ بہت ہی دکھی ہوں گی۔"

"بس اب میں سیدھا وہیں جا رہا ہوں۔"

"یہ بہت اچھا ہوگا۔ وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں آپ کے اوپر انہیں بھروسہ بھی بہت ہے۔ کیسی لگ رہی تھیں؟"

"بڑی سخت پریشان اور غم زدہ — مگر بہت حسین۔"

ایک طویل غم میں ڈوبی آہ ایک سسکی کی طرح کارٹن کے دل سے نکلی۔ فوراً مسٹر لاری نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو آگ کی طرف مڑ گیا تھا۔

ایک ہلکا سا سایہ یا روشنی کی جھلک چہرہ پر آئی اور تیزی سے گذر گئی جیسے ایک جنون خیز چمکیلی صبح پہاڑی کی ڈھلوان پر سے کوئی جھونکا گذر جائے۔ انھوں نے پیر سے ایک گرتی ہوئی لکڑی کو ٹھکرا کر واپس آتشدان میں ڈالنے کے لئے پیر اس پر رکھ دیا۔ وہ اس وقت سفید سواری کا کوٹ اور اونچے جوتے جو اس زمانے میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔ پہنے ہوئے تھا۔ آگ کی روشنی ان سفید پرتوں پر پڑنے کی وجہ سے وہ زرد و زرد نظر آ رہا تھا۔ اس کے لمبے بھورے بال بے ترتیبی اور الجھے ہوئے چہرے کے گرد بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا پیر ابھی تک ... دہکتے ہوئے انگارے پر رکھا تھا۔ یہ اس کے دباؤ سے پچ رہا تھا۔ مسٹر لاری نے اسے آگ کی طرف سے اس قدر تعجب انگیز حد تک لاپرواہ دیکھ کر اسے ٹوکا۔

"میں بھول گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

مسٹر لاری کی نظریں پھر اس کے چہرے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ قدرتی حسین چہرہ مہرہ جو

عزم سے اس قدر مشابہ تھا لا پروائی اور بے توجہی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مسٹر لاری کو بے اختیار ڈاسنے کا جبڑا یاد آگیا۔ اس وقت سڈنی کے چہرے پر بھی وہی تاثرات تھے۔ جو مسٹر لاری کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔

"اور آپ یہاں، جس کام سے آئے تھے وہ پورا ہو گیا۔"

"ہاں — کل میں آپ کو بتا رہا تھا تو اس وقت اچانک لوسی آگئیں آخر کار میں نے وہ کام ختم کر لیا۔ بس کے لئے آیا تھا۔ میرا خیال تھا میں انہیں نہایت محفوظ چھوڑ کر پیرس سے روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے پاس پروانہ راہداری موجود ہے۔ میں جانے کے لئے بالکل تیار تھا۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

آپ کی زندگی کافی طویل ہے جسے آپ مڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔" کارٹن نے سوچ میں ڈوب کر کہا۔

"میں اٹھہتر برس کا ہوں۔"

"آپ کی ساری عمر کارآمد گذری ہے۔ ہمیشہ ثابت قدمی سے مشغول رہے۔ لوگوں نے آپ کے اوپر اعتبار کیا ہے۔ تعظیم کی ہے اور احترام سے دیکھا ہے۔"

"میں جب سے سن بلوغ کو پہنچا ہوں کاروبار میں غرق ہوں میں تو لڑکپن ہی سے کاروباری ذہنیت کا تھا۔"

"اب دیکھئے اٹھہتر برس کی عمر میں آپ کتنے بلند مرتبے پر پہنچ گئے ہیں۔ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو کتنے لوگ آپ کی جدائی کا غم کریں گے۔"

"میں بے چارہ ناکتخدا بوڑھا میرے لئے کون رونے والا ہے"

مسٹر لاری نے مسکرا کر جواب دیا

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں، کیا وہ آپ کے لئے نہیں روئیں گی۔ ان کی بچی نہیں روئے گی"

"ہاں، ہاں خدا کا شکر ہے میں نے جو کچھ کہا اس سے میرا یہ مطلب نہ تھا"

"اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے نا"

"یقیناً"

اگر آج رات آپ اپنے سنسان دل سے یہ کہہ سکتے کہ دنیا میں کوئی انسان مجھے محبت نہیں کرتا کسی سے مجھ کو لگاؤ نہیں۔ کوئی میرا شکر گذار نہیں۔ کسی کے دل میں میں نے جگہ نہیں بنائی کسی کو میرا درد نہیں۔ میں نے زندگی میں کوئی مفید کام نہیں کیا کہ مجھے کوئی یاد رکھ سکے آپ کے یہ اٹھتر سال آپ کے لئے اٹھتر بوجھل لعنتیں بن جاتیں کہ نہیں"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ مسٹر کارٹن۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے"

سڈنی نے پھر اپنی آنکھیں آگ کے شعلوں پر جمائیں اور ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد کہا:

"میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ کو بچپن بہت دور معلوم ہوتا ہے۔ کیا وہ دن جب آپ اپنی ماں کے زانو پر بیٹھے تھے۔ خواب کی طرح موہوم نظر آتے ہیں"

"بیس برس پہلے تو واقعی یہ باتیں بہت دھندلی ہوگئی تھیں مگر جوں جوں آخری وقت قریب آرہا ہے میں واپس گھوم پھر کر دوبارہ ابتدا کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے اس طرح ایک ہموار چلنا راستہ تیار ہوتا جا رہا ہے۔ میرا دل ان بہت سی یادوں سے متاثر ہو رہا ہے جو عرصہ ہوا سو گئی تھیں۔ اب بڑھاپے میں بھی مجھے اپنی حسین کمسن ماں اند وہ دن یاد آتے ہیں جب یہ دنیا میرے لئے اتنی مادی شے نہیں تھی۔ اور میری کمزوریاں اسوقت تک اتنی پختہ نہیں ہوئی تھیں۔"

"میں ان جذبات کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں جن کی وجہ سے آپ کے دل کو ڈھارس ہوتی ہے" کارٹن کے تمتائے ہوئے چہرے پر رونق آگئی۔

"امید تو یہی ہے۔"

یہاں پہونچ کر کارٹن نے بات چیت کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اور اٹھکر انھیں اوورکوٹ پہننے میں مدد دی۔

"مگر تم ــــ تم جوان ہو" مسٹر لاری نے موضوع کی طرف دوبارہ لوٹ کر کہا۔

"ہاں میں بوڑھا نہیں ہوں۔ مگر جوانی میں میری حرکتیں ایسی نہیں تھیں۔ جو انسان کو عمر طبعی کو پہونچنے دیں۔ بس ختم کیجیے میرا ذکر" کارٹن نے کہا۔

"اور میرا ذکر بھی ختم ہونا چاہیے۔ کیا باہر جا رہے ہیں آپ" مسٹر لاری نے کہا۔

"میں ان کے پھاٹک تک آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ تو میری آوارہ گردی اور بے قراری سے واقف ہیں۔ اگر میں دیر تک سڑکوں پر چکر لگاؤں تو فکر نہ کیجیے گا۔ میں کل صبح حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ کل عدالت تشریف لے جائیں گے؟"

"ہاں بدقسمتی سے جانا پڑے گا۔"

"میں بھی وہاں موجود رہوں گا۔ مگر صرف ہجوم کے ایک فرد کی طرح۔ میرا مخبر میرے لئے جگہ تلاش کر رکھے گا۔ میرے بازو کا سہارا لے لیجئے حضرت"۔

مسٹر لاری نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ نیچے اتر کر گلی میں چلے گئے اور چند منٹ میں منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ کارٹن وہاں ان سے رخصت ہوگیا۔ مگر تھوڑی دور جا کر ٹھیر گیا اور جب پھاٹک بند ہوگیا تو واپس لوٹ کر اسے چھوا۔ اس نے سنا تھا وہ روز جیل خانہ کے قریب جاتی ہے" وہ اس جگہ باہر آئی ہوگی" اس نے اپنے چاروں طرف دیکھ کر سوچا "ادھر مڑ کر ان پتھروں پر یقیناً بارہا قدم رکھے ہوں گے۔ میں اس کے قدموں کے نشان پر چلوں تو"

"شب بخیر" سٹیزن۔

"ری پبلک کا کیا حال چال ہے"

"تمہارا مطلب مس گلوٹین سے ہے۔ اچھی خاصی ہے آج کی تعداد تریسٹھ تھی۔ بہت جلد ہم لوگ سو تک پہونچ جائیں گے کبھی کبھی سمن اور اس کے آدمی شکایت کرتے ہیں کہ وہ تھک کر چور ہوجاتے ہیں۔ ہا، ہا، ہا، کیا بیہودہ آدمی ہے۔ سمن کمال کا حجام ہے"۔

"کیا تم اکثر دیکھنے جاتے ہو"

"حجامت بناتے۔ ہاں ہمیشہ۔ روزانہ۔ کیا حجام ہے۔ کبھی تم نے اسے کام کرتے دیکھا"

"کبھی نہیں"

جس دن ذرا اچھا دستہ پہونچے اس دن جا کے اسے دیکھو۔ ذرا خود اندازہ لگاؤ سٹیزن۔ آج میں نے دو پائپ پئے تھے کہ اس نے تریسٹھ کی حجامت کردی۔ دو پائپ سے

بھی کم وقفہ میں! قسمیہ۔"

جب منحنی سا آدمی ہاتھ سے پائپ، دکھا کر جلاد کے وقت کا حساب لگا رہا تھا تو کارٹن کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھری کہ وہ اسے وہیں جان سے مار دے، اس لئے وہ پلٹ پڑا۔

"مگر تم تو انگریز نہیں ہو حالانکہ انگریزی لباس پہنے ہوئے ہو۔" آرکش نے کہا۔

"ہاں" کارٹن پھر رکا اور مڑ کر جواب دیا۔

"تم فرانسیسی کی طرح بولتے ہو۔"

"میں یہاں کا پرانا طالب علم ہوں۔"

"آہا۔ ایک مکمل فرانسیسی ۔۔۔! شب بخیر انگریز آدمی!"

"شب بخیر سیٹیزن۔"

"مگر جا کے اس بیہودہ کتے کو ضرور دیکھنا۔ اپنے ساتھ ایک پائپ بھی لیتے جانا۔" منحنی سے آدمی نے پکار کر پھر اس کے پیچھے پڑ کر کہا۔

سڈنی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ بیچ سڑک میں ایک روشن لیمپ کے نیچے رک گیا۔ اور پنسل سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھا۔ تب اس شخص کی طرح بجے ہوئے قدم رکھتا ہوا جسے اچھی طرح راستہ یاد ہو، بہت سی اندھیری اور گندی گلیوں میں سے گزرتا جو پہلے سے زیادہ گندی ہو رہی تھیں کیونکہ اس مار دھاڑ کے زمانہ میں بہترین سڑکیں بھی صاف نہیں کی جاتی تھیں۔ وہاں سے وہ ایک عطار کی دوکان پر

پہونچا۔ جسے مالک خود اپنے ہاتھوں سے بند کر رہا تھا۔ یہ ایک تاریک اور ٹیڑھی میڑھی مختصر سی دوکان تھی جو ایک نہایت تکلیف دہ چڑھائی کی سڑک پر واقع تھی۔ مالک بھی مختصر سا کبڑا شخص تھا۔

اس شہری کو بھی اس نے شب بخیر کہا اور میز پر اس کے سامنے کاغذ کا ٹکڑا رکھ دیا۔

"افوہ"! عطار نے آہستہ سے پڑھ کر کہا "ہی ہی ہی!"

مڈلی نے کوئی توجہ نہ دی اور عطار نے کہا۔

"خود تمہارے لئے سٹیزن؟"

"اپنے لئے"

"الگ الگ حفاظت سے رکھو گے سٹیزن۔ جانتے ہو انھیں ملا دینے کا کیا نتیجہ ہوگا؟"

"بالکل!"

کچھ چھوٹی چھوٹی پڑیاں بنا کر اسے دے دی گئیں۔ اس نے ایک ایک کر کے انھیں اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ گن کر ان کی قیمت ادا کر دی اور دکان سے نکل آیا۔

"اب کل تک کچھ بھی نہیں کرنا ہے" اس نے چاند کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے نیند بھی نہیں آرہی ہے!"

تیزی سے تیرتے ہوئے بادلوں کے سائے میں اس نے یہ الفاظ کہے تو اسکے رویے سے لاپروائی نہیں ظاہر ہو رہی تھی۔ لاپروائی سے زیادہ تو ان سے دیری ٹپکتی تھی۔ وہ ایک مستقل طور پر بھٹکے انسان کی طرح نظر آرہا تھا جو آوارگردی کرتے کرتے جدوجہد کا راستہ کھو بیٹھا ہو مگر جسے آخر میں اپنی راہ مل جائے اور وہ منزل کی طرف چل پڑے۔

عرصہ ہوا جب وہ نوجوان تھا اور اپنے ہم عصر مقابلہ کرنے والوں میں مہنہار مشہور تھا۔ تب اس کا باپ انتقال کر گیا۔ اس کی ماں عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ وہ تاریک سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرے تھے۔ چاند اور بادل اس کے سر پر تیر رہے تھے اس وقت وہ مقدس الفاظ جو اسکے باپ کی قبر پر پڑھے گئے تھے اسے یاد آگئے "مرنے والوں کے لئے میں پیام حیات ہوں۔ میں ہی نور زندگی ہوں" خداوند یسوع کہتا ہے۔" وہ جو مجھ پر یقین رکھتا ہے مر کر بھی زندہ رہے گا۔ اور وہ جو زندہ ہے اور مجھ پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔" وہ شہر جس کے اوپر کلہاڑی کا سایہ حاوی تھا رات کا وقت اور تنہائی۔ دل میں ترسٹھ مرنے والوں کا غم قدرتی طور پر اُبھر رہا تھا۔ اور دوسرے دن کے معتوب انسانوں کے سلسلے جو قید خانوں میں اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر دوسری کل ــ اور ایک نئی کل ــ خیالات کے سلسلے نے الفاظ یاد دلائے۔ خیالات کی زنجیر الفاظ کی یاد کو ایک پرانے ڈوبے ہوئے جہاز کے زنگ آلود ہوئے لنگر کی طرح کنارے پر کھینچ لائی،

اسے اس کی تلاش نہیں تھی مگر ان الفاظ کو دل ہی دل میں دہراتا وہ چلتا رہا۔

ان روشن کھڑکیوں کی طرف اس نے دیکھا۔ جہاں لوگ تمام ہولناکیوں میں گھرے ہونے کے باوجود سب کچھ بھول کر چند پرسکون گھنٹوں کے لئے سونے کی تیاری کر رہے تھے گرجا کے ان میناروں کی طرف اس کا خیال گیا جہاں عبادت جرم بن چکی تھی لوگوں کو مکار پادریوں اور لٹیرے مذہبی رہنماؤں اور دغا بازوں سے اتنی شدید نفرت ہوگئی تھی کہ وہ خود اپنی تباہی کے درپے ہوگئے تھے۔ اس نے ان قبرستانوں کی طرف دیکھا جن کے پھاٹکوں پر لکھا تھا کہ ابدی نیند کے لئے وقف ہیں۔ ان جیلوں کے متعلق اور سڑک پر سے گذر کر موت کی آغوش میں جانے والوں میں ایک گہری اور مقدس دلچسپی محسوس کی۔ وہ موت جو اس قدر عام مادی حقیقت بن چکی تھی کہ لوگوں میں سولی سے قتل کئے جانے والوں کے متعلق کوئی زبردست بھوت پریت کی کہانی بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ سڈنی کارٹن اس شہر کی جو سونے کی تیاری میں مشغول تھا موت اور زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہوا دریائے سین سے گذر کر پھر روشن گلیوں میں پہونچ گیا۔ بہت کم گاڑیاں نظر آرہی تھیں کیونکہ گاڑیوں میں سفر کرنے والوں پر شبہ کیا جانے کا خطرہ تھا اور اونچے طبقے کے لوگ لال ٹوپیوں میں منھ چھپائے بھاری جوتے پہنے پیدل چل رہے تھے مگر تھیٹر تمام بھرے ہوئے تھے اور جب وہ ادھر سے گذرا تو لوگ ہنستے قہقہے لگاتے نکلے اور ہنسی مذاق کرتے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ایک تھیٹر کے دروازے پر ایک چھوٹی سی بچی اپنی ماں کے

ساتھ کیچڑ بھری سڑک پار کرنے کی منتظر کھڑی تھی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر اس پار لے گیا اور اسے اتارنے سے پہلے اس سے ایک پیار مانگا۔

"میں ہی مرنے والوں کے لئے پیام حیات ہوں اور میں ہی نور زندگی" خداوند مسیح کہتا ہے "وہ جو مجھ پر یقین رکھتا ہے مر کر بھی زندہ رہے گا۔ اور وہ جو زندہ ہے اور مجھ پر ایمان رکھتا ہے کبھی نہیں مرتا"

اور رات بیت گئی اور سڑکیں سنسان ہوگئیں۔ تو یہی الفاظ اس کے قدموں کی چاپ میں گونج رہے تھے۔ اور ہوا میں رقصاں تھے۔ چلتے میں وہ نہایت اطمینان اور ثابت قدمی سے کبھی کبھی ان الفاظ کو دہراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مگر یہ الفاظ برابر اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

رات بیت گئی۔ وہ پل پر کھڑا پیرس کے جزیرے سے ملحق دریا کے کناروں سے ٹکراتے ہوئے پانی کی آواز سنتا رہا۔ مکان اور گرجے ایک الجھی ہوئی تصویر کی طرح چاند کی روشنی میں جگمگا رہے تھے۔ برف پوش دن ایک کفن پوش مردہ چہرے کی طرح آسمان میں طلوع ہو رہا تھا۔ تب چاند اور تاروں سے مزین رات زرد پڑ گئی۔ اور دم توڑ دیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا پر موت کی حکمرانی قائم ہوگی۔

مگر سورج طلوع ہوا اور یہ الفاظ جو رات کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ روشن اور طویل کرنوں کے ذریعہ اس کے دل میں تر و تازہ ہو گئے

اس نے پرستش کے جذبہ سے متاثر ہو کر آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے ان کی طرف دیکھا۔ کرنوں کا ایک پل سا اس کے اور سورج کے درمیان ہوا میں معلق نظر آیا اور دریا اس کے نیچے جھلملا رہا تھا۔

صبح کی خاموشی میں موجیں کتنی زبردست کتنی تیز اور ثابت قدم تھیں۔ وہ ایک سچے دوست کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ گھروں سے دور وہ دریا کے کنارے چلتا رہا، اور کنارے پر سورج کی روشنی اور گرمی میں پڑ کر سو گیا۔ جب وہ اٹھ بیٹھا تب بھی وہاں کچھ دیر ٹھیرا رہا۔ اور بھنور کے بے مقصد چکروں کو دیکھتا رہا۔ یہانتک کہ دھارے نے اس بھنور کو اپنے میں جذب کر لیا اور سمندر کی گود میں پہونچا دیا۔

"بالکل میری طرح!"

ایک تجارتی کشتی جس کے بادبان نرم و نازک خشک پتوں کے رنگ کے تھے تیرتی ہوئی نظر آئی اور سامنے سے گذر کر گم ہوگئی۔

جب کشتی کے پانی پر چھوڑے ہوئے نقوش خاموشی سے معدوم ہو گئے تو وہ دعا جو اس کے لبوں پر دل سے ابھر کر آئی تھی جس میں اس نے خدا سے التجا کی تھی کہ اس کی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ چشمی کی وجہ سے جو غلطیاں ہوئی تھیں۔ انھیں پروردگار اپنے رحم و کرم سے بخش دے۔ یہ دعا اس کے لبوں پر ان الفاظ میں تمام ہوئی "میں مرنے والوں کے لئے پیام حیات ہوں اور میں ہی نور زندگی"
جب وہ واپس لوٹا تو مسٹر لاری باہر جا چکے تھے اور یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ

وہ نیک مرد خدا کہاں گیا ہوگا۔ سڈلی کارٹن نے کافی کے سوا کچھ نہ پیا۔ تھوڑی سی روٹی کھائی پھر نہا دھو کر تازہ دم ہوا اور عدالت کی جانب روانہ ہوگیا۔

عدالت میں گڑبڑ اور آوازوں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی۔ کالی "بھیڑ" نے جس سے بہت سے لوگ ڈر کر ہٹ گئے اسے ہجوم کے درمیان ایک کونے میں گھسا دیا۔ مسٹر لاری اور ڈاکٹر مینٹ موجود تھے وہ بھی وہیں اپنے باپ کے پاس بیٹھی تھی۔ جب اس کے شوہر کو لائے تو اس نے مڑ کر دیکھا اس کی نگاہوں میں ہمت افزائی کی کوشش تھی۔ انتہائی پرستش اور محبت تھی۔ رحم سے لبریز الفت تھی اس کی وجہ سے وہ بڑی دلیری سے اپنے دل کو سنبھالے ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ڈارنے کی ڈھارس بندھ گئی اور چہرے پر صحت مند خون کی سرخی دوڑ گئی اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اس کے دل کو تقویت پہونچی۔ اگر کوئی اس وقت سڈنی کارٹن کو دیکھتا تو اسے اس کے چہرے پر بھی بالکل یہی تاثرات نظر آتے۔

اس نا انصاف عدالت کی موجودگی میں مقدمہ کی کارروائی میں کوئی ترتیب نہ تھی جس سے ملزم کی صحیح طور پر شنوائی ہونے کی امید کی جاتی۔ اگر نہایت سختی اور حیوانیت سے تمام قوانین کو مسخ نہ کر دیا جاتا تو انقلاب کیسے ہوتا۔ انتقام سے حد درجہ متاثر ہو کر تمام قوانین کو کالعدم کر دیا گیا تھا۔ گو یہ فعل خودکشی کے مترادف تھا۔ سب کی نگاہیں جیوری کی طرف متوجہ تھیں وہی پرانے جمہوریت پسند قوم پرست مستعدی سے جمع ہوئے تھے جو کل بھی تھے اور آنے والی کل اور پرسوں بھی ڈٹے

رہیں گے۔ جیوری کے ارکان میں سب سے زیادہ پر جوش ایک اعصاب کا مریض تھا۔ جس کی پُر ہوس انگلیاں بے قراری سے اس کے ہونٹوں پر رینگ رہی تھیں اسے دیکھ کر حاضرین کی بڑی ڈھارس بندھ رہی تھی بعد آدم خور خونخوار سینٹ انٹائن سا جیکوس نمبر تین تھا۔ یہ کتوں کی پنچایت ایک ہرن کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تھی۔

پھر سب کی نظریں پانچ ججوں اور سرکاری وکیل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ آج اس طرف سے بھی کسی رعایت کی اُمید نہ تھی۔ آج ان کے بھی نہایت جنگجو قاتلانہ اور ظالمانہ ارادے نظر آرہے تھے۔ لوگوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف اطمینان اور پسندیدگی سے دیکھا۔ سروں کو جنبش دی اور پھر بڑے انہماک اور دلچسپی سے مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے آگے جھک گئے۔

چارلس ایورمونڈ عرف چارلس ڈارنے کل رہا کر دیا گیا تھا۔ کل ہی دوبارہ الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ وارنٹ گزشتہ رات اس کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ ری پبلک کا مشتبہ دشمن جسے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ امیر نسل کا آدمی ظالموں کے خاندان کا ایک رکن — ملعون طبقہ کا ایک فرد۔ کیونکہ ان لوگوں نے اپنی سابقہ مراعات عوام کو بے شرمی سے کچلنے میں استعمال کیں۔ ایورمونڈ جو چارلس ڈارنے کہلاتا ہے ان قوانین کی روشنی میں قطعی مرچکا تھا۔

سرکاری وکیل نے کچھ اس معنی کے مختصر سے جملوں میں تشریح کی۔

کیا مظلوم کھلے بندوں الزام لگایا گیا ہے یا خفیہ مخبری کی گئی ہے۔

صدر نے دریافت کیا۔

"صدر اعلیٰ کھلے بندوں الزام لگایا گیا ہے"

"کس نے الزام لگایا ہے؟"

"اس کے خلاف تین اشخاص کی آوازیں ہیں ایک تو آدلسٹ ڈیفارج، — سینٹ انٹائن کا شراب فروش"

"بہت خوب"

"دوسری تھیریسی ڈیفارج — اس کی بیوی"

"بہت خوب"

"اور الیگزنڈر مینٹ — ڈاکٹر"

عدالت میں ایک شور بلند ہوا۔ اس شور کے درمیان ڈاکٹر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"معزز صدر میں احتجاج کرتا ہوں۔ یہ دھوکا اور فریب ہے۔ آپ جانتے ہیں ملزم میری بیٹی کا شوہر ہے۔ میری بیٹی اور وہ لوگ جو اسے عزیز ہیں مجھے اپنی جان سے زیادہ پیارے ہیں۔ وہ کون شخص ہے اور کہاں ہے جو کہتا ہے میں اپنی بیٹی کے شوہر کو ملزم قرار دیتا ہوں"

ڈاکٹر مینٹ — آپ پے سے باہر مت ہو جائیے۔ عدالت کی حکم عدولی اور نافرمانی کرنے سے آپ خود قانون کی زد میں آجائیں گے۔ نیز یہ کہ آپ کو

جان سے کیا کچھ زیادہ عزیز ہے تو ایک اچھے شہری کو ری پبلک سے پیاری کوئی چیز نہ ہونا چاہیئے۔"

اس سرزنش پر تحسین و آفریں کا شور بلند ہوا۔ صدر نے اپنی گھنٹی بجائی اور نہایت جوش سے کہا۔ اگر ری پبلک آپ سے آپ کی بیٹی کی قربانی مانگے تو آپ کا یہ فرض ہوگا کہ اسے قربان کر دیں۔ خاموشی سے بیٹھ کر کارروائی سنیئے۔"

پھر لوگوں نے بے قرار ہو کر شور مچایا۔ ڈاکٹر مینٹ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ چاروں طرف نظر ڈال کر بیٹھ گئے۔ ان کی بیٹی ان کے قریب آگئی۔ اعصابی مرض میں گرفتار شخص نے دونوں ہاتھ ملے اور پھر ایک ہاتھ سے ہونٹ ملنے لگا۔

جب عدالت میں خاموشی چھا گئی تو ڈی فارج کو پیش کیا گیا۔ اس نے مختصر طور پر ڈاکٹر مینٹ کی کہانی اور ان کا قید ہونا بیان کیا۔ وہ اس وقت لڑکا ہی تھا اور ڈاکٹر کے یہاں نوکر تھا۔ اس کے بعد رہائی اور رہائی کے بعد جب وہ اسکے سپرد کیا گیا اس وقت جو قیدی کی حالت تھی اس کی تفصیل بتائی۔ عدالت کا کام بڑی پھرتی سے ہوتا تھا۔ مختصر سی جرح ہوئی۔

سٹیزن۔ جب بیسٹیل کا قید خانہ قبضہ میں آیا۔ تو تم نے قابل قدر خدمات انجام دیں؟"

"جی ہاں؟"

اتنے میں ایک پرجوش عورت مجمع میں سے چیخی "تم سب اچھے قوم پرستوں

میں سے تھے ۔ کہتے کیوں نہیں ۔ اس روز تم توپچی تھے اور اس منحوس قلعہ میں فتح کے وقت جو سب سے پہلے داخل ہوئے ان میں تم موجود تھے ۔ اسے قوم پرستو میں حقیقت بیان کر رہی ہوں ۔!"

یہ وکجنس تھی جو حاضرین کی پر جوش تحسین وآفرین کے درمیان مقدمہ کی کارروائی میں مدد دے رہی تھی ۔ صدر نے اپنی گھنٹی بجائی ۔ مگر وکجنس کو حاضرین کی شہ جو ملی تو وہ برابر چیختی رہی ۔

"مجھے اس گھنٹی کی رتی بھر پرواہ نہیں ۔" اس پر بھی لوگوں نے اسے شاباشی دی ۔

"شہر کی عدالت کو بتاؤ ۔ اس دن بیسٹیل کے اندر کیا کچھ کیا ۔"

"میں جانتا تھا ۔" اس نے گواہ کے بلند چبوترے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھکر کہنا شروع کیا ۔ وہ نیچے کھڑکی سے برابر گھورے جا رہی تھی " میں جانتا تھا کہ جن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک سو پانچ شمالی برج میں قید تھے ۔ انھوں نے مجھے خود یہ بتایا تھا ۔ وہ خود اپنے آپ کو سوائے ایک سو پانچ شمالی برج کے کسی اور نام سے نہیں پہچانتے تھے ۔ وہ اس زمانے میں میرے یہاں جوتے بنایا کرتے تھے ۔ جب وہ میرے یہاں تھے اور جوتے بنایا کرتے تھے ۔ اس دن جب میں نے اپنی بندوق سنبھالی تو میں نے ارادہ کیا کہ جب قلعہ فتح ہو جائے گا تو میں اس کال کوٹھری کو دیکھوں گا ۔ قلعہ فتح ہو جاتا ہے تو جیلر کی رہنمائی سے میں کال کوٹھری تک چڑھ کر جاتا ہوں میرے

ساتھ ایک دوسرا شہری بھی تھا۔ جو اس وقت جیوری کا رکن بنا بیٹھا ہے۔ میں بڑی جاں فشانی سے اس کوٹھری کی تلاشی لیتا ہوں۔ چمنی کے سوراخ میں جہاں دیوار کھود کر ایک جگہ بنائی گئی تھی مجھے ایک خط ملتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر مینٹ کی تحریر دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ یہ خط جو ڈاکٹر مینٹ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے میں صدر کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

"اس خط کو پڑھا جائے۔"

خاموش موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ملزم جس پر مقدمہ چلایا جارہا تھا پیار بھری نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر پریشان ہو کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر مینٹ کی آنکھیں خط پڑھنے والے پر جمی تھیں۔ میڈم ڈیفارج مسلسل ملزم کو گھور رہی تھی۔ ڈیفارج اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ اور باقی لوگوں کی نگاہیں ڈاکٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ جو کسی کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

خط پڑھا گیا ـــ اس میں لکھا تھا ـــ:-

دسواں باب

سائے کی اصل بنیاد

" میں یعنی الکزنڈر مینٹ۔ بودے کا باشندہ جو بعد میں پیرس میں مقیم ہو گیا تھا ۔۔۔ وہ بد نصیب ڈاکٹر ۔۔۔ ۱۷۶۷ء کے آخری مہینے کے دوران میں اپنی کال کوٹھڑی میں بیٹھا اپنی دکھ بھری کہانی سپرد قلم کر رہا ہوں۔ میں چوری چھپے یہ الفاظ رقم کر رہا ہوں۔ میرے دکھوں کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد میں یہ کاغذ آتش دان کی دیوار میں چھپا دوں گا۔ جہاں میں نے بڑی محنت سے ایک جگہ کھود کر بنالی ہے۔ اور جب میں اور میرے دکھ درد مٹی میں مل جائیں تو شاید یہ کاغذ کسی رحم دل انسان کے ہاتھ پڑ جائے۔

" یہ الفاظ میں ایک نوکدار لوہے کے ٹکڑے کی مدد سے تحریر کر رہا ہوں۔ آتشدان کی چمنی سے کالک اور کوئلے کرا سے میں نے اپنے خون میں مل کے روشنائی تیار کی ہے۔ آج مجھے قید ہوئے دس سال گذر گئے۔ امید میرے دل سے یکسر غائب ہو چکی ہے۔ کئی بار مجھ پر خود فراموشی کے ایسے دورے پڑ چکے ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے ہوش و حواس زیادہ عرصے تک سلامت نہیں رہیں گے۔ مگر میں بھے

وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تحریر کو سپرد قلم کرتے وقت میرے ہوش حواس قطعی صحیح اور سالم ہیں۔ میری یادداشت بالکل تازہ اور واضح ہے۔ اور خواہ کوئی انسان اس تحریر کو پڑھ سکے یا نہ پڑھ سکے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر لکھ رہا ہوں۔ اور مجھے حشر کے دن خدا کو جوابدہ ہونا ہے۔

" برسات کی ایک چاندنی رات تھی۔ دسمبر کا تیسرا ہفتہ تھا۔ (میرا خیال ہے مہینے کی بائیسویں تاریخ تھی) یہ ۱۷۵۷ء کا واقعہ ہے۔ میں دریائے سین کے ایک سنسان کنارے کہر آلود تر و تازہ ہوا کی خاطر چہل قدمی میں مصروف تھا۔

" میں میڈیکل اسکول کے علاقے میں رہتا تھا اور یہ جگہ وہاں سے کوئی گھنٹہ بھر کے فاصلے پر تھی۔ یکایک ایک تیز رفتار گاڑی پیچھے سے آئی۔ میں ایک طرف کو ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں گاڑی سے کچلا نہ جاؤں۔ کسی نے گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر کوچوان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ کوچوان نے گھوڑوں کو قابو میں کر کے گاڑی روکی۔ اس شخص نے میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ گاڑی کچھ آگے جا کر رکی تھی۔ اس لئے جب تک میں گاڑی کے پاس پہونچوں گاڑی کا دروازہ کھول کر دو شریف آدمی گاڑی سے اتر پڑے۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کے لئے لبادوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دونوں جب ساتھ ساتھ کھڑے تھے تو بات چیت اور چال ڈھال سے میرے ہم عمر یا مجھ سے کچھ چھوٹے ہوں گے۔ جتنا میں دیکھ سکا۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک

دوسرے سے حد درجہ مشابہ ہیں۔

" کیا آپ ہی ڈاکٹر مینٹ ہیں۔ " ایک نے کہا۔

" ہاں ـــ ہوں تو ! "

" وہی ڈاکٹر مینٹ جو پہلے بووے میں رہتے تھے۔ نوجوان ڈاکٹر۔ جو پہلے بڑے ماہر سرجن تھے۔ دو سال ہوئے پیرس میں آکر بڑا نام پیدا کر لیا ہے " دوسرے نے پوچھا۔

" حضرات۔ میں وہی ڈاکٹر مینٹ ہوں جس کے بارے میں ابھی آپ نے عزت افزائی کے الفاظ کہے " میں نے کہا۔

" ہم آپ کے گھر ہو کر آ رہے ہیں " پہلے نے کہا " بدقسمتی سے وہاں ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم ہوا کہ چہل قدمی کی غرض سے آپ اس طرف گئے ہیں اسی امید میں کہ ہم یہاں آپ کو جا لیں گے۔ ہم پیچھے پیچھے چلے آئے کیا مہربانی کر کے آپ گاڑی میں سوار ہونے کی تکلیف کریں گے "

" دونوں کا انداز نہایت تحکمانہ تھا۔ یہ الفاظ کہہ کر دونوں آگے بڑھے اور مجھے اپنے اور گاڑی کے دروازے کے درمیان گھیر لیا۔ وہ مسلح تھے۔ میں نہتا تھا۔

" حضرات " ۔ میں نے کہا " معاف کیجئے گا۔ جن لوگوں کو میری ضرورت ہوتی ہے پہلے میں ان سے یہ پوچھ لیا کرتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں جو مجھ سے مدد لیکر

میری عزت افزائی کر رہے ہیں نیز مرض کس قسم کا ہے جس کے لئے مجھے بلایا جا رہا ہے۔
اس کا جواب دوسرے نمبر پر بولنے والے نے دیا۔ "ڈاکٹر آپ کو بلانے والے معزز لوگ ہیں۔ مرض کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ ہمیں آپ کی ہوشیاری اور مہارت پر اتنا بھروسہ ہے کہ ہمارے خیال میں مریض کا حال بتلانے سے بہتر ہے آپ خود چل کر معائنہ کرلیں۔ اچھا بس اب بحث کا موقع نہیں مہربانی کرکے گاڑی میں سوار ہوجائیے۔"
سوائے ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے اور میرے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ خاموشی سے میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں میرے بعد گاڑی میں داخل ہوئے۔ پچھلے شخص نے گاڑی کی سیڑھی اوپر اٹھالی اور کود کر اندر آگیا۔ گاڑی مڑ کر پھر اسی تیز رفتار سے روانہ ہوگئی۔ میں نے وہ گفتگو اسی طرح لکھنے کی کوشش کی ہے جس طرح اس وقت ہوئی تھی۔ میں ہر بات کو بالکل بغیر کم و کاست ویسا ہی بیان کرنے کی سعی کر رہا ہوں جیسے وہ پیش آئی تھیں۔ جس مقام پر میں ایسے ٹوٹے پھوٹے نشان لگا دیتا ہوں جیسے کہ اس کاغذ پر یہاں میں نے لگائے ہیں وہاں میں موقتی طور پر لکھنا بند کر دیتا ہوں اور اپنا خط اسی مقررہ جگہ چھپا دیتا ہوں۔

★ ★ ★

گلیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی شمالی چوکی سے گذر کر گاڑی دھات کی سڑک پر پہونچ گئی۔ اس وقت میں نے فاصلہ کے بارے میں غور نہیں کیا۔ مگر

واپسی کے وقت میں نے اندازہ کیا کہ چوکی سے دو تہائی کوس چل کر شارع عام سے گذر کر ایک سنسان سے مکان کے سامنے رُک گئی۔ ہم تینوں اتر کر چلے اور ایک نم آلود پگڈنڈی پر سے ہوتے ہوئے باغ میں گذرے جہاں لاپروائی کی وجہ سے چشمے کا پانی اُبل کر گھر کے دروازے کے سامنے تک پھیل گیا تھا۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ فوراً نہیں کھلا۔ اور جب نوکر نے دروازہ کھولا تو میرے ساتھ جو آدمی تھے ان میں سے ایک نے اپنے دستانے اس کے منہ پر دے مارے۔

"اس منظر کو دیکھ کر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ عام غریبوں کو کتوں سے بڑھ کر مار پڑتی ہے۔ مگر جب دوسرے نے بھی بالکل اسی طرح اس انداز میں غصہ ہو کر اسے مارا تو ایک دم مجھے خیال ہوا کہ دونوں کی چال ڈھال ایک ہی جیسی ہے۔ اور یقیناً وہ توام بھائی ہوں گے۔

"جونہی ہم دروازے کے قریب اُترے تھے جہاں تالا لگا ہوا تھا جسے دونوں بھائیوں میں سے ایک نے کھول دیا تھا۔ ہمارے کانوں میں کسی کی چیخوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ آوازیں اوپر کی منزل سے آرہی تھیں فوراً مجھے وہاں لے جایا گیا۔ جب ہم سیڑھیوں پر چڑھنے لگے تو چیخیں اور بھی بڑھتی گئیں میں نے دیکھا کہ ایک مریضہ دماغی بخار میں مبتلا ایک پلنگ پر دراز ہے۔

"وہ ایک نہایت حسین وجمیل نوجوان عورت تھی بیس برس سے زیادہ اس کی عمر کسی طرح نہیں تھی۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھ اس کے پہلو میں

رومالوں اور کمربندوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جن چیزوں سے اسے جکڑا گیا تھا وہ مردانہ لباس کے مختلف حصے تھے ان میں سے ایک جھالر لگے ہوئے کپڑے کو میں نے پہچان لیا کہ وہ درباری لباس ہے۔ اور اس پر کسی رئیس کا خاندانی نشان اور حرف ای کڑھا ہوا ہے۔

مریضہ کو دیکھتے ہی چند منٹوں میں میں نے ان تمام باتوں کا اندازہ لگا لیا۔ کیونکہ بے قراری سے تڑپ کر وہ اوندھی ہوگئی تھی۔ اور منہ میں رومال کا کونا ٹھونس لیا تھا۔ جس سے اس کا دم گھٹ جانے کا ڈر تھا۔ پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کا دم گھٹنے سے بچایا۔ اور رومال ہٹاتے وقت میں نے کونے پر کڑھے ہوئے نشان کو دیکھ لیا۔

میں نے اسے سیدھا کیا۔ اسے آرام سے چت لٹانے کے لئے میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا اور غور سے اس کے چہرے کا معائنہ کیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں وحشت جھلک رہی تھی اور وہ متواتر فلک شگاف چیخیں مارے جارہی تھی اور بار بار یہی الفاظ دہراتی تھی۔ "میرا شوہر ـــ میرا باپ میرا بھائی!" ـــ پھر اس نے بارہ تک گنتی گنی۔ اور کہا "شش"! بس ایک لمحہ کے لئے وہ کچھ سننے کی غرض سے رکی۔ اور پھر کانوں کے پردے پھاڑنے والی چیخیں شروع ہوگئیں۔ پھر اس نے وہی جملہ دہرایا ـــ میرا شوہر ـــ میرا باپ اور میرا بھائی ـــ بارہ تک گنتی گنی پھر کہا "شش"! مسلسل بالکل ایک ہی انداز میں بغیر رکے وہ اسی طرح

پیچھے جا رہی تھی۔

" یہ حالت کتنی دیر سے ہے "، میں نے دریافت کیا۔

" دونوں بھائیوں کی تفریق کے لئے میں انھیں چھوٹا اور بڑا کہوں گا۔ بڑے سے میرا مطلب ہے وہ جو سب سے زیادہ حکم چلا رہا تھا۔ بڑے نے ہی جواب دیا۔" کل رات تقریباً اسی وقت سے "

" کیا اس کا شوہر باپ اور بھائی ہے "

" ایک بھائی ہے "

" مجھے اس کے بھائی سے گفتگو کا شرف تو نہیں حاصل ہے "

" نہیں اس نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔

" کیا بارہ کی تعداد سے اسے حال ہی میں کچھ واسطہ پڑا ہے "

" ہاں بارہ بجے کا خیال اس کے دماغ میں بھر گیا ہے "؛ چھوٹے بھائی نے کچھ چڑ کر بے دلی سے کہا۔

" دیکھئے حضرات ـــــ آپ جس حالت میں مجھے لے آئے ہیں، میں قطعی مجبور اور بیکار ہوں۔ اگر وہاں مجھے مریضہ کا کچھ حال معلوم ہو جاتا تو میں کچھ دوائیں لے کر آتا۔ مگر اب تو بہت وقت برباد ہوگا۔ یہاں اس سنسان جگہ میں بھلا دوائیں کہاں ملیں گی "

" بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف دیکھا جو نہایت غرور اور گستاخی

سے بولا: دواؤں کا ایک بکس تو موجود ہے " اور الماری سے بکس نکال کر میز پر رکھ دیا۔

★ ★ ★

میں نے چند بوتلوں کو کھول کر سونگھا اور چکھا۔ اگر میں ان دواؤں کے علاوہ کوئی اور دوا دینا چاہتا، کوئی دوا بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سب دوائیں نشہ آور تھیں۔ جو بذات خود زہر ہوتی ہیں۔

"دیکھئے جناب یہ دوائیں دینا تو مجھے ہیں " میں نے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے بار بار کوشش کر کے بڑی مشکل سے خوراک مریضہ کے گلے میں اتاری۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد پھر وہی دوا دینا تھی۔ اور میں اس کا اثر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک بد حال سی عورت جو نیچے والے آدمی کی بیوی تھی خدمت کے لئے موجود تھی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

مکان نہایت بوسیدہ اور نم تھا۔ بے ترتیبی سے ساز و سامان بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا عارضی طور پر حال ہی میں رہائش اختیار کی گئی ہے۔ کچھ موٹے کپڑے کے پردے کھڑکیوں پر ٹھوک دیئے گئے تھے تاکہ چیخوں کی آواز دب جائے۔ مریضہ مسلسل چیخیں مارے جا رہی تھی۔ اور بار بار وہی الفاظ دہراتی تھی۔ "میرا شوہر — میرا باپ اور میرا بھائی " اور پھر بارہ تک کی گنتی اور "شش "! وحشت اس قدر

شدید تھی کہ میں نے اس کے ہاتھ کھولے نہیں تھے۔ صرف تکلیف کم کرنے کے لئے ذرا درست کر دیئے تھے۔ تاکہ تکلیف نہ ہو۔ مریضہ کے کیس میں بس ایک بات امید افزا تھی کہ میں نے جو اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا تھا اس سے وہ چند منٹ سکون پا کر خاموش رہتی تھی۔ مگر چیخوں پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ بالکل گھڑی کی رفتار کی طرح تلی تلی برابر جاری تھیں۔

" شاید میرے ہاتھ رکھنے سے جو سکون مل رہا تھا (دو گھنٹے سے میں اسی طرح مریضہ کے قریب بیٹھا تھا اور دونوں بھائی غور سے دیکھ رہے تھے) کہ اتنے میں بڑے بھائی نے کہا۔

" 'ایک مریض اور بھی ہے'

" میں چونک پڑا اور پوچھا 'کیا وہ بھی نازک حالت میں ہے'

" 'بہتر ہے آپ خود چل کر دیکھ لیں' اس نے لاپروائی سے جواب دیا اور روشنی اٹھا کر راستہ دکھانے لگا۔

★ ★ ★

" دوسرے زینے سے گذر کر پچھلے کمرے میں دوسرا مریض اصطبل کے ایک قسم کے مچان پر پڑا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں نیچی سی پلاسٹر کی چھت تھی باقی کھلا ہوا تھا۔ آگے کھپریل کی کھلی چھت کا کنارہ تھا اور اوپر کڑیاں پڑی تھیں اس حصہ میں گھاس اور پھوس بھرے ہوئے تھے۔ کچھ جلانے کی لکڑیاں پڑی تھیں

اور ریت میں سیبوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ اس حصہ سے گذر کر مجھے مریض والے حصہ کی طرف جانا پڑا۔ میری یادداشت محدود مگر بہت واضح ہے میں ان تفصیلوں کی مدد سے بیسٹل کی اس کال کوٹھری میں جہاں مجھے قید ہوئے دس برس ہونے کو آئے آج بھی تخیل کی مدد سے ہر چیز اتنی ہی واضح دیکھ رہا ہوں جیسے میں نے اس رات دیکھی تھیں۔

" تھوڑی سی گھاس پر ایک حسین کسان لڑکا پڑا تھا۔ اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ رکھا تھا اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سترہ سال کی ہوگی۔ وہ چت پڑا تھا اور اس کی دانت بھنچی ہوئی تھی۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بھنچی ہوئی سینے پر رکھی تھی اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے دو زانو ہوا تو مجھے اس کا زخم تو نہیں دکھائی دیا مگر اتنا معلوم ہوگیا کہ وہ کسی نکیلے ہتھیار کا زخم کھا کر مر رہا تھا۔

" میں ڈاکٹر ہوں غریب بچے مجھے معائنہ کرنے دو" میں نے کہا۔

" میں معائنہ نہیں کروانا چاہتا" اس نے کہا " رہنے دو۔"

" زخم اس کے ہاتھ کے نیچے تھا۔ میں نے بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹانے پر رضامند کرلیا۔ زخم تلوار کے بھونکنے سے لگا تھا اور بیس یا چوبیس گھنٹے پہلے لگا تھا۔ اگر فوراً ہی اسے طبی امداد مل جاتی تب بھی اس کی جان نہیں بچ سکتی تھی۔ بڑی تیزی سے اس کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا

وہ حسین لڑکے کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ قطعی کوئی اس ہی جیسا انسان نہیں بلکہ کوئی زخمی پرندہ خرگوش یا چوہا ہے۔

" یہ زخم کیسے لگا جناب"، میں نے کہا۔

" پنچ پاگل کتا ہے۔ کم بخت۔ کسان ہے ۔ میرے بھائی کو تلوار کھینچنے پر مجبور کیا اس نے۔ اور میرے بھائی کے وار سے زخمی ہوا۔ ایک شریف مرد کی طرح میرے بھائی نے اسے مار گرایا"۔

" اس کے لہجہ میں رحم افسوس یا انسانی ہمدردی کا شائبہ بھی نہ تھا اس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس مختلف قسم کے جانور کے یوں بے موقعہ محل مرنے سے کوفت ہو رہی تھی۔ اسے دستور کے مطابق اپنے کرم خوردہ ماحول میں اپنے درجہ کے لوگوں کی طرح گمنامی کی موت مرنا چاہئے تھا تب کوئی قباحت نہ تھی۔ اس میں غریب لڑکے پر کسی قسم کا رحم کھانے یا اس کی بدنصیبی کو محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ جب وہ بول رہا تھا تو لڑکے نے آہستہ سے آنکھیں اس کی طرف گھمائیں پھر آہستہ سے میری طرف نظریں پھیر دیں۔

" ڈاکٹر یہ لوگ بڑے مغرور ہیں — یہ امیر لوگ — مگر ہم سڑک کے کتے بھی غیرت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ہماری خودداری بھی جاگ اٹھتی ہے۔ یہ ہمیں لوٹتے ہیں، تباہ کرتے ہیں، ہمارے جھونپڑوں پر ہنٹر برساتے ہیں اور ہمیں جان سے مار ڈالتے ہیں۔ مگر تھوڑی سی حمیّت باقی رہ گئی ہے۔ وہ — کیا آپ نے

اسے دیکھا ڈاکٹر؟"

"چیخوں اور آہوں کی آواز گو کچھ دب گئی تھی پھر بھی وہاں صاف پہونچ رہی تھی۔ اس کا مطلب ان چیخوں ہی سے تھا ـــــ جیسے وہ ہمارے سامنے ہی پڑی ہوئی ہو۔

"میں نے کہا: ہاں میں نے اسے دیکھا ہے۔"

"ڈاکٹر وہ میری بہن ہے۔ ان شرفا کے بے حیائی کے حقوق ہیں انھیں ہماری ماں بہنوں کی عزت لوٹنے کا برسوں سے حق ملا ہوا ہے۔ یہ عرصے سے یونہی منھ کالے کرتے آئے ہیں۔ مگر اب بھی ہم میں پارسا لڑکیاں موجود ہیں۔ میں جانتا ہوں اور میں نے اپنے باپ کو کہتے سنا ہے وہ ایک نیک اور پارسا لڑکی تھی ایک نیک سیرت نوجوان سے اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ وہ اس کا اسامی تھا۔ ہم سب ہی اس کے اسامی تھے۔ اس شخص کے جو سامنے کھڑا ہے۔ یہ دوسرا اس کا بھائی ہے گندی نسل کا بدترین نمونہ!"

"بڑی سخت کوشش سے سارے جسم کی طاقت صرف کرکے لڑکے نے اتنی بات کہی۔ مگر ان الفاظ میں اس کی روح بول رہی تھی۔ اس شدت میں بھیانک پن تھا۔

"یہ آدمی جو سامنے کھڑا ہے اس نے ہمیں اس بری طرح لوٹا ہے۔ ہماری نسل کے سب ہی حقیر کتوں کو جسے یہ اپنے آپ کو برتر انسان سمجھتا ہے اس نے

بے رحمی سے لگان وصول کیا ہے۔ بغیر معاوضہ کے بیگار بھگتنے پر ہم لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے۔ زبردستی ہمیں اس کی پن چکی پر اناج پسوانا پڑتا ہے ان کے پالتو پرندوں کو لپنے اجڑے ہوئے کھیتوں سے اناج کھلانا پڑتا ہے۔ ہم خود کوئی پرندہ یا جانور نہیں پال سکتے۔ ہمیں اتنا لوٹا کھسوٹا جاتا ہے کہ اگر کبھی ہمیں ذرا سا گوشت کا ٹکڑا نصیب ہو جاتا ہے تو ہم ڈر ڈر کر کھاتے ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کھاتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ ہمارے منھ سے نوالہ نہ چھین لے جائیں۔ ہم اتنے لوٹے گئے اور برباد کئے گئے اور اتنے مفلس اور کنگال ہوئے کہ ہمارے باپ نے کہا کسی بچے کو دنیا میں جنم دینا بھی گناہ عظیم ہے۔ اور ہمیں سب سے زیادہ اس بات کی دعا مانگنا چاہیے کہ ہماری عورتیں بانجھ ہو جائیں اور ہماری بدقسمت نسل دنیا سے مٹ جائے"

" میں نے کبھی کچلے جانے کے خلاف احساس بغاوت کو اس شدت سے آگ کی طرح بھڑکتے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا تو مجھے خیال تھا کہ یہ احساس لوگوں کے دلوں میں دبا دیا یا موجود ضرور ہے مگر میں نے یوں اسے بند توڑ کر بھڑکتے ہوئے صرف اس دم توڑتے ہوئے لڑکے میں دیکھا تھا۔

" پھر بھی ڈاکٹر میری بہن نے شادی کرلی وہ اس وقت علیل تھا اور اس نے اپنے محبوب سے اس لئے شادی کرلی کہ وہ اسے اپنی جھونپڑی میں لے آئے اور اسے آرام اور سکون پہونچا سکے۔ ہماری حقیر جھونپڑی جسے یہ شخص

کتے کے رہنے کا ڈربہ کہے گا۔ اس کی شادی کو چند ہفتے ہی گذرے تھے کہ اس شخص کے بھائی نے اسے دیکھا اور ریجھ گیا۔ اور اس کے شوہر سے کہا اسے کچھ عرصہ کے لئے عاریتاً دیدے۔ ہم لوگوں میں شوہر کی حقیقت ہی کیا ہے وہ تو تیار تھا مگر بہن باعصمت اور نیک تھی۔ اور اس شخص کے بھائی سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی جتنی میں کرتا ہوں جانتے ہیں پھر ان دونوں نے کیا کیا۔ ان دونوں نے اسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ دباؤ ڈالکر اپنی بیوی کو راضی کرے!"

لڑکے کی آنکھیں پہلے میرے اوپر جمی ہوئی تھیں آہستہ سے اس نے نظریں گھماکر جب ان دونوں حاضرین کی طرف دیکھا اور پھر میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ جو کچھ اس نے کہا سب سچ تھا۔ دو مختلف قسم کی خودداری کا موازنہ میں نے یہاں بیسٹل کے جیل خانہ میں بھی کیا ہے اور ان کی ٹکر دیکھی ہے۔ شرفاء تو نہایت غور سے ہر بات کو بے توجہی اور لاپروائی سے ٹالنا چاہتے تھے کچلے اور پسے ہوئے کسان جوش میں آکر انتقام کے منصوبے باندھتے ہیں۔

"جانتے ہیں ڈاکٹر۔ ان لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم عام کتوں کو گاڑیوں میں جوت کر ہنکائیں۔ انھوں نے اسے اسی طرح جوت کرا سے ہنکایا آپ جانتے ہیں کہ ان لوگوں کو حق حاصل ہے کہ ساری رات ہم کو پکڑ کر ہم سے پہرہ دلوائیں اور مینڈکوں کی ٹرٹر بند کرانے پر مامور کردیں تاکہ خود ان کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ انھوں نے مضر صحت کہرے میں اسے رات بھر رکھا پھر صبح گاڑی میں جوت دیا۔

مگر وہ پھر بھی تیار نہ ہوا۔ ایک روز سہ پہر کو جب تھوڑا بہت کھانا کھانے کے لئے اگر وہ کہیں سے حاصل کر سکے اسے کھولا گیا تو اس نے گھنٹے کی ہر چوٹ پر ایک سسکی لی۔ اور پوری بارہ سسکیوں کے بعد اپنی بیوی کی آغوش میں دم توڑ دیا۔

جو مظالم اس پر ڈھائے گئے تھے ان کا حال بتانے کی لگن کے سوا کوئی ایسی انسانی طاقت نہ تھی جس کے بل پر وہ زخمی لڑکا ابھی تک زندہ تھا اس نے موت کے حملہ اور تاریک سایوں کو دور جھٹک دیا۔ وہ زور سے مٹھی بھینچے اپنے زخم کو دبائے ہوئے تھا۔

ملنے بھائی کی اجازت بلکہ اس کی مدد سے یہ اسے پکڑ کر لے گیا۔ اس کے باوجود کہ اس نے اپنی نازک حالت کا اس کے بھائی سے ذکر کر دیا تھا۔ اس کی حالت کیوں نازک تھی۔ یہ بات بھی زیادہ دیر تک آپ سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ اس پر بھی اس کا بھائی اپنی وقتی عیاشی اور دل کے بہلاوے کے لئے اسے پکڑ کر لے گیا۔ سڑک پر میں نے اسے اپنے قریب سے گذرتے دیکھا۔ جب میں نے گھر پہونچ کر یہ خبر سنائی تو میرے باپ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ اس نے اپنے سینے میں بھرے ہوئے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ میری ایک دوسری بہن بھی ہے۔ میں اسے ایسی جگہ پہونچا آیا۔ جہاں اس شخص کا عمل دخل نہیں ہے اور جہاں کم از کم وہ اس کی لونڈی بننے سے بچ جائے گی۔ پھر میں نے اس کے بھائی کا پتہ چلایا۔ اور یہاں پہونچ گیا۔ اور کل رات مجھ جیسا ذلیل کتا ہاتھ میں تلوار لے کر چڑھ آیا۔ جان کی

کھڑکی کدھر ہے ۔۔۔ وہ یہیں کہیں تھی "

" اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ کشمکش ہوئی تھی۔ کیونکہ ادھر ادھر کی گھاس بے ترتیب اور روندی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

" اس نے میری آواز سنی اور بھاگ کر اندر آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ جب تک یہ مر نہ جائے وہ قریب نہ آئے وہ بھی اندر آیا۔ پہلے تو اس نے میری طرف کچھ روپے پھینکے پھر مجھے ہنٹر سے مارا۔ مگر میں نے بھی حالانکہ ایک حقیر کتا ہوں ایسا منھ توڑ جواب دیا کہ اسے تلوار کھینچنا پڑی۔ جو میرے خون میں ڈوبی ہے اپنی جان بچانے کے لئے اس نے اپنی مہارت سے فائدہ اٹھایا اور تلوار میرے سینے میں اتار دی "

" تھوڑی دیر پہلے میری نظر ایک ٹوٹی ہوئی تلوار پر پڑی تھی۔ جس کے ٹکڑے گھاس میں پڑے تھے۔ یہ ایک رئیس آدمی کا ہتھیار تھا دوسرے کونے میں ایک پرانی تلوار تھی جو کسی سپاہی کی معلوم ہوتی تھی۔

" مجھے سہارا دے کر اٹھائیے۔ ڈاکٹر مجھے اٹھائیے۔ کہاں ہے وہ "

" وہ یہاں نہیں ہے "، میں نے اسے سہارا دیا۔ میں نے سوچا اس کا اشارہ اس کے بھائی کی طرف ہے۔

" وہ ۔۔۔ بڑا مغرور رئیس زادہ ہے۔ مگر مجھے دیکھنے کے ڈر سے دم نکلتا ہے اس کا کہاں ہے وہ شخص جو ابھی ابھی یہیں تھا۔ میرا رخ اس کی طرف

چھپ... ردبچے :

میں نے گھٹنے کے سہارے سے اس کا سر اونچا کر کے رخ ادھر پھیر دیا۔ یکایک اس میں غیب سے حیرت انگیز طاقت پیدا ہو گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ میں اسے سہارا نہ دے پاتا۔

"مارکوئیس" لڑکے نے کہا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور سیدھا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ایک دن آئے گا جب ہر بات کا جواب دینا ہوگا۔ میں تمہارے بھائی کو جو تمہاری نسل کا سب سے ذلیل فرد ہے للکارتا ہوں اور جواب طلب کرتا ہوں۔ شہادت کے لئے میں تمہارے اوپر خون آلود صلیب کھینچے دیتا ہوں تاکہ سند رہے۔"

دوبارہ اس نے اپنے سینے کے گھاؤ میں انگلیاں ڈبوئیں اور انگلی سے خلا میں صلیب کی شکل کھینچی۔ وہ انگلی اٹھائے ایک لمحہ کے لئے کھڑا رہا۔ پھر انگلی کے ساتھ ساتھ وہ بھی زمین پر گر پڑا اور میں نے اس کی لاش کو نیچے رکھ دیا۔

★ ★ ★

جب میں نوجوان عورت کے پاس واپس لوٹا تو وہ اسی طرح مسلسل ہذیان میں مبتلا تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ حالت نہ معلوم کتنی دیر قائم رہ سکتی تھی اور پھر خاموشی موت کی خاموشی ہی ہو گی۔

جو دوا میں نے پہلے دی تھی وہی پھر دی اور اس کے قریب بیٹھا رہا یہاں تک کہ کافی رات بیت گئی۔ اس کی چیخوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ نہ ہی

الفاظ کی ترتیب میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ برابر کہے جا رہی تھی: میرا شوہر — میرا باپ اور میرا بھائی — ایک — دو — تین — چار — پانچ — چھ — سات — آٹھ — نو — دس — گیارہ — بارہ — شش!"

"میرے آنے کے بعد سے مسلسل چھبیس گھنٹے تک یہی حالت رہی۔ میں دو بار آیا اور گیا اور پھر آکر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تب اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اس موقعہ پر جو کچھ بھی ممکن تھا کرنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ وہ اور غنودگی میں ڈوبتی گئی اور بے جان سی پڑی رہی۔

"اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے باد و باراں کے مہیب طوفان کے بعد آخر کار سناٹا چھا گیا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور مددگار عورت کو بلایا تاکہ اس کی مدد سے اس کا جسم اور پھٹے ہوئے کپڑے درست کر سکوں۔ اس وقت مجھے اس کی اصلی حالت کا پتہ چلا۔ اس کے جسم سے ماں بننے کے ابتدائی آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اور اس وقت جو مجھے موہوم سی امید اس کے جینے کی تھی وہ ختم ہو گئی۔

"کیا مر گئی؟" مارکوئیس نے پوچھا۔ میں اسے بڑا بھائی ہی کہوں گا وہ گھوڑے کی سواری کے لمبے جوتے پہنے ہوئے داخل ہوا۔

"مری تو نہیں بس دم توڑ رہی ہے!" میں نے کہا۔

"ان گنواروں کے جسم میں کس بلا کی طاقت ہوتی ہے!" اس نے بڑے تجسس سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

" غم اور ناامیدی میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے" میں نے جواب دیا۔
پہلے تو وہ میری بات پر ہنسا پھر ناک بھوں چڑھانے لگا۔ پھر اس نے میرے قریب ایک کرسی سرکائی۔ اس عورت کو باہر بھیجدیا اور دھیمی آواز میں کہا۔
" اپنے بھائی کو ان کمینوں کی چکر میں پھنسا دیکھ کر میں نے رائے دی کہ آپ کی خدمات حاصل کی جائیں۔ آپ کافی مشہور ہیں۔ آپ کو اپنے مستقبل کو سنوارنے سے کافی دلچسپی ہوگی۔ ابھی آپ کو دولت کمانی ہے۔ جو کچھ آپ یہاں دیکھ رہے ہیں یہ باتیں دیکھنے کی ہیں۔ نگران کے بارے میں منہ سے کچھ کہنا قطعی واجب نہیں"
" میں مریضہ کی سانس پر کان لگائے ہوئے تھا۔ میں نے جواب سے احتراز کیا۔
" آپ مجھے اپنی توجہ کا شرف بخش رہے ہیں ڈاکٹر"
" مارکوئیس صاحب ــــ میرے پیشے کے یہ اصول ہیں کہ مریضوں کے راز کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے" میں محتاط ہو کر جواب دے رہا تھا۔ کیونکہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔
" اب اس کی سانس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میں نے اس کی نبض اور دل کی طرف توجہ دی۔ جسم میں اب بھی جان تو تھی۔ باقی اور کچھ نہ تھا۔
" اپنی نشست پر بیٹھ کر جب میں نے مڑ کر دیکھا تو دونوں بھائی مجھے گھور رہے تھے!

★ ★ ★

" مجھے لکھنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ سردی اتنی شدید ہے میں ڈر رہا ہوں کہ اگر پکڑا گیا تو مجھے تہہ خانے کی بھیانک تاریکی میں قید تنہائی کی سزا دی جائے گی۔ اس لئے مجھے اپنی داستان کو مختصر کرنا چاہیئے۔ میری یادداشت میں نہ کوئی الجھن ہے نہ بھول چوک مجھے ساری تفصیل اور ایک ایک لفظ یاد ہے جو میرے اور ان دو بھائیوں کے درمیان کہا سنا گیا۔

" مریضہ ایک ہفتہ تک گھستی رہی۔ آخر وقت میں میں نے اس کے لبوں سے کان لگا کر سنا تو چند الفاظ میری سمجھ میں آئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا وہ کہاں ہے۔ میں نے اسے بتا دیا۔ پوچھا میں کون ہوں۔ یہ بھی میں نے اسے بتا دیا۔ میں نے اس کے خاندان کا نام بہت پوچھا مگر بے کار کیونکہ اس نے ہرگز نہیں بتایا۔ آہستہ سے اس نے تکیہ پر اپنا سر ہلایا اپنے راز کو اس لڑکے کی طرح سینے میں دفن رکھا۔

" مجھے اس وقت تک اس سے کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جب تک کہ میں نے بھائیوں کو یہ نہیں بتایا کہ اب وہ ایک دن بھی نہیں جی سکے گی اس وقت تک حالانکہ مریضہ کے علم میں صرف میں اور خادمہ ہی وہاں رہتے تھے مگر جب میں موجود ہوتا تو ان بھائیوں میں سے ایک ضرور پردے کے پیچھے کرسی ڈال کر اس کے سرہانے کی طرف چوکس بیٹھا رہتا تھا۔ مگر جب آخری وقت آیا تو انھیں کوئی پروا نہ تھی کہ میں اس سے کیا معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ گویا کہ ــــ میرے دل میں ایک دفعہ سوال ابھرا ــــ جیسے میں بھی مرنے والا تھا۔

" میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ چھوٹے بھائی نے جو ایک نیچ انسان اور وہ بھی ایک لونڈے سے نبرد آزمائی کی۔ اس سے ان کی خودداری کو کافی ٹھیس لگی تھی۔ صرف ایک بات ان کو اہم معلوم ہوتی تھی۔ جس سے وہ متاثر تھے کہ ان کی ہتک ہوگئی۔ اور نہایت مضحکہ خیز واقعہ رونما ہوگیا۔ جس سے خاندان کے وقار کو دھکہ پہونچا تھا۔ جب کبھی میں نے چھوٹے بھائی کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے مجھ سے انتہائی نفرت ہے۔ کیونکہ اس لڑکے نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بڑے بھائی کی بہ نسبت مجھ سے زیادہ خوش اخلاقی اور تپاک سے پیش آتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ بڑے بھائی کے دماغ میں میرا وجود روڑا بن کر اٹک گیا تھا۔

" میری مریضہ نے آدھی رات سے دو گھنٹے قبل ہی دم توڑ دیا۔ میری گھڑی سے ٹھیک وہی وقت تھا جس وقت میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت میں اس کے ساتھ اکیلا تھا۔ جب اس کا نوجوان سر ایک طرف کو آہستہ سے ڈھلک گیا اور دنیا کے سارے دکھوں اور غموں سے نجات مل گئی۔

" اس وقت دونوں بھائی نیچے کمرے میں سوار ہو کر روانہ ہونے کے لئے بے قرار بیٹھے تھے۔ میں بستر مرگ کے پاس اکیلا بیٹھا سن رہا تھا وہ بے چینی سے جھنجھلا کر اپنے جوتے پر ہنٹر مار رہے تھے۔ اور ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

" 'آخر ختم ہو ہی گئی' جب میں اندر گیا تو بڑے نے کہا۔

"ہاں وہ مر گئی" میں نے کہا۔

"مبارک ہو میرے بھائی" اس نے مڑکر کہا۔

اس سے پہلے بھی اس نے مجھے روپیہ دینے کی کوشش کی تھی جس کو میں نے ٹال دیا تھا۔ اب اس نے مجھے مہروں کا توڑا دیا۔ میں نے اسکے ہاتھ سے لے لیا۔ مگر میز پر رکھدیا۔ میں نے خوب غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ کچھ نہ لوں گا۔ میں نے کہا۔

"حالات کو دیکھتے ہوئے میں کچھ لینا مناسب نہیں خیال کرتا"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر جب میں نے انکے سامنے سر جھکایا تو جواب میں وہ بھی جھک گئے۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور خاموش رخصت ہو گئے۔

★ ★ ★

"میں تھک گیا ہوں — تھک گیا ہوں — تھک گیا ہوں۔ مصیبتوں نے مجھے کچل ڈالا ہے۔ جو کچھ میں نے ان سوکھے مارے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ میں پڑھ نہیں سکتا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اشرفیوں کا توڑا ایک بکس میں رکھ کر جس پر میرا نام لکھا تھا میرے گھر پہونچا دیا گیا۔ شروع ہی سے میں پریشان سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس دن میں نے خفیہ طور پر وزیر کو لکھنے کا فیصلہ کیا

تاکہ اس کیس کے متعلق انہیں مطلع کرسکوں جو میرے سپرد کیا گیا تھا اور اس مقام اور اس حالات کے بارے میں تفصیل بیان کرسکوں جہاں مجھے بلایا گیا تھا۔

" مجھے معلوم تھا کہ دربار میں امرا اور رؤسا کو رسوخ حاصل ہے اور ہر طرح کی مراعات ملی ہوئی ہیں اور میری تحریر پر کوئی توجہ نہیں دی جائے گی مگر میں اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے اپنے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس واقعہ کو مکمل راز میں رکھا تھا۔ اور اپنی بیوی تک کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ میرا ارادہ تھا اس بات کو بھی اپنی تحریر میں واضح کردوں گا۔ مجھے اصلی خطرے کے متعلق قطعی کوئی شبہ نہ تھا مگر اتنا مجھے خیال تھا کہ دوسروں کے لئے اگر وہ اس راز میں شریک ہوگئے تو خطرے کا امکان پیدا ہوجائے گا۔

" اس دن میں بہت مشغول رہا اس لئے اس رات اپنا خط مکمل نہ کرسکا۔ دوسرے دن مقررہ وقت سے پہلے اسے پورا کرنے کے لئے اٹھ بیٹھا وہ سال کا آخری دن تھا۔ خط مکمل کرنے کے بعد میرے سامنے پڑا تھا۔ اس وقت مجھے اطلاع ملی کہ ایک عورت مجھ سے ملاقات کی خواہشمند ہے۔

★ ★ ★

" دن بدن میری ہمت ٹوٹتی جارہی ہے اور وہ کام جس کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے دشوار نظر آرہا ہے۔ کتنا اندھیرا اور سردی ہے۔ میرے حواس منجمد ہوئے جارہے ہیں اور میری روح پر گہرا اندھیرا چھا رہا ہے۔

" وہ خاتون جو مجھ سے ملنے آئی تھی ۔ جوان اور حسین تھی۔ مگر چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ عمر طبیعی کو پہونچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ بے انتہا پریشان تھی ۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ مارکوئیس سینٹ ایورےمونڈ کی بیوی ہے ۔ لڑکے نے بڑے بھائی کو اسی نام سے مخاطب کیا تھا ۔ اور اسی نام کا پہلا لفظ رومال پر کڑھا ہوا تھا ۔ اندازے سے میں نے محسوس کیا کہ موصوف سے میں نے حال ہی میں ملاقات کی تھی ۔

" میری یادداشت قطعی صحیح و سالم ہے مگر میں بات چیت حرف بحرف نہیں لکھ سکتا ۔ مجھے شبہ ہوا کہ جتنا میرا خیال تھا اس سے کہیں زیادہ میرے اوپر نظر رکھی جا رہی ہے ۔خاتون نے کچھ اندازے سے اور کچھ حقیقت جان کر درد ناک کہانی کے اہم واقعات معلوم کر لئے تھے اور اپنے شوہر کی مدد اور شرکت کا حال بھی اسے معلوم ہو چکا تھا ۔ اسے لڑکی کی موت کا پتہ نہیں تھا ۔ اس کی خواہش تھی کہ چپکے سے اس سے ملکر ہمدردی کا اظہار کرے اور خدا کے قہر سے اس خاندان کو بچانے کی کوشش کرے ۔ جو عوام کی تباہی کا ذریعہ بن کر ان کی نفرت کا مرکز بن چکا تھا ۔ اسے پتہ تھا کہ ایک چھوٹی بہن بھی کہیں موجود تھی ۔ اس کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ کسی طرح اس بہن کی مدد کرے ۔ میں اسے اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا کہ واقعی ایک بہن تھی ۔ اس سے زیادہ مجھے خود کچھ معلوم نہ تھا ۔ وہ میرے پاس اس غرض سے آئی تھی کہ شاید میں اسے اس بہن کی جائے قیام کے متعلق کچھ خبر دے سکوں آج تک مجھے اس کے متعلق کوئی خبر نہیں ۔

★ ★ ★

" کاغذ کے ٹکڑے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ کل ایک ٹکڑا مجھ سے چھین لیا گیا۔ اور مجھے تنبیہہ کی گئی۔ آج مجھے اپنی داستان مکمل کر لینا چاہئے۔

" وہ ایک نیک اور رحمدل خاتون تھی۔ اپنی شادی سے خوش نہ تھی اور خوش ہو بھی کیسے سکتی تھی اس کے شوہر کا بھائی نہ اس پر بھروسہ کرتا تھا نہ اسے پسند کرتا تھا۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں اس کے مفاد کے خلاف تھیں۔ اس لئے وہ اس سے ڈرتی تھی۔ نیز اپنے شوہر سے بھی ڈرتی تھی۔ جب میں نے اسے گاڑی میں سوار کرایا تو اس میں ایک دو تین سال کا خوبصورت بچہ بھی بیٹھا تھا۔

" 'ڈاکٹر اس بچے کی خاطر میں ہر ممکن طریقے سے اس ظلم کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں'۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا 'ورنہ یہ اس ورثہ کو پا کر کبھی پھل پھول نہ سکے گا۔ میرا جی ڈر رہا ہے کہ اگر کوئی کفارہ ادا نہیں کیا گیا تو ایک دن اس کا صبر اس کی جان پر پڑے گا۔ میرے پاس سوائے چند زیورات کے اور کچھ نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ میں اسے مرتے وقت وصیت کر جاؤں گی کہ اسے اپنی بدنصیب ماں کا کچھ بھی خیال ہے تو اس بہن کو ڈھونڈ کر معذرت اور معافی کی درخواست کے ساتھ اسے مرنے والی کی طرف سے اس ستم زدہ خاندان کو دیدے'۔

" 'اس نے لڑکے کو پیار کیا اور اسے سینے سے لگا کر کہا 'یہ تیری ہی بھلائی کے لئے ہے پیارے چارلس۔ تو اپنا فرض پورا کرے گا' بچے نے دلیری سے

جواب دیا "ہاں"۔ میں نے خاتون کے ہاتھ کو بوسہ دیا اس نے بچے کو گود میں لے لیا۔ اور اسے کلیجے سے لگائے روانہ ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

چونکہ اس نے یہ سمجھ کر اپنے شوہر کا نام بتایا تھا کہ مجھے پہلے سے ہی معلوم ہے۔ میں نے اپنے خط میں اس کا اضافہ نہیں کیا۔ خط پر مہر لگا کر میں نے کسی پر اعتبار کرنے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے اسے پہونچا دیا۔

وہ رات سال کی آخری رات تھی۔ نو بجے کے قریب ایک آدمی کالا لباس پہنے آیا۔ اور میرے پھاٹک کی گھنٹی بجائی۔ اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میرے نو عمر نوکر ارنسٹ ڈیفارج کے پیچھے پیچھے اوپر چلا آیا۔ جب میرا نوکر اوپر آیا تو میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آہ میری پیاری جان سے عزیز بیوی — میری حسین انگریز بیوی — ہم نے اس آدمی کو دیکھا جسے پھاٹک کے پاس ہونا چاہئے تھا۔ وہ خاموش نوکر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

روسینٹ ہونور میں ایک بہت اہم کیس کا اس نے ذکر کیا اور کہا کہ مجھے زیادہ وقت نہیں صرف کرنا ہوگا۔ گاڑی وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

اور وہ گاڑی مجھے یہاں لے آئی۔ مجھے اپنی قبر میں لے آئی۔ جیسے ہی میں گھر سے باہر نکلا۔ میرے منہ پر ایک سیاہ رومال ڈال کر پیچھے باندھ دیا گیا اور میری مشکیں کس دی گئیں۔ دونوں بھائی سڑک کے ایک تاریک سایہ دار کونے سے نکلے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے مجھے شناخت کیا۔ مارکوئیس نے جیب سے وہ خط نکال کر

مجھے دکھایا جو میں نے لکھا تھا۔ لالٹین کے سامنے رکھ کر اسے جلایا اور اس کی راکھ پیروں سے مسل ڈالی۔ ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ مجھے یہاں لے آئے۔ مجھے اس زندہ قبر میں لے آئے۔ اگر خدا ان ظالم بھائیوں کے دل میں اتنا سا رحم ڈال دیتا تو وہ مجھے اس خوفناک اور طویل قید کے عرصے میں مجھے میری بیوی کی خیر خبر سے مطلع کر دیتے بس ایک لفظ کے ذریعہ مجھے اتنا ہی بتا دیتے کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ تو میں سمجھ لیتا کہ خدا نے ان بھائیوں کی طرف سے قطعی منہ نہیں موڑا۔ مگر اب مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ وہ سرخ صلیب کا نشان ان کے لئے اٹل فیصلہ دے چکا ہے اور خدا کی مہربانیاں ان کے نصیب میں نہیں۔

اور آج ۱۷۶۷ء کی آخری شب —— ناقابل برداشت اذیت سے مجبور ہو کر میں بدنصیب الیگزنڈر مینٹ اس خاندان اور اس کی آئندہ پیدا ہونے والی نسلوں پر خدا اور دنیا کے انصاف پسند انسانوں کے روبرو لعنت بھیجتا ہوں اور انہیں اس ظلم و ستم کا جو میرے اوپر ڈھائے گئے مجرم قرار دیتا ہوں"

جب خط پڑھا جا چکا تو ایک بھیانک شور بلند ہوا۔ اس شور میں کوئی پرمعنی الفاظ نہ تھے صرف خون میں ڈوبی شدید پیاس اور ہوس تھی۔ اس داستان کو سنکر لوگوں میں اس شدت سے جوش انتقام کی آگ بھڑک اٹھی کہ اس زمانے کی تاریخ میں اس میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس شور کی پکار کے آگے ملک کے بلند سے بلند سر کو بھی قلم ہو کر زمین پر گرنا پڑتا۔

جیوری عدالت کے حاکموں اور حاضرین کو دیکھنے کے بعد اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ کس طرح ڈیفارج اور میڈم ڈیفارج نے اس خط کو بسٹیل کے قید خانے میں حاصل کی ہوئی اشیار کی نمائش کے وقت دوسری یادگار چیزوں کے ساتھ جلوس میں پیش کرنے کے بجائے چھپا کر رکھ لیا تھا۔ اور موقع کے منتظر تھے۔ یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس خاندان کے نام سے سینٹ اینٹائن کے باسیوں کو کتنی شدید گھن آتی تھی اور اس کا نام اس خوفناک فہرست میں لکھا جاچکا تھا۔ پردہ زمین پر ایسا کوئی فرد نہیں تھا خواہ اس نے کتنی ہی خدمات اور ملک کے لئے قربانیاں کی ہوں۔ جو اس الزام سے بری ہوسکتا یا معاف کردیا جاتا۔ ملزم کی یہ اور بھی بڑی بدقسمتی تھی کہ مدعی ملک کا مشہور باشندہ تھا۔ اس کا اپنا عزیز دوست تھا اور اسکی بیوی کا باپ تھا۔

"سبقت لے جانے کی گھبراہٹ میں لوگ اس زمانۂ قدیم کے ایک مکروہ رواج کی نقل پر تل گئے تھے۔ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ عوام کے حضور میں اگر انسان کو اپنی ہستی بھی قربان کرنا پڑے تو یہ عین فرض شناسی ہوگی۔ اس لئے صدر نے یہی کہا ـــــ (اور جو وہ نہ کہتے تو خود ان کا سر کاندھوں پر باقی نہ رہتا) کہ ری پبلک کے قابل ڈاکٹر ایک گھناؤنے خاندان سے ملک کو پاک کرکے اور بھی ہردل عزیز ہو جائیں گے۔ اور یقیناً

اپنی بیٹی کو بیوہ اور نواسی کو یتیم بنا کر انھیں ایک روحانی قسم کی مسرت اور فخر محسوس ہوگا۔ یہ سُن کر لوگوں نے تحسین و آفریں کے نعرے لگائے خوب خوب قومی جوش پیدا ہوا مگر انسانی ہمدردی کا کہیں شائبہ بھی نظر نہ آیا۔

"ہونہہ۔ بڑا رسوخ ہے لوگوں میں ڈاکٹر کا۔ اب اسے بچاؤ، ڈاکٹر صاحب۔ اب بچالو تو جانیں!" میڈم ڈیفارج نے ونجنس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

جیوری کے ہر رکن کی تائید پر نعرے بلند ہوئے۔ اور تائید کی گئی اور نعرے بلند ہوئے۔ تائید پہ تائید نعرے پر نعرا!

"اتفاق آرا۔ دل کی گہرائیوں سے اور نسلی رشتہ سے ایک ہیں۔ ری پبلک کا دشمن مشہور و معروف عوام کش۔ پھر واپس کنسیئرجری کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سزائے موت دیئے جانے کا حکم صادر کر دیا گیا۔

گیارہواں باب

"دھندلکا"

عدالت نے جب بے گناہ انسان کو موت کا حکم سنایا تو اس کی بدنصیب بیوی کے دل پر ایسی زبردست چوٹ لگی کہ اس کے جملہ حواس مفلوج ہو کر رہ گئے مگر اسی وقت اس کے دل نے پکارا کہ بجائے خود ہمت ہار دینے کے اس کا فرض ہے وہ اپنے شوہر کی ڈھارس بندھائے۔ اور بجائے اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے نہایت ثابت قدمی سے اس کے دل کو تقویت پہونچائے۔ اس خیال نے اس میں حیرت انگیز قوت برداشت پیدا کر دی۔

ججوں کو چونکہ عدالت کے باہر جلوس میں شریک ہونا تھا اس لئے کچہری برخاست ہو گئی۔ لوگ عدالت سے باہر نکلنے کے لئے تیزی سے مختلف دروازوں سے جا رہے تھے۔ ابھی عدالت کا کمرہ خالی نہیں ہوا تھا کہ لوسی نے پیار اور محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے ہاتھ اپنے پیارے شوہر کی طرف پھیلا دیئے۔

• اے معزز شہریو! اگر آپ کی اجازت ہو تو ایک بار میں اپنے شوہر سے

بغل گیر ہو لوں ۔ ایک دفعہ انھیں اپنی باہوں میں لے لوں ۔ یقیناً آپ کے دل میں ہمارے لئے اتنا رحم تو ضرور باقی رہ گیا ہوگا۔"

وہ چار آدمی جو رات کو اسے گرفتار کر کے لے گئے تھے ان کے علاوہ چارلس ڈارنے کے ساتھ صرف ایک جیلر تھا اور برساڈ تھا۔ لوگ تماشہ دیکھنے باہر سڑک پر چلے گئے تھے۔ برساڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا "بغل گیر ہو لینے دو۔ چند لمحوں کی تو بات ہی ہے۔" وہ لوگ بھی خاموشی سے اجازت دینے پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے اسے اوپر بلند چبوترے پر پہونچا دیا۔ جہاں وہ کٹہرے پر سے جھک کر اسے اپنی باہوں میں لے سکتا تھا۔

"خدا حافظ میری جان ۔ میری پیاری ۔ میری آخری دعائیں لو۔ ہم پھر ملیں گے وہاں جہاں تھکے ماندوں کو سکون ملتا ہے ۔!"

یہ اس کے شوہر کے آخری الفاظ تھے ۔ اور وہ اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

"میرے پیارے چارلس میں سب کچھ برداشت کر لوں گی ۔ میرے لئے دکھی نہ ہو۔ خدا میرا نگہبان ہے۔ اپنی بیٹی کو بھی آخری بار دعائیں دے لو۔"

" تم میری دعائیں اس تک پہونچا دینا۔ اس کے حصے کا پیار مجھ سے تم اپنے ہونٹوں پر لے لو۔ تمہارے ذریعہ میں اس کو گلے لگا لوں۔" اور جب وہ اس سے جدا ہونے لگا تو لوسی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"ٹھیرو میرے پیارے شوہر ـ بس ایک لمحہ اور ـــ سنو ہم زیادہ دن ایک دوسرے سے جدا نہیں رہیں گے ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری جدائی سے آہستہ آہستہ دل شکستہ ہو کر میں بھی ختم ہو جاؤں گی ۔ مگر جب تک مجھ میں سکت رہے گی میں اپنا فرض انجام دوں گی ۔ اور جب میں اپنی بچی کو دنیا میں تنہا چھوڑ جاؤں گی تو خدا اسے بھی ایسے ہی مہربان دوست اور ہمدرد عطا کر دے گا ۔ جیسے مجھے بخشے تھے "

اس کا باپ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا ۔ اگر ڈارنے اسے پکڑ لیا نہ ہوتا تو وہ وہیں ان دونوں کے قدموں پر گر جاتا ۔ انھیں روک کر اس نے کہا ۔

" نہیں نہیں ـــ اس میں آپ کا کیا قصور ہے ۔ آپ نے کون گناہ کیا ہے کہ آپ ہمارے قدموں پر گر رہے ہیں ۔ اب ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کسی زمانے میں آپ نے کیا کچھ جھیلا تھا ۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب آپ کو میرے خاندان کی اصلیت کے بارے میں پہلی بار شبہ ہوا تھا تو آپ پر کیا گذری تھی ۔ اور پھر جب علم ہوا تھا تو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی ۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کس ضبط سے اس قدرتی نفرت کو دبایا ہو گا جو آپ کو میرے خلاف محسوس ہوئی ہو گی ۔ یہ سب کچھ آپ نے اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر برداشت کیا ۔ ہم دونوں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ خدا آپ کو امان میں رکھے ـــ "

ان باتوں کے جواب میں اس کے باپ نے اپنے سفید بال نوچ ڈالے اور ایک

درد بھری چیخ ماری۔

"یہ ہونے والی بات تھی" قیدی نے کہا۔ "حالات کو دیکھتے ہوئے یہی انجام ہونا لازمی تھا۔ اپنی غریب ماں کی آخری وصیت کو پورا کرنے کی آرزو اور کوشش کے سلسلے میں آپ سے میری ملاقات ہوئی۔ اتنی بھیانک بدی کا انجام کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی دکھ بھری ابتدا کا کبھی مسرت بھرا اختتام نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے دل کو قابو میں رکھئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے"!

جب اسے گھسیٹ کر جدا کیا گیا تو اس کی بیوی نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ اور پُر سکون مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے ہی ڈار نے قیدیوں کے دروازے سے نکل کر گیا۔ لوسی نے مڑ کر اپنا سر باپ کے سینے پر ٹکا دیا۔ اس سے کچھ کہنا چاہا مگر زبان میں طاقت نہ تھی اور وہ بیہوش ہو کر ان کے قدموں میں گر پڑی۔

سڈنی کارٹن جو ایک تاریک کونے میں ساکت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نکل کر آیا اور اسے باہوں میں اٹھا لیا۔ لوسی کے ساتھ اس وقت صرف اس کا باپ اور مسٹر لاری تھے۔ جب کارٹن نے اسے اٹھایا تو اس کے ہاتھ جذبات کی شدت سے لرز گئے۔ اس نے اس کے سر کو سنبھالا۔ مگر اس کے چہرے پر بجائے رحم کے فخر اور غرور کے جذبات نے سرخی پیدا کر دی تھی۔

"کیا میں انھیں گاڑی تک لے چلوں مجھے ان کا بوجھ قطعی محسوس نہ ہو گا"!

وہ اسے بڑی آسانی سے اٹھا کر دروازے تک لے گیا۔ اور ایک گاڑی میں احتیاط سے لٹا دیا۔ باپ اور ان کا پرانا عزیز دوست سوار ہو گئے۔ اور وہ خود کوچوان کے پاس بیٹھ گیا۔

جب وہ اس گلی میں پہونچے جہاں چند گھنٹے پہلے وہ ان پتھروں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کو لوسی کے قدموں نے چھوا ہوگا۔ تو اس نے اسے پھر گاڑی میں سے اٹھا لیا۔ اور سیڑھیوں پر سے چڑھ کر ان کے کمرے میں اسے لے گیا۔ اسے ایک صوفے پر لٹا دیا جہاں اس کی بچی اور مس پروس نے اس پر آنسو بہانا شروع کر دیئے۔

"انھیں ہوش میں لانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ بیہوشی ہی ان کے حق میں بہتر ہے وہ پھر بیہوش ہو جائیں گی۔ تو پھر ہوش میں لانے سے کیا فائدہ" اس کے بعد اس نے نرمی سے کہا۔

"اوہ کارٹن۔ پیارے کارٹن ۔۔۔ کارٹن!" بچی نے اٹھ کر اسے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "اب تو تم آگئے ہو۔ اب یقیناً ماں کی تم ضرور کچھ مدد کرو گے۔ اور پاپا کو بچانے کی تدبیر سوچو گے۔ آہ۔ ذرا ان کی طرف دیکھو پیارے کارٹن۔ کیا تم جوان سے محبت کرتے ہو۔ تم ان کی یہ گت دیکھنا برداشت کر سکتے ہو؟"

وہ بچی پر جھک گیا اور اس کے پھول سے رخسار کو اپنے چہرے سے لگا لیا۔ پھر آہستہ سے اسے اپنے سے جدا کیا اور اس کی بے سدھ ماں کی طرف دیکھا۔

"کیا جانے سے پہلے میں انھیں ایک بار چوم سکتا ہوں"؟ انہوں نے کہا اور ٹھٹک گئے۔

بعد میں یہ کہا جاتا تھا کہ جب وہ جھکے اور اپنے ہونٹوں سے اس کے چہرے کو چوما تو زیر لب کوئی بات کہی۔ بچی جو اس کے بہت قریب موجود تھی اس نے سب کو بعد میں بتایا اور جب وہ ایک ضعیف حسین ہوگئی تو اس نے اپنے پوتوں نواسوں کو بھی بتایا کہ کارٹن کو کہتے سنا۔

"وہ جان جو تمہیں پیاری ہے"۔

جب وہ دوسرے کمرے میں گیا تو اس نے ایک دم سٹرلاری اور ڈاکٹر مینٹ سے جو اس کے ساتھ تھے کہا۔

"ڈاکٹر مینٹ کل تک آپ کا یہاں بڑا رسوخ تھا اسے ایک بار اور آزما کر دیکھ لیجئے۔ تمام جج اور با اثر لوگ آپ کے بہت گہرے دوست ہیں اور انھیں آپ کی خدمت کا اعتراف ہے نا"؟

"چارلس کے متعلق کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھی گئی تھی۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ میں اسے بچالوں گا۔ اور میں نے اسے بچا لیا تھا"۔ ڈاکٹر مینٹ نے غمگین اور پریشان ہو کر آہستہ سے کہا۔

ایک دفعہ اور اس رسوخ کو آزما کر دیکھ لیجئے۔ اس وقت سے لے کر کل سہ پہر تک وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے پھر بھی کوشش تو کرنا ہی چاہیئے"۔

۔ حتی الامکان میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ میں ایک پل بھی دم نہ لوں گا۔"

"بالکل ٹھیک ۔ میں نے آپ جیسی قوت رکھنے والے انسانوں کو بڑے بڑے مرحلے طے کرتے دیکھا ہے ۔ حالانکہ وہ مراحل اتنے شدید تو نہ تھے پھر بھی کوشش تو کرنا چاہیئے ۔ ویسے اگر ہم زندگی کو بے مقصد گذاریں تو اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔ لیکن اگر کسی کی جان بچانے کے لئے زندگی کی بازی لگائی جائے تو اس کی ایک وقعت ہو جاتی ہے ۔ اگر اس کی پھر بھی کوئی قیمت نہ ہوتی تو پھر جان دینے میں کوئی بات ہی نہ تھی"۔ کارٹن نے مسکرا کر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

"میں سیدھا پریذیڈنٹ اور مقدمہ چلانے والے وکیل کے پاس جاؤں گا۔ اور میں ان کے پاس بھی جاؤں گا جن کا نام لینا مصلحت کے خلاف ہے ۔ میں عرضی بھی دوں گا ۔ مگر ٹھیرو ۔۔۔ سڑک پر کوئی جلوس نکل رہا ہے ۔ اور رات گئے تک کسی سے ملاقات نہ ہو سکے گی" ڈاکٹر مینٹ نے کہا ۔

"بالکل درست ۔ بڑی موہوم سی امید ہے اور اگر رات ہونے کی وجہ سے دیر ہو گئی ۔ تب بھی کچھ ناامیدی زیادہ تو نہیں بڑھ جائے گی ۔ مجھے آپ کی کوششوں کے نتیجے کا انتظار رہے گا ۔ خیال رہے مجھے کوئی خاص امید قطعی نہیں ۔ ڈاکٹر مینٹ ۔ آپ کب تک ان خوفناک حکام سے مل سکیں گے"؟

"مجھے امید ہے کہ رات ہوتے ہی یعنی اب سے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد مل سکوں گا"۔

"چار بجے کے بعد ہی اندھیرا ہو جائے گا ۔ ہمیں دو ایک گھنٹے کسی طرح گذار دینے

ہوں گے۔ اگر میں نو بجے مسٹر لاری کی جائے رہائش پر پہونچ جاؤں تو کیا خود آپ سے یا آپ کے دوست سے مجھے پتہ چل جائے گا کہ آپ کی کوششیں کہاں تک بار آور ہوئیں ۔"

"ہاں ۔"

"خدا آپ کو خوش رکھے ۔"

مسٹر لاری سڈنی کے ساتھ باہر کے دروازے تک گئے اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھکر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

"مجھے تو کوئی امید نہیں ۔" انھوں نے نہایت غمگین آواز میں آہستہ سے کہا۔

"مجھے بھی کوئی امید نہیں نظر آتی ۔"

"اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے جو کہ قطعی محال ہے کہ ان میں سے کوئی بھی یا سلے کے سارے افراد اس کی جان بخشی کا فیصلہ کر لیں کیونکہ ایک عام زندگی کی ان کے لئے کوئی حقیقت نہیں۔ مگر عدالت میں جو احتجاج ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی کو چارلس پر رحم کھانے کی ہمت نہیں ۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس شور و غل میں مجھے کلہاڑی کے دار کی دھمک محسوس ہوئی تھی ۔"

مسٹر لاری نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ ٹکا کر اپنا چہرہ اس میں چھپا لیا۔

"اتنے دل برداشتہ نہ ہوئیے۔ اتنا غم نہ کیجئے۔ میں نے ڈاکٹر مینٹ کو چارلس کی

معافی کے لئے کوشش کرنے کی رائے صرف اس لئے دی کہ ایک دن لوسی کو تسلی محسوس ہوگی ورنہ شاید وہ یہ سوچے کہ چارلس کی زندگی لاپرواہی کی وجہ سے ختم ہوگئی۔ اور یہ خیال اس کے لئے سوہانِ روح بن جائے گا۔"

"ہاں ہاں ۔ تم ٹھیک کہتے ہو ۔۔۔۔ اس کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا وہ ہلاک ہوجائے گا ۔ اس کے بچنے کی اب کوئی خاص اُمید نہیں" مسٹر لاری نے کہا۔

"ہاں آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ وہ ہلاک ہوجائے گا ۔ کوئی خاص اُمید باقی نہیں رہی ۔" کارٹن نے ان کے الفاظ کی تائید کی اور ثابت قدمی سے زینے کے نیچے اتر گیا۔

بارہواں باب

اندھیرا

سڈنی کارٹن متذبذب کی حالت میں گلی میں کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے۔

"ٹیلسن کے بینک گھر میں نو بجے جانا ٹھیک ہوگا یا نہیں" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "اچھا ہے جو لوگ مجھے دیکھ لیں۔ تاکہ انھیں معلوم ہوجائے کہ

مجھ جیسا بھی کوئی شخص پیرس میں موجود ہے۔ یہ احتیاط ضروری ہے اور ممکن ہے یہ احتیاط لازمی بھی ثابت ہوجائے۔ مگر جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے سوچ سمجھ کر ہوشیاری سے کرنا چاہئے۔"

اس کے قدم منزل مقصود کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک دم رُک گیا اور تاریکی میں ڈوبتی ہوئی گلی میں دو تین چکر لگائے اور ہر زاویے سے سوچ بچار کرنا شروع کیا۔ جو خیال پہلے دل میں آیا تھا وہی مناسب معلوم ہوا: "بہتری اسی میں ہے کہ یہ لوگ دیکھ لیں کہ مجھ جیسا کوئی شخص موجود ہے۔" اس نے آخر میں فیصلہ کیا، اور سینٹ اینٹائن کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس روز ڈیفارج نے اپنے آپ کو سینٹ اینٹائن کے نواح کا ایک شراب فروش بتایا تھا۔ اس لئے اس شخص کے لئے جو شہر سے بخوبی واقف ہو بغیر پوچھے اس کا گھر ڈھونڈ لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ مکان کا پتہ اچھی طرح معلوم کرکے کارٹن ان تاریک گلیوں سے نکل آیا اور ایک ہوٹل میں سیر ہوکر کھانا کھانے کے بعد گہری نیند سوگیا۔ کئی سال کے عرصے میں زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے کوئی تیز شراب نہیں پی۔ گذشتہ رات سے اس نے سوائے تھوڑی سی ہلکی شراب کے اور کچھ نہیں لیا تھا۔ اور گذشتہ شب اس نے مسٹر لاری کے آتشدان کے سامنے شراب انڈیل کر اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ اب پینے پلانے سے اس نے توبہ کرلی۔

قریب سات بجے وہ تازہ دم ہوکر اٹھ بیٹھا اور پھر باہر گلیوں میں نکل گیا۔

سینٹ اینٹائن جاتے وقت راستہ میں اس نے ایک دوکان کے شیشے میں دیکھ کر اپنی مسلی ہوئی قمیص واسکٹ اور کوٹ کا کالر درست کیا۔ ذرا بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا۔ اور اس کے بعد وہ سیدھا ڈیفارج کے ہاں گیا۔ اس وقت دوکان میں سوائے پھٹی ہوئی آواز اور بے قرار انگلیوں والے جیکوس نمبر تین کے اور کوئی خریدار موجود نہ تھا۔ اس شخص کو اس نے کچہری میں جیوری کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس وقت وہ کھڑا شراب پی رہا تھا اور موسیو ڈیفارج اور اس کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ وینجنس بالکل گھر کے ایک فرد کی طرح بیچ بیچ میں لقمے دے رہی تھی۔ کارٹن آکر بیٹھ گیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں چھوٹا سا گلاس شراب کا مانگا۔ پہلے میڈم ڈیفارج نے یونہی اچلتی ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر غور سے دیکھا۔ پھر اور غور سے دیکھا۔ پھر بذات خود اس کے پاس آئی اور پوچھا۔ اس نے کس چیز کی فرمائش کی تھی۔

اس نے پھر اپنی درخواست دہرادی۔

"آپ انگریز ہیں؟" میڈم نے اپنی سیاہ ابرو اوپر اٹھا کر تجسس سے پوچھا۔

پہلے تو کارٹن نے میڈم کو ایسے دیکھا جیسے اُسے فرانسیسی زبان کا ایک ایک لفظ سمجھنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ پھر نہایت غیر ملکی لہجہ میں جواب دیا۔

"جی ہاں میڈم ـــــ میں انگریز ہوں"

میڈم شراب لیے اپنی میز کی طرف چلی گئی۔ کارٹن نے ایک جیکوبین رسالہ اٹھایا اور بن کر ایسے پڑھنا شروع کیا جیسے اسے بڑی محنت کرنا پڑ رہی ہو۔ اور

اٹک اٹک کر معنی نکالنے لگا۔ اس نے میڈم کو کہتے سنا۔

"قسمیہ بالکل ایورمونٹ کی طرح ہے۔"

"ڈیفارج نے شراب لاکر سامنے رکھ دی اور "شام بخیر" کہا۔

"کیسے ؟"

"شام بخیر!"

"اوہ — شام بخیر — سیٹیزن۔ کیا نفیس شراب ہے۔" اس نے گلاس بھرتے ہوئے کہا "ری پبلک زندہ باد۔" اس نے ری پبلک کا جام صحت پی کر کہا۔

ڈیفارج واپس چلا گیا اور کہا۔

"ہاں کچھ کچھ ملتا ہے۔"

"میں تم سے کہتی ہوں کہ بہت ملتا ہے۔" میڈم نے سختی سے کہا۔

"وہ ایسا تمہارے دماغ میں گھس گیا ہے کہ ہر جگہ وہی نظر آتا ہے" — جیکوس نمبر تین نے نرمی سے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک بات ہے۔ کل کا بڑا انتظار ہے۔ جب تم دوبارہ اسے دیکھوگی —" خوش مذاق ونجنس نے ہنس کر لقمہ دیا۔

کارٹن بڑی محنت سے انگلی رسالہ پر رکھے پڑھنے میں مشغول تھا وہ سب کے سب میز پر کہنیاں ٹکائے سر جوڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر

تک وہ خاموش اسے غور سے دیکھتے رہے۔ اور پھر باتیں کرنے لگے۔ کارٹن بےخبر
بنا انہماک سے رسالہ پڑھتا رہا۔

"میڈم نے جو کچھ کہا وہ قطعی درست ہے" جیکوس نمبر تین نے کہا۔ "مگر ہاتھ
روکنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے مگر ٹلنے سے کیا فائدہ ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ مگر انسان کو کہیں نہ کہیں تو رکنا ہی پڑے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ
کہاں رکا جائے" ڈیفارج نے کہا۔

"پوری نسل کے خاتمے پر" میڈم نے کہا۔

"لاجواب تجویز" ! جیکوس نمبر تین نے رائے دی اور ونجنس نے پرزور
تائید کی۔

"نسل کے خاتمے کا طریقہ اپنی جگہ برا نہیں۔ بیوی" ڈیفارج نے ذرا
پریشان ہو کر کہا۔

"عام طور پر مجھے اس سے اختلاف نہیں۔ مگر ڈاکٹر نے زندگی میں بڑے
دکھ سہے ہیں۔ آج تم نے اسے دیکھا تھا اس کے چہرے کا رنگ اس وقت دیکھا
تھا جب وہ خط پڑھا جا رہا تھا"

"ہاں میں نے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھا تھا۔ چہرے سے وہ
ہماری ری پبلک کا سچا دوست نہیں معلوم ہوتا۔ اسے اپنے چہرے کا خیال رکھنا
چاہیئے" ! میڈم نے نفرت اور غصے سے کہا "اور بیوی تم نے اس کی بیٹی کے دکھ کا

اندازہ بھی لگا لیا ہوگا۔ بیٹی کے دکھ سے اسے کس قدر شدید تکلیف ہوتی ہوگی ۔"
ڈلیفارج نے ناراض ہوکر کہا۔

"میں نے اس کی بیٹی کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔" میڈم نے دہرایا۔" میں نے بڑی اچھی طرح سے اس کی بیٹی کو دیکھا اور کئی بار دیکھا۔ آج بھی دیکھا اور بھی کئی بار دیکھا۔ آج کچہری میں دیکھا اور قید خانہ کی دیوار کے قریب سڑک پر بھی دیکھا۔ بس ذراسی انگلی ہلانے کی دیر ہے۔"

ایسا معلوم ہوا بس انگلی ہلا دے گی۔ کارٹن پر جیسے کسی نے کلہاڑی سے چوٹ لگائی۔ دھڑسے اس کے ہاتھ سے رسالہ چھوٹ کر گر پڑا۔

"موصوفہ کا جواب نہیں !" جیوری کے رکن نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے یہ تو فرشتہ ہے !" دوسرے شخص نے اسے گلے لگا کر کہا۔

"اور تیرا جہاں تک سوال ہے — خوش قسمتی سے تیرا تو بس نہیں چلتا ورنہ تو اب بھی اس کو بچانے کو تیار ہوجائے گا" میڈم نے تسکا یتاً ڈلیفارج سے کہا۔

"نہیں — قطعی نہیں اگر اس گلاس کے اٹھانے سے اس کی جان بچتی ہو تب بھی میں اتنی سی تکلیف گوارا نہ کروں۔ مگر بس میرے خیال میں اتنی سزا کافی ہے۔ میں اس سے زیادہ سزا کو مناسب نہیں سمجھتا۔" ڈلیفارج نے کہا۔

"تو سنو — جیکوس تم اچھی طرح سن لو۔ اور میری ننھی ونجنس تو بھی غور سے سن لے۔ اس نسل کے ظالم ایسے ایسے مظالم ڈھاتے رہے ہیں کہ ان کا نام بہت عرصے ان لوگوں کی فہرست میں درج ہے۔ جن کی نسل کا بچ بھی نیست ونابود کردیا جائے گا۔ میرے شوہر سے پوچھ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں" میڈم نے غصے اور نفرت سے مغلوب ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے" اس سے پہلے کہ کوئی پوچھتا ڈیفارج نے کہا۔

"ان عظیم الشان دنوں میں — جب بیسٹل کا جیل خانہ ہمارے قبضہ میں آیا تھا۔ میرے شوہر کو وہ خط ملا تھا جو آج عدالت میں پڑھا گیا تھا۔ وہ خط یہ گھر لے آیا تھا اور آدھی رات کو جب دوکان بند کردی گئی تب ہم نے اسے پڑھا یہاں ایسی جگہ بیٹھ کر اس لیمپ کی روشنی میں پڑھا۔ پوچھو ان سے"

"بالکل درست!" ڈیفارج نے اقبال کیا۔

"جب خط پڑھا جا چکا تھا تو لیمپ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور صبح کی روشنی ان کھڑکیوں کی سلاخوں اور چھتوں میں سے جھلملا رہی تھی — تب میں نے ان سے کہا۔ آج میں تمہیں ایک راز بتانا چاہتی ہوں۔ پوچھو ان سے!"

"بالکل درست!" ڈیفارج نے پھر اقرار کیا۔

"تب میں نے اس راز سے انھیں آگاہ کیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتی پیٹ کر کہا۔ ڈیفارج میری پرورش مچھیروں کے درمیان سمندر کے کنارے

ہوئی۔ اور ان دو ایور مونڈ بھائیوں نے جس کسان خاندان پر ستم ڈھائے وہ میرا خاندان تھا ڈیفارج۔ مہلک زخم سے دم توڑتے ہوئے لڑکے کی بہن میری بہن تھی وہ شوہر میری بہن کا شوہر تھا۔ اور وہ بچہ جو ابھی شکم مادری میں تھا ان کا بچہ تھا۔ وہ بھائی میرا بھائی تھا۔ وہ باپ میرا باپ تھا۔ وہ مرنے والے میرے پیارے تھے۔ اور ان مظالم کا جواب دینا میرا فرض ہے۔ میرا فرض ہے۔ پوچھو ان سے "

" بالکل درست! ڈیفارج نے پھر کہا۔

" تو پھر ___ ہوا سے کہہ دو وہ رک جائے ___ آگ سے کہو وہ جلانا بند کر دے ___ مگر مجھ سے رکنے کو نہ کہو " میڈم نے کہا۔

اس کے زہریلے غصے سے اس کے دونوں سامعین کو نہایت بھیانک قسم کی لذت مل رہی تھی۔ اسے دیکھے بغیر کارٹن کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا رنگ سفید پڑ گیا ہے اور دونوں کے دل میں اس کی انتہائی وقعت تھی۔ بے چارہ ڈیفارج اقلیت کے گروہ میں رہ گیا۔ اس نے دبی زبان سے بدکار شوہر کی رحم دل بیوی کا حوالہ دیا۔ مگر اس کی بیوی نے دوبارہ سمجھا کر کہا " ہوا اور آگ کو روک سکتے ہو مگر مجھے نہ روکو "

کچھ گاہک آ گئے اور مجلس تتر بتر ہو گئی۔ انگریز گاہک نے جو کچھ پیا تھا اس کے دام چکائے پھر خردہ لے کر احمقوں کی طرح گننے لگا۔ پھر ایک اجنبی کی طرح سے نیشنل پیلس کا راستہ پوچھا۔ میڈم ڈیفارج اسے دروازے تک لے گئی۔ اور

راستہ بتاتے وقت اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ اس وقت انگریز گاہک کا بے اختیار دل چاہا اس ہاتھ کو اوپر اٹھا کر اس کے نیچے دل میں خنجر بھونک دے تو توکتنا اچھا ہو۔

مگر وہ اپنے راستے چل دیا۔ اور جیل خانہ کی دیوار کے سایوں نے اسے نگل لیا۔ مقررہ وقت پر وہ وہاں سے نکلا اور مسٹر لاری کے پاس پہونچا۔ وہاں بے چارے بڈھے میاں بے چینی سے ٹہل رہے تھے انھوں نے بتایا کہ وہ ابھی تک لوسی کے پاس تھے اور صرف اس سے حسب وعدہ ملاقات کی غرض سے آئے ہیں۔ چار بجے سے جو اس کا باپ بینک کی عمارت سے گیا تھا تو اب تک اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اسے کچھ موہوم سی امید تھی کہ وہ چارلس کو بچانے کے لئے شاید کچھ کر سکیں۔ ڈاکٹر کو گئے پانچ گھنٹے گذر چکے تھے۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔

مسٹر لاری نے دس بجے تک انتظار کیا۔ مگر ڈاکٹر مینٹ واپس نہ لوٹے اور لاری لوسی کو زیادہ دیر تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس لئے طے ہوا کہ وہ پھر واپس اس کے پاس چلے جائیں اور اس عرصہ میں کارٹن آتشدان کے پاس بیٹھے ان کا انتظار کرتے رہیں۔ پھر مسٹر لاری واپس آگئے اور ڈاکٹر کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ کہاں تھے۔

وہ اس نکتے پر بات چیت کر ہی رہے تھے اور ڈاکٹر کے آنے میں جو دیر ہو رہی تھی اس سے کچھ امید افزا نتیجہ نکلنے کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ اتنے میں انہی سیڑھیوں پر ڈاکٹر کی آمد کی آہٹ سنائی دی۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے

صاف پتہ چل گیا کہ انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پتہ نہیں وہ واقعی کسی سے ملے یا یونہی اب تک بھٹکتے ہوئے گلیوں کے چکر لگا رہے تھے اب یہ کون بتا سکتا تھا۔ جس انداز میں وہ آنکھیں پھاڑے گھڑے گھور رہے تھے۔ اس سے سب کچھ واضح ہو گیا۔

" مجھے سخت ضرورت ہے ـــ مگر کہیں نہیں ملتی ـــ کہاں گئی ـــ " انہوں نے کہا۔ ان کا سر کھلا تھا اور گریبان چاک تھا۔ اِدھر اُدھر پھٹی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے انہوں نے کوٹ اتار کر فرش پر پھینک دیا اور بولے:۔

" میری بچی کہاں ہے ؟ میں نے سارے شہر میں ڈھونڈ ڈالا۔ کہیں نہیں ملتی۔ لوگوں نے میری چیزیں کہاں غارت کر دیں وقت کم رہ گیا ہے۔ مجھے وہ جوتے جلد تیار کر دینا چاہئیں "۔

مسٹر لاری نے کارٹن کی طرف دیکھا، اور دونوں کے دل ڈوب گئے۔

" دیر کیوں لگا رہے ہو " انھوں نے رہانسی کھلی ہوئی آواز میں کہا " مجھے کام کرنے دو ـــ اپنا کام کر لینے دو "

کچھ جواب نہ پا کر انھوں نے اپنے بال نوچ ڈالے اور ایک کھسیانے بچے کی طرح زمین پر سپٹخنے لگے۔

" ایک غریب بدنصیب انسان کو مت ستاؤ " انہوں نے بے قراری سے دردناک لہجہ میں التجا کی " مجھے میرے اوزار دے دو۔ اگر وہ جوتے آج پورے نہ ہوئے تو ہم لوگوں کا کیا انجام ہوگا "

تباہی ___ مکمل تباہی!

انھیں سمجھانے کی کوشش فضول تھی۔ نہ ہی انھیں ہوش میں لایا جا سکتا تھا۔

دونوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں تسلی دی۔ انھیں اطمینان دلایا کہ ان کے اوزار ابھی ابھی مہیا کر دیئے جائیں گے۔ اور انھیں کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کرسی پر گر پڑے۔ آتشدان میں شعلوں کو گھورتے رہے اور آنسو بہاتے رہے۔ مگر جو کچھ اس عرصہ میں واقع ہوا تھا وہ سب ایک خواب تھا۔ ایک وہم تھا۔ مسٹر لاری نے دیکھا کہ وہ پھر وہی ڈاکٹر مینٹ بن گئے جنھیں ایک دن انھوں نے ڈیفارج کی حفاظت میں دیکھا تھا۔

وہ دونوں ان کی اس گت سے حد درجہ متاثر ہوگئے تھے۔ مگر اس وقت جذبات کی رو میں بہہ جانا بیکار تھا۔ ان کی بے یار و مددگار لڑکی جس کی ساری امیدوں پر پانی پھر چکا تھا اس کا خیال دونوں کو بے قرار کرنے لگا۔ پھر جیسے قصداً انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خیال ابھرا۔ کارٹن نے اظہار میں پہل کی۔

"آخری موہوم سہارا بھی گیا۔ بہتر ہے انھیں لوسی کے پاس پہونچا دیا جائے مگر جانے سے پہلے مہربانی کر کے میری ایک بات دھیان سے سنئے۔ براہ کرم مجھ سے وعدہ کیجئے مگر اس کی تفصیل نہ پوچھئے کہ میں کیوں یہ وعدہ لے رہا ہوں۔ ایک وجہ ہے اور نہایت معقول وجہ ہے۔"

"مجھے اس میں قطعی کوئی شبہ نہیں " مسٹر لاری نے جواب دیا " فرمائیے "
ان کے درمیان میں بیٹھے ہوئے ۔ ڈاکٹر مینٹ مسلسل آہیں بھر رہے تھے اور آگے پیچھے جھول رہے تھے ۔ وہ دونوں اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے ۔ جیسے وہ رات کو کسی مریض کے سرہانے کھڑے ہوں ۔

کارٹن نے جھک کر کوٹ اٹھالیا جو اس کے پیروں میں پڑا اُڑل رہا تھا ۔ کوٹ اٹھانے میں جیب سے ڈاکٹر کی وہ کتاب فرش پر گر پڑی جس میں وہ مزدوری کا غذات رکھا کرتے تھے ۔ کارٹن نے اسے اٹھالیا ۔ اس میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا ۔
"دیکھنا چاہئے اس میں کیا ہے " اس نے کہا ۔

اس نے اسے کھول کر دیکھا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا " شکر خدا کا "!
"کیا ہے " مسٹر لاری نے پرشوق لہجہ میں پوچھا ۔

" ذرا ٹھیریئے میں ابھی بتاتا ہوں " ۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور کاغذ نکالا " دیکھئے یہ وہ پروانہ ہے جس کے ذریعہ سے میں ملک سے باہر جاسکتا ہوں ۔ یہ دیکھئے ــــــ سڈنی کارٹن ـــ قومیت انگریز "

" دیکھا آپ نے "
مسٹر لاری غور سے کاغذ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگے ۔

" کل تک کے لئے اسے اپنے پاس رکھئے ۔ میں کل ڈارنے سے ملنے جارہا ہوں ۔ جیل خانہ میں یہ کاغذات ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا "

"کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ مگر میں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ یہ کاغذات جو ڈاکٹر مینٹ کے پاس تھے۔ انھیں بھی رکھ لیجئے۔ یہ بھی ایسا ہی ایک اجازت نامہ ہے جس کی مدد سے وہ ان کی بیٹی اور اس کی بچی فرانس سے باہر جب چاہیں جا سکتے ہیں اور سرحد پار کر سکتے ہیں۔ دیکھا آپ نے؟"

"ہاں!"

شاید انہوں نے برے دنوں کے ڈر سے یہ اجازت نامہ لے کر رکھ لیا تھا اس پر کون سی تاریخ پڑی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ دیکھنے میں وقت ضائع نہ کیجئے اسے حفاظت سے اپنے اور میرے اجازت نامے کے ساتھ رکھ لیجئے۔ اب ذرا غور سے سنئے۔ مجھے پہلے سے یقین تھا کہ ان کے پاس یہ اجازت نامہ ضرور ہوگا۔ حالانکہ ابھی گھنٹہ دو گھنٹہ ہوئے مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید نہیں ہے۔ یہ اجازت نامہ اس وقت تک کام آسکتا ہے۔ جب تک کہ اس کے خلاف احکامات صادر نہیں کئے جاتے اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد یہ کاغذات بیکار کر دیئے جائیں گے۔"

"کیا یہ لوگ خطرے میں ہیں؟"

ان کی جانیں انتہائی خطرے میں ہیں۔ میڈم ڈیفارج ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے والی ہے۔ میں نے خود اس کے منہ سے یہ بات سنی۔ آج رات میں نے اس عورت کے منہ سے جو باتیں سنی ہیں ان سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ اُن کی

جانیں خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے میں نے مخبر یعنی برساڈ سے گفتگو کی ہے اسکے بعد سے میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ مخبر نے بھی میرے شبہ کی تائید کی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک آرہ کش جو قید خانے کی دیوار کے سامنے رہتا ہے۔ میڈم کے قبضہ میں ہے اور وہ اسے ان لوگوں کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار کر رہی ہے۔ اس نے انھیں قیدیوں سے اشارے سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے لوسی کا نام نہیں لیا۔ صاف ظاہر ہے کہ ان پر سازش کرنے کا عام فہم الزام لگایا جائے گا۔ اس کی اور شاید اس کی بچی کی جان خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے اور شاید اسکے بوڑھے باپ کی جان بھی نہ بچ سکے۔ کیوں وہ اور بچی بھی اس کے ساتھ قید خانہ کے قریب دیکھے گئے تھے۔ ارے آپ اس قدر خوفزدہ کیوں ہو رہے ہیں۔ یقیناً آپ انھیں بچا لیں گے"۔

"کاش خدا کی مدد سے میں انھیں بچا سکوں کارٹن ۔۔ مگر کیسے ؟"

"میں ابھی آپ کو بتاؤں گا کہ کیسے انھیں بچایا جا سکتا ہے۔ آپ سے زیادہ ذمہ دار شخص اور کوئی نہیں جس کے سپرد یہ مہم کی جا سکے۔ کل کے بعد ہی یہ الزامات لگائے جائیں گے۔ شاید دو تین دن کی اور مہلت مل جائے۔ ممکن ہے ایک ہفتہ مل جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ سولی پانے والوں کا ماتم کرنا یا ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا بہت خطرناک جرم ہے۔ لوسی اور اس کا باپ یقیناً اس جرم کا ارتکاب کریں گے۔ وہ بدذات عورت جسے اس قسم کی حرکتوں کا جنون ہو گیا ہے۔ اپنے مقدمہ کو

مضبوط کرنے کے لیے ان کے رنج و غم کو کام میں لائے گی۔ اور اپنے دعوے کو اور مستحکم بنالے گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟"

"میں اتنی توجہ اور غور سے تمہاری تجویزیں سن رہا تھا کہ وقتی طور پر میں اس دردناک سانحہ کو بھول گیا تھا۔" انھوں نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کے پاس روپے ہیں اور آپ ساحل تک تیز رفتاری سے سفر کرنے کے لوازمات خرید سکتے ہیں۔ چند روز ہوئے آپ لوگوں کے انگلستان واپس جانے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ کل صبح ہی آپ اپنے گھوڑوں کو تیار رکھئے تاکہ سہ پہر کو دو بجے تک روانہ ہونے کے لئے آسانی رہے۔"

کارٹن کا رویہ اس قدر پر جوش تھا کہ مسٹر لاری میں بھی اس سے متاثر ہو کر نوجوانوں جیسی مستعدی آگئی۔

"آپ بڑے دل والے ہیں کیا میں نے آپ کو بتایا کہ آپ سے زیادہ بھروسہ کے قابل اور کوئی نہیں۔ آج رات اسے اس خطرے کے متعلق جو اس کی بچی اور باپ کے لئے پیدا ہو گیا ہے تفصیل سے سمجھا دیجئے گا۔ اسے اپنی جان کی تو پرواہ نہیں وہ بڑی خوشی سے اپنے شوہر کے ساتھ جان دینے کو تیار ہو جائے گی۔" تھوڑی دیر کے لئے وہ ہچکچایا پھر کہا "اس سے کہئے گا کہ اپنی بچی اور بوڑھے باپ کی خاطر اسے پیرس فوراً چھوڑ دینا چاہئے۔ اور وقت مقررہ پر آپ کے ساتھ انھیں لے کر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے۔ اس سے یہ بھی کہئے گا کہ یہ اس کے شوہر کی آخری خواہش تھی اور وہ سوچ بھی

نہیں سکتی کہ یہاں سے چلے جانا کتنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا موجودہ حالت میں اس کے والد اس کے کہنے پر عمل کرنے پر راضی ہوجائیں گے۔"

"ہاں مجھے یقین ہے وہ راضی ہو جائیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی خاموشی اور احتیاط سے احاطے میں سارا انتظام کرنے کے بعد خود بھی گاڑی میں سوار ہوجایئے۔ جیسے ہی میں آؤں۔ فوراً مجھے گاڑی میں ساتھ لے کر روانہ ہوجایئے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں ہر حالت میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں۔"

"میرا پروانہ راہداری آپ کے پاس دوسرے اشخاص کے اجازت ناموں کے ساتھ ہوگا۔ میرے لئے جگہ مقرر کردیجئے گا۔ اور جب وہ جگہ پر ہوجائے تو فوراً انگلینڈ روانہ ہوجایئے گا۔"

"اوہ تب تو اس سفر کے انتظام کا سارا بار مجھ ضعیف کے کندھوں پر ہی نہیں پڑے گا۔ میری مدد کے لئے ایک پرجوش نوجوان بھی ساتھ ہوگا۔" مسٹر لاری نے اس کا مضبوط ہاتھ نہایت گرم جوشی سے دبا کر کہا۔

"خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ مجھ سے پختہ وعدہ کیجئے خواہ کچھ ہوجائے اس وقت جو ہم نے فیصلہ کیا ہے وہ اٹل رہے گا۔ اس میں کسی وجہ بھی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔"

"یقیناً ـــــ کوئی تبدیلی نہیں ہوگی کارٹن۔"

مدکل ان الفاظ کو یاد رکھے گا۔ کوئی تبدیلی واقع ہوگی یا دیر ہوگی۔ خواہ وہ کسی بھی وجہ سے ہو تو کسی کی جان بھی نہ بچے گی۔ بلکہ اور بہت سی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی اور ان کی قربانی دینی ہوگی۔"

"میں ان سب باتوں کا دھیان رکھوں گا۔ اور نہایت وفاداری سے اپنا فرض ادا کروں گا۔"

"اور مجھے بھی اُمید ہے کہ اپنا فرض ادا کر سکوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔!"

بڑی بردبار مسکراہٹ کے ساتھ کارٹن نے خدا حافظ کہا۔ اور بزرگ بینک کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ مگر اس وقت رخصت ہو جانے کے بجائے سبے حال ڈاکٹر میسٹ کو بجھتے ہوئے آتشدان کے پاس سے اٹھانے میں ان کی مدد کی۔ انھیں لبادہ اور ٹوپی پہنائی۔ انھیں امید دلائی کہ ان کی بچی اور داماد ان کے پاس پہونچائے جا رہے ہیں۔ وہ اب تک مسلسل آہیں بھر رہے تھے۔ اور اپنے مشغلے کا سامان مانگے جا رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اس احاطہ تک گئے جہاں مکان میں لوسی بھیانک رات جاگ کر گذار رہی تھی۔ اسی گھر میں چارلس ڈارنے نے اپنے مجروح دل کے بے پناہ دکھ کا اس سے اظہار کیا تھا۔ احاطے میں داخل ہو کر وہ چند لمحے کھڑا اس کھڑکی کی جانب تکتا رہا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے دل سے لوسی کے لئے دعائیں نکلیں دل ہی دل میں اسے خدا کے سپرد کیا ——— اور چل دیا۔

تیرھواں باب

(۵۲)

"باون"

کینسر جری کے اندھیرے قید خانے میں اس روز کے معتوب افراد اپنی موت کی گھڑیاں گن رہے تھے ان کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی ایک سال کے ہفتوں کی ہوتی ہے۔ باون افراد اس سہ پہر کو زندگی کی موجوں پر بہتے ہوئے ابدی سمندر میں غرق ہوجانے والے تھے۔ اس سے پہلے کہ انھیں اپنی کوٹھریوں سے باہر نکالا جاتا نئے شکار لاکر بند کئے جارہے تھے۔ گزشتہ کل کے خون میں ان کا خون ملنے سے پہلے آنے والی کل کے لئے خون کا انتظام کر لیا گیا تھا تاکہ وہ ان کے خون میں مل جائے باون اشخاص کو موت کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔ نہ ستر برس کے فارمر جنرل کی دولت اس کی زندگی کا خون بہا ادا کرسکی اور نہ بیس برس کی درزن کو اس کی گمنامی اور غربت بچا سکی۔ جسمانی بیماریاں جو برائیوں اور بے التفاتیوں سے انسان میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ہر کس و ناکس کو اپنے شکنجہ میں دبوچ لیتی ہیں۔ ناقابل بیان مظالم اور تکالیف انتہائی جور و ستم اور حد سے گذری ہوئی بے رحمی بغیر کسی رو رعایت کے سب کو برابر کچل رہی تھی۔ چارلس ڈارنے جب سے عدالت کا فیصلہ سن کر اپنی کوٹھری

میں آیا تھا اس نے اپنے آپ کو کسی قسم کے حسین مغالطے میں نہیں ڈالا تھا۔ اس نے بیانات کی ہر سطر میں اپنی موت کا پیغام سنا تھا۔ اسے پوری طرح یقین تھا کہ کسی قسم کا ذاتی رسوخ اس کی جان نہیں بچا سکتا۔ وہ لاکھوں انسانوں کے غیظ و غضب کا شکار تھا اور اب افراد کے بس میں کچھ نہ تھا۔

مگر اس حالت میں جب کہ اس کی محبوب بیوی کا چہرہ اس کی نظروں میں بسا ہوا تھا بغیر کسی ذہنی خلجان کے آنے والے وقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے زندگی سے شدید لگاؤ تھا اور یوں زندگی سے منہ موڑ لینا آسان نہ تھا۔ بڑی کوششوں سے وہ زندگی سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا مگر ایک ہاتھ بڑی کوششوں سے چھوٹتا تو دوسرے ہاتھ کی انگلیاں زندگی کی رعنائیوں کو جکڑ لیتیں اور جب مسلسل جدوجہد کے بعد ایک ہاتھ کو دُور کھینچتا تو دوسرا ہاتھ دنیا کی نعمتوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ اس کے دماغ میں اضطراری الجھن برپا تھی۔ دل میں بے پناہ طوفان اٹھ رہے تھے۔ جو اسے ترک دنیا سے روک رہے تھے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے وہ دل پر پتھر رکھ کر زندگی سے دست بردار ہو کر صبر کر لیتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا وہ خودغرضی کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کی بیوی اور بچی کو اس کے بغیر دنیا میں جینا ہوگا۔ انھیں کیسے سکون حاصل ہوگا، کون انکی خبر گیری کرے گا۔

یہ حالت تو شروع شروع میں تھی مگر پھر بھی یہ سوچ کر اس کی ہمت بندھ گئی کہ وہ اکیلا ہی نہیں۔ کتنے ہی اس کی طرح روزانہ ناانصافی کی بدولت موت کے

گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ انھوں نے نہایت استقلال سے دنیا کو خیرباد کہا تھا۔
دوسرا خیال جس نے اسے ضبط پر مجبور کیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر اس نے اس عذاب کو
جواں مردی اور استقلال سے برداشت نہ کیا تو کیا اس کے پس ماندوں کا ذہنی
سکون خاک میں نہیں مل جائے گا۔ اس لئے آہستہ آہستہ اس پر ایک مقدس قسم کا سکون چھا
گیا۔ اس کے خیالات دنیا کی لہو لعب سے آزاد ہو کر انتہائی بلندی پر پہونچ گئے
اور اسے بہت سکون اور اطمینان حاصل ہوا۔

یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخری سفر
کی اتنی تیاریاں تو ہو چکی تھیں۔ اسے خط لکھنے کا سامان خریدنے کی اجازت اور
ایک لالٹین مل گئی تھی وہ بیٹھ کر خط لکھنے لگا۔

اس نے لوسی کو ایک طویل خط لکھا۔ اس نے بتایا کہ اسے لوسی کے والد کی
لمبی قید کے بارے میں اس وقت تک کوئی پتہ نہ تھا جب تک خود اس نے نہیں
بتایا تھا۔ اور نہ خط کا مضمون سننے سے پہلے اسے یہ معلوم تھا کہ لوسی کے باپ کی
تباہی کا باعث خود اس کے چچا اور باپ تھے وہ اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ڈاکٹر
مینٹ نے منگنی کے وقت صرف ایک شرط رکھی تھی وہ یہ کہ چارلس ڈارنے اپنا
اصلی نام بتا کر لوسی کو اس راز سے کبھی آگاہ نہ کرے۔ شادی کی صبح بھی انھوں نے دوبارہ
اسی بات کا پختہ وعدہ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی التجا کی کہ وہ اپنے باپ سے اس خط کے
بارے میں کچھ باز پرس نہ کرے، اور نہ کچھ تفتیش کرے۔ کیونکہ اس سے انھیں بہت

مدمہ پہونچے گا۔ برسوں ہوئے ایک اتوار کو جب وہ سب اس پیارے درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور جب ٹاور کا ذکر نکلا تھا تو اس وقت پتہ نہیں کیوں ڈاکٹر مینٹ ایک دم پریشان ہوگئے تھے۔ شاید اس وقت اس خط کا خیال ان کے ذہن سے بالکل اتر گیا تھا یا شاید وقتی طور پر اس کی یاد ان کے دماغ میں ابھر آئی تھی۔ اگر اس خط کے بارے میں کچھ یاد بھی تھا تو یقیناً اس وجہ سے انہوں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ وہ سمجھے ہوں گے کہ بیسٹل کی تباہی کے بعد تمام ان اشیاء کی جو وہاں دستیاب ہوئیں لمبی چوڑی تفصیل ساری دنیا میں نشر ہوئی تھی۔ مگر اس خط کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر وہ خط اس عام تباہی میں تلف ہوگیا ہوگا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی اس نے بڑی انکساری سے لکھا تھا کہ وہ اپنے باپ کو تسلی دے۔ اور انھیں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ قطعی حق بجانب تھے۔ اور انھیں خود کو ملامت نہیں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے تو ان دونوں کی بہتری کے لئے سب کچھ فراموش کر دیا تھا۔

اس کے بعد اس نے اس محبت کا شکریہ ادا کیا جو اسے نصیب ہوئی تھی اور اپنی آخری دعائیں دیں اور صبر کرنے کی تلقین کی۔ اپنی اور اس کی بچی کی نگہداشت اور پرورش میں زندگی گذارنے کا مشورہ دیا۔ یہ بھی کہا کہ اب ہم دوسری دنیا میں ملیں گے۔ اور اس کے والد کے دل کو ڈھارس بندھائیں گے۔

اس نے اس کے والد کو ایک علیحدہ خط لکھا اس کا مضمون بھی وہی تھا

اس میں اپنی بیٹی اور بیوی کو ان کے ہاتھوں میں سونپا تھا اور جان بوجھ کر ان کی اس ذمہ داری کو یاد دلایا تھا۔ کہ کہیں پھر وہ دین و دنیا سے غافل نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اسے کچھ اس قسم کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔

اور ان سب کو مسٹر لاری کے ہاتھوں میں سونپا تھا ان کی محبت اور رفاقت کا دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سب کام پوری طرح سے مکمل ہو گیا۔ کارٹن کا اسے خیال ہی نہ آیا۔ دوسروں کی فکر میں وہ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اس کے متعلق کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔!

روشنیاں گل ہونے سے پہلے اس نے سارے خط لکھ ڈالے۔ اور جب وہ اپنے پھونس کے بستر پر لیٹا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس دنیا سے اس کا رشتہ ختم ہو گیا۔

مگر نیند میں یہ دنیا اسے اپنی رنگینیوں کی طرف واپس کھینچ رہی تھی اس نے خواب میں دیکھا وہ سوہو کے گھر میں ہنسی خوشی پہونچ گیا ہے۔ حالانکہ خواب کا یہ گھر اصلی گھر سے بالکل مختلف تھا۔ وہ لوسی کے پاس ہے اس کا دل دماغ ہلکا پھلکا اور ناقابل بیان لطافت سے لبریز ہے۔ لوسی اس سے کہہ رہی ہے "یہ سب خواب تھا" اور دراصل وہ کہیں بھی نہیں گیا تھا ـــ پھر لاعلمی کا ایک موہوم سا خلا طاری ہو گیا ـــ پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ اس نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں مگر مرنے کے بعد سکون پاکر پھر لوسی کے پاس لوٹ آیا ہے اور وہ بالکل تبدیل نہیں ہوئی۔

پھر ایک تاریک خلاء چھا گیا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی، نہایت اداس تھی۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں یہ حقیقت کوندگئی: "آج کا دن میری موت کا دن ہے!"

یوں اس نے گھڑیاں گذاریں۔ یہاں تک کہ وہ دن آگیا جب باون افراد ختم ہونے والے تھے! اور اب جب کہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اسے اپنی قسمت پر صبر آگیا ہے۔ نئے نئے خیال انوکھے اندازے اس کے دماغ میں ابھرنے لگے۔ جن پر قابو پانا ایک بہت ہی دشوار کام تھا۔

جس ہتھیار سے اس کی گردن اڑنے والی تھی وہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ زمین سے کتنا اونچا تھا۔ کتنی سیڑھیاں چڑھنا پڑیں گی۔ اسے کہاں کھڑا کیا جائے گا۔ اسے کس طرح چھوا جائے گا۔ کیا چھونے والے ہاتھ خون میں لتھڑے ہونگے اس کا چہرا کس طرف گھمایا جائے گا۔ وہ سب سے پہلا فرد ہوگا یا اس کی باری سب سے آخر میں آئے گی۔ ایسے ہی کتنے سوال لاشعوری طور پر بار بار ابھر رہے تھے ان سوالوں کا خوف سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کیونکہ اسے خوف تو قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ تو پے در پے صرف اس خیال سے پیدا ہو رہے تھے کہ جب وقت پڑے گا۔ تو کیا کرنا ہوگا۔ چند لمحوں میں کام تمام ہو جائے گا۔ مگر اس کے متعلق جو سوال ابھر رہے تھے وہ نسبتاً نہایت غیر متوازن اور حد سے زیادہ شدید تھے۔ ایک عجیب قسم کا تفکر تھا۔ جیسے یہ تجسس خود اسے نہیں اس کے اندر چھپے ہوئے کسی اور وجود کے

دل میں پیدا ہو رہا تھا۔

گھڑیاں گذرتی رہیں اور وہ آگے پیچھے ٹہلتا رہا۔ اور گھڑیال وہ گھنٹے بجاتا رہا جو زندگی میں پھر نہ سنائی دیں گے۔ نو ہمیشہ کے لئے گیا۔ دس بھی گزر گیا گیارہ بھی سدا کے لئے بیت گیا۔ بارہ کا گھنٹہ گذرنے کے لئے بڑھتا آرہا تھا۔ آخری وقت کے ان الجھے ہوئے خیالات کی یورش پر اس نے انتہائی ضبط کے بعد فتح پالی تھی۔ وہ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے پیاروں کے نام دہرا رہا تھا سخت کشمکش کا لمحہ گذر چکا تھا اس کے خیالات منتشر نہیں تھے۔ اور اب وہ ادھر سے ادھر ٹہل کر اپنے اور ان کے حق میں دعا کر رہا تھا۔

بارہ کا گھنٹہ ہمیشہ کے لئے بیت گیا!

اسے اطلاع دی گئی تھی کہ تین بجے سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے طلب کیا جائے گا کیوں کہ چھکڑے سڑکوں سے دھیرے دھیرے گھسٹ کر گذرا کرتے تھے۔ لہذا اسنے دو بجے کا وقت اپنے دل میں مقرر کر لیا تھا۔ اس عرصے میں اسے اپنا دل مضبوط کرنا تھا۔ اس کے بعد تو اس کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ دوسروں کی ہمت بندھا سکے سینے پر ہاتھ باندھے وہ ادھر سے ادھر متواتر ٹہل رہا تھا اس میں اور لا فورس کے قیدی میں بڑا فرق تھا۔ ایک کا گجر بج کر دور گہرائی میں ڈوب گیا اور اسے تعجب نہ ہوا۔ سب گھنٹے ایک ہی مقررہ طوالت کے تھے! اس نے دل سے خدا کا شکر ادا کیا کہ آخر وقت میں اسے صابر و شاکر رہنے کی

ہمت عطا کی۔ بس ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔" اس نے سوچا اور پھر ٹہلنے لگا!

باہر برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی ــــ وہ ٹھٹک گیا۔

تالے میں چابی لگا کر گھمائی گئی۔ دروازہ کھلنے سے پہلے ــــ بلکہ جونہی تھوڑا سا دروازہ کھلا۔ اس نے ایک مرد کو دھیمی آواز سے انگریزی میں کہتے سنا۔

"اس نے یہاں مجھے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ میں اس کی نظروں سے بچتا ہی رہا ہوں۔ تم اکیلے اندر جاؤ ــــ میں باہر کھڑا رہوں گا۔ دیر نہ کرنا!"

دروازہ جلدی سے کھلا اور بند ہو گیا۔ اس کے سامنے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ لئے ہونٹوں پر خاموش رہنے کے لئے انگلی رکھے۔ سڈنی کارٹن کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر لاجواب دمک تھی۔ چند لمحوں تک تو قیدی سمجھا کہ وہ خود اس کے دماغ کا تخلیق کیا ہوا کوئی واہمہ ہے۔ مگر وہ بول رہا تھا۔ اور یہ اس کی ہی آواز تھی اس نے قیدی کا ہاتھ تھاما ــــ گرفت واہمہ نہ تھی!

"دنیا بھر کو چھوڑ کر ایک میرے ہی آجانے کی تمہیں قطعی اُمید نہ ہو گی" کارٹن نے کہا۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ تم ہی ہو۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ تم قیدی تو نہیں ہو نا ــــ" ڈارنے کے دل میں ایک دم خوف پیدا ہو گیا۔

"نہیں ــــ اتفاق سے یہاں ایک محافظ کی دُکھتی رگ میرے ہاتھ آگئی ہے بس اس کے سہارے اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ عزیز ڈارنے ــــ میں

تمہاری بیوی کے پاس سے آرہا ہوں۔"

قیدی حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

"اس کی طرف سے ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔"

"کیا ہے وہ؟"

"بڑی لجاجت سے اس نے بہت ہی درد بھرے لہجہ میں کہا ہے۔ تمہیں اسکی آواز تو یاد ہوگی۔ جو تمہیں اتنی عزیز تھی۔ اس نے ایک التجا کی ہے۔"

قیدی نے تھوڑا سا اپنا چہرا ایک طرف کو موڑ لیا۔

"میں یہ پیغام تم تک کیوں لایا ہوں۔ نہ تمہارے پاس وقت ہے کہ اس کی تفصیل پوچھو اور نہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ میں بیان کر سکوں۔ بس تمہیں فوراً اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ تم اپنے جوتے اتار دو۔ اور یہ میرے جوتے پہن لو۔"

قیدی کی پشت پر کوٹھری کی دیوار سے لگی ایک کرسی رکھی تھی۔ کارٹن نے بجلی کی سی پھرتی سے ڈارنے کو اس پر زبردستی بٹھا دیا اور خود جوتے اتار کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا

"یہ میرے جوتے پہن لو۔ ذرا زور لگاؤ۔ ہمت سے کام لو۔ جلدی کرو۔"

"کارٹن یہاں سے فرار ناممکن ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤگے۔ یہ نرا پاگل پن ہے۔"

"اگر میں تم سے بھاگ نکلنے کو کہوں تو واقعی پاگل پن ہوگا۔ مگر میں نے تم سے کب کہا بھاگ نکلنے کو۔ جب میں تم سے کہوں کہ اس دروازے سے باہر قدم نکالو تو

مجھے کہہ دینا۔ یہ پاگل پن ہے مت جانا۔ لو یہ گلے کا رومال تبدیل کرلو۔ اور میرا کوٹ بھی پہن لو۔ اتنے میں فیتہ تمہارے بالوں سے کھول کر تمہارے بال اپنی طرح پریشان کئے دیتا ہوں۔"

نہایت پھرتی سے اس نے اپنی ذہنی اور جسمانی طاقت کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا اور چارلس ڈارنے میں جلدی جلدی تبدیلی پیدا کردی۔ قیدی اس کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوا تھا۔

"کارٹن ۔۔ میرے پیارے دوست۔ یہ دیوانہ پن ہے۔ اس میں کسی طرح کامیابی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کئی دفعہ لوگوں نے کوشش کی ہے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ میری تلخیوں میں اپنی موت کو مت شامل کرو۔"

"عزیز ڈارنے میں نے تم سے دروازہ سے گذرنے کو کب کہا۔ جب میں کہوں تو صاف انکار کردینا میز پر کاغذ اور قلم دوات ہے۔ کیا تمہارے ہاتھوں میں اتنا دم ہے کہ کچھ لکھ سکو؟"

"جب تم آئے تھے جب تک تو دم تھا۔"

"اچھا تو پھر تیار ہو جاؤ۔ جو میں بولتا جاؤں وہ لکھتے جاؤ۔ جلدی کرو دوست، جلدی۔"

وحشت زدہ ہو کر ڈارنے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبوچ لیا اور میز کے پاس بیٹھ گیا۔ کارٹن اپنا دایاں ہاتھ اپنے گریباں میں چھپائے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"جو میں بولتا جاؤں بس وہی لکھتے جاؤ۔"

"کس کو خطاب کروں؟"

"کسی کو بھی نہیں۔" کارٹن کا ہاتھ اب بھی اس کی بغل میں چھپا ہوا تھا۔

"تاریخ ڈالوں؟"

"نہیں!"

ہر سوال پر قیدی نظر اٹھا کر اوپر دیکھتا جاتا تھا۔ کارٹن کھڑا ہوا نیچے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ سینے پر چھپا ہوا تھا۔

"شاید تمہیں یاد ہوگا۔" کارٹن نے لکھنے کے لیے بولنا شروع کیا۔ "عرصہ ہوا جو ہمارے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ اس تحریر کو دیکھنے کے بعد سب کچھ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ مجھے معلوم ہے تمہیں وہ الفاظ یاد ہوں گے۔ انھیں بھول جانا تمہاری عادت کے خلاف ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ گریبان سے نکال رہا تھا۔ اس وقت اتفاق سے قیدی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کارٹن نے پھر جلدی سے کوئی چیز بغل میں چھپالی۔

"تم نے لکھا اُن کو بھول جانا'۔" کارٹن نے پوچھا۔

"ہاں لکھا۔ کیا تمہارے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہے؟"

"نہیں ــــ میں مسلح نہیں ہوں۔"

"پھر تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ لکھو۔ بس چند لفظ اور باقی ہیں۔" اس نے پھر لکھوانا شروع کیا۔ "مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ وہ وقت آگیا ہے جب میں اپنا وعدہ سچا ثابت کر کے دکھا سکوں گا۔ اپنا وعدہ پورا کرتے وقت۔ نہ مجھے رنج ہے نہ پچھتاوا۔" یہ کہتے کہتے اس نے آہستہ سے گریباں سے ہاتھ نکال کر لکھنے والے کے چہرے کی طرف بڑھایا۔

ڈارنے کے ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا اور اس نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کس قسم کے بخارات ہیں؟"

"بخارات؟"

"ہاں۔ ابھی۔ میری ناک میں کچھ محسوس ہوا۔"

"مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ قلم اٹھاؤ اور تحریر مکمل کرو۔ جلدی۔ جلدی۔!"

ایسا معلوم ہوتا تھا قیدی کے جملہ حواس بکھرے جا رہے ہیں۔ اس کی یادداشت گم ہو رہی ہے اس نے اپنی پوری کوشش صرف کر کے پھر توجہ دینا چاہی۔ اس نے کارٹن کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ سانس کی رفتار بگڑ گئی تھی۔ کارٹن نے ہاتھ گریباں میں چھپا لیا تھا۔ اور اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"جلدی کرو۔ جلدی۔"

قیدی پھر کاغذ پر جھک گیا۔

"اگر حالات کچھ اور ہوتے تو مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فی الحال خیال نہ آتا ـــ اگر حالات کچھ مختلف ہوتے تو۔" کارٹن کا ہاتھ پھر آہستہ آہستہ چوری چوری نیچے آ رہا تھا۔ اب اس کا ہاتھ قیدی کے چہرے پر تھا "تو مجھے بہت سی باتوں کا جوابدہ ہونا پڑتا۔ اگر حالات مختلف ہوتے تو۔" کارٹن نے دیکھا قلم بہت رک رہا تھا۔ اور الفاظ ٹیڑھے میڑھے بے معنی بن رہے تھے۔

اب کارٹن کا ہاتھ واپس اپنے گریباں کی طرف نہیں گیا۔ قیدی ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور ملامت کی نظروں سے گھورنے لگا۔ مگر کارٹن کا ہاتھ اس کے نتھنوں پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ الٹے ہاتھ سے اس نے اس کی کمر کو جکڑ لیا۔ تھوڑی دیر چارلس ڈارنے اس شخص کے خلاف جدوجہد کی کوشش کرتا رہا جو اس کے لئے اپنی جان دینے آیا تھا۔ مگر ایک منٹ کے اندر اندر وہ بے ہوش ہو کر فرش پر دراز ہو گیا۔

مضبوط ارادے کے ساتھ نہایت تیزی سے کارٹن نے قیدی کے وہ کپڑے پہن لئے جو اس نے اتار کر رکھے تھے۔ کنگھی کر کے اس فیتے سے اپنے بال باندھ لئے جو پہلے قیدی کے بالوں میں بندھا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔

"آجاؤ ـــ اندر آجاؤ ـــ" اور مخبر اندر داخل ہوا۔

"دیکھ رہے ہو؟" بیہوش آدمی کے قریب ایک گھٹنے کے بل جھک کر اسکی

جیب میں کاغذات ٹھونستے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں بہت خطرہ ہے؟"

"مسٹر کارٹن۔ یہاں اتنی گڑبڑ ہے۔ آپ اپنے قول پر قائم رہیں تو یہاں میرے لئے کوئی خطرہ نہیں۔"

"ڈرو نہیں میں آخری دم تک اپنا قول نبھاؤں گا۔"

"یہی لازم بھی ہے آپ کو ـــ اگر باون کی تعداد پوری کرنا ہے تو اس لباس میں کسی کو کچھ شبہ نہ ہوگا۔ اور پھر مجھے کوئی خوف نہ ہوگا۔"

"ڈرو مت۔ بہت جلد میں تمہیں نقصان پہونچانے کی حد سے گذر جاؤں گا اور باقی کے لوگ خدا نے چاہا تو یہاں سے بہت دُور پہونچ چکے ہوں گے۔ اچھا بس اب مدد کے لئے کسی کو بلاؤ اور مجھے گاڑی میں پہونچا دو۔"

"آپ کو ـــ" مخبر نے گھبرا کر کہا۔

"اسے ـــ پہلے آدمی جس سے میں نے کپڑے تبدیل کر لئے ہیں۔ جس دروازے سے مجھے لائے تھے اسی راستے واپس جاؤ گے نا؟"

"یقیناً۔"

"جب تم مجھے لائے تھے تو میں کمزور اور نڈھال ہو رہا تھا اور جب باہر لے جا رہے ہو تو میں اور بھی پست ہو رہا ہوں۔ جدائی کے منظر نے مجھے بے حال کر ڈالا ہے۔ ایسے حادثات اکثر ہوا کرتے ہیں۔ اب تمہاری زندگی خود تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ جلدی کرو ـــ مدد گار بلاؤ ـــ"

"آپ قسم کھایئے کہ میرا راز فاش نہیں کریں گے۔"

"کیا عجیب آدمی ہے۔ کیا میں نے بڑی سے بڑی قسم کھا کر وعدہ نہیں کیا ہے کہ میں اس کام کو بخیر و خوبی انجام دوں گا۔ کیوں بیکار وقت ضائع کرتے ہو۔ تم خود اسے احاطے میں لے جاؤ۔ گاڑی میں بٹھا کر مسٹر لاری کے سپرد کر دو۔ ان سے کہہ دینا سوائے تازہ ہوا کے کسی اور دوا دارو کی ضرورت نہیں۔ اور میری کل رات کی بات اور اپنا وعدہ یاد رکھیں۔ اور فوراً روانہ ہو جائیں!"

مخبر چلا گیا۔ کارٹن اپنے ہاتھوں سے سر تھام کر میز پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی مخبر دو آدمیوں کے ساتھ داخل ہوا۔

"ارے واہ! دوست کے نام سینٹ گلوٹین کی لاٹری کا ٹکٹ نکل آیا تو بے چارہ چت ہو گیا!" ان میں سے ایک نے گرے ہوئے آدمی کو دیکھ کر کہا۔

"لیکن اگر اس کے نام خالی پرچی نکلتی اور یہ بچ جاتا تو ایک سچے قوم پرست کو بھی کچھ اس قسم سے کم صدمہ نہ ہوتا۔" دوسرے نے کہا۔

انہوں نے بے ہوش انسان کو اٹھا کر ٹکٹکی پر لٹا دیا جو وہ دروازے کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ اور جھک کر اسے اٹھا کر لے جانے لگے۔

"ایورمونڈ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔" مخبر نے تنبیہاً کہا۔

"میں خوب جانتا ہوں۔ میری التجا ہے کہ میرے دوست کو احتیاط سے پہونچا دینا۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"چلو آؤ بھی ۔۔۔ اسے اٹھاؤ اور لے چلو" برسا ڈ نے کہا

دروازہ بند ہو گیا اور کارٹن تنہا رہ گیا۔ اس نے اپنی پوری سماعت کی طاقت لگا کر سننا چاہا کہ باہر کوئی غل وغیرہ تو نہیں مچ رہا ہے کسی کو شبہ تو نہیں ہو گیا مگر کوئی غیر معمولی گڑبڑ سنائی نہیں دی۔ کنجیاں گھمائی گئیں۔ دروازے کھڑکھڑائے اور قدموں کی چاپ دور برآمدے میں ڈوب گئی۔ اطمینان کا سانس لے کر وہ میز پر بیٹھ گیا اور پھر غور سے سننے لگا۔ یہاں تک کہ دو بج گئے۔

اب وہ آوازیں ابھرنے لگیں۔ جن کا مطلب وہ خوب سمجھتا تھا مگر خوفزدہ نہیں تھا۔ متواتر کئی دروازے کھولے گئے۔ آخر میں اس کا دروازہ بھی کھلا۔ ایک جیلر نے جس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی اندر جھانک کر صرف اتنا کہا۔

"میرے ساتھ آؤ ایورمونڈ" اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا تھوڑے فاصلہ پر ایک بڑے سے اندھیرے کمرے میں پہونچ گیا۔ وہ ایک تاریک جاڑوں کا دن تھا۔ باہر بھی سائے تھے کچھ اندر بھی سائے تھے۔ اس لئے وہ ان لوگوں کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا جو ہاتھ باندھنے کے لئے اس کمرے میں لائے گئے تھے۔ کچھ کھڑے تھے کچھ رو پیٹ رہے تھے۔ کچھ بے قراری سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے مگر ایسے لوگ تعداد میں کم تھے زیادہ تر لوگ خاموش اور ساکت تھے اور زمین پر نظریں جمائے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب وہ دیوار سے لگا ہوا ایک تاریک گوشے میں کھڑا تھا اور باون اشخاص جمع کئے جا رہے تھے تو ایک شخص اس سے بغل گیر ہونے کے لئے رکا۔ شاید وہ اسے جانتا تھا۔ راز

افشا ہو جانے کا خوف دم بھر کے لئے اس پر چھا گیا۔ مگر وہ آدمی آگے بڑھ گیا۔

اس کے چند ہی لمحوں بعد ایک نوجوان دبلی پتلی لڑکی جسے اس نے وہاں بیٹھے دیکھا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس سے بات کرنے کے لئے آگے بڑھی اس کا بھولا سا معصوم دبلا پتلا چہرا تھا جس میں رنگ کی رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔ اور بڑی بڑی حیرت سے کھلی ہوئی صبر سے لبریز آنکھیں تھیں۔

" سٹیزن الیورمونڈ۔ میں وہی غریب درزن ہوں جو آپ کے ساتھ لافورس میں مقید تھی۔" اس نے اپنا کمزور برف سا سرد ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھدیا۔

" اچھا۔ مگر میں یہ بھول گیا کہ تم پر کیا الزام لگایا گیا ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

" سازش! مگر خدا جانتا ہے میں بالکل بے قصور ہوں۔ ذرا سوچئے تو۔ بھلا مجھ جیسی کمزور اور بے بس لڑکی کے ساتھ مل کر کون سازش کرے گا۔"

جس پُر درد انداز میں اس نے اپنی رام کہانی سنائی اس سے کارٹن کا جی بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

" میں موت سے نہیں ڈرتی۔ مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا! ری پبلک کو جو ہم غریبوں کی بھلائی کے لئے اپنا بہت کچھ کرنے والی ہے میری موت سے کچھ فائدہ پہونچتا تو مجھے مرنے سے انکار نہیں۔ مگر میری سمجھ کام نہیں کرتی۔ سٹیزن الیورمونڈ۔ بھلا مجھ جیسی ناچیز اور کمزور ہستی کی موت سے ری پبلک کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔"

وہ شخصیت جس نے زندگی میں آخری بار اس کے دل میں عزت پیدا کی اور پیار کے جذبہ کو اُبھارا وہ وہی قابل رحم لڑکی تھی۔

"میں نے سنا تھا سٹیزن ایورمونڈ کہ آپ رہا کر دیئے گئے۔ مجھے امید تھی کہ وہ خبر ٹھیک ہوگی"

"وہ خبر صحیح تھی مگر مجھے پھر گرفتار کر کے موت کی سزا دیدی گئی"

"اگر میں آپ کے چھکڑے میں لے جائی گئی سٹیزن ایورمونڈ تو آپ مجھے اپنا ہاتھ تھام لینے دیں گے۔ میں ڈرتی تو نہیں ہوں مگر میں بہت کمزور اور نازک سی ہوں۔ آپ کے ہاتھ کے سہارے سے ڈھارس بندھی رہے گی"

لڑکی نے صبر سے لبریز آنکھیں جب کارٹن کی طرف اٹھائیں تو اس نے ان آنکھوں میں شبہ اور حیرت کی جھلک دیکھی اس نے اس کا بھوک اور کام کاج کا مارا دُبلا پتلا ہاتھ دبایا۔ اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھدی۔

"آپ ان کی خاطر اپنی جان دے رہے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ــــ خاموش ــــ اس کی بیوی اور بچی کی خاطر"

"اوہ ــــ اے بہادر اجنبی، آپ مجھے اپنا ہاتھ تھام لینے دیں گے"

"شش! ہاں میری پیاری معصوم بہن ــــ آخری لمحہ تک!"

وہی اندھیرے جو قید خانہ پر چھائے ہوئے ہیں، سہ پہر کے وقت سرحد کے

قریب اس مجمع پر بھی اپنا سایہ ڈال رہے ہیں جو پیرس کی طرف سے آنے والی گاڑی کے گرد جمع تھا۔ اور جس کا معائنہ ہونے والا ہے۔

"کون جا رہا ہے۔ اندر کون کون ہے۔ کاغذات کہاں ہیں؟"

"کاغذات پیش کئے گئے۔"

"الکزنڈر مانیزٹ ۔۔۔ معالج قومیت فرانسیسی۔ کون ہے وہ؟"

وہ یہی ہیں۔ یہ مجبور و لاچار گم سم بیٹھے نہ جانے کیا آپ ہی آپ بڑبڑا رہے ہیں۔ کھوئے کھوئے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا گیا۔

"معلوم ہوتا ہے سٹیزن ڈاکٹر اپنے ہوش و حواس میں نہیں۔ انقلابی بحران بے چارے کے لئے بہت بھاری ثابت ہوا؟"

ہاں بہت کٹھن ثابت ہوا۔

"ہا ہا ۔ بہتیرے اس دبا کے مارے نظر آتے ہیں۔ لوسی ۔۔ اس کی بیٹی ۔۔ فرانسیسی کون سی ہے؟"

یہ نہیں وہ۔

"اندازے سے تو یہی معلوم ہوتی ہے ۔۔ لوسی ۔۔ ایورمونڈ کی بیوی ہے نا؟"

جی ہاں۔

"ہا ہا ۔۔ ایورمونڈ کا ایک دوسری جگہ کا بلاوا ہے آج ۔۔ لوسی ۔۔ اس کی بچی ۔۔ قومیت انگریز ۔۔ یہی ہے نا؟"

ہاں یہ وہی ہے۔

"اے ایورمونڈ کی بچی۔ ہمیں پیار کر۔ ہاں۔ آج تم نے ری پبلک کے ایک اچھے شہری کا بوسہ لیا۔ یاد رکھنا خاندان میں یہ بالکل انوکھی بات ہوئی ہے۔ سڈنی کارٹن، وکیل قومیت انگریز — کون ہے بھئی"

وہ گاڑی کے اس کونے میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے

"معلوم ہوتا ہے انگریز وکیل بے ہوش ہو گیا ہے"

ہاں مگر تازہ ہوا میں اس کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اس کی صحت اچھی نہیں ہے۔ ایک ایسے دوست سے جدا ہو کر آیا ہے جسے جمہوریت نے معتوب کر دیا ہے

بس اتنی سی بات ہے ایسی یہ کون سی بڑی بات ہے۔ بہتوں پر جمہوریت کا عتاب نازل ہو رہا ہے۔ اور انھیں سولی کی کھڑکی میں سے گردن نکال کر جھانکنا پڑے گا۔ جارویس لاری — بینکر — قومیت انگریز — کون سا ہے وہ"

"میں ہوں — کیوں میں ہی باقی رہ گیا ہوں"

ان تمام سوالوں کے جواب جارویس لاری ہی نے دیئے تھے۔ وہی گاڑی سے اتر کر دروازہ تھامے افسروں کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے گھوم کر بڑے سکون سے گاڑی کے اوپر چڑھ کر مختصر سے سامان کا

معائنہ کر رہے ہیں۔ جو چھت پر رکھا ہے۔ دیہاتی لوگ چاروں طرف جمع ہو کر گاڑی کے اندر بھوکی بھوکی نظروں سے گھور رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے بچے کا ہاتھ جسے ماں گود میں اٹھائے ہوئے ہے آگے بڑھایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ رئیس زادے کی بیوی کو چھو سکے۔ جسے آج سولی دی جا رہی ہے۔

"یہ لو چاروس لاری اپنے کاغذات۔ ان پر دستخط کر دیئے گئے ہیں۔"

"اب ہم جا سکتے ہیں؟۔ سیٹیزن؟"

"ہاں اب جا سکتے ہو۔ آگے بڑھو کوچوان ۔۔۔ سفر مبارک ہو۔"

"آداب عرض کرتا ہوں سیٹیزن۔ اور پہلے خطرے سے تو گذر گئے!!"

یہ الفاظ بھی چاروس لاری ہی نے کہے۔ اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے مضبوط جکڑ کر اوپر دیکھنے لگے۔ گاڑی میں وحشت طاری ہے۔ آنسو بہائے جا رہے ہیں۔ بیہوش مسافر کی بھاری سانسیں گاڑی میں سنائی دے رہی ہیں "ہم بہت آہستہ جا رہے ہیں۔ کیا کوچوانوں کو تیز چلنے کی تاکید نہیں کی جا سکتی" لوسی ضعیف مرد سے لپٹ کر کہتی ہے۔

"عزیز من ۔۔۔ اس سے فرار کا شبہ ہو جائے گا۔ ہم ان سے گاڑی تیز چلانے کو کہیں تو شاید کسی کو شک ہو جائے۔"

"ذرا پیچھے دیکھئے۔ کہیں ہمارا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا ہے؟"

"ابھی تک تو سڑک خالی ہے۔ پیاری بیٹی۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا جا رہا ہے۔"

ڈو ڈو تین تین گھر پہلو سے گذرتے جا رہے ہیں۔ سنسان کھیت۔ تباہ شدہ عمارتیں رنگ سازی کا کارخانہ، چمڑے کا کارخانہ وغیرہ وغیرہ، پھر کھلا دیہات اور لنڈ منڈ پیڑوں کے جھرمٹ گذرتے جا رہے ہیں۔ سڑک نہایت ناہموار ہے۔ سڑک کے دونوں طرف نرم کیچڑ ہے، کبھی اینٹ پتھر سے بچنے کے لئے جو کہ گاڑی کو ہلائے ڈالتے ہیں ہمیں کنارے کی کیچڑ میں گاڑی اتارنی پڑتی ہے۔ کبھی گڈھوں اور دلدل میں پہئے دھنس جاتے ہیں۔ اس وقت خوف اور بے چینی اس قدر شدت سے بڑھ جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے وحشت زدہ ہو کر اتر پڑیں۔ بھاگ کر کہیں چھپ جائیں۔ چاہے کچھ بھی کرلیں۔ مگر رکیں نہیں۔

کھلے دیہات سے گذر کر پھر تباہ شدہ عمارتیں نظر آتی ہیں۔ وہی سنسان کھیت، رنگوں کا کارخانہ — چمڑے کا کارخانہ وغیرہ وغیرہ۔ دُو دُو تین تین گھر پہلو سے گذرتے جا رہے ہیں۔ پھر وہی لنڈ منڈ درختوں کے جھنڈ! کیا یہ کوچوان ہمیں دھوکا دے کر واپس دوسرے راستے سے لوٹائے لئے جا رہے ہیں۔ کیا یہ وہی جگہ تو نہیں جو پہلے گذر چکی ہے نہیں شکر خدا کا — ایک گاؤں دکھائی دے رہا ہے۔ پیچھے دیکھو پیچھے! دیکھو تمہارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا ہے۔

• شش — خاموش — ڈاک گھر آگیا!

بڑے آرام سے ہمارے چاروں گھوڑے کھولے جاتے ہیں۔ گاڑی مختصر سی گلی میں بڑے سکون سے کھڑی ہے اس میں سے گھوڑے کھول لئے گئے ہیں ایسا معلوم

ہوتا ہے۔ یہ گاڑی اب کبھی نہیں چلے گی۔ بڑے اطمینان سے تازہ دم گھوڑے نظر آتے ہیں۔ نئے کوچوان بڑے سکون سے اپنے ہنٹروں کو تھوک میں تر کر کے اینٹھ گوندھ رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک نئے کوچوان مزے مزے سے ٹہلتے ہوئے آتے ہیں پرانے کوچوان دھیرے دھیرے دیا ہوا کرایہ گنتے ہیں۔ غلط گن جاتے ہیں۔ دوبارہ گنتے ہیں۔ آخر کو اوپری دل سے صبر کر لیتے ہیں۔ اس عرصہ میں دل خوف سے بوکھلائے ہوئے اس تیز رفتاری سے دھڑک رہے ہیں کہ روئے زمین کے سب سے زیادہ تیز دوڑنے والے گھوڑے کو بھی سرپٹ دوڑنے میں چھوڑ جائیں۔

آخر کار نئے کوچوان اپنی اپنی زین پر بیٹھ جاتے ہیں اور پرانے کوچوان پیچھے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ہم گاؤں سے گذر کر پہاڑی پر چڑھتے ہیں۔ پار اتر کر نیچے ترائی میں گذرنے لگتے ہیں۔ ایک دم کوچوان تیزی سے ہاتھ چلا چلا کر آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور گھوڑے ایسے اچانک روک لئے جاتے ہیں کہ وہ الف ہونے لگتے ہیں۔ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

"اے ــ گاڑی میں جانے والو ــ جواب دو!"

"کیا بات ہے؟" یلاری نے کھڑکی میں سے جھانک کر پوچھا۔

"کیا تعداد بتائی تھی لوگوں نے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!"

"پچھلے ڈاک کے اسٹیشن پر سولی پر چڑھائے جانے والوں کی کیا تعداد

بتائی گئی ہے:

"باون بٹ"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ خاصی اچھی تعداد ہے۔ یہ میرا ساتھی شہری بیالیس ۴۲ ہی میں مگن ہوا جارہا تھا۔ بھئی دس کھوپڑیاں کافی ہوتی ہیں۔ اچھی بھلی چل رہی ہے سولی: میں تو قربان ہوں اس پر"

"جاؤ آگے بڑھو —— تخ تخ!"

اندھیری رات گھر آئی ہے۔ وہ متحرک ہو کر ہوش میں آتا جارہا ہے اس کا خیال ہے۔ وہ دونوں اب بھی اس جگہ ساتھ ساتھ ہیں۔ وہ اس کے بارے میں پوچھتا ہے —— اس کا نام لے کر پوچھتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں کیا پکڑے ہوئے ہے۔ رحم کر اے خدائے مہربان اور ہماری مدد فرما۔ ذرا دیکھو —— باہر کی طرف دیکھو —— کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔

ہمارے پیچھے ہوا جھپٹتی چلی جارہی ہے۔ بال اڑتے چلے جارہے ہیں اور چاند پیچھے ڈوبتا جارہا ہے۔ مگر اب تک ہمارا کوئی بھی تعاقب نہیں کر رہا ہے۔

چودھواں باب

"بُنائی ختم"

عین اس وقت جب بادن انسان اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ میڈم ڈیفارج انقلابی جیوری کے رُکن جیکوس نمبر تین اور " ونجنس " کے ساتھ خوفناک صلاح و مشورہ کر رہی تھی ۔ یہ مجلس بجائے شراب کی دوکان کے آرہ کش کی جھونپڑی میں منعقد ہو رہی تھی ۔ یہ آرہ کش پہلے سڑکوں کی مرمت کیا کرتا تھا آرہ کش بذات خود اس کانفرنس میں شریک نہیں تھا ۔ بلکہ ایک زمین کے گرد گھومنے والے چھوٹے سے سیارے کی طرح ایک طرف بیٹھا تھا ۔ جب تک اس کی رائے طلب نہ کی جائے اسے بولنے کی اجازت نہ تھی ۔

" مگر ہمارا ڈیفارج یقیناً ایک بہترین جمہوریت پسند انسان ہے ۔ کیوں ؟ " جیکوس نمبر تین نے پوچھا ۔

" فرانس میں اس سے بہتر کوئی نہیں " چرب زبان ونجنس نے اپنی تیز دھار دار آواز میں احتجاج کیا ۔

خاموش رہو پیاری ونجنس میری بات سنو " میڈم ڈیفارج نے

ذرا میں بے چین ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا شوہر ایک بہترین انقلابی اور ری پبلک کا بہادر شہری ہے۔ وہ ری پبلک کی عنایت کا حقدار ہے۔ اور بھروسے کا آدمی ہے۔ مگر میرے شوہر کی کچھ کمزوریاں ہیں اور اس کمزوری کی وجہ سے وہ ڈاکٹر کے ساتھ رعایت کرنا چاہتا ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ باتیں ایک اچھے شہری کو زیب نہیں دیتیں۔ افسوس کی بات ہے" جیکوس نمبر تین نے فکرمند ہو کر کہا۔ اس کی بے رحم انگلیاں اس کے پُرہوس ہونٹوں کو چھو رہی تھیں۔

"دیکھو مجھے تو اس ڈاکٹر سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میری بلا سے اسکا سر کٹے یا سلامت رہے۔ مگر ایورمونڈ کے خاندان کی بیخ کنی لازمی ہے۔ اس کے بعد اس کی بیوی کی باری ہے" میڈم نے کہا۔

"اس کا سر بھی بہت خوبصورت ہے! میں دیکھ چکا ہوں ایک دن۔ جب سمسن نے نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والے سر لٹکا کر دکھائے تھے تو بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے" عفریت صفت جیکوس نمبر تین نے عیش پرست انسان کی طرح کہا۔

میڈم ڈیفارج نے آنکھیں نیچی کر کے کچھ سوچا۔

"بچی کے بھی سنہری بال اور نیلی آنکھیں ہیں۔ مقتل میں ایسے حسین منظر کم دیکھنے کو ملتے ہیں" جیکوس نمبر تین نے تخیل میں اس منظر سے

لطف اندوز ہوکر کہا۔

"مختصر یہ کہ اس معاملے میں میں اپنے شوہر پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔ کل رات سے اس کو اپنے منصوبہ کے بارے میں بتاتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی خوف ہے کہ اگر اسے کہیں سے پتہ چل گیا تو وہ مخبری کر دے گا۔ اور وہ لوگ بچ کر نکل جائیں گے۔

میڈم نے گہرے سوچ سے چونک کر کہا۔

ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔ مردوں کی ہمارے پاس آج کل کمی ہے۔ روزانہ ایک سو بیس سر ہونے چاہئیں۔

"بات یہ ہے کہ میرے شوہر کو سارے خاندان نیست و نابود دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں محسوس ہوتی اور مجھے ڈاکٹر کے ساتھ رعایت کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی مجھے اپنے دل کی خوشی کرنا چاہیے۔ ادھر آؤ سیٹیزن"

میڈم ڈیفارج نے پکارا۔

آرہ کش جس کے دل میں میڈم کی بہت عزت تھی۔ مگر اس سے خوفزدہ بھی بہت بری طرح تھا۔ اپنی لال ٹوپی پر ہاتھ رکھے آگے بڑھا۔

"سنو تم نے لوسی کو قیدیوں سے اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ کیا تم آج اس کی گواہی دینے کو تیار ہو" میڈم نے سختی سے کہا "ہاں ہاں" آرہ کش بولا۔ کیوں نہیں۔ روزانہ خواہ کیسا ہی موسم ہو دو بجے سے چار بجے تک

وہ یہاں کھڑی اشارے کیا کرتی تھی۔ کبھی اس کے ساتھ اس کی بچی بھی ہوتی تھی اور کبھی نہیں ہوتی تھی۔ جو بات مجھے معلوم ہے اس سے انکار نہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

بات کرتے وقت وہ خوب ہاتھ چلا چلا کر اشارے کر رہا تھا۔ گویا اتفاقیہ وہ ان حرکات کی نقل کر رہا تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی وہ حرکتیں نہیں دیکھی تھیں۔

"صاف کھلی ہوئی سازش!" جیکوس نمبر تین نے کہا۔

"جیوری کی طرف سے تو کسی قسم کا شبہ نہیں۔" میڈم نے گھٹی ہوئی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

وطن پرست جیوری پر بھروسہ رکھو۔ عزیز سیٹیزن۔ میں اپنے ان ساتھیوں کی ذمہ داری لیتا ہوں۔"

"ایک دفعہ اور مجھے غور کر لینے دو۔ کیا اپنے شوہر کی خاطر اس ڈاکٹر کو چھوڑ دوں؟ مجھے کوئی خاص پروا نہیں۔ کیا چھوڑ دوں اسے؟"

"ویسے تو اس کا سر بھی گنتی میں آسکتا ہے۔ واقعی سروں کی بارے اس کچھ قلت ہی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔" جیکوس نمبر تین نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جب میں نے دیکھا تو بچی کے ساتھ وہ بھی اشارے کر رہا تھا۔ اگر ایک کا

ذکر کروں تو دوسرے کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔ مجھے خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ پورے مقدمہ کا بار اس معصوم شہری کے سر نہیں ڈال دینا چاہیئے۔ میں خود کچھ بری گواہ نہیں" میڈم نے ارشاد فرمایا۔

دکنس اور جیکوس نمبر تین ان دونوں نے پر جوش طریقہ پر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ رائے دی کہ میڈم نہایت قابل تعریف اور لاجواب گواہ ہیں۔ اور آرہ کش بھلا کیوں اس معاملہ میں پیچھے رہ جاتا۔ اس نے پر زور انداز میں کہا کہ وہ ایک آسمانی گواہ ہے۔

"نہیں میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتی۔ اسے بھی بھگتنا پڑے گا۔ آج تین بجے تمہیں فرصت نہیں ہوگی۔ آج جو گروہ قتل کیا جا رہا ہے اسے تو دیکھنے جاؤ گے نا ــــ تم؟" میڈم نے آرہ کش سے مخاطب ہو کر کہا ــــ

آرہ کش نے فوراً اثبات میں جواب دیا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ بھی یقین دلایا کہ وہ ری پبلک کا ایک نہایت جوشیلا حامی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو نہایت بدنصیب انسان سمجھے گا۔ اگر وہ قومی حجام کی کارگذاری کا منظر دیکھنے سے محروم رہا اور وہاں اطمینان اور سکون سے پائپ پینے کا موقع نہ ملا۔ جس جوش و خروش سے وہ قتل و غارت میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس سے میڈم کی سیاہ تیز و طرار آنکھوں سے یہ

بات نہ چھپ سکی کہ اسے خود اپنی جان کا ڈر لگا ہوا تھا۔
" مجھے بھی وہیں جانا ہے۔ رات کے قریب آٹھ بجے جب سب ختم ہو جائے گا تو میرے پاس سینٹ اینٹائن آنا اور ہم اپنے محلّے کے دفتر میں ان لوگوں کے خلاف گواہی دیں گے " میڈم نے کہا۔

آرہ کش نے کہا کہ خاتون سٹیزن کی خدمت میں حاضر ہونا اسکے لئے باعث عزت و فخر ہوگا۔ وطن پرست خاتون سٹیزن نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بری طرح سٹ پٹا گیا۔ ایک ڈرے ہوئے کتے کی طرح اس سے آنکھ چرا کر جلدی سے لکڑیوں کی طرف کھسک گیا اور آرے کے دستے کے پیچھے اپنا منہ چھپالیا۔

میڈم ڈیفارج نے جیوری کے مذکورہ رکن اور ونجنس کو مدد وانسہ کے قریب بلایا اور اس طرح اپنے منصوبہ کی تشریح کی۔ اس وقت وہ گھر پر اپنے شوہر کی موت کے غم میں رونے پیٹنے میں لگی ہوگی۔ اس کی ذہنی حالت اس وقت ری پبلک کے منصفانہ دعوے کے لئے بہت موزوں ثابت ہوگی۔ وہ ری پبلک کے دشمنوں کی طرف داری کرے گی۔ میں اس کے پاس جاتی ہوں "

" کیا لاجواب عورت ہے۔ بے مثال عورت ہے! جیکوس نمبر تین نے مسرت سے جھوم کر کہا۔

"ہائے میری لاڈلی!" وبجنس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم میری بنائی لیتی جاؤ۔ اور میری مقررہ کرسی پر رکھ دینا۔ اور میرے لئے جگہ رکھنا۔ جلدی سے جاؤ کیونکہ آج تو روزانہ سے زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوگی"

"اپنی سردار کا حکم سرآنکھوں پر" وبجنس نے مستعدی سے کہا اور اس کا گال چوم لیا "تم دیر تو نہیں کروگی"

"میں کھیل شروع ہونے سے پہلے پہونچ جاؤں گی"

"جھکڑے آنے سے پہلے آجانا۔ میری جان ضرور آنا" وبجنس نے پکار کر کہا۔ کیونکہ اتنی دیر میں میڈم سڑک پہ مڑگئی تھی۔ "جھکڑے آنے سے پہلے۔ اچھا"

میڈم نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس نے سن لیا۔ اپنا ہاتھ ہلادیا۔ کہ وہ ٹھیک وقت پر پہونچ جائے گی۔ یہ کہتی ہوئی وہ کیچڑ میں سے ہوتی ہوئی قیدخانہ کی دیوار کے کونے سے مڑگئی۔ جیوری کا رکن اور وبجنس تعریف کی نگاہوں سے اس کے حسین قد کو دیکھتے رہے اور اس کی اخلاقی برتری کے قائل ہوگئے۔

اس زمانہ میں ہزاروں عورتیں تھیں جنہیں حالات نے بدہیئت بنادیا تھا۔ مگر ان میں ایک بھی اس خوفناک بے رحم عورت کے مقابلہ کی

نہ تھی۔ جو اس وقت سڑک پر چلی جارہی تھی۔ وہ نہایت مضبوط اور نڈر کردار کی مالک تھی۔ مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ ساتھ مستقل مزاج بھی تھی۔ اس کا حسن کچھ اس قسم کا تھا جس سے مضبوطی اور کینہ پروری صرف ظاہر ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ دوسروں میں بھی بڑی شدت سے اس بات کا احساس پیدا کر دیتی تھی کہ انتشار کے زمانے میں اس کا عروج ایک لازمی شے تھی۔ مگر چونکہ بچپن سے اس میں احساس مظلومیت کوٹ کوٹ کر بھر گیا تھا اس لئے اسے ایک خاص طبقہ سے پرانا بغض تھا۔ ان تمام حالات نے مل کر اسے ایک شیرنی بنادیا تھا۔ اگر اس میں کوئی خوبی تھی تو وہ کبھی کی مر چکی تھی۔

اسے اس بات کا قطعی خیال نہ تھا کہ ایک بے قصور انسان اپنے باپ دادا کے گناہوں کی خاطر مارا جارہا ہے۔ وہ اسے نہیں صرف انھیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے قطعی کوئی پروا نہ تھی کہ اس کی بیوی اور بیوہ اور بچی یتیم ہونے والی تھی۔ یہ سزا بھی ناکافی تھی کیونکہ وہ اس کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ اس لئے اس کا شکار تھی۔ ان جیسوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس سے رحم کی التجا کرنا بے کار تھا کیونکہ اس کے دل میں خود اپنے لئے بھی رحم نہ تھا۔ اگر ان حملوں میں جن سے ان کا پالا پڑا وہ خود سڑک پر دھرلی جاتی تو اس وقت وہ خود پر کبھی رحم نہ کھاتی

اور اگر اس کی گردن کلہاڑی سے اڑا دیئے جانے کا حکم ملتا تب بھی مقتل میں جاتے وقت اس کے دل میں سوائے اس کے کوئی نرم سیال نہ پیدا ہوتا کہ کاش اس کی گردن اڑانے کا حکم دینے والا اس کی جگہ لے آیا جائے۔

اپنے کھُردرے لباس کے نیچے میڈم ڈیفارج اس قماش کا دل رکھتی تھی۔۔ لاپروائی سے پہنا ہوا یہ لباس ایک خاص خوفناک معنوں میں اس پر خوب سج رہا تھا۔ اور اس کے چمکیلے سیاہ بال سرخ ٹوپی کے نیچے شاندار معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سینے میں ایک بھرا ہوا پستول اور کمر میں ایک دھار دار خنجر چھپا تھا۔ اس طرح مسلح ہو کر وہ اپنے کردار کی شان کے مطابق اطمینان سے چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال میں لوچ دار بے ساختہ پن تھا۔ اس عورت کی طرح سڑک پر جا رہی تھی، جو بچپن میں برہنہ پا ٹانگیں کھولے سمندر کی بھوری ریت پر چلنے کی عادی رہی ہو۔

گاڑی اپنے آخری مسافر کے انتظار میں کھڑی تھی۔ رات کو انتظام کے وقت مس پروس کو لے جانے کے بارے میں بڑی دقتیں درپیش تھیں۔ مسٹر لاری کا خیال تھا کہ گاڑی میں زیادہ بوجھ بڑھانا ٹھیک نہیں دوسرے گاڑی میں کم سے کم مسافر ہوں تاکہ جانچ پڑتال میں زیادہ

وقت نہ لگے۔ کیونکہ بچ نکلنے کے لئے چند لمحے بھی بہت قیمتی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر موقع پر ایک اہم لمحہ بچانا چاہئے۔ لہذا انھوں نے طے کیا کہ مس پروس اور جیری بعد میں تین بجے کی اس ہلکی پھلکی گاڑی سے روانہ ہوں جو اس زمانہ میں چلا کرتی تھی۔ انھیں شہر سے جانے کا اجازت نامہ مل چکا تھا۔ چونکہ سامان وغیرہ ان کے ساتھ نہیں ہوگا، اس لئے وہ تیزی سے ان کی گاڑی کو جالیں گے۔ اس کے بعد آگے جا کر وہ پہلے سے تازہ دم گھوڑے حاصل کرلیں گے۔ اس طرح ان کی گاڑی تیزی سے سفر کر سکے گی۔ کیونکہ دیر ہو جانے میں خطرہ بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

مس پروس کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ کیونکہ اس طرح انھیں آڑے وقت میں مدد کرنے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو انہوں نے اور جیری نے جنھیں معلوم تھا کہ سامن کسے لا رہا ہے۔ چند لمحے بڑی پریشانی اور فکر کے گذارے مگر گاڑی کے جانے کے بعد اطمینان ہوا تو انھیں اپنی روانگی کی فکر ہوئی۔ ادھر وہ کھڑے آپس میں مشورہ کر رہے تھے ادھر میڈم ڈیفارج گلیوں میں سے گذرتی ہوئی سنسان احاطے کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔

"مسٹر کرنچر، اب آپ کا کیا خیال ہے۔ اگر ہم اس احاطے سے نہ روانہ ہوں تو بہتر ہے۔ ایک گاڑی پہلے یہاں سے روانہ ہو چکی ہے،

اب کہیں لوگوں کو شبہ نہ ہو جائے۔"

مس پروس نے کہا۔ وہ اس قدر پریشان تھیں کہ بولنا، کھڑے ہونا، ہلنا، چلنا حتیٰ کہ جینا بھی انھیں دشوار ہو رہا تھا۔

"میری تو رائے ہے مس صاحبہ کہ آپ کی رائے صحیح ہے۔ صحیح ہو یا غلط میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا"۔ مسٹر کرنچر نے کہا۔

"پیارے بچوں کی فکر کی وجہ سے میرے تو ہوش ٹھکانے نہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ مسٹر کرنچر کیا تم کوئی اچھی سی ترکیب سوچ سکتے ہو"؟ وحشت زدہ ہو کر مس پروس چلائیں۔

"موت کے بعد والی حالت میں تو کچھ سوچ سکتا ہوں مگر اس زندگی میں تو اپنی یہ مقدس کھوپڑی ذرا مشکل ہی سے کام کر سکتی ہے"۔ مسٹر کرنچر نے جواب دیا۔

"مس صاحبہ میں آپ کے ساتھ دو باتوں کا عہد کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا غور کر کے انھیں یاد کر لیجئے"۔

"اے ہے خدا کے واسطے! فوراً بتاؤ بھلے آدمی اور ان کا قصہ ختم کرو"۔ مس پروس نے پریشانی سے روتے ہوئے کہا۔

پہلی بات تو یہ ۔۔۔ کہ وہ غریب لوگ جو گزر گئے ۔۔۔ ان کے

ساتھ اب آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں کروں گا۔۔۔“
مسٹر کرنچر کا منہ فق تھا اور بڑی طرح لرز رہے تھے۔

”یقیناً۔۔۔ وہ جو کچھ بھی ہو۔۔۔ تفصیل کی کوئی ضرورت نہیں یقیناً تم کہتے ہو کہ کبھی نہیں کروگے۔ تو بس مجھے یقین ہے۔“ مس پروس نے کہا۔

”نہیں مس صاحبہ اس کا آپ سے ذکر نہیں کروں گا۔ دوسری بات یہ کہ اب وہ غریب، گذرے ہوئے لوگوں کا قصہ طے ہوگیا، تو اب میں مسٹر کرنچر کے ٹکریں مارنے میں بھی کوئی دخل نہیں دوں گا۔“

”کوئی گھرداری کے بارے میں کچھ ہوگا۔۔۔ خیر۔ میرے خیال میں اگر اس کام کو مسٹر کرنچر کی زیر نگرانی چھوڑ دیا جائے تو بالکل کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہائے میرے بچے۔ نہ جانے کیا گذر رہی ہوگی ان پر!“ مس پروس نے آنسو پونچھ کر اپنے دل کو سنبھالنا چاہا۔

”میں تو یہ بھی کہنے کو تیار ہوں مس صاحبہ۔ اور قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے الفاظ لکھ لیجئے۔ اور مسز کرنچر کو پہونچا دیجئے گا کہ ٹکریں مارنے کے بارے میں میری رائے تبدیل ہوگئی ہے اور میرا

دلی تمنا ہے کہ کاش مسز کرنچر اس وقت بھی ٹکریں مار رہی ہوں"! مسٹر کرنچر ایسے لیکچر جھاڑنے لگے جیسے وہ گرجے میں ممبر پر کھڑے ہوئے ہوں۔
"ارے ارے ــــ مجھے امید ہے کہ جیسا آپ کہہ رہے ہیں وہ ویسا ہی کر رہی ہوں گی۔ اور اپنی امید کے مطابق اس سے فیض حاصل کر رہی ہوں گی" بد حواس مس پروس نے کہا۔
"خدا نہ کرے!" مسٹر کرنچر نے اور زیادہ سنجیدگی سے بہت آہستگی سے رک رک کر کہا: "اس کا جبر میرے قول اور فعل کی وجہ سے اور ان بدنصیبوں کی وجہ سے مجھ پر پڑے۔ خدا نہ کرے ہم سب کو ٹکریں مارنا چاہیئے۔ اگر اس سے کوئی آسانی پیدا ہونے کی امید ہو تب تو ــــ ان کو اس تاریک خطرے سے بچایا جا سکے۔ خدا نہ کرے مس صاحبہ جیسا کہ میں نے کہا ــــ خدا نہ کرے" مسٹر کرنچر کو اس سے بہتر اور سلجھی ہوئی بات نہ ملی تو انہوں نے یہی کہہ ڈالا۔
ادھر میڈم ڈیفارج گلیوں میں راستہ طے کرتی ہوئی قریب اور قریب تر آ رہی تھی۔
"اگر ہم کبھی اپنے وطن پہونچ گئے نا ــــ تو یقین مانو جو کچھ تم نے اس خوبصورتی سے کہا اور جتنا کچھ میری سمجھ میں آیا ہے اور جتنا یاد رہے گا۔ میں سب مسز کرنچر تک پہونچا دونگی۔ اور میں خود

اس خوفناک وقت میں تمہاری سنجیدگی کے بارے میں گواہی دوں گی۔ اب کوئی ترکیب سوچنا چاہیئے۔ میرے قابل عزت مسٹر کرنچر کوئی ترکیب سوچنے کی کوشش کریں۔ مس پروس نے کہا۔ ادھر میڈم دیفارج راستہ طے کرتی قریب تر چلی آرہی تھی۔

"اگر تم پہلے سے چلے جاؤ اور گاڑی گھوڑے وہیں رکوا کر میرا انتظار کرو تو کیا ہی اچھا ہو۔ کیوں؟"

مسٹر کرنچر نے سوچا یہ بالکل ٹھیک بات ہوگی۔

"کہاں مسٹر کرنچر میرا انتظار کروگے؟" مس پروس نے پوچھا۔

مسٹر کرنچر ایسے بوکھلا رہے تھے کہ سوائے ٹیمپل بار کے انہیں اور کوئی جگہ نہ سوجھی۔ مگر ٹیمپل بار ہزاروں میل کے فاصلہ پر تھی۔ اور میڈم ڈیفارج قریب آرہی تھی۔

"گرجا کے دروازے کے پاس۔ اگر مجھے بڑے گرجا کے دروازے کے پاس دونوں میناروں کے بیچ میں ساتھ لے لو تو کیا بہت چکر پڑ جائے گا؟" مس پروس نے کہا۔

"نہیں مس صاحب!" کرنچر نے جواب دیا۔

"اچھا بھلے آدمی کی طرح جلدی ڈاک گھر جاؤ اور یہ اتنی سی

تبدیلی کرا دو" مس پروس بولیں۔

"آپ کو اکیلے چھوڑ کر جاتے ہوئے ذرا مجھے خدشہ محسوس ہو رہا ہے۔ خدا جانے کیا ہو جائے!" مسٹر کریچر نے ہچکچاتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔

"یہ تو خدا ہی جانے ـــ مگر میری فکر مت کرو۔ مجھے گرجا کے سامنے یا اس کے پاس سے تین بجے لے لینا۔ یہاں سے روانہ ہونے سے تو بہتر ہوگا۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ خدا نگہبان مسٹر کریچر۔ میرا نہیں ان زندگیوں کا خیال کرو جن کا ہمارے اوپر دارومدار ہے" مس پروس نے جواب دیا۔

اس لمبی چوڑی تمہید کے بعد مس پروس نے اس قدر دکھ بھری التجا کے ساتھ ان کا ہاتھ دبایا کہ مسٹر کریچر فوراً تیار ہو گئے۔ ہمت بڑھانے کے لئے انہوں نے سر ہلایا اور تیزی سے انتظام میں تبدیلی کرنے اور انھیں تجویز کے مطابق بعد میں لینے کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔

احتیاطاً جو ترکیب سوچی گئی تھی اس پر عمل کیا جا رہا تھا اس سے مس پروس کو کچھ ڈھارس بندھی انہوں نے اپنے آپ کو ظاہری طور پر کافی سنبھال لیا۔ تاکہ انھیں پریشان دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہو۔ اس

طرف سے اطمینان ہوگیا تو انھوں نے سوچا وقت بہت کم ہے
اس لئے فوراً تیار ہونا چاہئے۔

اکیلے سنسان گھر میں مس پرکس کو ڈر لگ رہا تھا: ایسا معلوم
ہوتا تھا ہر دروازے کے پیچھے سے کوئی چہرہ جھانک رہا ہے ان
کی آنکھیں سرخ ہوکر سوج گئی تھیں۔ اس لئے تسلے میں ٹھنڈا پانی
لے کر آنکھیں دھونے لگیں۔ گھبراہٹ اور وہم کی وجہ سے وہ ایسی
بدحواس ہوگئی تھیں کہ دیر تک آنکھیں بند کرتے بھی ڈر لگ رہا تھا
اور بار بار پانی ٹپکاتے میں رک جاتیں۔ اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے
لگتیں۔ ایک دفعہ جو پانی ٹپکاتے میں انہوں نے رک کر آنکھیں کھولیں
تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی انہوں نے سامنے دروازے میں کسی کو
کھڑے ہوئے دیکھا۔

تسلہ گر کر ٹوٹ گیا اور پانی میڈم ڈیفارج کے قدموں تک بہہ
گیا! بڑے دشوار گذار راستوں میں خون آلود ہونے کے بعد وہ قدم
آج اس پانی سے بھیگ گئے۔

"ایورمونڈ کی بیوی کہاں ہے؟" میڈم ڈیفارج نے سرد مہری
سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

ایک دم مس پروس کو ڈر ہوا کہ سب دروازے کھلے ہوئے ہیں

اور اسے ان کے بھاگ جانے کا پتہ چل جائے گا۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ ان چاروں دروازوں کو بند کر دیا۔ پھر وہ اس دروازے پر جو لوسی کے کمرے میں کھلتا تھا ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں میڈم ڈیفارج انھیں پھرتی سے دروازے بند کرتے اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد انھیں گھورنے لگی۔ مس پروس میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کی عمر نے ان سے جنگلی پن چھڑایا نہ تھا۔ اور نہ انکی شکل و صورت اور خرانٹ پن میں نرمی گھولی تھی۔ لیکن وہ اب بھی اپنے میدان میں ایک ثابت قدم عورت تھیں۔ انھوں نے میڈم ڈیفارج کو سر سے پیر تک آنکھوں ہی آنکھوں میں تولا۔

"چاہے صورت شکل سے تم شیطان کی جورو ہی کیوں نہ لگتی ہو مجھ سے قطعی نہیں جیت سکوگی۔ میں ایک انگریز عورت ہوں" مس پروس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میڈم ڈیفارج نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا مگر اسکی آنکھوں میں بھی وہی خیال جھلک رہا تھا کہ آج مقابلہ زبردست ہے اس نے دیکھا اس کے سامنے ایک نہایت مضبوط اور تنومند عورت کھڑی ہے۔ اسی عورت سے کئی سال ہوئے مسٹر لاری کو بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مس پروس ایسی عورت ہے، جو

اس خاندان پر جان چھڑکتی ہے۔ اور مس پروس بھی خوب سمجھ گئی تھیں کہ میڈم ڈیفارج اس خاندان کی سب سے کمینی دشمن ہے۔

"میری کرسی وہاں میری بنائی کے ساتھ رکھی ہوگی" اس نے قتل گاہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہاں جاتے جاتے راستے میں ذرا اس کے پاس صاحب سلامت کی غرض سے چلی آئی۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تیری نیت خراب ہے۔ مگر خاطر جمع رکھ، میں تجھ سے نبٹ سکتی ہوں،" مس پروس نے کہا۔

دونوں اپنی مادری زبان میں بول رہی تھی۔ اس لئے قطعی ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھیں۔ مگر دونوں چوکس تھیں اور ایکدوسرے کے تیوروں سے گفتگو کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔

"اس وقت مجھ سے چھپنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نیک طن پرست اس رویہ کا کوئی غلط، مند نتیجہ نہیں نکالیں گے۔ مجھے اس سے مل لینے دو۔ جاؤ اس سے کہو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ سنا تم نے؟" میڈم نے کہا۔

اگر تیری آنکھیں پیچ کش ہوتیں اور میں ایک مسہری ہوتی تو بھی تو میری ایک کیل ڈھیلی نہ کر سکتی۔ بدذات عورت۔ میں تجھے

خوب نبٹ سکتی ہوں" مس پروس نے جواب دیا۔

میڈم ڈیفارج ان تشبیہات کی تفصیل کو قطعی نہیں سمجھی۔ مگر اتنا ضرور اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی کرکری ہو گی۔

" بیوقوف سور یا عورت! میں تیری بک بک نہیں سننا چاہتی میں ضرور اس سے ملوں گی۔ یا تو اس سے جا کر کہہ دے کہ میں اس سے ملنے پر مصر ہوں یا میرے راستے سے ہٹ جا اور مجھے اس کے پاس جانے دے" میڈم ڈیفارج نے چیں بہ جبیں ہو کر ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔

"تمہاری یہ احمقانہ زبان سمجھنے کی میں نے کبھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ مگر اس وقت سوائے جسم کے کپڑوں کے سب کچھ دیدوں اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ تمہیں اصلیت کے متعلق کچھ ذرا سا بھی پتہ ہے کہ نہیں"

دونوں مسلسل ایک دوسرے سے آنکھیں چار کئے ہوئے تھیں، میڈم ڈیفارج وہیں کھڑی تھی۔ جہاں مس پروس نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر اب وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

"میں برطانوی شہری ہوں اور اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہوں۔ مجھے اپنی رتی برابر فکر نہیں۔ بس میں اتنا جانتی ہوں کہ جتنی دیر

میں تمہیں یہاں روکے رہوں میری پیاری بٹیا کی زندگی کے لئے امید بڑھے گی۔ اگر تم نے مجھے انگلی بھی چھوائی تو تمہاری کھوپڑی پر ایک بال باقی نہیں بچے گا:" مس پروس نے کہا۔

مس پروس نے لمبے لمبے جملے لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر تیزی سے بول ڈالے۔ یہ وہ مس پروس تھیں جنہوں نے کبھی زندگی میں کسی پر وار نہیں کیا تھا۔

مگر ان کی ساری دلیری جذباتی قسم کی تھی۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔ اس بہادری کو بدقسمتی سے میڈم ڈیفارج نے بزدلی سمجھا۔" ہا! ہا!" وہ ہنسی — بدنصیب عورت! تیری حقیقت کیا ہے — میں اس ڈاکٹر سے بات کروں گی۔"

پھر اس نے اونچی آواز سے پکارا — " سٹیزن ڈاکٹر۔ ایوَمونڈ کی بیوی — ایورمونڈ کی لڑکی — اس کم بخت احمق کے سوا کوئی بھی میڈم ڈیفارج کی بات کا جواب دے"!

شاید جواب نہ ملا۔ اس لئے یا شاید مس پروس کے چہرے سے کچھ شبہ ہوگیا۔ یا ویسے بھی اس کے دل میں کسی نے کہہ دیا کہ وہ لوگ چلے گئے۔ میڈم ڈیفارج جھپٹی اور تینوں دروازے کھول ڈالے۔

" یہ سب کمرے الٹ پلٹ پڑے ہیں۔ شاید جلدی جلدی سامان

باندھا گیا ہے۔ ادھر ادھر چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ تمہارے پیچھے کمرے میں تو کوئی نہیں۔ مجھے دیکھنے دو۔"

"ہرگز نہیں" وہ میڈم کی درخواست قطعی سمجھ گئی جیسے میڈم ان کے انکار کا مطلب سمجھ گئیں۔

"اگر وہ کمرے میں نہیں ہیں تو پیچھا کرکے انھیں پکڑ کر واپس لایا جاسکتا ہے" میڈم نے خود سے کہا۔

"اوہ جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ وہ کمرے میں ہیں یا نہیں تم فیصلہ نہ کرسکو گی کہ کیا کرو اور اگر میرا بس چلا تو تم یہ نہ معلوم کرسکو گی۔ خیر معلوم کرسکو یا نہ کرسکو، میں تمہیں یہاں سے کبھی جانے نہیں دوں گی" مس پروس نے بھی خود سے کہا۔

انقلاب میں حصہ لینے کے لئے سب سے پہلے سڑک پر میں ہی نکل پڑی تھی۔ کسی کی کیا ہستی ہے جو مجھے روک سکے۔ چاہے مجھے تمہارے پرزے ہی اڑانے پڑیں۔ میں تمہیں اس دروازے سے ہٹا کے رہوں گی۔ میڈم ڈیفارج نے کہا۔

"ہم یہاں اتنی بلند عمارت پر تنہا ہیں۔ اور احاطے میں سناٹا ہے کوئی ہماری آواز نہیں سن سکے گا۔ اب خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے اتنی جسمانی طاقت دے کہ تمہیں روک سکوں۔ ایک ایک منٹ جو تم

یہاں گذار رہی ہو۔ میری پیاری بیٹی کے لئے ہزار ہزار روپیہ کا ہے" مس پروس نے کہا۔

میڈم ڈیفارج دروازے کی طرف جھپٹی۔ مس پروس نے ایک دم اسے کمر سے مضبوطی سے پکڑ کر روک لیا۔ میڈم ڈیفارج نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر بیکار۔ مس پروس بلا بن کر چمٹ گئیں۔ محبت ہمیشہ نفرت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ انہوں نے میڈم کو دبوچ لیا بلکہ انہیں اس کشمکش میں زمین سے اٹھا لیا۔ میڈم ڈیفارج نے دونوں ہاتھوں سے ان کا منہ نوچ ڈالا۔ مگر مس پروس نے سر نیچے جھکا لیا اور ان کی کمر سے ایسی چمٹی رہیں جیسے ڈوبتی ہوئی عورت جان بچانے کو چمٹ جائے۔

جلد ہی میڈم نے مارنا نوچنا بند کر دیا۔ اور اپنی کمر کو ٹٹولنا شروع کیا۔" وہ میرے ہاتھ کے نیچے ہے۔ تم خنجر نہیں کھینچ سکتیں۔ خدا کا شکر کہ میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ میں جب تک تمہیں پکڑے رہوں گی۔ جب تک ہم میں سے ایک بے ہوش نہ ہو جائے۔ یا مر نہ جائے" مس پروس نے کہا۔

میڈم ڈیفارج کا ہاتھ اپنے سینے پر گیا۔ مس پروس نے دیکھا اور ایک ہاتھ مارا۔ ہاتھ مارتے ہی ایک دھماکا ہوا اور ایک خوفناک

شعلہ نکلا اور وہ دھوئیں میں اندھوں کی طرح اکیلی کھڑی رہ گئیں۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوگیا۔ ایک خوفناک خاموشی طاری ہوگئی۔ دھواں مرنے والی کی روح کی طرح ہوا میں تحلیل ہوگیا اور اس کا بے جان جسم زمین پر پڑا رہ گیا۔

خوف کے پہلے حملہ پر تو مس پرڈس خود کو ایسی خطرناک مصیبت میں گھرا پاکر لاش سے دور بھاگ گئیں اور مدد کے لئے بیکار غل مچاتی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئیں۔ لیکن شکر ہے کہ فوراً ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اور وہ اپنے آپ پر قابو پاکر لوٹ آئیں۔ دروازے تک جانے کے لئے لاش کے پاس سے گذرتے ہوئے ان کا دم نکلا جارہا تھا۔ مگر مجبوراً اپنی ٹوپی اور دوسری چیزیں لینے انھیں بالکل قریب جانا پڑا۔ کیونکہ بغیر ان چیزوں کے وہ باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ انھوں نے دروازے بند کرکے تالا لگا دیا اور کنجی قبضہ میں کرکے سیڑھیوں پر ٹوپی وغیرہ پہنی۔ پھر وہ دم لینے کے لئے سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ پھر اٹھ کر تیزی سے روانہ ہوگئیں۔

خوش قسمتی سے ان کی ٹوپی میں نقاب لگی ہوئی تھی۔ ورنہ سڑک پر گزرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا۔ اور یہ بھی ان کی خوش قسمتی

تھی کہ وہ دیکھنے میں اس قدر بے ڈول تھیں کہ ان کی بگڑی ہوئی صورت کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ان کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اتنی نوچ کھسوٹ کے بعد کچھ ضرور فرق معلوم ہوتا۔ نقاب اور بے سنگم پن دونوں ہی ان کے بہت کام آئے کیونکہ ان کے چہرے پر ناخونوں کے کھروبنچے اور نچے ہوئے بال صاف دکھائی دیئے جاتے ان کا لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ جسے جلدی سے انہوں نے ہاتھوں سے ٹھیک ٹھاک کرلیا۔

پل پر سے گذرتے وقت انہوں نے کنجی دریا میں پھینک دی۔ وہ جیری کے وہاں آنے سے کچھ منٹ پہلے پہونچ گئیں۔ انھیں بُرے بُرے خیالات ستانے لگے۔ اگر کنجی جال ڈال کر نکال لی گئی ہوگی تب وہ لوگوں نے پہچان لیا ہوگا۔ اور اگر دروازہ کھول کے لاش مل گئی ہو تو کیا ہوگا۔ اور اگر انھیں دروازے پر روک کر قتل کا الزام لگا کر جیل میں بھیجدیا تو پھر کیا ہوگا انھیں یہ خیالات ستا ہی رہے تھے کہ ان کا ہمراہی آگیا اور انھیں سوار کرا کے لے گیا۔

"کیا گلی میں شور مچ رہا ہے؟" انھوں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں روزمرہ کا غل غپاڑہ ہے!" مسٹر کرنچر ان کی حالت

اور سوال سن کر چکرائے۔" مجھے سنائی نہیں دیتا کیا کہا تم نے"
مس پروس نے کہا۔

مسٹر کرچر نے اپنے الفاظ دہرائے مگر وہ بیکار ثابت ہوئے
مس پروس نے کچھ نہیں سنا۔

"اس سے بہتر ہے کہ میں سر ہلا دوں۔ شاید دیکھ تو لیں گی"
مسٹر کرنچر نے متعجب ہوکر سوچا۔

"کیا گلی میں اب بھی شور نہیں" تھوڑی دیر بعد مس پروس
نے پھر پوچھا۔

مسٹر کرچر نے سر ہلا دیا۔

"مجھے سنائی نہیں دیتا"

"انھیں ہو کیا گیا۔ ایک ہی گھنٹے میں بہری ہوگئیں" مسٹر کرنچر
نے پریشان دماغی سے جگالی کرتے ہوئے سوچا۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ایک شعلہ نکلا اور دھماکا
ہوا۔ اس زندگی میں بس وہ دھماکا آخری آواز تھی جو میرے کانوں
میں گئی" مس پروس نے کہا۔

"شرطیہ بڑی عجیب حالت ہو رہی ہے ان کی! اپنی ہمت کو
قائم رکھنے کے لئے انہوں نے کونسی چیز استعمال کی ہوگی۔۔ سنو۔ وہ

خوفناک پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی ہے!

"یہ تو سن سکتی ہو مس صاحب؟" مسٹر کرنچر نے اور زیادہ پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں کچھ بھی نہیں سن سکی"! ان کو اپنے سے مخاطب دیکھ کر مس پروس نے کہا "اے بھلے آدمی۔ پہلے تو زور کا دھماکا ہوا پھر مہیب سناٹا چھاگیا۔ اور وہ سناٹا جم کر رہ گیا ہے۔ اور زندگی بھر یونہی طاری رہے گا۔ کبھی نہ ٹوٹے گا۔"

"اگر انھیں ان خوفناک گاڑیوں کا شور نہیں سنائی دے رہا ہے جو مقتل کے قریب پہونچ رہی ہیں تو وہ اب دنیا میں کوئی چیز نہ سن سکیں گی"۔ مسٹر کرنچر نے انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اور واقعی وہ کبھی نہ سن سکیں!۔

پندرہواں باب
"قدموں کی چاپ ہمیشہ کیلئے ڈوب گئی"

پیرس کی سڑکوں پر موت کی گاڑیوں کی کھوکھلی گھڑگھڑاہٹ کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔ چھ عدد چھکڑوں میں موت کی دیوی کی خدمت میں روز مرہ کی شراب لے جائی جارہی تھی! جب سے انسان کے تخیل نے جنم لیا ہے ان گنت بھیانک دیووں اور عفریتوں کی تخلیق کی ہے۔ مس گلوٹین جیسا سب کو نگل جانے والا حریص آسیب خواب میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ فرانس کی سرزمین اور رنگا رنگ آب و ہوا پھول پتوں گھاس پھوس اور جڑی بوٹیوں کے لئے بھی کبھی اتنی زرخیز نہیں ثابت ہوگی جتنی اس وقت کے حالات نے اس قتل وغارت کے لئے اسے سازگار بنا دیا تھا۔ انسانیت کو جب بھی کچل کر توڑ مروڑ دیا جائے گا، وہ ایسی ہی ٹیڑھی اور مہیب صورت اختیار کرلے گی اور ظلم وستم کا آلہ بن جائے گی۔ جب کبھی ظلم وستم کا بیج بویا جائے گا تو ایسا ہی

زہریلا پھل پیدا ہوگا۔

یہ چھ عدد چھکڑے سڑک پر چلتے ہیں۔ اے وقت کے مقتدر جادوگر! انھیں اپنی پرانی شکلوں میں تبدیل کردے تو یہ پھر وہی جابر شاہوں اور امیروں کی گاڑیاں بن جائینگے۔ رئیسوں کی رتھیں اور بھڑکیلی حرافاؤں کے نگار خانے بن جائیں گے۔ وہ کلیسا بن جائیں گے۔ جو پروردگار کے گھر نہیں چوروں کے اڈے ہیں اور وہ جھونپڑیاں جن میں کروڑوں بھوکے کسان ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ مگر نہیں۔ یہ جادوگر تو پوری شان وشوکت سے اپنے پیدا کرنے والے کا حکم بجا لاتا ہے۔ اور ہیئت پھر نہیں بدلتی۔

"اگر تو نے خدا کے حکم سے یہ صورت اختیار کی ہے تو اسی بھیس میں رہ اور اگر جادو کے زور سے یہ ہیئت قبول کرنا پڑی ہے تو اپنی اصلی صورت پر آجا!" عرب کی کہانیوں میں جادوگر سحر زدہ انسان سے کہتا ہے۔ مگر ان چھکڑوں کی قسمت بدلنے والی نہ تھی اور وہ بڑھتے چلے جارہے تھے!

چھکڑوں کے پہیے جوں جوں آگے بڑھ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے سڑک پر انسانوں کے کھیت میں ہل سے گہری کھاڑی بنتی جارہی ہے۔ ہل مستعدی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

انسانی چہروں کی منڈیریں سڑک کے دونوں طرف چھٹتی جارہی ہیں۔ آس پاس کے گھروں میں بسنے والے اس منظر کے ایسے عادی ہوچکے ہیں کہ بہت سی کھڑکیوں میں سے کوئی فرد بھی نہیں جھانک رہا ہے۔ اگرچہ لوگ بے توجہی سے جھانک بھی رہے ہیں تو انہوں نے ہاتھ کے کام کو الگ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔ مزے سے کام کرتے جارہے ہیں۔ اور چھکڑوں پر جانے والے انسانوں کے چہرے دیکھتے جارہے ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ کوئی اجنبی بھی کسی شخص کے ساتھ نظر آجاتا ہے۔ جسے وہ ایک تجربہ کار پادری کی طرح انگلی کے اشارے سے تفصیل بھی سمجھاتا جارہا ہے۔ فلاں چھکڑے میں آج کون ہے۔ کل اسی جگہ کون جارہا تھا۔ اور اس سے اگلے دن کون گیا تھا۔

چھکڑوں پر سوار انسان اپنی زندگی میں آخری مرتبہ شہر کے راستے پر سے گذر رہے ہیں۔ کچھ خاموش آنکھیں پھاڑے یہ سب سن اور دیکھ رہے ہیں۔ کچھ بڑی دلچسپی سے انسان کے طور وطریق کو غور سے دیکھتے جارہے ہیں۔ کچھ ہاتھوں سے سر پکڑے غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جنہیں اب بھی اپنی سج دھج کا خیال ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے

کسی تھیٹر یا تماشے میں لوگوں کو دیدار کا شرف بخش رہے ہیں۔
کچھ آنکھیں بند کئے سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے بکھرے
ہوئے خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صرف ایک
ایسا شخص ہے جس غریب پر خوف اور دہشت کا نشہ سا سوار
ہو گیا ہے۔ اور وہ گا رہا ہے۔ ناچنے کی بھی کوشش کر رہا ہے۔
مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو عام تماش بینوں سے
رحم کی ایک نظر کا بھی خواستگار ہو۔

چھکڑوں کے آگے آگے کچھ محافظ بھی گھوڑوں پر سوار چل
رہے ہیں۔ جن سے لوگ کبھی کبھی سوال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ معلوم
ہوتا ہے کہ وہ سب ہی ایک سوال کر رہے ہیں۔ کیونکہ جواب سنکر
سب ایک دم تیسرے چھکڑے کی طرف یورش کرتے ہیں اس
چھکڑے کے آگے چلنے والے محافظ اپنی تلواروں سے ہر بار ایک
شخص کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ سب اسی کو دیکھنے کی فکر میں لگے
ہوئے ہیں۔ وہ چھکڑے کے پچھلے حصے میں کھڑا ہے۔ پہلو میں
بیٹھی ہوئی ایک کم سن لڑکی سے کچھ جھیپ کر بات کر رہا ہے۔
وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے۔ اس کو اپنے ارد گرد کے منظر
سے نہ کوئی دلچسپی ہے نہ اس کی پروا۔ صرف لڑکی سے باتیں کر رہا ہے

سینٹ ہونور کی سڑک پر ادھر ادھر سے لوگ اس پر آوازے کس رہے ہیں۔ اگر وہ کسی طرح اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو جواب میں آہستہ سے مسکرا کر اپنے چہرے پر اور بال بکھیر لیتا ہے۔ چونکہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اسلئے وہ اپنا چہرہ آسانی سے نہیں چھپا سکتا۔

ایک گرجا کی سیڑھیوں پر جاسوس یعنی جیل کا محافظ چھکڑوں کے انتظار میں کھڑا ہے۔ وہ پہلے چھکڑے میں دیکھتا ہے۔ ناامیدی ہوتی ہے۔ دوسرے چھکڑے میں بھی نہیں۔ وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے۔

"کیا اس نے میری بھینٹ چڑھادی؟" مگر فوراً اس کے چہرے سے پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ وہ تیسرے چھکڑے میں دیکھتا ہے!

"ایورمونڈ کون ہے؟" اس کے پیچھے سے ایک آدمی پوچھتا ہے،

"وہ ــــ ذرا پیچھے کی طرف!"

"وہ جو لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے؟"

"ہاں!!"

"ایورمونڈ مردہ باد، سولی پر چڑھادو سارے امراء کو ــ ایورمونڈ

مردہ باد ــــ! وہ آدمی چلّایا۔

"ارے ارے خاموش رہو" اس نے سہم کر التجا کی۔

"مگر کیوں نہیں سیٹیزن"

"وہ اپنا تاوان ادا کرنے جارہا ہے۔ پانچ منٹ میں وہ ہرجانہ ادا ہوجائے گا۔ جانے دو۔ بیچارے کو!"

مگر وہ آدمی مستقل چلّانے لگا "ایورمونڈ مردہ باد ــــــ"

ایورمونڈ نے ایک دفعہ اس کی طرف مڑکر دیکھا۔ ایورمونڈ نے مخبر کو دیکھا۔ غور سے دیکھتا رہا اور اپنی راہ چلا گیا۔

گھڑیوں میں تین بج رہے ہیں۔ خلقت کے بیچ میں جو ہل چلانے سے کھاڑی بن گئی تھی سمٹ کر قتل گاہ میں جمع ہوگئی جب آخری چھکڑے کا ہل اس کھاڑی میں گذر گیا تو انسانوں کی منڈیریں منہدم ہوکر ہموار ہوگئیں اور قتل گاہ کی طرف ان کے ساتھ چلنے لگیں۔ مقتل کے عین سامنے کرسیوں پر خواتین ایسے بیٹھی بنائی میں مشغول ہیں جیسے عام تفریح کے سرکاری باغ میں دل بہلانے آئی ہوں۔ سب سے اگلی کرسیوں میں سے ایک کے پاس ونجنس کھڑی اپنی دوست کو تلاش کررہی ہے۔

"ٹریسی ــــ ٹریسی ڈیفارج ــــ ارے کسی نے اسے دیکھا ہے!"

"اس سے پہلے اس نے کبھی ناغہ نہیں کیا" ایک بنائی کرنے والی نے کہا۔
"اور آج بھی وہ ناغہ نہیں کرے گی۔ ٹیریسی!" دیفرج نے چڑھ کر پکارا۔
"اور زور سے!" عورت نے رائے دی۔

"ہاں — زور سے — دیفرج اور زور سے پکارو — اور پھر بھی وہ تمہاری آواز نہیں سن سکے گی — اور زور سے۔ دیفرج — ذرا ساتھ میں ایک آدھ گالی بھی بڑھادو۔ مگر وہ پھر بھی نہیں آئے گی۔ دوسری عورتوں کو اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھیجو۔ کہیں رک گئی ہوگی۔ حالانکہ اسے بلانے والے خود نہایت مکروہ حرکات کر سکتے ہیں۔ مگر کیا وہ اس کی تلاش میں اتنی دور جانے کو تیار ہوں گے۔ جہاں وہ اس وقت ہوگی، کیا بدقسمتی ہے۔ اور لو چھکڑے تو آبھی گئے۔ ایوری مونڈ تو پلک جھپکتے میں ختم ہو جائے گا۔ اور وہ دیکھ بھی نہ پائے گی۔ یہ دیکھونا اس کی بنائی میرے ہاتھ میں ہے اور کرسی خالی پڑی ہے۔ یا خدا مجھے تو مارے غصہ کے رونا آرہا ہے"

جیسے ہی دیفرج نیچے اتری چھکڑے اپنا بوجھ اتارنے لگے "مس گلوٹین" کے خدام آراستہ پیراستہ تیار ہیں! کھٹاک! سراڑ گیا۔ جلاد نے اٹھا کر دکھایا۔ ایک لمحہ پہلے جب یہ سر سوچ سکتا تھا۔ اور بول سکتا تھا اس وقت بھی بننے والی خواتین نے کام سے نظریں اوپر تک نہ اٹھائیں صرف تعداد گنی — ایک!

دوسرا چھکڑا ابھی خالی ہو کر ہٹ گیا۔ اور تیسرا چھکڑا آیا۔ کھٹاک! مگر بننے والیاں بغیر ہاتھ روکے انہماک سے بنتی رہیں!

نام بہادر ایور مونڈ اترا اور اس کے بعد کم سن درزن کو بھی اتارا گیا۔ حسب وعدہ اس کے ہاتھ اترتے وقت بھی نہیں چھوڑا، اور مستقل پکڑے رہا۔ اس نے نہایت پیار سے اسے اس مشین کی طرف پشت کر کے بٹھا دیا۔ جو متواتر کھڑ کھڑاتی اور چڑھتی تھی۔ پھر دھماکے سے نیچے گرتی تھی۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور شکریہ ادا کیا۔

"عزیز اجنبی اگر تم ساتھ نہ ہوتے تو میری ڈھارس نہ بندھتی۔ میں قدرتی طور پر بہت ڈرپوک اور کمزور دل کی ہوں۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں اس ہستی کی طرف دھیان نہ لگا پاتی جسے صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ اور جس سے آج ہمارے دلوں میں امید اور سکون کا شعلہ جل رہا ہے۔ میں تو سوچتی ہوں تم آسمان سے میری ہمت بندھانے کے لئے بھیجے گئے ہو۔"

"اور تم میری ہمت بندھانے کیلئے بھیجی گئی ہو۔" سڈنی کارٹن نے کہا۔

"میری طرف نظریں جمائے رکھو اور کسی بات کی پروا نہ کرو۔"

"جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ اگر انھوں نے پھرتی کی اور مجھے ہاتھ چھوڑنا پڑا تب بھی مجھے کوئی پروا نہ ہوگی۔"

"خاطر جمع رہو — پھرتی ہی کریں گے وہ لوگ۔"

وہ دونوں کھڑے ہوئے ہیں۔ مظلوموں کا جھنڈ چھدرا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر وہ باتوں میں ایسے مشغول ہیں جیسے وہ وہاں تنہا کھڑے ہیں۔ آنکھ سے آنکھ ملا دے آواز، ہاتھ سے ہاتھ اور دل سے دل ملائے۔ دھرتی ماتا کے یہ دو بچے — ویسے

ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ آج ایک ہی تاریک راستہ سے ساتھ ساتھ ابدی سکون اور آرام کی طرف جا رہے تھے۔

"آئیے بہادر اور فیاض دوست۔ میں بڑی جاہل ہوں۔ میرے دل میں ایک بات فدا کھٹک رہی ہے کیا میرے ایک آخری سوال کا جواب دوگے؟"

"پوچھو ـــ کیا بات ہے؟"

"میری ایک رشتے کی بہن ہے وہی میری تنہا رشتہ دار ہے اور میری طرح یتیم ہے۔ میں اسے بہت چاہتی ہوں وہ مجھ سے پانچ برس چھوٹی ہے اور جنوب کی طرف ایک کسان کے گھر میں رہتی ہے۔ غربت نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اور اسے میری بدقسمتی کا کچھ پتہ نہیں۔ کیونکہ میں اسے لکھ نہیں سکتی تھی۔ اگر لکھ بھی سکتی تو اسے کیسے بتاتی۔ مگر یہ بھی ایک طرح سے ٹھیک ہوا نا؟"

"ہاں ـــ یہی ٹھیک ہے؟"

"جب ہم یہاں آ رہے تھے تو میں سوچ رہی تھی آپ کے بردبار اور مہربان چہرے کی طرف دیکھ کر میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ تب بھی یہی سوچتی ہوں کہ اگر پبلک سے واقعی غریبوں کو فائدہ پہنچنے والا ہے اگر ان کی بھوک کی شدت کم ہو جائے اگر ہر طرح سے ان کے دکھوں میں کمی آجائے تو میری وہ بہن بہت عرصے تک جیے گی۔ شاید اسے لمبی عمر نصیب ہو؟"

"تو پھر ـــ میری بھولی بہن۔ کیا کہنا چاہتی ہے؟"

"تو پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا جنت میں جب میں اس کا انتظار کروں گی تو بڑی کٹھن گھڑیاں گذریں گی۔"

"نہیں میری بچی وہاں نہ وقت کی رفتار ہوگی اور نہ مشکلیں۔"

"تم میری کتنی ہمت بندھاتے ہو۔ میں تو بالکل نادان ہوں۔ کیا وقت آگیا اب میں تمہیں پیار کرلوں۔"

"ہاں!"

دونوں نے ایک دوسرے کے لبوں کو بوسہ دیا۔ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کی۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا تو اس میں لرزش نہ تھی چہرے پر نہایت شیریں سکون اور صبر طاری تھا۔

اس سے پہلے لڑکی کو جانا تھا۔ وہ گئی!

"میں مرنے والوں کے لئے پیام حیات ہوں اور میں ہی نور زندگی" خداوند مسیح فرماتا ہے۔

"وہ جسے مجھ پر ایمان ہے۔ مر کر بھی زندہ رہے گا۔ اور وہ جو زندہ ہے اور مجھ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔"

بہت سی آوازوں کی بھنبھناہٹ ـــــ بہت سے اوپر اٹھے ہوئے چہرے، مجمع کی قطار پر بڑھتے ہوئے قدم ـــــ مجمع ایک جیسے پانی کی موج کی طرح آگے بڑھ آتا ہے ـــــ اور سب کچھ ایک جھلک دکھا کر گم ہوجاتا

ہے۔ تئیس۲۲ !

اس رات شہر کے لوگوں نے کہا کہ اس کا جیسا پرسکون چہرہ مقتل میں کبھی نہیں دکھائی دیا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ مرتے وقت اس کا چہرہ تقدس کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ اور اس پر ایک پیغمبرانہ شان تھی۔

اسی کلہاڑی کا شکار ہونے والوں میں ایک عجیب و غریب عورت تھی، جس نے عین سولی کے سائے میں جا کر درخواست کی کہ اسے ان خیالات کو تحریر کرنے کی مہلت دی جائے جو اس وقت اس کے دماغ میں موجزن ہو رہے تھے۔ اگر سڈنی کارٹن اپنے خیالات کو اظہار کا جامہ پہنا سکتا تو یہ الہامی الفاظ ہوتے ——

• میں دیکھ رہا ہوں۔ پرانے ظالمانہ نظام سے ابھرنے والے نئے ظالموں کو —— برساڈ کلائی اور ڈیفارج —— ونجنس —— جیوری اور جج کو —— یہ سب کے سب اسی طرح ختم ہو جائیں گے۔ سزا کا یہ ہتھیار — ملنے سے پہلے ان سب کو نیست و نابود کر دے گا۔

میں ایک خوبصورت شہر دیکھ رہا ہوں۔ وہ بھی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے راستے میں فتوحات بھی ہیں اور ناکامیاں بھی۔

زمانہ حال کی خباثت جو زمانہ ماضی کی خباثت کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، آہستہ آہستہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے فنا ہو چکی ہے۔

میں ان انسانوں کی زندگیوں کو بھی دیکھ رہا ہوں جن کی خاطر میں نے اپنی زندگی قربان کی۔ اس انگلستان میں جسے میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ وہ مطمئن کارآمد خوش حال اور پُر مسرت زندگی گذار رہے ہیں۔ اس نازنین کی چھاتی پر ایک ننھا سا بچہ ہمک رہا ہے، میری یاد میں اس نے اس کا نام سڈنی رکھا ہے۔ میں اس کے باپ کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ بڑھاپے سے کمر جھک گئی ہے۔ مگر وہ صحت یاب ہو چکا ہے۔ اور بڑی جانفشانی سے انسانوں کے دکھ درد کا علاج کر رہا ہے۔ میں اس ضعیف شخص مسٹر لاری کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ ان کا پرانا دوست ــــ جس نے ان دس برسوں میں اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر کے ان کی زندگیوں کو مسرتوں سے پر کر دیا۔ اب چین کی نیند سو رہا ہے۔

پُشتہا پُشت تک ان کے اور ان کی آل اولاد کے دلوں میں میرے لئے جذبۂ تقدیس جاگتا رہے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں ــــ وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔ مگر آج کے دن کی یاد میں وہ میرے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ وہ اور اس کا شوہر اپنے آخری بستر خاک پر پہلو بہ پہلو لیٹے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں ان کے دلوں میں کبھی ایک دوسرے کے لئے اتنا احترام اور تقدیس نہیں پیدا ہوا جیسا ان دونوں کے دلوں میں میرے لئے تھا۔

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرا ہم نام بچہ جو ایک دن اس کے سینے پر لیٹا تھا جوان ہو گیا ہے۔ زندگی کے اسی میدان میں جہاں کبھی میں بھی رواں دواں تھا

کامیابیاں اس کے قدم چوم رہی ہیں۔ اسے اس قدر شہرت ملی ہے کہ اس کے سہارے سے میرا نام روشن ہوگیا ہے۔ وہ سیاہ داغ جو میں نے ایک دن اسی نام پر لگائے تھے مٹ گئے ہیں۔ انصاف پسند انسانوں کی صف میں وہ سب سے پیش پیش ہے۔ وہ ایک اور میرے ہم نام بچے کا ہاتھ پکڑے قتل گاہ میں لئے چلا آرہا ہے۔ نہیں یہ قتل گاہ نہیں۔ بدل کر نہایت حسین جگہ بن گئی ہے۔ اور آج کی سیاہ کاریوں کا اس پر ایک بھی داغ نہیں۔ وہ بھورے بالوں اور روشن پیشانی والا بچہ۔۔ کسی کی یاد تازہ کررہا ہے۔۔ اس میرے ہم نام بچے کو وہ میری کہانی سنا رہا ہے۔ میں سُن رہا ہوں۔۔

جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی آواز لرز رہی ہے!

"یہ موت نہیں۔۔ میری زندگی کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔

"یہ خاتمہ نہیں۔۔ وہ ابدی سکون ہے جو زندگی میں مجھے کبھی نصیب نہ ہوا"

A TALE OF TWO CITIES,

BY

CHARLES DICKENS

وکٹورین عہد کا عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس "دو شہروں کی کہانی" کا خالق ہے۔ یہ اس کا واحد تاریخی ناول ہے جو اس نے کارلائل کے "انقلاب فرانس" سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

مارکوئس ایورمونڈ اور ان کے بھائی ایک کسان خاندان پر بے پناہ ظلم ڈھاتے ہیں۔ ایک عورت کو زبردستی اپنے محل میں اٹھا لاتے ہیں۔ اس کے شوہر اور بھائی کو مار ڈالتے ہیں۔ صدموں سے وہ عورت بھی مر جاتی ہے۔ ڈاکٹر الیگزنڈر اس واقعے سے باخبر ہو جاتے ہیں اور حکام اعلیٰ سے شکایت کر دیتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں بیسٹل میں 18 سال تک قید رہنا پڑا اور جب وہ قید سے رہا ہوئے تو اپنے ہوش و حواس کھو چکے تھے۔
کہانی ڈاکٹر کی بیٹی لوسی کے گرد گھومتی ہے جس کی شادی ظالم مارکوئیس کے بھتیجے چارلس ڈارنے سے ہوئی ہے۔ ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ڈارنے پیرس میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کی بیوی اور بچی، خسر سڈنی کارٹن اور مسٹر لاری سبھی کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ میڈم ڈیفارج کو ڈارنے سے شدید نفرت تھی اور اس کی یہ نفرت بلاوجہ بھی نہیں تھی۔ ایک لاابالی بیرسٹر کی بے پناہ محبت ڈارنے کو موت کے منہ سے بچا لیتی ہے اور ناول اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے۔

جس انداز سے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور کرداروں کو پیش کیا گیا ہے اس سے اس وقت کے وحشیانہ پن اور لرزہ خیز واقعات کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مصنف نے اپنی قوتِ تخیل سے اس وقت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جو کسی تاریخی روزنامچے سے کہیں زیادہ صاف اور واضح ہے۔
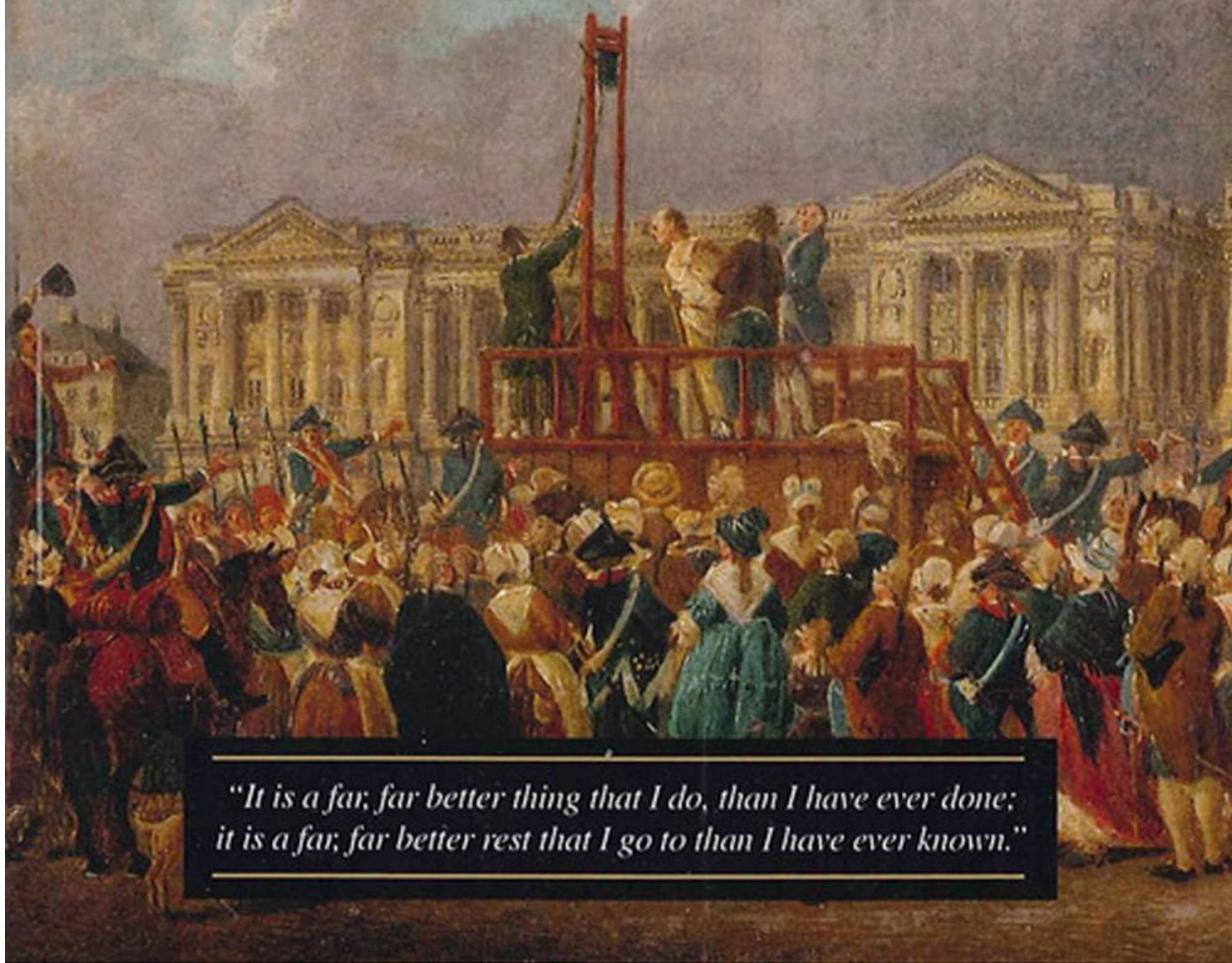
A Tale of
Two Cities
Charles Dickens
"It is a far, far better thing that I do, than I have ever done;
it is a far, far better rest that I go to than I have ever known."